

لَا شَيْءَ إِغْدَانَا الصَّارِطَا

تنزيله رياض



دشِ ظلمت میں

”دامن سے لے کر آستینوں تک یہ والا ڈیزائن اس طرح سے چھاپنا کہ درمیان سے خم بن جائے۔“

اس نے قمیص کا کپڑا پھیلا کر رکھتے ہوئے انگلی سے نشاندہی کی۔ حیدر نے خاموشی سے اس کی ہدایت کو سنا پھر متعلقہ ڈیزائن والا کاربن پیپر نکالنے لگا۔ اس کے چہرے سے اس کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ اپنی عادت کے برخلاف وہ اسے مشورہ دینے کے بجائے چپ چاپ کاربن پیپر کے پلندے میں کھویا ہوا تھا۔ اس کو مصروف اور اس درجہ لائق دیکھ کر مریم دکان کا جائزہ لینے لگی۔ وہ کافی عرصہ بعد حیدر کی دکان پر آئی تھی، اس لیے اسے بہت سی نئی تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں۔ گزشتہ مہینے حیدر نے نئی پیکوشین خریدی تھی جس کے لیے اسے ایک نیا ملازم رکھنا پڑا تھا۔ اب اس کی دکان پہ بشمول اس کے تین لڑکے ہوتے تھے۔ ایک لڑکا پیکو کرتا تھا جبکہ دوسرا چھپائی کا کام سنبھالتا تھا۔ دو ملازموں کی بدولت اب حیدر کا کام ان کی نگرانی در قم وصولی، دھاگوں یا اس قسم کی دوسری چیزوں کو فروخت تک محدود ہو گیا تھا۔ مریم چونکہ گھر کی فرد تھی، اس لیے اس کی قمیص کی چھپائی حیدر خود کر رہا تھا مگر اس کے چہرے پہ خفگی کے آثار نمایاں تھے اور مریم اس کی خفگی دور کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ کوئی ایسی چیز تلاش کر رہی تھی جسے موضوع گفتگو بنا کر وہ اسے مخاطب کر سکے۔ اسے بالآخر مختلف رنگوں کے دھاگوں کی ٹلکیوں سے بنی الماری میں ایک چیز نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک موٹی سی کتاب تھی۔ مریم نے ہاتھ بڑھا کر اس کتاب کو اٹھالیا جس پر بی اے انگلش کا بیڈبک لکھا تھا۔

”یہ کس کی کتاب ہے؟“ صفحہ در صفحہ پلٹتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔ حیدر نے ایک نظر اسے دیکھا پھر اس کے ہاتھ سے وہ کتاب تقریباً چھیننے والے انداز میں پکڑ کر بند کی اور اسی جگہ پر رکھ دی جہاں سے مریم نے اٹھائی تھی۔ مریم کو محدود درجہ بے عزتی کا احساس ہوا مگر یہ احساس نیا نہیں تھا۔ وہ گزشتہ کئی دن سے حیدر کا یہی رویہ برداشت کرتی چلی آ رہی تھی۔ حیدر اس کی حالت زار سے بے خبر وہی کپڑا میز پر رکھ کر ہاتھوں کے دباؤ سے اس پر

پڑی سلوٹیں دور کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے اس پر متعلقہ ڈیزائن والا کاربن پیپر بچھالیا۔ وہ کافی پسند کیے جانے والا ڈیزائن تھا اور بار بار چھپائی کے باعث کچھ بوسیدہ ہو چکا تھا۔ اسی دوران دو خواتین آگئیں جنہیں دھاگے اور موتی وغیرہ خریدنے تھے۔ حیدر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ حالانکہ اس کا ملازم پہلے ہی ان خواتین کو ڈیل کر رہا تھا۔ حیدر کا انداز دیکھ کر مریم کا معصوم دل مزید دکھی ہو گیا۔

”مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے اور ان سے کتنی محبت سے بات کر رہا ہے“ اس نے آنکھوں میں آئی ہلکی ہلکی نمی کو پیتے ہوئے خود کلامی کی۔ حیدر اس کا فرسٹ کزن تھا۔ پھپھاجی کی وفات کے بعد پھپھو اپنے سسرال میں رہنے کے بجائے ان کے گھر آگئی تھیں۔ اس کے بعد انہیں سسرال سے لینے کوئی آیا نہ ہی انہوں نے خود واپس جانا مناسب سمجھا۔ بھائی نے بھی بہن کا بہت ساتھ دیا اور زندگی کے ہر معاملے میں ان کی مدد کی کیونکہ اللہ کا دیا بہت کچھ تھا ان کے پاس۔ اپنی زمین، دو بھینسیں، ذاتی مکان، بچوں کے جوان ہونے تک اس عادت میں مزید چنگی آتی چلی گئی۔ مریم اور عمر دو ہی بہن بھائی تھے۔ حیدر نے ان کی تکون کو مکمل کر دیا تھا۔ ان تینوں میں بہت گہری دوستی تھی۔ وہ ہر کام ایک ساتھ کرنے کے عادی تھے۔ حیدر نے اسکول جانا شروع کیا تو ایک ہی ضد لگائے رکھی۔

”عمر اور مریم کو ساتھ لے کر اسکول جاؤں گا۔“

”عمر تو ابھی بہت چھوٹا ہے اور مریم لڑکی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ اسکول نہیں جاسکتی۔“ ماموں نے

سمجھایا تو وہ اور بھی بھڑک اٹھا۔

”واہ جی واہ..... مریم لڑکی ہے..... جب یہ مریم کی بچی کرکٹ کھیلتے ہوئے مجھے اور عمر کو چوکے مارتی ہے، تب آپ کہتے ہیں کہ مریم تو میرا بیٹا ہے اور اب یہ مریم لڑکی ہوگئی۔“

وہ تنک کر بولا تو انہیں اس پر اور بھی پیار آیا۔ انہوں نے اس کے گالوں کو چومتے ہوئے اسے گود میں اٹھالیا۔ وہ جانتے تھے کہ تینوں بچے ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں اور ان کا ایک دوسرے کے بغیر گزارا نہیں، اس لیے وہ ماسٹر صاحب سے خصوصی اجازت لے کر آئے کہ کچھ دن تین سالہ مریم کو اس کے ساتھ بیٹھنے دیا جائے۔ یوں ننھی مریم اس کے ساتھ لڑکوں کے اسکول جانے لگی، لیکن اس سے حیدر کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ حیدر کے کلاس فیلوز اور سینئر لڑکے مریم کو اتنا پیار کرتے، اس سے دوستی کرنا چاہتے تھے تو حیدر آگ بگولا ہو جاتا اور ان سے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا۔

”یہ تو بالکل میری گڑیا ہے۔“ ایک دن ماسٹر صاحب نے مریم کو گود میں بٹھا کر پیار کرتے ہوئے کہا تو حیدر کی شکل دیکھنے والی تھی۔ وہ ماسٹر صاحب سے جھگڑا نہیں کر سکتا تھا مگر اس دن کے بعد سے اس نے مریم کو ساتھ لے جانے کی ضد نہیں کی۔ اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر مریم نے ماسٹر صاحب سے دوستی کر لی تو کیا ہوگا۔

☆ ☆ ☆

”ذرا دھیان سے کرنا۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”مجھے مشورہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر غرایا۔ مریم اس کی دوسری بدتمیزی

پر پہلے کی طرح پھر خاموش ہوگئی۔ حیدر نے اسٹیج کو ہلکے ہاتھ سے تجوڑ کر کاربن پیپر پر بکھ دیا۔ وہ مریم کو ستانا نہیں چاہتا تھا مگر نجانے کیسے جوہ نہیں چاہتا تھا، وہی ہو گیا تھا۔ کاربن پیپر بوسیدہ ہونے کے باعث درمیان میں سے پھٹ گیا اور ساری روشنائی کپڑے کو پھول بوڑوں سے آراستہ کرنے کی بجائے دائدار کر گئی۔ دونوں کچھ لمحے تک اس ہلکے بزرگ کے کپڑے کو تکتے رہے پھر مریم کے منہ سے ”ہا“ کی صورت سکی نما آواز نکلی۔

”کوئی مسئلہ نہیں، کوئی مسئلہ نہیں۔ دھل کر صاف ہو جائے گا۔ پکارنگ نہیں ہے، ایک دھلائی کی مار ہے۔“ حیدر کا خود ساختہ خول لمحہ بھر میں جچ گیا تھا۔ وہ پشیمانی سے کہنے لگا۔

”بیڑا غرق ہو تبہارا حیدر! یہ کیا کر دیا تم نے۔ ہائے میرے اللہ! کتنا پسند تھا مجھے یہ رنگ۔ پھپھو نے کتنے شوق سے مجھے یہ تین سو روپے کا سوٹ لے کر دیا تھا۔“ وہ روہاسی ہو کر بولی جبکہ حیدر کہنے لگا۔

”یہ دھل کر صاف ہو جائے گا مریم! سرف ایکسل ہے نا۔“

”مریم! سرف ایکسل کے بچے۔ میری خوشی سے تمہیں پتا نہیں کیوں آگ لگ جاتی ہے۔“

وہ جل کر بولی پھر اس کے ہاتھ کے نیچے سے وہ قمیص کا کپڑا کھینچ کر نکالا اور تن فن کرتی اس کی دکان سے باہر نکل گئی۔ اس کی امی ساتھ والی دکان سے دو بچے رگوار ہی تھیں۔ اس نے پلٹ کر ایک بار بھی حیدر کی جانب نہیں دیکھا تھا جس کے دل پر ایک بات نقش ہو کر رہ گئی تھی۔

”میری ہر خوشی سے تمہیں پتا نہیں کیوں آگ لگ جاتی ہے۔“

☆ ☆ ☆

”ناراض ہو؟“ حیدر نے یکدم سوال کیا تل کے نیچے پڑے پانی سے بھرے ٹب میں مریم کا متحرم ہاتھ رک گیا۔ منشی چاچا کچھ دیر پہلے آموں سے بھرا ٹوکرا دے کر گئے تھے۔ مریم محن میں ایک طرف لگے تل کے پاس بیٹھی آم دھونے میں مصروف تھی۔ حیدر چوکی لے کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”نہیں، میں کیوں ناراض ہونے لگی تم سے۔“ وہ بے حد لائق سے بولی تو حیدر اس کے انداز پر کٹ سا گیا مگر کچھ کہنے کی بجائے اس نے بھی اسی ٹب میں ہاتھ ڈال دیے اور مریم کے ساتھ ٹل کر آموں کو غسل دینے لگا۔ یہ اس کے بچپن کی عادت تھی۔ وہ مریم کی ناراضی دور کرنے کے لیے اسی طرح اس کے کاموں میں اس کی مدد کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا اور اس دوران اگر وہ اسے مخاطب کر بیٹھتی تو پھر خوب ہنستا۔

”ارے گلابی سنڈی! تم مجھ سے ناراض ہو بھی! اتنی جلدی بھول کیوں جاتی ہو۔ یاد نہیں تم نے قسم کھائی تھی کہ اب مجھ سے بات نہیں کرو گی؟“ وہ اسے چڑانے کو کہتا تو مریم خاموش ہو جاتی۔

”مان لو گلابی سنڈی! تم میرے بغیر رہ ہی نہیں سکتیں۔“ وہ سینہ تان کر کہتا تو مریم اس کے بال کھینچنے لگتی پھر وہ دونوں ہنس دیتے اور ناراضی ختم ہو جاتی مگر اس بار کی ناراضی عجیب ہی تھی، جس میں خفگی سے زیادہ لا تعلقی اور اجنبیت تھی۔ مریم ٹب میں اس کے ہاتھوں کو حرکت کرتا دیکھتی رہی پھر اس نے آہستگی سے اپنے ہاتھ ٹب سے باہر نکال لیے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھتی حیدر نے اس کا ہینگا ہاتھ تھام لیا۔

”یہ ٹھیک نہیں ہے مریم!“ وہ بہت بے چارگی سے بولا جیسے خود اپنے آپ سے تنگ آچکا ہو۔ گزشتہ

کئی دنوں سے اس کے دل میں جو اٹھل پھٹل مچ چکی تھی، وہ خود بھی اس سے عاجز آچکا تھا۔ مریم اس کی ماموں زاد تھی۔ وہ ماموں جس نے اسے اس کے ابا کے انتقال کے بعد باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ آج کل جو سوچ رہا ہے، اس کی بجائے کسی کے کانوں تک پہنچے۔ سہارا ماموں سمجھیں کہ وہ اپنی اوقات بھولتا جا رہا ہے۔ اسے اپنی اور اپنی امی کی عزت کا بہت پاس تھا مگر آج کل حالات جس بچ پر چل رہے تھے، وہ بھی ناقابل برداشت تھے۔ اس کے دل میں اپنی کم مائیگی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی اس ذہین و فطین، گوری جتنی کزن کے سامنے خود کو بہت کمتر محسوس کرنے لگا تھا۔ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اسے ہمیشہ سے اپنے لمبے چوڑے کمرتی جسم پر اور اپنے قد و قامت پر ناز محسوس ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس جیسی شاندار شخصیت والا لڑکا پورے خاندان میں کوئی دوسرا نہیں ہے، مگر جب مریم کا ایف ایس سی کارڈ آتا تو اسے احساس ہوا کہ صرف لمبا چوڑا شاندار سراپا کافی نہیں ہوتا۔ اپنا آپ ثابت کرنے کے لیے کچھ اور خصوصیات بھی ہونی چاہئیں جو اس میں موجود نہیں تھیں اور تب ہی سے احساس ہوا کہ وہ مریم کے لیے کچھ مختلف قسم کے محسوسات کا شکار ہو رہا ہے۔ ان دنوں مریم انٹری ٹیسٹ کی تیاری کرنے لگی اور حیدر نے مسجد جا کر پانچوں وقت باجماعت نماز ادا کرنا شروع کر دی۔ سب کا خیال تھا کہ وہ مریم کے لیے دعا کرتا ہے۔ مگر وہ عجیب سے خدشات میں گہرا رہتا۔

”اگر مریم ڈاکٹر بن گئی تو ماموں مجھ جیسے چھاپے والے کو کبھی اپنی قابل بیٹی دینا پسند نہیں کریں گے۔“

وہ اکثر سوچتا اور پھر خود ہی شرمسار رہتا۔ وہ خود سمجھ نہیں پاتا تھا کہ وہ مریم کی کامیابی سے جلنے کیوں لگا ہے۔ حالانکہ تینوں بچوں میں بڑا ہونے کے باعث ماموں ممانی اسے بہت عزت دیتے تھے مگر بھی وہ سب سے خائف رہنے لگا۔ اس کی بددعاؤں کا نتیجہ تھا شاید کہ مریم انٹری ٹیسٹ میں ٹپل ہو گئی۔ حیدر کو لگنے لگا جیسے محاذوں پہ خاموشی چھا گئی ہے۔ اسے اطمینان ہونے لگا مگر مریم اس کے اطمینان کی دشمن تھی۔

”میں بی ایس سی نہیں کروں گی، میں کچھ اور کرنا چاہتی ہوں۔ کچھ ایسا جسے کر کے مجھے سکون ملے۔ میں اپنے آپ کو اسی فیلڈ سے منسلک رکھنا چاہتی ہوں، جس کے میں نے خواب دیکھے تھے۔ میں ڈاکٹر نہیں بن سکی مگر میں نرس تو بن سکتی ہوں۔“ اس نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ اخبار میں چھپنے والے کسی اشتہار نے اسے پھر سے حیدر سے دور کرنے کے اسباب پیدا کر دیے۔

”میں نرسنگ کرنا چاہتی ہوں ابو!“ اس نے اسی روز کھانا کھاتے ہوئے سب کے سامنے ابوجی کو مطلع کیا۔ حیدر کو بعض لوگوں کی خبر نہیں تھی مگر خود اس نے خاموشی سے جج پلیٹ میں رکھ کر کھانے کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ اس کی ہموک بی اڑ گئی تھی۔ ماموں نے ہنس کر بات ٹال دی مگر اس کا دل چاہا کہ دو جوتے لگا کر اس ہٹ دھرم لڑکی کو قاضی صاحب کے سامنے لے جا کر کھڑا کرے اور اس مؤثر صورت ضدی لڑکی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا پابند کر لے مگر وہ یہ سب صرف سوچ سکتا تھا۔ آنے والے دنوں میں مریم کی ضد بڑھتی گئی اور ماموں مسلسل انکار کرتے گئے وہ چاہتے تھے مریم بی ایس سی کر لے مگر مریم کے ذہن و دل پہ سفید اور آل چمک کر رہ گیا تھا۔

”حیدر..... میرے اچھے بھائی..... تمہاری بات تو ابوجی ضرور مان لیں گے۔ تم میری سفارش کر دو۔ یہ میرا خواب ہے حیدر! یہ پورا نہیں ہوا تو میں مرجاؤں گی۔ میں بچ مرجاؤں گی۔“

وہ ایک دن اس کے کندھے پر سر رکھ کر روتے ہوئے کہنے لگی۔ اس کی اس فرمائش پہ حیدر تقریباً تڑپ اٹھا۔ اسے لفظ ”بھائی“ یکدم ہی برا لگنے لگا مگر مریم کا رونا بھی برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے دل کو مار کر اس نے ماموں کو منالیا تھا۔ حیدر نے خود مریم کے فارمز اور فیس وغیرہ جمع کروائی تھی مگر ہر مقام پر وہ اپنے آپ کو مزید کھوکھلا اور بے جان محسوس کرتا۔ وہ چڑچڑاہوتا جا رہا تھا۔ عجیب سی قنوطیت اسے گھیرے رکھتی اور لوگ شکوہ کرتے رہتے کہ وہ بدل گیا ہے۔ وہ جانتا تھا، وہ تبدیل نہیں ہوا مگر ہر گزرتے دن کے سامنے اس کے دل میں اپنی کم مائیگی کا بڑھتا ہوا احساس اسے کمزور کر رہا تھا۔

”حیدر..... حیدر کے بچے..... میرا ہاتھ چھوڑو۔“

وہ اس کا ہاتھ پکڑے سوچ کی بجائے کون سی سیڑھی چڑھ رہا تھا کہ مریم نے اس کی پیشانی پر دوسرا ہاتھ مار کر اسے ہوش کی دنیا میں واپس لانا چاہا۔ حیدر نے دھیرے سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”حیدر.....! تمہیں کیا ہو گیا ہے..... تم بہت بدل گئے ہو..... تم ایسے تو نہیں تھے۔“ مریم نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ وہ شاید کسی حیدر کی کیفیت کو سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اونچا مزید اونچا اڑنے کی لگن اسے کسی اور طرف دھیان دینے کا موقع کم ہی دیتی تھی۔

”میں کیا کروں مریم! میرا ہی آج کل بہت اداس رہنے لگا ہے۔“ حیدر نے تھک ہار کر کہہ ڈالا۔

”مجھے ہر چیز سے الجھن ہوتی ہے۔ دل چاہتا ہے خود مرجاؤں یا سب کو مار ڈالوں۔“ مریم کے خاموش رہنے پر مزید گویا ہوا۔

”میری وجہ سے اداس ہوتا؟“ مریم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے یکدم سوال کیا تو حیدر اثبات میں سر ہلا گیا۔ مریم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری تھی۔

”بہت محبت کرتے ہونا مجھ سے؟“ مریم نے ایک بار پھر سوال کیا تو وہ ہکا بکا ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔ وہ بات جو وہ بہنوں سے خود سے کہتے ہوئے بھی شرما رہا تھا، وہی بات مریم نے بہت آرام سے کہہ ڈالی تھی۔

”عمر کی حالت بھی تمہارے جیسی ہو رہی ہے، وہ تمہاری طرح چڑچڑا تو نہیں ہوا مگر بہت اداس رہنے لگا ہے۔ میں جانتی ہوں تم دونوں مجھے چڑانے کے لیے مجھ سے جھگڑا کرتے ہو مگر حقیقتاً تم دونوں کو مجھ سے بہت محبت ہے۔“ اس کی بات سن کر وہ گہرا سانس بھر کر رہ گیا۔

”تم بالکل بے وقوف ہو مریم!“ وہ بے چارگی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”ابویں..... کوئی نہیں..... تم خود ہو گے بے وقوف۔“

وہ ناک چڑھا کر بولی پھر صحن کے پتھوں بچ پڑی چار پائی پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنے والے دنوں کے حوالے سے ایک نیا عزم صاف دکھائی دے رہا تھا اور حیدر کو اس کے ان ہی عزائم سے ڈر لگتا تھا۔ وہ دو سال بعد والی مریم کا تصور کرنے کی کوشش کرتا تو سادہ لباس میں چوٹی باندھے معصومیت سے مسکراتی ہوئی مریم

کی بجائے ایک نہایت طرحدار اسٹاکش لباس میں ملبوس اونچی ہیل اور کھلے بالوں کے ساتھ منہ میڑھا کر کے انگریزی بولتی ایک لڑکی اس کے سامنے آ جاتی۔ کلف نگے شلوار قمیص میں ملبوس اپنے آپ کو شہزادہ سمجھنے والا حیدر، مریم کے سامنے ایک دم ہی چند لگنے لگتا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس قسم کی سوچوں کو جنٹیک نہیں پاتا تھا۔

”مریم! ایک بات پوچھوں؟“ اس نے وہیں ٹل کے پاس بیٹھے بیٹھے مریم کو مخاطب کیا۔

”نہیں۔“ وہ فوراً بولی بھر بے وجہ ہنسنے لگی۔

”تم بالکل بدل گئے ہو حیدر! اب تم مجھ سے اجازت لے کر بات کیا کرو گے۔ ارے میں وہی مریم ہوں جسے تم گلابی سنڈی اور چٹکبری سنڈی کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔“ وہ کلفتہ سے انداز میں اسے اس کے بدلے ہوئے رویے کا احساس دلانے لگی۔ حیدر بھی اب کی بار کھل کر مسکرایا۔

”میں چاہے سو بار بدل جاؤں مریم! مگر تم کبھی مت بدلنا۔ ایسی ہی رہنا معصوم، اپنی اپنی سی۔“ وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی سی آواز میں بولا تو مریم کی بولتی بند ہو گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے حیدر کو مزید مسکرانے پر مجبور کیا۔

”اتنی بھی بے خوف نہیں ہو مریم!“ یہ بات اس نے خود سے کہی اور مریم نجانے کیوں بس پاؤں کی اگھیلوں کو نکتے جا رہی تھی۔



گھڑی کی سوئیاں نجانے کیا بجا رہی تھیں جب اس کی آنکھ کھلی۔ کھڑکیوں کے پرے ابھی تک نہیں ہٹائے گئے تھے جس کی وجہ سے کمرے میں تاریکی کا راج تھا اور سامنے دیوار پر لگی گھڑی اسے صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے دو تین بار آنکھیں جھپکیں پھر منہ کھول کر جمائی لی۔ اس کے سارے وجود پر عجیب سی کسلندی اور بیزاری چھائی ہوئی تھی۔ اس کا جب جب اپنی می سے جھکڑا ہوتا تھا، تب تب یہی بیزاری اس کے پورے وجود پر چھا جاتی تھی۔ اس نے کروٹ بدلی اور سائینڈ ٹیبل پر پڑی اپنی رسٹ وایج اٹھا کر ٹائم دیکھنے لگا۔ بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ اسے حیرت کا شہید جھٹکا لگا۔ اس کا خیال تھا ابھی ساڑھے چھ یا سات کا وقت ہوا ہوگا۔

”یعنی کہ حد ہو گئی۔ ایک می کا موڈ مجھ سے آف ہو جائے تو سارا گھر مجھ سے لاتعلقی ہو جاتا ہے“ اس نے گردن جھٹک کر خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ اسے جلد از جلد اٹھ کر پارک میں واک کے لیے جانا تھا، جہاں اس کی اپنے پاپا کے ساتھ ملاقات متوقع تھی مگر می کے ساتھ ہونے والے جھگڑے نے سب چوٹ کر دیا تھا۔ اسے پاپا کے ساتھ بہت سی باتیں ڈسکس کرنا تھیں جو وہ اب نہیں کر سکتا تھا کیونکہ پاپا ایک ماہ کے لیے تھائی لینڈ جا رہے تھے۔ اسے رات والے جھگڑے کے متعلق بھی پاپا کو مطلع کرنا تھا۔ روٹین کے مطابق وہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب گھر واپس آیا تو می پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں۔ انہوں نے اپنے ذرائع سے اس کے میٹرک کا رزلٹ پتا کر لیا تھا اور وہ اس بار بھی کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ حالانکہ اس سال وہ دوسری بار میٹرک کا امتحان دے رہا تھا۔

”تمہارے رزلٹ کا کیا بتا سنی؟“ می نے سنجیدگی سے استفسار کیا تھا۔ وہ لاؤنج میں پڑے فرنیچ کا دروازہ کھولے پانی کی بوتل نکال رہا تھا۔ ان کے انداز نے اسے چونکا یا تھا۔ گزشتہ سال رزلٹ اناؤنس ہونے پر می نے اس کی جس انداز میں آؤ بھٹکت کی تھی، وہ اسے بھی بھولا نہیں تھا۔ وہ جواب دینے کی بجائے بوتل کا ڈھکن کھول کر پانی پینے لگا۔

”میں نے تم سے تمہارے رزلٹ کے متعلق پوچھا ہے سنی؟“ می اب کی بار اونچی آواز میں بولیں۔ انہیں اپنے سوالات کا نظر انداز کیے جانا سخت ناپسند تھا۔

”ابھی رزلٹ اناؤنس نہیں ہو امی! میرا خیال ہے ابھی کچھ اور دن لگ جائیں گے۔“ وہ جل تو جلال تو کا درد کرتے ہوئے بظاہر اطمینان سے بولا تھا۔ اس کا یہی اطمینان انہیں مزید سلگا گیا۔

”تم جھوٹ بھول رہے ہو! اپنے باپ کی طرح تم بھی مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو۔“ وہ چلا کر بولیں۔ ان کے غیض سے وہ ہمیشہ ہی خائف رہتا تھا۔

”میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہا می! بلکہ سچ.....“

”ٹھٹ اپ..... جسٹ اپ.....“ انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں تمہارے سارے کرتوتوں سے واقف ہوں۔ تم ساری زندگی کچھ نہیں کر پاؤ گے، بس مجھے شرمندہ کرواتے رہو گے اور میرا دل جلاتے رہو گے۔ تمہیں تو اس بات پر بھی کوئی شرمندگی نہیں ہوتی کہ تمہارے باقی کلاس فیلوز تم سے آگے نکل چکے ہیں اور تم ابھی تک میٹرک ہی کلیئر نہیں کر پائے۔ میرے کہتے.....“

”میں نے آپ سے کہا تھا می! میں سائنس سبجیکٹ نہیں پڑھنا چاہتا۔ ان فیکٹ میں پڑھ ہی نہیں سکتا۔ مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں ہے مگر آپ نے زبردستی.....“

”زبردستی..... زبردستی..... شیم آن یونی! میں نے تمہیں آپشن دیا تھا کہ تم.....“

”نہیں می!“ وہ دونوں مسلسل ایک دوسرے کی بات کاٹ کر اپنا اپنا نقطہ نظر واضح کر رہے تھے۔

”اسے آپشن نہیں کہتے جو آپ نے میرے سامنے رکھا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ اگر میں نے سائنس سبجیکٹس نہیں پڑھے تو آپ مجھے سڈنی، بوے ماموں کے پاس بھجوا دیں گی، اس لیے مجھے مجبوراً سائنس سبجیکٹس ہی پڑھنے پڑے، ورنہ آپ جانتی ہیں میں کامرس پڑھنا چاہتا تھا۔“ وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گیا۔ وہ بھی کچھ دیر کو خاموش ہو گئی تھیں کیونکہ بات وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اس نے پاپا کے مشورے سے کامرس پڑھنی چاہی تو می نے اس ایڈوکانا کا مسئلہ بنالیا تھا۔ وہ کسی قیمت پر اسے کامرس نہیں پڑھنے دینا چاہتی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی رہیں پھر ان کے چہرے پر بے بسی و بے چارگی کے تاثرات در آئے۔ ان کی نگاہ کی طرف جذبے میں ڈھلنے لگی۔

”اس شخص نے تم پر کوئی جادو کر دیا ہے جو تم میری کسی بات کو سننے پر تیار نہیں ہوتے۔ تم میری اولاد نہیں ہو، تم صرف اس شخص کی اولاد ہو۔ تمہیں کبھی بھی میرا احساس نہیں رہا۔ میں نے تمہاری بہتری کے لیے اپنا

”تمہیں میرے ساتھ زیادہ زبان چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں سے اٹھو، اپنے کمرے میں جاؤ۔ اب کی بار میں تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتوں گی۔ آج کی تاریخ میں لکھ لو، ٹھیک چھ ماہ بعد میں تمہیں سڈنی بھجوا دوں گی۔ مجھے تمہارے جیسے ہیرا سائٹ کی ضرورت نہیں ہے۔“ ان کی بات سن کر وہ ہلکے اٹھا۔

”آپ شاید اپنے حواسوں میں نہیں ہیں می! میں کبھی سڈنی نہیں جاؤں گا۔ آپ کو میرے جیسے ہیرا سائٹ کی ضرورت نہیں ہے تو کوئی بات نہیں، میں پاپا کے پاس چلا جاتا ہوں۔“ اس نے انہی کے انداز میں ہٹیلے پن سے کہا۔ اسے جواب دینا بھی انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ وہ خاموشی سے انہیں اور اپنے کمرے کی سمت چل دیں۔

”تم جانتے ہو میں اپنے فیصلے تبدیل نہیں کرتی۔“

لاؤنچ کا دروازہ چھوڑنے سے پہلے انہوں نے کہا۔

”میں بھی آپ ہی کا بیٹا ہوں می!“ وہ چلا کر بولا لیکن اس کی آواز درودیوار سے ٹکرا کر واپس آگئی تھی۔ می کمرے سے جا چکی تھیں۔ وہ کافی دیر تک وہیں بیٹھا کھولتا رہا پھر اس نے سینٹرل ٹیلی پر پڑا کرسل کا نفیس سا گلدان اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

”میں سر کر بھی آسٹرلیا نہیں جاؤں گا، کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں۔ آپ لکھ لیجئے می! میں نہیں جاؤں گا۔“ وہ کافی دیر تک اوجھی آواز میں بڑبڑاتا رہا۔ اپنے کمرے میں آکر بھی اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے موبائل سے پاپا کے موبائل پہ کال کرتا رہا مگر کوئی رسپانس نہیں آرہا تھا۔ کافی دیر تک غصہ کرنے کے بعد وہ بستر پہ گر گیا اور چھوٹے بچوں کی طرح رونے لگا۔

یونہی روتے روتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی عام حالات میں تو اماں بی اسے صبح جگا دیا کرتی تھیں مگر جب بھی اس کا ادھی کا جھکڑا ہوتا تو وہ بھی اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتیں کہ بہر حال ملازمہ تھیں اور مالکن کے مزاج کے مطابق چلنے میں ہی عافیت سمجھتی تھیں۔

اسے می کے ساتھ ساتھ باقی گھروالوں پہ بھی غصہ آنے لگا۔ اس کی بہن بالکل اس کی می کی کاربن کا پی تھی۔ اسے جب ضرورت ہوتی تو وہ بھائی سے محبت کی بات کر لیتی تھی، ورنہ اپنی دنیا میں گمن رہتی۔ اس کے لاتعداد فرینڈز اور ایک عدد منگیتہ ہی اس کی زندگی کا محور تھے۔ ایسے میں وہ بے چارہ خود کو بہت مس فٹ محسوس کرتا۔ وہ می سے یا بہن سے کوئی بھی بات ڈسکس نہیں کر سکتا تھا۔

”میں بھی دیکھتا ہوں می مجھے پاکستان چھوڑنے کے لیے کس طرح مجبور کرتی ہیں۔“ یہی سب سوچتے ہوئے وہ بستر سے اتر کر زمین پہ کھڑا ہو گیا۔ اپنی شرٹ اتار کر اس نے بیڈ پر پھینک دی اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے مسلز بھلا بھلا کر دیکھنے لگا۔ اچھی خوراک اور ورزش کی وجہ سے وہ دیوار گیر الماری کی جانب بڑھا۔ سی ڈی پلیئر کے پاس آکر اس نے ایک سی ڈی منتخب کر کے چلا دیا۔ والیوٹ فل کر کے وہ وارڈروب کی سمت آیا پھر کپڑوں کے نیچے سے اس نے مارون گولڈ کا پیکٹ نکالا تھا۔ یہ لت اسے چند دن پہلے لگی تھی۔ سگریٹ سلاک کر اس نے پیکٹ کو دوبارہ چھپایا اور خود بیڈ پر ڈھیر ہو کر سگریٹ اور میوزک سے لطف انداز ہونے

آپ قربان کر ڈالا مگر تم اس شخص کے نام کی تسبیح کرنے سے باز نہیں آئے۔ تم نے کبھی مجھے اچھا سمجھا ہی نہیں۔ حالانکہ میں نے تمہارے لیے.....“ آنسو ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ کرنے لگے۔

می کے دل میں ہمیشہ پاپا کے لیے غبار رہتا تھا۔ اس کے می اور پاپا کے بیچ اس کی پیدائش کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد علیحدگی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد پاپا نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح می کے دل میں موجود غلط فہمیوں کو دور کر سکیں، مگر وہ اپنی ہر کوشش میں ناکام رہے تھے۔ اپنے بچوں سے ملاقات کے لیے بھی انہیں کورٹ سے آرڈر حاصل کرنا پڑا تھا مگر ایک جنگ وہ می سے لڑے بغیر ہی جیت چکے تھے۔ ان کا بیٹا مکمل طور پر ان کے قابو میں تھا اور یہ بات اس کی می کو تاؤ دلائے رکھتی تھی۔ وہ کورٹ آرڈر کی وجہ سے اسے اپنے پاپا سے ملنے سے نہیں روک سکتی تھیں مگر وہ اس پر ہر معاملے میں نہایت سختی روا رکھتی تھیں۔ شاید اسی وجہ سے وہ ان سے اتنا خائف رہتا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ماں سے محبت نہیں کرتا تھا انہیں اس طرح سے روٹا دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ ان کے قریب آکر جھکتے ہوئے کارپٹ پہ ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”آئی ایم سوری می! آپ پلیز روئیے مت۔ ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ می! میں نے بہت کوشش کی مگر.....“ وہ ان کے بہتے آنسو دیکھ کر بے حد پشیمان تھا۔

”میں کیا کروں می! میرا اس طرف رجحان ہی نہیں ہے۔ مجھے بائیولوجی، کیمسٹری وغیرہ بالکل سمجھ میں نہیں آتے۔“ اس کی می نے اپنے گفتگوں پر رکھے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

”تمہیں احساس ہے میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کیا۔ تمہیں بہتر سے بہتر چیز فراہم کرنے کے چکر میں، میں نے خود کو بھی فراموش کر ڈالا۔ کتنی رقم خرچ کی میں نے تم پر۔ مہنگی کتابیں، بہترین ٹیوٹر، اعلیٰ اسٹی ٹیوٹ۔ کسی ایک چیز کی..... کسی ایک چیز کی تو لاج رکھی ہوتی سنی!“ وہ ایک بار پھر رونے لگیں۔

”مجھے پلیز معاف کر دیجئے می! پلیز می.....“

”تم ہر جگہ مجھے شرمندہ کرواتے ہو۔ تم کیسے بیٹے ہو سنی! بیٹے ایسے تو نہیں ہوتے۔ بیٹے تو ماؤں کا مان ہوا کرتے ہیں۔ تم ایسے کیوں ہو سنی!“ اب کی بار وہ ہلکے لگیں۔ یہ سلسلہ مزید چل سکتا تھا مگر دفعتاً فون کی بیل بج اٹھی۔ می نے بہتے آنسو پونچھ کر فون اٹھالیا۔ دوسری جانب اس کے پاپا تھے۔

”وہ تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔“ انہوں نے سختی سے کہہ کر فون بند کر دیا جبکہ وہ بے چینی سے پاپا کے فون کا منتظر تھا۔

”آپ کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے قہمی!“ اس کا اتنا کہنا قیامت ہو گیا۔

”تمہیں میرے جھوٹ یا بچ کی پروا نہیں ہونی چاہیے۔ تم صرف اپنی پروا کرو یا پھر اپنے باپ کی۔ تمہاری بلا سے میں جیوں یا مروں۔ وہ ہے نا تمہارا باپ“ انہوں نے اس کے پاپا کے لیے بلا دروغ دو تین گالیوں کا استعمال کیا۔

”آپ مجھے گالیاں دے لیجئے مگر پاپا کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ یکدم مشتعل ہو کر بولا۔ اس کا لہجہ اتنا اونچا تھا کہ لمحہ بھر کو اس کی می بھی خاموش ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

”میں تزئین بخاری ہوں۔“ مریم نے اس آواز پر سر اٹھا کر دیکھا پھر جھپکتے ہوئے اپنے سامنے کھڑی اس دروازہ قامت لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ اس لڑکی کے مقابلے میں مریم گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی بلکہ اس پہ کیا موقوف شہر کے سب سے بڑے اسپتال کے نرسنگ اسکول کے اس ہال میں موجود بہت سی لڑکیاں کافی سے زیادہ گھبراہٹ اور ہچکچاہٹ کا شکار تھیں۔ کلاس میں یہ ان سب کا پہلا دن تھا۔ ایسی صورت حال میں تزئین بخاری کے اس کے ساتھ والی کرسی پر آکر بیٹھنے اور مخاطب کرنے میں پہل کرنے سے مریم کو بہت ڈھارس ملی۔

”میں مریم چوہدری ہوں۔“ اس نے جھپکتے ہوئے اپنا نام بتایا۔

”ٹاکس ٹومیٹ یو۔ ویسے تمہیں تعارف کی ضرورت نہیں۔ تمہارے مارکس اتنے اچھے ہیں کہ تقریباً ساری کلاس تمہیں تمہارے نام سے مخاطب کرنے کے بجائے آٹھ سو نمبر والی لڑکی کہہ کر تمہارا ذکر کر رہی ہے۔“ تزئین نے سابقہ انداز میں کہا تو مریم کو شرم سی آگئی۔ پہلی تعارفی کلاس میں اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس نے میڈم کو اپنے کل نمبر بھی بتائے تھے۔ میڈم کے ساتھ ساتھ پوری کلاس بھی کافی متاثر ہوئی تھی۔ آٹھ سو یا آٹھ سو سے زیادہ نمبرز لے کر پری میڈیکل پاس کرنا اتنی حیرانی والی بات نہیں تھی۔ حیرانی والی یہ تھی کہ اتنے شاندار مارکس لے کر ایک لڑکی نرسنگ پڑھنے چلی آئی تھی۔ میڈم نے سب لڑکیوں کو مریم کے لیے تالیاں بجانے کے لیے کہا تھا، تب بھی مریم شرماسی گئی تھی۔

”ارے تم ایسے شرماری ہو جیسے آٹھ سو نمبر تمہارے دولہا کا نام ہے۔“ تزئین نے ہلکا سا تہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ مریم کی شکل ایک بار پھر دیکھنے والی تھی۔ اس کی دو دھیان رنگت پر سرخی پھیلنے میں بس لمحہ لگتا تھا۔ اسے تزئین کی بات عجیب سی لگی۔ وہ شرمائیں رہی تھی، بس اسے تعریف سمیٹنے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔

”مجھے لگتا ہے، میں اس کلاس کی واحد گھوڑی ہوں، باقی سب تو میرے مقابلے میں بکریاں لگ رہی ہیں۔“ اس کی خاموشی سے اکتا کر تزئین نے کہا تو مریم کو ایک بار پھر مسکرا نا پڑا۔ وہ اس کی بات کی تردید کیے بغیر کلاس کا جائزہ لینے لگی۔ وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہہ رہی تھی۔ کلاس کی باقی لڑکیاں بشمول مریم کے اتنی درواز قامت نہیں تھیں، جتنی کہ تزئین اور یہی قد و قامت اسے نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا تھا۔

”تمہاری اسکن بہت خوبصورت ہے، کیا استعمال کرتی ہو؟“

اب کی بار بھی تزئین کے سوال نے مریم کو الجھا دیا۔ وہ باقی لڑکیوں کی طرح گھبراہٹ و ہچکچاہٹ کا ذکر کرنے کے بجائے عجیب ہی باتیں کر رہی تھی۔

”پہلے میری اسکن بھی بہت اچھی ہوتی تھیں، فریض اور گلگونک پھر پہلا ہونا شروع ہو گئے۔ دراصل مجھے میک اپ کرنے کا بہت شوق ہے۔ ہر وقت چہرے پہ الایلا تھوپنے کے باعث یہ حشر ہو گیا۔“ وہ مسکراتے ہوئے پُر اعتماد لہجے میں اپنے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ مریم ایک بار پھر مصنوعی انداز میں مسکرائی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ تزئین کو سننے سے زیادہ بولنے سے دلچسپی ہے۔ وہ مریم کے استفسار کے بغیر

مریم کو بتانے لگی کہ اس کی چٹنی جلد کے لیے وہ کون کون سے ٹونکے استعمال کرتی ہے۔ مریم کو ایسی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لائف بوائے صابن سے نہانے والی اور لسی سے بال دھونے والی مریم چوہدری کے لیے اسکریننگ، کلینرنگ، اسٹریٹجٹ وغیرہ جیسے الفاظ بہت نئے اور انوکھے تھے۔ وہ تزئین کی باتیں نہایت عدم دلچسپی سے سن رہی تھی، جب ایک نہایت مہین سی آواز اس کو سنائی دی۔

”آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“ اس نے بائیں طرف بیٹھی لڑکی سے استفسار کیا۔

”جی..... میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں نے پہلی کلاس نہیں لی تھی، آپ مجھے کورس آؤٹ لائن بتا دیں گی؟“ وہ لڑکی پہلے سے بھی دھیمے اور مسکین سے لہجے میں بولی۔ مریم کو دل میں تھوڑا سا اطمینان ہوا کہ کوئی لڑکی اس سے بھی زیادہ گھبراہٹ کا شکار تھی، مگر نہ تو وہ خود کو ہی سب سے زیادہ پزل محسوس کر رہی تھی۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ مریم نے اپنی نوٹ بک کھولتے ہوئے اس سے پوچھا۔ تزئین ان دونوں کو باتیں کرتا دیکھ کر کسی اور لڑکی کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

”روبینہ یاسمین۔“ وہ لڑکی بولی۔ اس کی آواز بہت باریک تھی اور اس کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے ابھی رو دے گی۔

”میں آپ کو آؤٹ لائن لکھوا دیتی ہوں مگر آپ پریشان مت ہونا۔ ابھی تو ابتداء ہے، اس لیے بہت مشکل لگے گا مگر ظاہر ہے ہم انٹرنک۔ یہی باتیں بہت مرتبہ پڑھ چکے ہیں، اس لیے.....“

”میں نے تو ابھی میٹرک کیا ہے۔“ وہ مریم کی بات کاٹ کر بولی۔

”اچھا۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”پہلے سال جنرل نرسنگ میں ہمیں اناٹومی، فزیالوجی، کمیونٹی میڈیسن، نیوٹریشن، انگلش اور مائیکرو بائیالوجی پڑھائیں گے۔ پہلے تین ماہ صرف بنیادی چیزیں پڑھائیں گے پھر.....“

”فزیالوجی کے اسپیکٹرو بتا دیں پلیز۔“ روبینہ اس کی بات کاٹ کر سر جھکائے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی تو مریم کے منہ کا زاویہ بگڑتے بگڑتے رہ گیا۔

”واٹ ریش۔ تمہیں فزیالوجی کے اسپیکٹرو بھی نہیں آتے۔ لائٹ میں لکھ دیتی ہوں کورس آؤٹ لائن۔“

مریم کے کچھ کہنے سے قبل تزئین نے روبینہ کے ہاتھ سے نوٹ بک لے کر اس پر کورس آؤٹ لائن لکھنا شروع کر دی۔ جب اس نے Physiology کو physiology لکھا تو مریم نے گہرا سانس بھر کر اپنی نوٹ بک اس کے سامنے کھدی، تاکہ وہ اس پر سے نقل کر کے کورس آؤٹ لائن لکھ دے۔ ساری کلاس ہی تقریباً اپنی اپنی نوٹ بکس کھولنے لگی۔ سب کے چہروں پر فکر مندی کے اثرات غالب تھے، کیونکہ پہلی ہی کلاس میں میڈم بتا چکی تھیں کہ جنرل نرسنگ کے لیے کوالیفائی کرنے کے لیے انہیں ٹیسٹ والے مرحلے سے گزرنا پڑے گا جو تین ماہ بعد ہونا تھا۔ اس ٹیسٹ کو کلیئر کرنے کی صورت میں ہی وہ کوالیفائی کر سکتی تھیں، ورنہ نہیں۔

کورس آؤٹ لائن لکھ کر دینے کے بعد ترمین اب روہینہ کو پیڈی کیور اور مینی کیور کے متعلق بتا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

”میں نے نرسنگ اس لیے جوائن کی کہ میں دکھی انسانیت کی خدمت کر کے یسوع مسیح کے نیک اور پیارے بندوں میں اپنا نام لکھوانا چاہتی ہوں۔“ ستارہ مسیح نے سینے پہ صلیب بناتے ہوئے کہا تو ہال میں موجود بہت سی لڑکیوں نے بھی صلیب کا نشان بنایا۔ وہ تینوں ایک ہی رو میں بیٹھی یہ سب کاروائی دیکھ رہی تھیں۔ ستارہ مسیح کی بات سن کر مریم نے تالیاں بجانیں تو روہینہ بھی اس کی تقلید میں تالیاں بجانے لگی۔ جبکہ ترمین نے چونگ چباتے ہوئے صرف ناک چڑھانے پر اکتفا کیا۔ مزاج کے تفاوت کے باوجود ان تینوں کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہاں پر اسی فیصلہ لڑکیاں کر سکتی تھیں۔ دس فیصد کچھ دوسرے مذاہب سے تعلق رکھتی تھیں، جبکہ باقی پانچ فیصد مسلم لڑکیاں تھیں۔ ان پانچ فیصد مسلمان لڑکیوں میں مریم اپنی ہم مزاج لڑکی ڈھونڈنے نکلتی تو شاید اسے سارا سیشن اکیلے ہی گزارنا پڑتا، اس لیے اس نے روہینہ اور ترمین کی دوستی کو نہ صرف قبول کر لیا بلکہ ہاسٹل میں وہ تینوں ایک ہی کمرے میں اپنی الاؤمنٹ کروا چکی تھیں۔

ہاسٹل کے اس بڑے سے ہال میں یہ پارٹی سینٹرز کی طرف سے نئی آنے والی لڑکیوں کے لیے اربخ کی گئی تھی۔ سب ہی لڑکیاں باری باری وہ وجہ بتا رہی تھیں جس کی وجہ سے انہوں نے نرسنگ کو بطور کیریئر اپنانے کا سوچا تھا۔

”مجھے بچپن سے ہی میڈیسن پڑھنے کا شوق تھا۔ میڈیکل میں ایڈمیشن نہ ہو سکا تو میں نے یہاں ایڈمیشن لے لیا۔“ اپنی باری پہ مریم نے اہتمام سے کہا۔ پہلے دن کی نسبت اب وہ کافی پُر اعتماد ہو چکی تھی۔

”مجھے بھی شوق ہی ہے جی۔“ روہینہ نے اپنی باری آنے پہ مخصوص انداز میں کہا۔ بہت سی لڑکیوں کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ روہینہ کا لہجہ ہی کچھ اس قسم کا تھا

”مجھے شوق ہی نہیں بلکہ جنون ہے۔“ ترمین سپاٹ سے لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتا طنز مریم سے مخفی نہیں رہا تھا۔ اس کے دل میں شدت سے خواہش جاگی کہ وہ اس موضوع پر ترمین سے کھل کر بحث کرے مگر اسے موقع نہ مل سکا۔ ڈنر کے بعد پارٹی کا اختتام ہوا تو وہ اپنے اپنے کمروں میں آئیں۔ مریم نے تہیہ کر رکھا تھا کہ آج کی رات ترمین سے وجہ دریافت کر کے رہے گی کہ اس نے یہ پروفیشن کیوں اپنایا، جبکہ وہ اسے اس قدر ناپسند کرتی تھی۔ روہینہ کے سونے تک اسے انتظار کرنا پڑا مگر اس کے سونے کا اطمینان کرنے کے بعد وہ خود کو ایک لمحہ بھی روک نہ پائی۔

”ترمین! تم نے بتایا نہیں کہ تم نے نرسنگ کیوں جوائن کی؟“ اس نے اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے سوال کیا۔ ترمین اپنے ہاتھ کا مساج کر رہی تھی۔ اس کی بات سن کر لمحہ بھر کے لیے رک سی گئی پھر مریم کی طرف دیکھ کر بولی۔

”تم نے پوچھا بھی تو نہیں کہ میں نے نرسنگ کیوں جوائن کی؟“ اس کے انداز نے مریم کو الجھن

میں مبتلا کیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید ترمین اس سوال کو ٹال دے گی۔

”میں پوچھوں گی تو تم بتا دو گی؟“ اس نے ایک اور سوال کیا۔

”ویل..... بتا دوں گی..... یقیناً بتا دوں گی..... تم سے میں کچھ نہیں چھپاؤں گی کیونکہ مجھے اگلے چار

سال تک تمہارے ساتھ اسی کمرے میں رہنا ہے مگر..... اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی پھر اپنے بستر سے اٹھ کر اس کے بستر پر آکر اسی کے سر ہانے پہ سر کا کر لیٹتے ہوئے بولی۔

”مگر پھر تمہیں بھی اصل وجہ بتانا پڑے گی۔“

”میں ہال میں سب لڑکیوں کے سامنے بھی بتا چکی ہوں اور اب پھر ایک بار بتا دیتی ہوں کہ میرا شوق مجھے اس فیلڈ میں لایا۔ میں صرف اسی فیلڈ میں کامیاب ہو سکتی تھی، اس لیے میں نے اسے بطور پروفیشن اپنانے کے لیے یہاں ایڈمیشن لے لیا۔“ مریم نے ایک ہی سانس میں کہا تو ترمین کے لبوں پہ مسکراہٹ کھڑ گئی جس نے مریم کو کسی قدر الجھا دیا۔

”تمہیں شاید میری بات کا یقین نہیں ہے بلکہ تمہیں کسی کی بھی بات کا یقین نہیں آتا۔ ہال میں جب دوسری کلاس فیلوز نے یہ سب کہا تب بھی تمہارے چہرے پہ ایسی ہی مسکراہٹ تھی جیسی اب تمہارے چہرے پہ ہے۔“ وہ کلر بولی تو ترمین ہنس دی۔

”میرے چہرے پہ ایسی مسکراہٹ اس لیے آتی ہے کہ میں تم سب لوگوں کے کھوکھلے لہجے با آسانی پہچان سکتی ہوں۔ اگر کوئی لڑکی یہ کہے کہ وہ نرسنگ کی طرف اس لیے آئی ہے کہ اسے شوق ہے تو مجھے یہ اس صدی کا سب سے بڑا طیفہ لگتا ہے۔ بھلا کوئی انسان اپنی ضرورت کو اپنا شوق کیسے کہہ سکتا ہے۔“ وہ مادہ سے انداز میں ایک تلخ سی بات کہہ رہی تھی۔ مریم کو اس کی بات سے اتفاق نہیں تھا مگر وہ خاموش رہی تاکہ ترمین اپنی بات مکمل کرے۔

”تم جانتی ہو میں نے یہ فیلڈ کیوں اپنائی؟ کیونکہ اس میں مجھے اتنے روپے مل جائیں گے کہ میں اپنی بہت سی معاشی ضروریات با آسانی پورا کرنے کے قابل ہو جاؤں گی، کسی بھی اور پروفیشن کو اپنانے کے لیے۔ سب سے پہلے مجھے اس کے متعلق سب پڑھنا پڑے گا اور پھر جاب حاصل کرنے کا ایک ناختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا، جبکہ نرسنگ میں تو ابتدائی مہینوں میں ہی الاؤنس ملنے لگتا ہے۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے سانس لینے کو رکی۔

”یہ صرف اور صرف میری ضرورت ہے مریم! تم جانتی ہو میرے باپ نے میری امی کو تب چھوڑ دیا تھا جب میں صرف تین دن کی تھی۔ میری امی کا تصور یہ تھا کہ انہوں نے دوسری بیٹی کو جنم دیا تھا جبکہ میرے باپ کو بیٹے کی خواہش تھی۔ میری امی مجھے اور میری دو سالہ بہن کو لے کر اس دنیا کی ٹھوکریں کھانے کے لیے شوہر کے گھر کو چھوڑ کر آنے کے لیے مجبور کر دی گئیں۔ امی نے ایک پارلر میں ہیلپر کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ وہ ساری زندگی روپے جمع کرنے کی کوشش کرتی رہیں تاکہ اپنا ذاتی پارلر بنا سکیں دن رات کی محنت کے باوجود وہ کبھی اتنے روپے جمع نہیں کر پائیں۔ میری بہن نے سترہ سال کی عمر میں ایک۔ بوتیک میں جاب کر لی اور آج تک وہ یہی

جواب کر رہی ہے۔ اس کے پاس کبھی اتنی رقم نہ ہو سکی کہ اس بوٹیک سے خود اپنے لیے ایک سوٹ ہی خرید سکے۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر لہجہ سسک رہا تھا۔

”میں جانتی ہوں، میری امی اور میری بہن ہمیشہ اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کے لیے سسکتی رہیں گی۔ ان دونوں کو ملنے والے دو ہزار روپے ہمیں زندگی کی ہر چھوٹی آسائش کے لیے ترسانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ مجھے دیکھ کر شاید تمہیں یہ لگتا ہو کہ میں بہت مالدار لڑکی ہوں مگر یہ سب ملمع کاری ہے جو میں نے خود پر کی ہوئی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ لوگ مجھے غریب سمجھ کر دھتکاریں۔ میں اپنی امی اور بہن کی طرح ترس ترس کر جینا نہیں چاہتی۔ میں ایئر ہوسٹس کے لیے قومی ایئر لائن میں بھی اہلائی کر چکی ہوں۔ میں نے ماڈلنگ کے لیے بھی آڈیشن دیے ہیں مگر وہاں میری قسمت نے ساتھ نہیں دیا، اس لیے میں نے اس فیلڈ کو اپنا لیا۔ حالانکہ میری امی کی اخلاقیات پہ اس بات سے بہت کاری ضرب پڑی ہے مگر پھر بھی میں خوش ہوں کہ ان پر اپنی اہمیت بوجھ نہیں بنوں گی۔ الاؤنسز ملنا شروع ہو گئے تو میں امی اور باجی سے ایک روپیہ لینا بھی چھوڑ دوں گی۔“ مریم خاموشی سے اس کی بات سن رہی تھی، مگر بات مکمل ہو جانے پہ وہ تڑپ کر بولی۔

”تمہاری امی تمہارے اس فیصلے پر ناخوش کیوں ہیں؟“ تزئین نے جواب دینے کی بجائے ایک استہزائی سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

”اتنی معصوم مت، بنوریم! میری امی تو میرے عزائم سے ویسے ہی خائف رہتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں چند روپوں کی خاطر ہر حد پار کر سکتی ہوں۔ انہیں میرا کوئی بھی کام کرنا پسند نہیں ہے۔ انہیں ایئر ہوسٹنگ ناپسند ہے، انہیں ماڈلنگ ناپسند ہے، انہیں نرسنگ ناپسند ہے۔ شاید انہیں میں بھی ناپسند ہوں۔ ہر وہ کام جو ہمیں جلدی امیر کر سکتا ہے۔ انہیں ناپسند ہیں۔“ مریم کو تزئین کی باتیں بہت عجیب اور تکلیف دہ لگ رہی تھیں۔ اس کے ابو نے بھی اس کے اس فیلڈ کو اپنانے کے فیصلے کی مخالفت کی تھی مگر اس کی ضد کے آگے ان کی ایک نہیں چلی تھی، مگر اس کے ابو کے دل میں تزئین کی امی کی طرح کے خدشات نہیں تھے۔

☆ ☆ ☆

”مریم.....“ ناشتہ کے فوراً بعد وہ اپنا یونیفارم پر لیں کر رہی تھی، جب عقب سے تزئین کی آواز سنائی دی۔ اس نے منہ سے کچھ کہنے کی بجائے صرف گردن موڑ کر دیکھنے پہ اکتفا کیا۔

”میں امید رکھتی ہوں کہ جو کچھ میں نے رات کو تم سے ڈسکس کیا، وہ سب تم بھول چکی ہوگی۔“ تزئین کے لہجے میں اس قدر سادگی و بے بسی تھی کہ مریم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ مریم سے اپنا ہر راز کہہ دینے کے بعد اب خدشات کا شکار تھی۔ مریم نے استری کا ہلکا اتارا اور تزئین کے قریب آ گئی۔

”میں نے تمہیں دوست کہا ہی نہیں دل سے تسلیم بھی کیا ہے اور جسے میں دوست مان لیتی ہوں، اس کے ساتھ میں مرتے دم تک دوستی نبھاتی ہوں۔ رات جو کچھ تم نے مجھ سے کہا، میں نے سب بھلا دیا ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر محبت سے بولی۔ تزئین کے چہرے پر تشکرانہ جذبات ذرا کی ذرا چمکے پھر وہ اپنی جون میں واپس آتے ہوئے بولی۔

”ایک بات کا دھیان رکھنا، آئندہ کبھی مجھ سے سورج ڈھلنے کے بعد اتنی محبت سے کچھ مت پوچھنا۔ میرا داغ خراب ہو جاتا ہے۔“ مریم زور سے ہنس دی، اسی وقت روبینہ کمرے میں داخل ہوئی۔

”تم مجھ پر ہنس رہی تھیں نا؟“ ہاسٹل میں اور پھر نرسنگ اسکول میں بہت سی لڑکیوں کے ساتھ وقت گزار کر وہ اپنے بارے میں کچھ حقائق ہو چکی تھی۔

”ارے نہیں پاگل۔ دراصل میں نے مریم کو لطیفہ سنایا تھا، اس لیے یہ ہنس رہی تھی۔ تم نے شاید نہیں لیا؟“ تزئین نے اس کو ٹالنے والے انداز میں کہا پھر اس کا خشک سر دیکھ کر استفسار کیا۔

”میں نے تو کچھ نہیں لیا۔“ روبینہ نا کھچی کے انداز میں بولی تو تزئین اور مریم دونوں ہی ہنس دیں۔ روبینہ کی انگریزی کافی سے زیادہ خراب تھی۔

”تزئین نے پوچھا ہے تم نہائیں کیوں نہیں؟“ مریم نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ روبینہ نے کندھے پہ رکھا تو لیہ بستر پر پھینکا اور خود تزئین کے بستر پر دھپ کر بیٹھ گئی۔

”میں اس غسل خانے میں نہیں نہا سکتی، وہاں اتنا بڑا لال بیک اور دیوار کے ساتھ ایک چھپکلی بھی چپکی ہے۔ مجھے بے پردگی کا احساس ہوتا ہے۔“ روبینہ کے اس طرح سے کہنے پہ وہ دونوں پھر سے ہنس دیں۔

”او چک جھمرہ کی شہزادی! تم یہاں کیا کرنے آ گئی ہو، وہیں چک جھمرہ میں رہتیں نا۔ یعنی میڈم کو چھپکلی کے سامنے بے پردگی کا احساس ہوتا ہے۔“ تزئین نے ٹھفٹ سے انداز میں اسے چڑانا چاہا۔ مریم کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بکھری۔ اسے گھر کی یاد آ گئی تھی۔ اسے بھی چھپکلی اور دوسرے حشرات وغیرہ سے بہت ڈر لگتا تھا۔ برسات کے دنوں میں جب کپڑے کوڑے نکلتے تو وہ چیخنے چلانے لگتی۔ حیدر اس کا خوب مذاق اڑاتا اور پھر جب امی یا پھوپھیوں سے کوئی آکر پوچھتا تو عمر مسکین کی شکل بنا کر کہتا۔

”دیکھیں نا امی! دولہا بھائی پہلی بار گھر آئے ہیں اور مریم بی بی کس طرح شرمارہی ہیں۔“ اس کا اشارہ کا کروچ یا مینڈک وغیرہ کی طرف ہوتا۔ مریم کا غصے سے برا حال ہو جاتا، جبکہ باقی سب مسکرانے لگتے۔ اب بھی وہ سب یاد آیا تو مسکرانے لگی پھر تزئین اور روبینہ کو آپس میں الجھتا چھوڑ کر وہ خود غسل خانے کی سمت چل دی۔ گھر سے نکلتے ہی اسے لگنے لگا تھا جیسے وہ بہت بہادر ہو چکی ہے اور وہ لڑکی جو شہد کی مکھی سے بھی ڈرا کرتی تھی، اسی غسل خانے میں کپڑے تبدیل کرنے چل دی، جہاں ایک کا کروچ موجود تھا اور دیوار سے چھپکلی بھی چپکی تھی، کیونکہ یہاں کوئی حیدر یا عمر نہیں تھا جو اس کی تسلی کی خاطر جوتا لے کر چپکلی کے پیچھے بھاگتے۔ اسے یہاں اکیلے رہنا تھا اور بہت سی مشکلات کا اکیلے ہی مقابلہ کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

”مجھے لگتا ہے اگر ہم پاپا کے ساتھ رہا کرتے تو ہم سے زیادہ خوش قسمت کوئی نہ ہوتا۔“ ڈبل روٹی کے دو سلائز کے بیچ آلیٹ کو سیٹ کرتے ہوئے اس نے اپنی بہن سے کہا جو اس کے ساتھ والی چیر پر بیٹھی اور نج جوس گھونٹ گھونٹ اپنے اندر منتقل کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر لا پرواہی اور بے نیازی کا عنصر نمایاں تھا۔

”دیکھیں نہیں لگتا کہ اگر.....“

”اماں بی! میرا بیک فاسٹ لے بھی آئیے۔“ اس کی بہن اس کی بات کاٹ کر بولی۔ وہ ناشتے میں جوس کے بعد بوائل انڈہ کھاتی تھی جو ٹیبل پر موجود نہ تھا۔ اپنی بہن کے اس طرح سے بات کاٹ دینے سے وہ جی بھر کر بد مزہ ہوا۔

”بولو ناما ہی! تمہیں کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا۔“ وہ اپنا تیار کردہ سینڈوچ نگھٹے ہوئے استفسار کرنے لگا۔

”تم چھوٹا بٹ نہیں لے سکتے۔“ اس کی بہن نے ناگواری سے اپنی ننھی سی ناک چڑھا کر کہا۔

”تم میری بات کا جواب نہیں دے سکتیں۔“ وہ اسی کے انداز میں بولا۔

”نہیں، اس لیے کہ مجھے تمہاری بے سرو بابا توں میں کوئی انٹرنسٹ نہیں ہے۔ میں می کیساتھ رہنے کو بھی اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی سمجھتی ہوں۔“ وہ دونوں کے انداز میں بولی۔

”گوٹو ہیل (بھاڑ میں جاؤ) تم ہو ہی احسان فراموش..... جب بڑی بڑی اماؤنٹس (رقوم) چاہیے ہوتی ہیں تو کیسے پاپا کے ساتھ اپنا رویہ درست کر لیتی ہو۔ بھاگ بھاگ کر ان کے پاس جاتی ہو اور جب مطلب نکل جاتا ہے تو پھر می کی چچی بن جاتی ہو۔“ وہ اپنی بہن کو کھانے والے انداز میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اسی اثناء میں اماں بی ناشتے کے مزید لوازمات میز پر سجانے لگیں۔ وہ دونوں ان کی موجودگی کے باعث چپ ہو گئے تھے مگر ان کی نگاہوں میں ایک دوسرے کے لیے اس قدر ریزاری تھی کہ اماں بی پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔

”تم دونوں جھگڑا کر رہے تھے؟“ اماں بی ان کی آیا تھیں اور وہ دونوں ہی اماں بی سے بہت الجھڑتے۔

”ہم دونوں نہیں۔ صرف وہ لڑ رہا تھا مجھ سے۔ آپ جانتی ہیں اماں بی! جھگڑنے کی عادت مجھے نہیں، اسے ہے۔“ اس کی بہن نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا تو وہ بھڑک اٹھا۔

”ہاں میں تو لڑا کا طیارہ ہو۔ ہر وقت ہر ایک سے جھگڑنا میری تو فطرت ہالی ہے۔“ وہ اپنے آگے رکھی پلیٹ کھسکاتے ہوئے بولا۔ پلیٹ سامنے رکھے جوس سے بھرے گلاس سے ٹکرائی۔ گلاس لڑکھڑایا اور جوس کناروں سے چھلک کر ڈبل روٹی کے سلاٹس پر گر ا۔ اماں بی نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ گزشتہ کچھ دنوں سے وہ کچھ زیادہ ہی چڑچڑاہوتا جا رہا تھا۔ غصیلا تو وہ بچپن سے ہی تھا مگر اب ہر ایک سے بدتمیزی کرنا جیسے اس کی عادت بن چکی تھی۔ انہیں اس کی اسی سرکشی سے خوف آتا تھا۔

”ارے بیٹا! بہن نے ایسا تو نہیں کہا جو تم اس قدر بے قابو ہو رہے ہو۔ دیکھو ذرا کیا حشر کر دیا تم نے۔“ ان کا اشارہ میز کی اتر حالت کی جانب تھا۔ اس نے ایک نظر میز کی جانب اور دوسری اماں بی پر ڈالی۔ اس کی آنکھیں پانیوں سے لالاب بھری تھیں۔ اماں بی کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ اٹھارہ سالہ جوان لڑکا بالکل آٹھ سالہ بچے کی طرح لگ رہا تھا۔

”مجھے تم سے نفرت ہے، سب سے، تم سب قابل نفرت ہو۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا اماں بی اور اس کی بہن نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا پھر دونوں نے ہی ایک دوسرے سے نظریں

چرائیں۔

”بچہ ہے، جذباتی ہو جاتا ہے۔ بیگم صاحبہ! تو بروقتی اسے سڈنی بھجوا کر اچھا نہیں کر رہیں۔“ اماں بی نے جوس سے ٹیکے سلاٹس الگ پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”بچہ ہے.....؟ اماں بی! اٹھارہ سال کا ہو چکا ہے، بچہ نہیں رہا، آپ جانتی ہیں یہ اسمونگ کرنے لگا ہے۔ میں نے خود اس کو دیکھا ہے۔ بعد میں وارڈ روپ چیک کی تو وہاں سگریٹ کا پیکٹ بھی ملا اور آپ کہتی ہیں.....“ اس کی بہن کو جوش جذبات میں پتا نہیں چلا کہ وہ اس کے پیچھے آکر کھڑا ہو چکا ہے۔

”ہاں نہیں ہوں میں بچہ..... بہت بڑا ہو چکا ہوں اور کرتا ہوں میں اسمونگ، تمہیں کیا۔ میں وہی کروں گا جو میری مرضی ہوگی۔ میں نے تو کبھی تمہیں نہیں روکا کہ اپنے درجن بھر بوائے فرینڈز سے فون پر لمبی باتیں نہ کرو۔ ان کے ساتھ کھونٹے مت جاؤ، پھر تم کیوں میری ہر بات میں دخل اندازی کرتی ہو؟“ وہ چہاچہا کر بولنے لگا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ بھی اس کی حالت سے ڈر گئی۔

”میں تم سے بات نہیں کر رہی.....“

”تم مجھ سے بات نہیں کر رہیں مگر میرے بارے میں تو بات کر رہی ہو۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر

غرایا۔

”دیکھو سنی! میرے ساتھ زیادہ زبان چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم می کا غصہ مجھ پر مت نکالو۔ تمہیں می کے ساتھ رہنا ہے یا پاپا کے ساتھ، یہ تمہارا پرسل براہم ہے۔ میرے ساتھ بدتمیزی مت کرو، ورنہ میں می کو بتا دوں گی کہ تم اسمونگ کرتے ہو۔“ اس کی بہن کے دھمکی آمیز لہجے نے اسے مزید سلاگایا۔

”اوشیور، واے ناٹ۔ تم ابھی جا کر می کو بتا دو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ پرسوں تم می سے لیلیٰ کے گھر پارٹی میں جانے کی پریشن لے کر گئی تھیں مگر لیلیٰ تو ایک ہفتہ قبل اپنے جیوش کے ساتھ میوخن روانہ ہو چکی تھی۔ لیلیٰ کا بھائی میرا دوست ہے۔ پرسوں تم جب واپس آئی تھیں تو میں جاگ رہا تھا اور تم جس لڑکے کے ساتھ واپس آئی تھیں، اسے میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ وہی تھا نا انچرا علی..... می کے بزنس پارٹنر اطہر علی کا بیٹا..... تمہیں می نے پہلے بھی منع کیا تھا نا کہ اس لڑکے کے ساتھ میل جول ختم کر دو، تم می کو بتاؤ گی تو میں بھی.....“ وہ اس قدر اطمینان سے بول رہا تھا جبکہ اماں بی بے بسی اور بے چارگی سے بہن بھائی کے اس جھگڑے کو دیکھ اور سن رہی تھیں۔ دونوں کا چہرہ لال سمجھو کا ہو رہا تھا۔

”میں تمہارا منہ توڑ دوں گی، تمہیں شرم نہیں آتی.....“

”ہاں مجھے شرم نہیں آتی اور تم مجھے ہاتھ لگا کر دکھاؤ۔ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“ وہ آپے سے باہر

ہو رہا تھا۔ اماں بی لرز اٹھیں۔

”بس بیٹا! خدا کے واسطے بس کرو، بہن ہے تمہاری۔“ وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر بولیں۔ انکی آنکھ سے

ٹپ ٹپ گرتے آنسو اسے شرمسار کر رہے تھے۔ اس اتنے بڑے گھر میں اسے صرف اماں بی سے ہی محبت تھی۔ وہ

دھپ دھپ کرتا ڈانٹنگ روم کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

”سمجھتا کیا ہے خود کو، میں تو اب کبھی اس سے بات نہیں کروں گی۔ مٹی کے ساتھ کرے اتنے نخرے۔“
میں ایسا رویہ نہیں برداشت کر سکتی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

”حیدر بھائی! اپنی گھیا توری کالی ہو گئی ہے نا۔“ عمر نے محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چڑانے والے انداز میں کہا۔ مریم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ تین ماہ قبل عمر جب اس طرح کی کوئی بات کرتا تھا تو مریم بلا جھجک اپنا جوتا اس کی پشت پر رسید کرنے کو بھاگتی تھی مگر اب شاید حالات بدل گئے تھے۔ وہ کنفریشن لیٹر لینے کے بعد پہلی مرتبہ گھر آئی تھی اور سب گھر والے اس کے ساتھ ایسا سلوک کر رہے تھے، جیسے وہ کسی سلطنت کی ملکہ ہے۔ امی نے اس کے لُچ کے لیے اپنی موٹی تازی مرغی قربان کی تھی۔ پھپھو اپنے ہاتھوں سے خربوزے کی قاشٹیں کاٹ کاٹ کر اسے کھلانے پہ تلی ہوئی تھیں۔ حیدر آتے جاتے صرف شرمیلی مسکراہٹ اچھالنے پر اکتفا کر رہا تھا اور عمر جو پہلے کبھی اس کے نام کے ساتھ باجی یا آپا جیسی کوئی چیز نہیں لگا تا تھا، گزشتہ ایک دن سے اسے آپا مریم کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔

”کیا میری ترقی ہو گئی ہے؟“ اس نے عمر سے سوال کیا۔ وہ اس کے منہ سے آپا مریم سن کر ہی حیران پریشان ہو گئی۔

”ویسے تو مجھے یقین ہے ایسا نہیں ہوا لیکن اگر سچ ایسا ہو چکا ہے تو یہ یقیناً اس صدی کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔“ حیدر نے ہونٹ سیکڑ کر افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ مریم نے چار پائی پہ پڑا اکیہ اسے دے مارا جبکہ اس نے ہاتھ میں پکڑا پانی سے لبالب بھرا اسٹیل کا گلاس اس پر انڈیل دیا۔ اس کے بعد وہ تینوں پہلے کی طرح ایک دوسرے کو چڑانے اور ستانے لگے۔ عمر نے اسے ”گھیا توری“ کہا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

”گھیا توری کالی تو نہیں ہوئی مگر سکر ہری مرچ جتنی ہو گئی ہے۔“ حیدر نے ٹکڑا لگا نا ضروری سمجھا۔ وہ تینوں محن میں بھی چار پائیوں پر بیٹھے تھے۔ امی اور پھپھو محن میں ہی بنے مٹی کے چولہے پر ہنڈیا چڑھائے رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ مغرب کی اذان ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ تاریکی نے محن میں اپنا پھن پوری طرح پھیلا لیا تھا۔ محن میں چولہے کے پاس ایک زرد رنگ کا بلب روشن تھا جس کی زرد روشنی سارے محن میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ گھر بھر کی چیمٹی ولا ڈلی تھی۔ اس کے گھر میں موجود ہونے سے ایک عجیب طرح کی رونق سارے گھر میں محسوس کی جاسکتی تھی۔ عمر کی کام سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ وہ دونوں ہی اب ایک چار پائی پر بیٹھے تھے۔ محن میں لگے نیم کے درخت کے تنے پر ننھے ننھے سے نقطے جگمگا رہے تھے۔

”وہ دیکھو جگنو.....“ حیدر نے مریم کی توجہ ان ٹٹمٹاتے نقطوں کی جانب دلائی۔ مریم اسی سمت دیکھ رہی تھی۔ حیدر اٹھ کر تنے کے قریب گیا اور چند لمحوں بعد وہ ننھے ننھے نقطے اس کے ہاتھ میں منتقل ہو چکے تھے۔

”اپنا ہاتھ دو۔“ اس نے مریم کے قریب آکر کہا۔ مریم نے اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی۔ اب حیدر کے ہاتھ کے جگنو مریم کی ہتھیلی میں منتقل ہو گئے۔ حیدر ایک بار پھر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی مریم نے ہاتھ کھول دیا۔ جگنو ایک ایک کر کے اڑ گئے۔ حیدر نے حیرت سے اس کا یہ عمل دیکھا۔ یہ اس کا پسندیدہ

کھیل تھا۔ وہ جگنوؤں کو بوتل میں بند کر کے تاریکی میں رکھ دیتی اور پھر دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی۔
”روشنی قید ہو کر بھی روشنی رہتی ہے پھر اسے قید کرنے کا فائدہ۔“ حیدر کے چہرے پر پہلے بڑے سے سوالیہ نشان کا جواب دیتے ہوئے مریم نے کہا۔ حیدر چنر لمے ایک ایک اسے دیکھتا رہا۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی، وہ سمجھ نہیں پایا۔

”تم بہت بدل گئی ہو مریم!“ کچھ دیر بعد وہ بولا۔

”کوئی نہیں۔ میں تو پہلے جیسی ہی ہوں۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی۔

”ایسا لگ رہا ہے جیسے مجھ سے زیادہ تم خود کو یقین دلا رہی ہو۔“ حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا، مگر مریم سنجیدہ ہو گئی۔

”مطلب؟“ اس نے استفسار کیا انداز میں کہا۔

”یار! میرے کہنے کا مطلب ہے کہ تبدیلی برحق ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بس اسی طرح تم بھی تبدیل ہو گئی ہو۔“

”مثلاً؟“ مریم نے مزید سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔

”مثلاً؟“ یہ کہ پہلے تم جوتے کو جوتا کہتی تھیں، اب شوڑ کہتی ہو۔ پہلے تم غسل خانے کو غسل خانہ ہی کہتی تھیں، اب ہاتھ روم کہتی ہو اور پہلے.....“

”پہلے میں حیدر کو گدھا کہتی تھی، اب میں حیدر کو ڈونکی کہنے لگی ہوں۔“ وہ حیدر کی بات کاٹ کر بولی تو اندر کرے میں داخل ہوتے ہوئے ابوبھی مسکرا دیے۔

”اپنے ابوبی کے لیے کون سا لفظ منتخب کیا ہے۔ ہماری گزیا نے۔“ انہوں نے مریم کے پاس بیٹھ کر شفیق سے لہجے میں پوچھا تو اس نے ”میرے پیارے ابوبی“ کہہ کر ان کے کندھے سے سر نکا دیا۔ اس جذباتی منظر میں گھر کا اصل بات کہیں پیچھے رہ گئی، مگر مریم کے ذہن سے نہ نکل سکی۔ رات کو اپنے بستر پر لیٹ کر وہ حیدر کے اس معصوم الزام کو یاد کرتی رہی اور تاروں سے بھرے آسمان کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں تردید کرتی رہی۔ صبح اٹھنے ہی اس نے پھپھو سے پوچھا تھا۔

”پھپھو جان! کیا میں تبدیل ہو گئی ہوں؟“ پھپھو کڑیاں چولہے میں دیے پھونکنی کی مدد سے انہیں سلگانے کی کوشش کر رہی تھیں، اس کی بات سن کر رک گئیں، کھانسیں اٹھ رہیں اور پھر مسکرا دیں۔

”میں کل رات بھابھی سے یہی بات کر رہی تھی کہ ہماری مریم بہت بدل گئی ہے۔“ ان کی بات سن کر مریم کا چہرہ اتر سا گیا ہے۔ وہ بات جو اس کے سب گھر والے محسوس کر رہے تھے۔ وہی بات اسے کیوں محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

”میری بیٹی پہلے سے بہت سوتی اور بہت پیاری ہو گئی ہے۔“ وہ گہری سانس بھر کر پرائیوں کے لیے پیڑے بنانے لگی۔ گھر میں شروع سے سب پر اٹھے ہی کھاتے تھے۔ ناشتے میں چائے کے ساتھ رات کا سالن، اچار اور دہی سب کو بہت پسند تھا۔ اس نے سب افراد کے حساب سے گن کر آنے کے پانچ

بیڑے بنائے اور تب ہی اسے احساس ہوا تھا کہ حقیقتاً وہ کچھ نہ کچھ تبدیل ضرور ہوئی ہے۔ وہ بھی بچپن سے پراٹھا کھاتی آئی تھی مگر پہلی بار اس نے اپنے لیے پراٹھا نہیں بنایا تھا۔ اتنے دن تک دودھ اور ڈبل روٹی کا ناشہ کرتے رہنے کے بعد اب اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ پراٹھا ناشے میں کھائے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا آنے کا بیڑا پرات میں رکھا اور اندر کرے میں چل دی۔ نجانے کیا بات تھی اسے رونا آ رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ آنکھیں جھپک جھپک کر آنسو روکنے کی کوشش کرتی رہی مگر ناکام رہی۔ حیدر کسی کام سے کمرے میں آیا تو اسے رونا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

”کیا ہوا ہے مریم!“ اس نے بے چینی سے پوچھا۔ وہ چپ رہی تو وہ اور بھی مضطرب ہو گیا۔
”تم بتاتی کیوں نہیں ہو کہ کیا ہوا ہے۔ اچھا میں ماموں کو بلا کر لاتا ہوں، وہی تم سے پوچھیں گے۔“
وہ دمکی آمیز انداز میں بولا۔

”حیدر پلیز! ابوجی کو مت بلانا۔“ وہ اس کے انداز پر اہنجا کرتے ہوئے بولی۔ حیدر خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”اب بولو کیا بات ہے؟ کسی کی بات بری لگی ہے؟“ اس نے بہت محبت سے پوچھا مگر پھر بھی مریم کو اس کا انداز اچھا نہ لگا۔ وہ سب ل کر اسے شہزادیوں والا پروٹوکول دے رہے تھے اور پھر شکوہ بھی اسی سے کر رہے تھے۔ وہ چپ چاپ حیدر کو سننے لگی کہ وہ بے چارہ نجل سا ہو گیا۔

”تم نے کیا مجھے نظر لگانی ہے؟“ وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔
”میں کیا بہت بدل گئی ہوں حیدر؟“ اس نے تم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو حیدر کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ خواہواہ ہی ہنس دیا۔

”ارے میری بدھوی مریم! تم بالکل نہیں بدلیں، ویسی ہی ہو۔ احمق اور بے وقوف اور میں بھی وہی حیدر ہوں جو تمہیں بچک کرنے اور چڑانے کو ایسی باتیں کرتا رہتا ہے۔“ وہ پہلے سے بھی زیادہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔ مریم کے دل سے بھاری بوجھ سرکا۔

”میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں کبھی نہیں بدلوں گی۔“ وہ اپنی آنکھوں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے مستحکم لہجے میں بولی۔ اس کا رویہ اب چہرہ بے حد معصوم لگ رہا تھا۔ حیدر کا دل چاہا، اس کی پلکیوں میں اٹکے آنسو اپنی، تحلیل یوں میں جذب کر لے۔ پہلے تو وہ بہت آرام سے روتی ہوئی مریم کو کندھے سے لگا کر دلا سادے لیا کرتا تھا مگر گزشتہ تین ماہ نے جیسے ایک نادیہ پردہ ان دونوں کے درمیان حائل کر دیا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی خواہش پوری نہ کر سکا۔

”دل تو میں بھی بہت گیا ہوں یار!“ اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔ مریم کب کی اٹھ کر باہر جا چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

”یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟“ ایک کرخت سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ شرمندگی سے اٹھ کر

بیٹھ گئی۔ وارڈز شروع ہوئے ابھی چند دن ہی ہوئے تھے۔ پہلے سال ان کی ڈیوٹیز دو سے اڑھائی گھنٹے تک کی ہوتی تھیں مگر ان مختصر ڈیوٹیز میں بھی وارڈز سے وارڈز تک اتنے چکر لگتے تھے کہ وہ تھک جاتی تھیں۔ اس کی ڈیوٹی چنڈرن وارڈز میں تھی۔ پہلی ہی کلاس میں اسے کی بات پر پروفیسر اختر کمال سے ڈانٹ پڑ گئی تھی پھر چنڈرن وارڈز میں بچوں کے درمیان ان کے حج حج نے اسے بے حد تھکا دیا تھا۔ اس کے سر میں بہت درد ہو رہا تھا۔ ایک بچے کی ماں واٹس رہم کی طرف گئی تو مریم آ کر اس کے بچے کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ڈراویر کو سستانے کے خیال سے اس نے شوز اتار کر پاؤں بھی پیرالیے۔ اسی دوران اس دہلی پتلی مگر لمبی سی خاتون نے اسے اس کی غلط حرکت کا احساس دلایا۔

”محترمہ! آپ شاید بھول گئی ہیں کہ آپ اپنے گھر کے لاؤنج میں نہیں بلکہ ہاسٹل کے وارڈز میں بیٹھی ہیں۔“ وہ خاتون تک کر بولیں۔ مریم نے انہیں پہچان لیا تھا، وہ سینئر مسٹرس وارڈ سسٹرنز آغا تھیں، جنہیں سب میڈم زینت کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ہفتہ بھر قبل جب فرسٹ ایئر کے وارڈز شروع ہوئے تھے، تب ان کی ایک سینئر نے بطور خاص میڈم زینت کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ وہ بہت سخت قسم کی وارڈ سسٹر ہیں جو جوئیئر سسٹر کے ساتھ بہت سختی سے پیش آتی ہیں۔ مریم اپنی باقی کلاس فیلوز کی طرح ان سے ڈرتی تھی بلکہ ساری فرسٹ ایئر چونکہ ابھی مسٹرس جوئیئر تھیں، اس لیے وارڈز بوائز اور سوپرز وغیرہ بھی ان پر رعب جمانے کی کوشش کرتے تھے۔ فرسٹ ایئر کے سفید دوپٹے اور نیلی Sash ہی دور سے سمجھا دیتی تھی کہ ان کو دھکانا آسان ہے۔

”اب کیا مراقبے میں چلی گئی ہو؟“ اب کی بار میڈم زینت نہایت کاٹ دار لہجے میں بولیں۔ دوسرے بیڈز پر اپنے اپنے بچوں کے ساتھ لیٹی مائیں اور دوسری بیمار دار عورتیں دلچسپی سے ان دونوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ مریم کو نہایت شرمندگی کا احساس ہوا۔

”مس! میں آپ سے مخاطب ہوں۔“ وہ چٹکی بجا کر اسے متوجہ کرتے ہوئے بولیں۔
”آئی ایم سوری میڈم! دراصل..... میں آئندہ.....“ وہ منمناتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آنسو گالوں پر پھلنے لگے تھے۔

اسے اس قسم کی ایکسپلینیشن کا لڑ بھگتنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا ایک لائق فائق طالبہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اساتذہ کی ہمیشہ پسندیدہ رہی تھی مگر یہاں کا نظام ذرا مختلف تھا۔ یہاں استاد صرف استاد نہیں بلکہ باس تھا۔

”میں آئندہ نہیں کروں گی میڈم!“ مریم نے خود کو سنبھالتے ہوئے بات مکمل کی۔

”آئندہ.....؟ آئندہ کی نوبت کون آنے دے گا۔ میں ابھی جا کر میٹرن سے آپ کی شکایت کرتی ہوں۔ آپ کو احساس ہے آپ نے کس قدر غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ اگر اتفاق سے کوئی سینئر ڈاکٹر اس طرف آ جاتے تو ہم سب کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ ہر جگہ کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور سب لوگوں کو ان اصولوں کے مطابق چلنا چاہیے۔ آپ یہاں مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے آئی ہیں خود اپنی دیکھ بھال کے لیے نہیں.....“ میڈم زینت کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی مریم نے ہچکیاں لے کر رونا شروع کر دیا شرمندگی،

خجالت، خفت اور سب سے بڑھ کر خوف..... وہ خود کو رونے سے روک نہیں پاتی تھی۔

”یعنی کہ حد ہوگی، چوری پھر سیدہ زوری۔ بچی نہیں ہو دودھ پیتی کہ ذرا سی بات پر رونے لگو۔“ ان کا لہجہ اس قدر سخت تھا کہ مریم کے رونے میں تیزی آگئی۔ میڈم زینت کی بھینلاہٹ میں اضافہ ہوا۔

”ارے ایسا کیا کہہ دیا میں نے کہ تمہاری آنکھوں میں سیلاب اتر آیا۔ آج کل کی لڑکیاں بھی عجیب ہیں کسی غلطی پر سرزنش کرو تو شرمندہ ہونے کی بجائے دوسروں کو شرمندہ کرنے لگتی ہیں۔“ مریم کے رونے میں کمی آ رہی تھی نہ میڈم زینت کے غصے میں۔ ان کی آواز کی شدت سے دو ایک وارڈ بوائے اور جوئیر ڈاکٹر ز بھی شاید تماشاً دیکھنے کی غرض سے آکھڑے ہوئے تھے۔

”زینت آپا! کیوں ڈانٹ رہی ہیں بے چاری کو، بس کیجئے.....“ مریم کے کانوں میں بھاری مردانہ آواز پڑی۔ آنسوؤں کی دھند میں وہ کچھ دیکھ ہی نہیں پاری تھی۔

”ان بے چاری کی وجہ سے سب کو مصیبت آسکتی تھی ڈاکٹر! آج میڈم عذرا اور ڈاکٹر اطہر بخاری کا وزٹ ہے۔ آپ جانتے ہیں وہ کس قدر سخت مزاج اور اصولوں کے سخت ہیں۔“ میڈم زینت اس شخص کے ساتھ نسبتاً نرم لہجے میں بات کر رہی تھیں۔ مریم کا شرمندگی کے مارے برا حال تھا۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے کہ اس قدر بے عزتی سہنا پڑ گئی تھی۔

”آپ لوگ اسٹوڈنٹ نرسز کے ساتھ زیادہ ہی سختی برت جاتے ہیں۔“ اس شخص کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔

”ڈاکٹر! آپ شہہ مت دیجئے، آپ کچھ نہیں جانتے۔“ میڈم زینت کا لہجہ ناصحانہ سا تھا۔ وہ شخص پھر کچھ بڑبڑایا مگر اس کی آواز بے حد مدھم مدھم تھی۔ مریم کو کچھ بھی سمجھ میں نہ آسکا۔

”اوکے۔ ایز یوش۔“ وہ شخص کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔ میڈم زینت کی سختی سے سب ہی خائف رہتے تھے۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ میڈم زینت نے اس سے پوچھا۔

”مریم چوہدری۔“ مریم نے منمناتی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پا چکی تھی۔

”آنسہ مریم چوہدری مسلمان ہیں؟“ انہوں نے پھر استفسار کیا۔

”جی۔“ مریم نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”دیکھو مریم! میں کسی کی دشمن نہیں ہوں، بات اصول کی ہے۔ جب تم آن ڈیوٹی ہو تو تمہیں ایسی غیر ذمہ داری کا ثبوت نہیں دینا چاہیے۔ میں نے تمہیں سرزنش کی ہے۔ اگر میری جگہ ڈاکٹر بخاری ہوتے تو وہ تمہاری نیلی ساش daskh دیکھتے ہی ایک آدھ ہفتے کے لیے تمہیں ٹرمینٹ کر دیتے۔ ایسی بے ضرر ٹرمینٹرز بعد میں جاب کے حصول میں بہت نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ فرسٹ ایئر میں زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب کی بار میں تمہیں معاف کر دیتی ہوں، دوبارہ یہ غلطی نہ ہو۔“ ان کے جانے کے بعد مریم من من بھر کے قدم اٹھاتی وارڈ سے باہر آگئی۔ ریسپشن کے کاؤنٹر پہ اس کی کتابیں پڑی تھیں۔ کتابیں لے کر وہ ارد گرد دیکھے بغیر

باہر کی سمت چل دی۔ ہاسٹل واپس آ کر بھی اس کا موڈ کافی خراب تھا۔ اسے احساس تھا کہ غلطی اس کی تھی مگر یہ غلطی بہت بے ضرر تھی، اسے اتنی ڈانٹ نہیں پڑنی چاہیے تھی۔ تزئین اور روبینہ مارکیٹ تک گئی تھیں۔ وہ اپنے لیے چائے بنا کر چار پائی بریٹیشی تھی کہ نگہت آگئی۔ نگہت ان سے دو سال سینئر اور نہایت پھر تیلی لڑکی تھی۔ مریم کی اس سے اچھی علیک سلیک تھی جو روبینہ کے توسط سے ہوئی تھی۔ روبینہ اور تزئین نے بہت تھوڑے عرصے میں اچھی پی آر بنالی تھی۔

”میں نے سنا ہے تمہیں کالی گھوڑی سے ڈانٹ پڑی ہے؟“ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے راز دارانہ لہجے میں بولی۔ مریم پہلے تو کچھ نہیں اور جب سمجھ گئی تو جواب دینے کے بجائے پھر گردن جھکا کر بیٹھ گئی۔ آنسو پھر آنکھ کے گوشوں میں چمکنے لگے تھے۔ اس نے پہلے بھی نگہت اور دوسری سینئر نرسز کے منہ سے ”کالی گھوڑی“ کے بارے میں سن رکھا تھا۔ ہاسٹل میں جو نرسز نرسز کے بہت سے اگلے سیدھے نام رکھے ہوئے تھے۔

”کم آن مریم! اس عورت کی ڈانٹ کا برا مت مانو۔ اس کا بس چلے تو آتی جاتی ہوا کو بھی ڈانٹنے لگے۔“ نگہت اسے دلاسا دیتے ہوئے بولی۔ مریم کو اس لمحہ نگہت سے زیادہ ہمدرد اور کوئی نہیں لگا۔

”نہیں نگہت! غلطی یہی ہے، مجھے دھیان رکھنا چاہیے تھا۔“ وہ بمشکل بولی تھی۔ دل بے حد بوجھل ہو رہا تھا۔

”جی نہیں، تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔ مجھے اسلم بتا رہا تھا کہ شاید تم ذرا دیر کو آرام کی غرض سے وارڈ میں لیٹ گئی تھیں، اس لیے ڈانٹ پڑی۔ آرام کرنا کوئی غلط بات تو نہیں ہے اور اگر غلط بات ہے بھی تو کم از کم میڈم زینت صاحبہ کو ڈانٹنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ میٹرن نہیں ہے، صرف ایک وارڈ سسٹر ہے۔“ نگہت شاید پہلے سے ہی بھری بیٹھی تھی۔ اس کے انداز میں اس قدر حقارت تھی کہ مریم حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کا ایک دم سے اس قدر جذباتی ہو جانا حیران کن ہی تو تھا۔

”تم جانتی ہو میڈم زینت نے آج تمہیں کیوں ڈانٹا؟“ نگہت نے آواز کو بے حد مدھم کرتے ہوئے سوال کیا۔

”آج سرجن بخاری کا وزٹ تھا نا اس لیے۔“ نگہت نے اس کے مزید قریب آ کر کہا۔

”مجھے انہوں نے بتایا تھا کہ وہ اس لیے سختی سے پیش آرہی ہیں کہ آج سرجن بخاری کا وزٹ ہے۔ وہ بتا رہی تھی، سرجن بخاری اصولوں کے بہت پابند ہیں، وہ غیر ذمہ داری برداشت نہیں کرتے۔“ مریم نے ٹھنڈی چائے کا گک ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ اسے نگہت کا رویہ الجھن میں ڈال رہا تھا۔

”تم بہت معصوم ہو مریم! تم کچھ نہیں جانتیں۔“ نگہت تاسف سے بولی پھر اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات دیکھ کر مزید گویا ہوئی۔

”اس نے تمہیں اس لیے ڈانٹا کہ آج سرجن بخاری کا وزٹ ہے اور تم بہت خوبصورت ہو، سمجھیں کچھ؟“

”تم کیا کہہ رہی ہو، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا؟“ مریم زچ ہو کر بولی۔ نگہت اس کے چہرے کی جانب دیکھتی رہی۔ گویا اس کے دل کا حال جاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

”سنو بے وقف لڑکی! دراصل میڈم زینت نہیں چاہتی تھیں کہ سرجن بخاری تھیں دیکھیں۔ سرجن بخاری سب سے اپر دج فل سرجن ہیں۔ وہ میمنٹ کا حصہ ہیں۔ ان کی فیور حاصل ہو جائے تو سمجھو ہیلتھ سیکرٹریٹ تک رسائی حاصل ہوگی۔ میڈم زینت کو یہی فیور حاصل ہے اور وہ اسی فیور کو کھودینے سے ڈرتی ہے، اسی لیے اس کے انڈر رجسٹری بھی خوبصورت لڑکیاں ہوتی ہیں، وہ انہیں سرجن بخاری کے سامنے آنے ہی نہیں دیتی کہ اگر سرجن بخاری کسی اور حسینہ کی زلفوں کے اسیر ہو گئے تو خود اس کا کیا بنے گا، اسی لیے ہر خوبصورت لڑکی کو ڈانٹا اور بے عزت کرنا وہ اپنا حق سمجھتی ہے۔“ مریم نے نا سمجھی کے انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

”یار..... اتنی بڑی تہمت لگاؤ۔“ وہ نگہت کے انداز سے خائف ہو کر بولی۔

”یہ تہمت نہیں ہے، یہ اس ہاسپٹل کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ میں تمہیں اسی لیے یہ سب بتا رہی ہوں کہ تم محتاط رہنا۔ خصوصاً میڈم زینت سے تو دور ہی رہنا، وہ بالکل اچھی عورت نہیں ہے۔ ہاں میڈم اچھی ہے۔ وہ بہت محبت سے بات کرتی ہے۔“ وہ آخر میں مسکراتے ہوئے بولی مگر مریم مسکرا بھی نہ سکی۔

”اب تم پریشان مت ہو، اچھے برے لوگ تو ہر فیلڈ میں ہوتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ اپنا کام کرو۔ تمام سینئر ڈاکٹرز کے ساتھ بنا کر رکھو اور پھر میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“ نگہت نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر حوصلہ دینے والے انداز میں کہا۔ مریم کو حوصلے کی ہی ضرورت تھی۔ وہ نگہت کی باتوں سے بہل گئی۔

☆ ☆ ☆

”مریم! مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ تزئین نے اس کے ہاتھ میں کیوٹی میڈیسن کے نوٹس لے کر روہینہ کی چار پائی پر پھینک دیے۔ وہ ہاتھ میں آئینہ اور پلکے لے کر بیٹھی اپنی آنی بروز ادھیڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے نہایت ناگوار سے تزئین کی جانب دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں بولی۔ اس کے انداز و اطوار اور مزاج میں پہلے کی نسبت بہت تبدیلی آچکی تھی۔ ہفتہ دس دن قبل اس نے تزئین سے اپنی آنی بروز کی ہیپ بنوائی تھی۔ اب اس کی ہینڈوں کے نیچے ننھے ننھے بال نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ کافی دیر سے تزئین سے کہہ رہی تھی کہ دوبارہ سے آنی بروز کی ہیپ درست کروے، مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

”ابھی میرا موڈ نہیں ہے، جب موڈ ہوگا، جب تمہاری آنی بروز کی کاٹی جھانٹی کر دوں گی۔“ روہینہ کو یہی بات بری لگی تھی۔ اتنے بہت سے دن اتنی رنگ برنگ لڑکیوں میں گزار کر وہ کافی کچھ سیکھ گئی تھی۔ اب اسے چھوٹے چھوٹے مذاق بھی برے لگ جاتے تھے اور تزئین کے ساتھ تو اس کی اکثر جھڑپ ہو جاتی تھی۔ اس نے وہی نوٹس اٹھا کر دوڑ کر سی پڑھینک دیے۔

”اوہو، اب تو روہینہ بھی نخرے کرنے لگی ہیں۔“ اس نے روہینہ کو چڑا چا ہا اور روہینہ چڑھ چکی تھی۔

”میرے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ تڑخ کر بولی۔

”بلے بھئی بلے..... میڈم کی کوز کا م.....“ تزئین کی بات مکمل ہونے سے پہلے مریم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ان دونوں کی روز روز ہونے والی ان جھڑپوں سے وہ بہت تنگ آچکی تھی۔

”تم مجھ سے کوئی بات کرنے والی نہیں نا؟“ اس نے تزئین کو یاد دلایا۔

”اوہ ہاں، اس فٹے منہ کا منہ دیکھ کر سب بھول جاتا ہے۔“ اس نے روہینہ کی طرف اشارہ کر کے کہا تو روہینہ کھول کر رہ گئی۔ گزشتہ چار ماہ میں اس میں بہت تبدیلیاں آئی تھیں۔ بہتر سے بہترین کا سفروہ بہت تیزی سے طے کر رہی تھی، مگر تزئین سے جیتنا ابھی بھی اس کے لیے بہت مشکل تھا۔

”اب تم بک بھی چکو۔“ مریم نے اکتا کر کہا۔ اسے ابھی وائیو کی تیاری بھی کرنا تھی۔

”یار..... یہ روہینہ بہت تبدیل ہو گئی ہے۔“ تزئین نے دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے کہا، جہاں سے روہینہ باہر گئی تھی۔

”ٹھیک کہتی ہو اور یہ تبدیلی بہت مثبت ہے۔ تم نے دیکھا، وہ پہلے کی نسبت کتنے اچھے رنگوں کے کپڑے پہننے لگی ہے۔ ان کا انداز گفتگو بھی پہلے کی نسبت بہت بہتر ہو گیا ہے۔“ مریم نے اسے سراہتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اسے حیدر کی یاد آئی جو ہاسٹل سے گھر جانے پر اسے تبدیل شدہ قرار دے رہا تھا۔

”مجھے کہہ رہی تھی کہ تزئین! میری انگلش Vocabulary بہت دیک ہے۔ تم اس کو امپروو کرنے میں ہیلپ کر دو گی؟“ تزئین نے ہو ہو اس کی نقل اتاری تو مریم ہنس دی۔

”تم مجھ سے کیا بات کہنے والی تھیں؟“ اس نے تزئین کی طرف دیکھتے ہوئے پھر پوچھا تو وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئی پھر نچلا ہونٹ کاٹنے ہوئے آنکھیں میچے ایسے ظاہر کرنے لگی، جیسے کچھ سوچ رہی ہو پھر مریم کی طرف رخ کر کے بولی۔

”یار لڑکی! تم میری کوئی بات نہیں مانتیں مگر پھر بھی بنانے کیوں بری نہیں لگتیں۔ دل چاہتا ہے ہر راز تم سے ہی شیئر کروں۔“ اس کا انداز جتانے والا تھا مریم مسکرا دی۔ چند روز پہلے الاؤنس کی رقم ملنے پر تزئین نے کچھ فرینڈز کے ساتھ مل کر آؤٹنگ کا پروگرام بنایا تھا مگر مریم نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اسی بات کو الیٹو بنا کر تزئین اسے طعنہ دے رہی تھی۔

”اب پھوٹ بھی چلو کیا بات ہے؟“ تزئین کے ایک بار پھر خاموش ہونے پر مریم اس کا کندھا ہلا کر بولی۔

”یار! تم نے سانوں کی رنگت والا وہ لڑکا دیکھا ہے جس کی داڑھی ہے، جس کی آنکھیں خمار آلودہ سی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے نیند اس کی پلکوں پہ ٹھہری رہتی ہے۔“

”ہاں..... دیکھا ہے۔“ مریم نے اس کے سوال کا مختصر جواب دیا۔

”کون ہے؟“ تزئین نے دلچسپی سے پوچھا۔

”انصاف الحق۔“ مریم اطمینان سے بولی تو تزئین کے لبوں سے تہقہ پھوٹ پڑا۔

مریم نے دوبارہ سے اپنے نوٹس اٹھالیے اور پڑھنے کی کوشش کرنے لگی مگر اسے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ تین اپنی قوتِ طبع کو بھلائے روئینہ کی تیاریوں پر فخر سے کئے میں مصروف تھی، جبکہ روئینہ مسلسل اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوتی کہ وہ تڑخ کر جواب دینے پر مجبور ہو جاتی۔ اس ساری صورت حال میں یکسوئی سے پڑھنا تو ناممکن تھا۔ مریم نے بھی نوٹس سائڈ میں رکھ دیے اور ان دونوں کی اس نوک جھونک کو دیکھنے لگی۔ روئینہ کے کمرے سے نکلنے کے بعد ہی اس کا خاتمہ ہوا تھا اور مریم نے بھی تب ہی سکون کا سانس لیا مگر یہ سکون بھی عارضی تھا۔

”یار! یہ محترمہ اتنا تیار ہو کر انجوائے کرنے باہر جاسکتی ہے تو ہم کیوں نہیں جاسکتے۔ چلو ہم بھی چلتے ہیں۔“ تین نے گویا حکم سنایا۔ مریم کے مسلسل انکار کے باوجود وہ اسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لائی۔ ”ہم جائیں گے کہا؟“ مریم نے اپنے اڑتے ہوئے دوپٹے کو بمشکل سنبھالنے ہوئے پوچھا۔ تین نے اسے کپڑے بدلنے کی مہلت بھی نہیں دی تھی، ہاں مگر اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک ضرور لگوا دی تھی۔ اسے تین کی زبردستی اچھی نہیں لگی تھی مگر اب آسمان کی گہری رنگت کہیں کہیں لہرائی بنیالی بدلیاں اور پھر چھتر چھتر چھاڑ کرتی ہوا اسے بہت حرا دے رہی تھی۔

”ہم افق کے پار جائیں گے۔“ تین ہوا سے بھی زیادہ مستی میں تھی۔ ہاسٹل کے میں گیٹ سے باہر نکلتے ہی وہ لوکل وین میں سوار ہو گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

”ممی کا عزم حقیقتاً قابلِ تعریف ہے۔“ اس نے نمائو کچپ کی پلیٹ میں فرنج فراز سے دائرے بناتے ہوئے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔ اس کے پاپا کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”تم شاید اپنی ممی کی بے جا ضد کو عزم کہہ رہے ہو۔ وہ صرف اور صرف ضد میں یہ سب کر رہی ہے تاکہ تمہیں مجھ سے دور کر سکے کیونکہ وہ جانتی ہے مجھے تم سے بہت محبت ہے اور میری ہر محبوب چیز اسے چھین لینے کی عادت ہے۔“ وہ نہایت طنزیہ انداز میں کہہ رہے تھے۔ اس نے پہلے کبھی اپنے پاپا کو ممی کے بارے میں اس طرح بات کرتے نہیں سنا تھا۔

”نہیں پاپا! ایسی بات نہیں ہے۔ ممی ایسی نہیں ہیں، وہ دل کی بہت اچھی ہیں پاپا!“ اس نے فوراً تردید کی اسے ہزار ہاشکاتیوں کے باوجود اپنی ممی سے بہت محبت تھی۔ اپنی طرف سے وہ ممی پاپا کے دل میں ایک دوسرے کے لیے موجود کدورت دور کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

”ان فیکٹ میرے برے رزلٹ نے ان کا موڈ اس قدر آف کر دیا ورنہ آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔“ اس نے تمام تر ذمہ داری قبول کرتے ہوئے تاسف میں گھر کر کہا۔ اس کا رزلٹ اناؤنس ہونے تقریباً چھ ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس کی ممی نے چھ ماہ قبل جو سنڈنی بھوانے کی دھمکی دی تھی، وہ ابھی تک اس پر قائم تھیں مگر چونکہ وہ ابھی اٹھارہ سال کا نہیں ہوا تھا، اس لیے یہ سلسلہ کسی قدر تھقل کا شکار ہو گیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اپنا فیصلہ تبدیل کر چکی تھیں۔

”میں کرکٹ اسٹڈیم کی نہیں، اس ہاسٹل کی بات کر رہی ہوں۔ عام طور سے چلڈرن وارڈ میں نظر آتا ہے۔ بہت سو براور سنجیدہ سا لگتا ہے۔ بہت عزت و احترام سے مخاطب کرتا ہے اور پھر.....“

”یار ہوگا، تم وہ بات بتاؤ جو تمہیں مجھے بتانی تھی۔“ مریم اس کی قصیدہ خوانی سے زچ ہو کر بولی۔ وہ اسے دنوں میں ہی تین کی عادات کے متعلق بہت اچھی طرح جان گئی تھی۔ وہ جب بھی کسی بات پر ڈپریشن ہوتی تھی، تب اسی طرح کے بے سرو پا اور بے معنی باتیں کیا کرتی تھی۔ اس کے اپنی امی سے تعلقات بہت اچھی نوعیت کے نہیں تھے بلکہ اس کی امی ابھی تک اس سے ناراض تھیں اور عام طور پر تین کی سب سے بڑی پریشانی اس کی امی کا رویہ ہی تھا۔

”امی نے ننگین کا رشتہ طے کر دیا ہے۔“ تین نے بالآخر گل ہی دیا۔

”یہ تو خوشی کی بات ہے، مبارک ہو۔“ مریم نے خوش ہو کر کہا۔ دو ایک بار تین نے ذکر کیا تھا کہ اس کی امی جلد از جلد اس کی بڑی بہن کی شادی کروینا چاہتی ہیں۔

”بہت زیادہ خوشی کی بات ہے۔ وہ شخص جس سے ننگین کی شادی ہو رہی ہے، تقریباً اس سے دو گنی عمر کا ہے اور پھر شادی شدہ بھی ہے۔ وہ ننگین سے شادی صرف شریعت کا تقاضا نبھانے کی خاطر کر رہا ہے۔“ تین دل جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ اسے بتانے لگی۔ مریم کو بھی اذہا افسوس ہوا۔ وہ ابھی تسلی ولا سے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی تھی کہ روئینہ کمرے میں آگئی۔ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر تین نے نیکی کے ساتھ کروٹ بدل لی۔ وہ اپنی آنکھ میں آئی نمی کم از کم روئینہ کو نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ روئینہ اس کے انداز کو اس کی ادا سمجھی، اس لیے ناک چڑھا کر الماری سے کپڑے نکالنے لگی۔ اس نے پہلے الاؤنس کی مد میں ملنے والی تمام رقوم اپنی ذات پر خرچ کر ڈالی تھی۔ وہ بہت سے نئے سوٹ لائی تھی۔ نئے جوتے، کاسمیٹکس کا سستا سامان اور تھوڑی سی جیولری بھی خریدی تھی۔

”تم کہیں جا رہی ہو؟“ مریم نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں..... ستارہ، لیز اور نگہت وغیرہ کے ساتھ ہوٹل میں کافی پینے جا رہی ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ جا رہی ہوں، تم بھی چلو۔“ اس نے بتانے کے ساتھ ساتھ دعوت بھی دے ڈالی۔

”ہوٹل میں کافی پینا، ہاسٹل میں کافی پینے سے مختلف ہوتا ہے کیا؟“ یہ سوال تین نے کیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ اس کے چہرے پر غم والہ تمام تاثرات غائب ہو چکے تھے۔ وہ غضب کی ادا کارہ تھی۔

”نہیں مگر ہوٹل میں مزا آتا ہے نا۔ فلموں میں نہیں دیکھا کبھی۔“ روئینہ سابقہ جھڑپ کو بھلا کر بھولے پن سے کہہ رہی تھی۔

”کیا پیہ روئینہ! ہوٹل میں کافی پانی کر بھی زیادہ مزا آئے کیونکہ تمہارے لیے تو کافی کا ذائقہ بھی ایک نئی چیز ہوگی۔ آئی ایم شیور، تم آج پہلی بار کافی پیو گی۔“ تین کا انداز طنزیہ نہیں تھا مگر پھر بھی شاید روئینہ کو اچھا نہیں لگا۔ وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر کپڑے پر لیس کرنے لگی۔

”تمہاری ممی تم سے محبت کرتی ہیں؟ میرے لیے تو یہ ایک بریکنگ نیوز ہے بھی! جہاں تک میرا خیال ہے، تمہاری ممی کو لفظ ”محبت“ سے بھی چڑ ہے۔“ وہ شکستہ سے انداز میں کہہ رہے تھے۔ ان کا مقصد ماحول میں پھیلنے والی سوؤاری نسفا کو ختم کرنا تھا۔

”نو پاپا؟ یو آر کو ایٹ رانگ۔ ان فیکٹ حالات نے ممی کو ذرا چڑ چڑا کر دیا ہے۔“ وہ وضاحت دیتے ہوئے بولا۔ اکثر وہ اپنے آپ کو عجیب طرح کی صورت حال میں الجھا لیتا تھا۔ ممی کے سامنے ہوتا تو پاپا کے متعلق وضاحتیں دیتا اور پاپا کے سامنے ممی کی حمایت میں بولتا۔ وہ دونوں ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔ اس کے پاپا بہت بذلہ رخ اور شوخ طبیعت کے تھے مگر کبھی کبھی ان پر بھی قنوطیت کا دورہ پڑ جاتا۔ وہ اسے اس بات پر آمادہ کر رہے تھے کہ وہ ان کے ساتھ رہنا بھی چاہتا تھا مگر ابھی کیونکہ اس کی عمر اٹھارہ سال نہیں ہوئی تھی اور اٹھارہ سال سے پہلے وہ خود مختاری سے فیصلہ نہیں کر سکتا تھا اور ویسے بھی اپنی ممی اور بہن کے سامنے وہ انہیں چھوڑ دینے کے بلند و بالغ دعوے ضرور کرتا تھا، مگر انہیں اکیلا چھوڑ کر پاپا کے پاس آکر رہنے کی اس میں بھی ہمت نہیں تھی۔

”تمہارا آئی کارڈ بن چکا ہے؟“ اسے خاموش دیکھ کر اس کے پاپا نے سوال کیا۔

”نہیں۔“ اس نے گہری سانس بھری پھر مزید گویا ہوا۔

”ابھی میری عمر اٹھارہ سال ہونے میں کچھ مہینے باقی ہیں۔“ اسے پاپا کی کمزور یادداشت پر ہمیشہ جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ وہ ہر ملاقات میں اس کی عمر کے متعلق سوال کرتے اور ہمیشہ بھول جاتے جبکہ می گھٹنے اور منٹ کی تفصیل کے ساتھ اس کی عمر بتا سکتی تھیں۔

”اس کا مطلب یہ کہ تمہارے سڈنی جانے میں ابھی کچھ عرصہ لگ جائے گا۔“ انہوں نے اپنے سامنے پڑے کافی کے کپ کو واپس لے کر رکھ دیا۔ کافی ٹھنڈی ہو کر بد ذائقہ ہو چکی تھی۔

”کم آن پاپا! کچھ اور عرصہ.....؟ ساری زندگی لگ جائے گی۔ میں تو کبھی سڈنی نہیں جاؤں گا، مگر ابھی نہیں۔“ اس کے پاپا نے تڑپ کر اس کی جانب دیکھا۔

”فضول باتیں مت کرو۔“ انہیں اس کی بات سے دکھ پہنچا تھا۔ گزشتہ چھ ماہ سے وہ بہت ہی زور و زنج ہو چکا تھا۔ اس کی صحت پہلے کے مقابلے میں کافی گر چکی تھی۔ اس کا قد کاٹھ ان ہی کی طرح لمبا چوڑا تھا اور رنگت اپنی ممی کی طرح بے حد سرخ و سفید تھی، مگر کمزور صحت کی بنا پر وہ بہت شاندار دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر کم سنی کے اثرات کسی قدر معدوم ہونے لگے تھے۔ دستوں کے صلاخہ مشورے پر اس نے کافی پہلے سے شیو کرنا شروع کر دی تھی، مگر اس کی آواز اور انداز میں بچپنا نمایاں تھا۔

”پاپا پلیز! آپ ممی سے بات کیجئے نا، ان کی بات پھر پر لکیر ہوتی ہے۔ وہ آج کل بار بار ایبسی فون کر کے نجانے کون سی انفارمیشن اکٹھی کرتی رہتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے ہی میرا ہر تھ ڈے ہوگا، ویسی ہی ممی میرے کندھے پر بیک ڈال کر مجھے پلین میں بٹھا دیں گی۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا جپس پلیٹ میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے پاپا اس کی ڈیپلومیسی پہ مسکرائے۔ اگر یہی بات وہ کہتے تو ان کا یہ معصوم بیٹا فوراً تردید کرنے لگتا۔

”اوکے..... اوکے..... تم پریشان مت ہو..... میں بات کروں گا۔“ انہوں نے میز کے اوپر

سے ذرا سا کھسک کر اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا اور اس کا دل چاہا کہ وہ ان کے گلے لگ جائے مگر ماحول کا تقاضا تھا کہ وہ خاموشی سے بیٹھا رہے۔ ریٹورنٹ میں اس وقت کافی رش تھا۔ موسم کی جولانی بھی عروج پر تھی اور وقت بھی شام کا تھا۔ ایسے میں تمام ٹیبلز ہی بھرے ہوئے تھے۔ لوگ مسلسل اپنی اپنی مٹلو بہ چیزیں۔ یلٹ سروس کے تحت لانے لے جانے میں مصروف تھے، جبکہ ان کی ٹیبل پر سب کچھ ویسے کا ویسا ہی پڑا تھا۔ اس کے پاپا کی کافی ٹھنڈی جبکہ اس کی کولڈ ڈرنک گرم ہو چکی تھی۔

”لاؤ یار! میں اور کافی لے آتا ہوں اور تمہارے لیے ٹھنڈی کوک بھی۔“ ان کے بیچ پھیلی خاموشی سے اکتا کر اس کے پاپا نے کہا اس نے ایک نظر کاؤنٹر پر ڈالی پھر گہری سانس بھر کر بولا۔

”بہت رش ہے، لائے میں لے آتا ہوں۔“

”بیک مین! میں ابھی بوڑھا نہیں ہوا۔“ انہوں نے اٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ان کے اس طرح سے کہنے پر وہ بھی مسکرا دیا۔ وہ کاؤنٹر کی سمت بڑھ گئے۔ سفید ٹی شرف اور ڈھیلی سی جینز میں وہ کافی بیک اور اسٹارٹ لگ رہے تھے۔ وہ اس کے پاپا کی بجائے بڑے بھائی لگتے تھے۔ اسے اپنے پاپا کی ڈشنگ پر نسلینی پہ ہمیشہ فخر محسوس ہوتا تھا۔ کاؤنٹر کے قریب کھڑی ایک خاتون اس کے پاپا کی جانب ہی دیکھ رہی تھیں اور وہ جس انداز میں دیکھ رہی تھیں، وہ بھی بہت دلچسپ تھا۔ اس کے لبوں پر بہت جانداری مسکراہٹ چمکی تھی۔

”مریم! ذرا دیکھنا، وہ لڑکا خود بخود مسکرا رہا ہے۔ یہ پاگل تو نہیں۔“ اس کے کانوں میں آواز آئی تھی۔ ساتھ والی ٹیبل پر دو لڑکیاں بیٹھی شاید اسی کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ ان کی سرگوشی نما آواز بھی اس کے کانوں میں بخوبی پہنچ رہی تھی۔ وہ شاید ابھی وہاں آکر بیٹھی تھیں۔

”آہستہ بولو، اس نے سن لیا تو۔“ مریم نامی اس لڑکی نے مزید دھیمی آواز میں کہا۔ وہ اپنی چیئر پر بالکل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں لڑکیاں اب مکمل طور پر اس کی نظروں کے حصار میں تھیں۔ سادہ سے کپڑوں میں ملبوس وہ دونوں لڑکیاں کافی خوبصورت تھیں۔ ان میں سے ایک نے دو پیسے سر پر پھیلا رکھا تھا جبکہ دوسری لڑکی نے کندھے پر لپا ہوا تھا۔ اس کے اس طرح سے دیکھنے پر وہ کچھ جھجک گئی تھی۔ کندھے پر دو پیسے والی لڑکی تو پھر بھی کسی قدر بولڈ لگ رہی تھیں مگر دو پیسے کے ہالے میں مقید وہ پریوش کچھ گھبرا سی گئی۔ اسے بڑی دلچسپی حیرت ہوئی۔ اس نے اپنے ارد گرد اس قسم کی لڑکیاں کچھ کم ہی دیکھی تھیں۔ ڈیٹاں اور افتخار اس کے ساتھ ہوتے تو اس لڑکی کو اپنے فقروں اور شرارتوں سے ٹھیک ٹھاک زچ کر سکتے تھے۔ چھٹی کے وقت گزرا کالج کے آگے سے اپنی موٹر بائیک پہ چکر لگا کر لڑکیوں نے فقرے کہنا اس نے انہی سے سیکھا تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر ان لڑکیوں کو ہاتھ سے ”ہیلو“ کا سگنل دیا۔

”تو بہ آج تو اس قدر رش ہے کہ ہماری باری شاید کل صبح تک آسکے گی۔“ اس کی اس حرکت پر وہ دونوں ٹیٹائی تھیں، اسی دوران اس کے پاپا خالی ہاتھ واپس آ گئے۔ اس نے جتانے والے انداز میں انہیں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ”میں نے کہا تھا نا۔“

”آؤ ہم کہیں اور چلتے ہیں۔“ اس کے پاپا نے اسے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنا سیل فون اٹھا کر

فوراً کھڑا ہو گیا۔ مین انٹرنس سے باہر نکلنے سے پہلے اس سے مزکر اسی ٹیبل کی جانب دیکھا، جہاں وہ لڑکیاں بیٹھی تھیں وہ ٹیبل اب خالی تھی۔ وہ لڑکیاں شاید اپنی جگہ تبدیل کر چکی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

”کھڑکیاں بند کر دو سسٹر! مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔“ ملک صاحب نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ مریم نے عجیب الجھن میں گھر کر کھڑکیوں کی جانب دیکھا۔ اس وی وی آئی بی روم کی تمام کھڑکیاں پہلے ہی بند تھیں۔ جولائی کے مہینے میں اسے سی جلنے سے شاید انہیں خشکی کا احساس ہو رہا تھا۔ مریم نے اٹھ کر بے دلی سے اسے سی بند کر دیا۔ حالانکہ اسے کافی گھٹن اور گرمی محسوس ہو رہی تھی۔

”مجھے بہت گھٹن محسوس ہو رہی ہے، کیا یہاں کا اسے سی ٹھیک کام کر رہا ہے؟“ اسے سی بند کر کے ابھی وہ اپنی جگہ پر بیٹھی تھی کہ ملک نے پھر سے حکم جاری کیا۔ مریم نے بے حد ہنچھلا کر انہیں دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے بے سدھ پڑے تھے۔ ان کے چہرے پر نقابہٹ کی زردی کھنڈی تھی۔ مریم کا نرم دل پیچھا۔ وہ خواہ مخواہ ایک بیمار شخص پر غصہ ہو رہی تھی۔ حالانکہ یہ اس کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ خود کو ڈانٹتی ہوئی اٹھی اور پھر سے اسے سی آن کر دیا۔ اسے سی فائن پاور والا اینٹنٹ ملک صاحب کے بیڈ کے بالکل اوپر تھا۔ مریم جب اسے سی آن یا آف کرنے کے لیے آگے بڑھتی تو اسے بیڈ کے بہت قریب ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ ملک صاحب دو اواؤں کے زیر اثر غنودگی میں تھے۔ ان کا ایک بازو پہلو میں ٹکا تھا جبکہ دوسرا بیڈ سے نیچے لٹک رہا تھا۔ مریم ان ڈانڈا لیا کے سینے پر ٹکا دیتی مگر وہ پھر سے نیچے ہو جاتا۔ ملک صاحب، مریم کو سکون سے بیٹھنے ہی نہیں دے رہے تھے۔ ان کی طرف سے ہر پندرہ منٹ بعد جاری ہونے والے نئے احکامات اسے متحرک رکھتے ہوئے تھے۔

”مجھے پانی پلا دو۔“

”میرے سر میں بہت درد ہے، سردی بادو۔“

”مجھے لحاف اوڑھا دو۔“

”میرا لحاف ہٹا دو۔“

یہ سب کام کرتے ہوئے اسے نگہت پہ بھی غصہ آ رہا تھا۔ مریم کام سے گھبرانے والی لڑکی نہیں تھی، مگر چونکہ اسے ابھی ایسے کاموں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس نے تو ابھی تک دو گھنٹے سے زیادہ والی کوئی ڈیوٹی بھی نہیں دی تھی۔ فرسٹ ایئر میں ہر شفٹ ذرا کم دورانیے کی ہوتی تھی۔ وہ صرف اور صرف نگہت کی وجہ سے اس الجھن میں گرفتار ہوئی تھی۔ نگہت کو کسی ضروری کام سے اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں جانا تھا اور اس کی ٹائٹ شفٹ تھی۔ اس نے مریم سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کی جگہ ڈیوٹی کر لے۔ مریم نے بہت مشکل سے ہامی بھری تھی۔ اگر میٹرن اس کی یہ ڈیوٹی لگاتی تو وہ ہنسی خوشی یہ فریضہ سرانجام دے لیتی مگر کسی اور کی جگہ اسے ڈیوٹی دینے پر ڈر لگتا تھا۔

”میرے ہاتھوں سے جان نکل رہی ہے سسٹر؟ میرے ہاتھ بالکل سن ہو چکے ہیں۔“ ملک صاحب کراہ کر بولے۔ ان کی آواز میں بے پناہ درد تھا۔ مریم ان کی تکلیف کی شدت کو محسوس کر کے ہمدردی کے

جذبات سے مغلوب ہو کر آگے بڑھی۔ اس نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار کی شدت محسوس کرنا چاہا، مگر ان کے جسم کا درجہ حرارت نارمل تھا۔ انہیں ڈرپ بھی نہیں لگی تھی۔ نگہت نے مریم کو یہی بتایا تھا کہ ملک صاحب ایذا کنی کا شکار رہتے ہیں۔ برنس میں ہونے والے نقصان کے باعث ان کا بی لی شوٹ کر گیا تھا۔ وہ ڈاکٹر کے مشورے پر بریلیکس کرنے کے لیے ہاسپٹل آؤٹ ہوئے تھے مگر نجانبے کیوں مریم کو محسوس ہو رہا تھا کہ ملک صاحب کا مسئلہ کچھ اور ہے وہ شدید احساس تنہائی کا شکار تھے، اسی لیے بار بار مریم کو پکارتے تھے۔

”میرے ہاتھوں کو سہلا دو سسٹر! میرے ہاتھ بے جان ہو رہے ہیں۔“ انہوں نے کراہتے ہوئے نیم غنودگی کی حالت میں کہا۔ مریم نے ان کے بھدے ہاتھ پر اپنا نرم و نازک ہاتھ رکھ کر سہلانا شروع کر دیا۔ ملک صاحب کے ہاتھوں پہ موجود سفید کھر درے بال ان کے ہاتھوں میں گدگدی پیدا کر رہے تھے۔ مریم ان کے ہاتھ کی پشت کو سہلا رہی تھی کہ انہوں نے اپنا ہاتھ سیدھا کر لیا۔ قبل اس کے کہ وہ مدھوشی کے زیر اثر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑتے دروازہ آہستگی سے کھل کر تیزی سے بند ہو گیا۔ مریم تو گڑبڑاتی ہی تھی، ملک صاحب نے بھی سٹیپا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ جوانمیں سویا ہوا سمجھ رہی تھی، ان کی اس حرکت پر کچھ حیران ہوئی۔ ابھی وہ ان کے ہاتھ دوبارہ تھامنا چاہتی تھی کہ دروازہ پھر سے کھلا۔ اندر داخل ہونیوالی شخصیت کو دیکھ کر وہ حیران ہی نہیں بلکہ پریشان بھی ہو گئی۔ وہ آن ڈیوٹی ڈاکٹر صاحب تھے۔ مریم ان کے چہرے سے واقف تھی مگر ان کے نام سے آگاہ نہیں تھی۔ انہوں نے اور آل کندھے پر لٹکا رکھا تھا جبکہ اسٹیتھو سکوپ گردن کے گرد لٹک رہا تھا۔ رات کے اس پہر بھی وہ جاگ رہے تھے۔ حالانکہ مریم نے سینئر نرسز سے سنا تھا کہ رات کی شفٹ کے آن ڈیوٹی ڈاکٹر ز عام طور پر اپنے اپنے کمروں میں مورچہ بند ہو کر بیٹھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

”کیسا محسوس کر رہے ہیں ملک صاحب!“ وہ شخص ملک صاحب کے بستر کے قریب آ کر دریافت کرنے لگا۔ ملک صاحب نے کیا جواب دیا، مریم سن نہیں پائی وہ دل ہی دل میں ”بل تو جلال تو“ کا ورد کرنے لگی۔ نگہت نے اسے خاص طور سے تاکید کی تھی کہ آن ڈیوٹی ڈاکٹر کو کال کرنے کی کوشش مت کرنا اور کسی بھی طرح کی پرابلم ہو تو اسے خود ہینڈل کرنا کیونکہ ایک تو ملک صاحب کی حالت بے حد تسلی بخش تھی اور دوسرا اس صورت میں نگہت کی جواب طلبی کا اندیشہ تھا۔

”آپ ماشاء اللہ بالکل ٹھیک لگ رہے ہیں ملک صاحب! انشاء اللہ مارنگ میں آپ کو ڈسچارج کر دیا جائے گا۔“ مریم کی طرف ایک نظر ڈالے بغیر ڈاکٹر صاحب نے چیک اپ مکمل کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”اب آپ کی ضرورت نہیں ہے سسٹر!“ آپ چل کر میرے کیبن میں بیٹھئے میں ابھی آتا ہوں۔ میرا خیال ہے، آپ کو بہت نیند آ رہی ہے اور آپ کو ایک کپ کافی کی ضرورت ہے۔“

ڈاکٹر نے پہلی مرتبہ مریم کی طرف دیکھ کر کہا۔ ان کی آنکھوں میں اب نیند کا شائبہ بھی نہیں تھا اور ان کے چہرے پر عجیب مبہم سی مسکراہٹ تھی۔ وہ دوبارہ سے ملک صاحب کی طرف متوجہ ہوا تو مریم فوراً اس پر انیویٹ روم سے باہر نکل کر نرسز کے لیے بنے ہوئے مخصوص کیبن میں آ کر دواش روم میں گھس گئی۔ اسے جواب طلبی سے

ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔ اور اس وقت اسے اسے گھبت پہ سب سے زیادہ غصہ آ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

”کیا آ آ آ“ گھبت نے ساری بات سن کر شہادت کی انگی منہ میں ڈال کر جس طرح ”کیا آ آ آ“ کا نعرہ بلند کیا، اس سے مریم جو جھنجھلائی ہی، ساتھ ساتھ دور آئینے میں اپنا عکس دیکھتی رو بینہ بھی بڑبڑا گئی۔ وہ لپ اسٹک لگانے میں مصروف تھی۔ گھبت کی بانگ نے اس کے ہاتھ کا توازن بھی خراب کیا۔ جس سے لپ اسٹک ہونٹوں کے کنارے سے آگے پھلتی چلی گئی۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا، مگر اس کے چہرے پر گھبت کے لیے ”فنے منہ تہارا“ والے تاثرات تھے۔

”کیا تم سارا وقت واش روم میں بیٹھی رہیں؟“ گھبت نے سابقہ حیرانی و پریشانی سے پوچھا۔ مریم نے اسے آنکھ کے اشارے سے خاموش ہو جانے کے لیے کہا کیونکہ وہ رو بینہ کے سامنے یہ سارا معاملہ ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ رو بینہ سے تو خبر اس کی بہت گہری دوہتی ہی نہیں تھی مگر توئین سے بھی اس نے ابھی یہ ساری بات ڈسکس نہیں کی تھی۔ لیکن گھبت کو بتانا بے حد ضروری تھا۔ رو بینہ اپنی سرگرمیوں میں دوبارہ مصروف ہو چکی تھی، اس لیے اس نے ان کی جانب اتنا دھیان ہی نہیں دیا۔

”تو کیا تم سارا وقت واش روم میں بیٹھی رہیں؟“ مریم کے ٹوکے پر گھبت نے آواز کو بے حد دھیمہ کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

”نہیں، میں سارا وقت واش روم میں بیٹھی نہیں رہی بلکہ واش روم کی چھت سے لٹک گئی تھی۔“ مریم نے بہت جل کر جواب دیا مگر گھبت پہ کوئی اثر نہیں ہوا۔

”ملک صاحب تو بہت غفا ہوں گے؟“ وہ بڑبڑائی مریم کا سارا دھیان رو بینہ کی جانب تھا جس کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ مریم خود بھی یہ سارا معاملہ تفصیل سے ڈسکس کرنا چاہتی تھی مگر اسے رو بینہ کے کمرے سے نکل جانے کا انتظار تھا۔

”وہ ڈاکٹر کون تھا جس نے تمہیں ڈانٹا تھا؟“ گھبت نے ایک اور سوال اٹھایا۔ اب کی بار مریم نے اسے گھور کر دیکھا پھر رو بینہ کی پروا کیے بغیر بولی۔

”میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں اس ڈاکٹر کا نام نہیں جانتی۔ میں نے ایک بار اسے وارڈز میں چلتے پھرتے دیکھا ہے مگر چونکہ مجھے وارڈز میں آتے جاتے بھی صحیح معنوں میں جسدہ جسدہ آٹھ دن نہیں ہوئے، اس لیے میری بہت سارے لوگوں سے ابھی واقفیت نہیں ہے۔“ گھبت نے اس کے لہجے کی سختی کا قطعاً برا منائے بغیر گردن ہلانا شروع کر دی تھی، گویا اس کی بات سے اتفاق کر رہی ہو۔

”وہ ڈاکٹر مرتضیٰ تو نہیں تھے نا؟“ گھبت نے پوچھا۔ ”نہیں بابا، وہ ڈاکٹر مرتضیٰ نہیں تھے۔“ مریم نے اسے تسلی دلائی۔

”وہ ڈاکٹر مرتضیٰ ہو بھی نہیں سکتے۔ انہوں نے میرے کام میں مداخلت کر کے اپنی شامت بلوائی تھی۔“

”گھبت نے با آواز بلند خود کلامی کی تھی۔ مریم نے اس کی جانب حیرانی سے دیکھا۔“

”یار! ڈاکٹر مرتضیٰ بہت رحم دل انسان ہے۔ وہ کسی کو نہیں ڈانٹ سکتے۔ میرا تو وہ بہت خیال رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے جس ڈاکٹر نے تمہیں ڈانٹ پلائی ہے، وہ ڈاکٹر مرتضیٰ نہیں تھے۔“ گھبت نے اس کی حیرانی بھی رفع کر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ خود کو بھی یقین دلارہی تھی۔

”مریم! میں اپنے کزن کے ساتھ اپنی خالہ کے گھر جا رہی ہوں۔ میں لیٹ واپس آؤں گی۔“ رو بینہ کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ اپنا دوپٹہ شانوں پر درست کرتی وہ مریم کو اپنے پروگرام کے بارے میں مطلع کر رہی تھی۔ مریم نے مسکرا کر صرف سننے پر اکتفا کیا۔ رو بینہ کے لاہور شہر میں اچانک بہت سے رشتے دار پیدا ہو گئے تھے۔ وہ اکثر اوقات ان سب سے ملنے کے لیے جاتی رہتی تھی اور واپسی میں لیٹ ہو جانا اس کا عام معمول تھا۔ جب تک رو بینہ کمرے سے نکل نہیں گئی، مریم اسی کی جانب دیکھتی رہی۔ رو بینہ اتنے سے دنوں میں بہت نکھر گئی تھی۔

”تم نے اس ڈاکٹر کے اوور آل پر لگا بیج نہیں دیکھا تھا؟“ رو بینہ کے چلے جانے کے بعد گھبت پھر سے اسی موضوع پر آگئی۔ وہ بے حد تشویش میں مبتلا تھی۔

”ارے یار! اس نے اوور آل کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ میں دیکھ ہی نہیں پائی اس کے نام والا بیج۔“ مریم نے افسوس سے کہا۔ اسے گھبت کی پریشانی کا احساس تھا اور وہ خود بھی کم پریشان نہیں تھی۔

”میں ایسا کرتی ہوں کہ تمہیں اس شخص کا حلیہ بتانا شروع کرتی ہوں۔ تم خود ہی اندازہ کر لینا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔“ اس ڈاکٹر کے متعلق بتانے لگی۔

”ہاں میں سمجھ گئی، وہ یقیناً ڈاکٹر عادل تھا۔ مجھے پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا کہ وہ ڈاکٹر عادل کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔“ گھبت نے ناگواری سے ناک چڑھا کر کہا۔

”ستیا ناس ہو تمہارا ڈاکٹر عادل..... اس ملک نے تو میرا قیمہ کر دینا ہے۔“ اب وہ بڑبڑا رہی تھی۔

مریم کو اس کی کچھ باتیں سمجھ میں آرہی تھیں اور کچھ بالکل سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ وہ بیک وقت ڈاکٹر عادل اور ملک صاحب کے خوف میں مبتلا تھی۔

”ڈاکٹر عادل میری شکایت تو نہیں کر دیں گے؟“ مریم نے ایک نئی تشویش میں گھر کر گھبت سے پوچھا۔

”تمہیں ڈاکٹر عادل کی پڑی ہے اور مجھے اس ملک سے خطرہ ہے۔“ گھبت اکتا کر بولی، پھر مریم کے رنگ بدلتے چہرے پر نظر پڑی تو نوآبادیات پلٹ کر بولی۔

”ایسی کی تیسی ڈاکٹر عادل کی، بھانڈ میں جائے۔ تمہیں پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میں ان سے ایکسپوز کر لیتی ہوں؟“ اس نے گویا گھبت سے اجازت طلب کی۔ گھبت بدک اٹھی۔

”خبردار جو تم اس شخص کے پاس گئیں۔ تمہیں کیا پتہ وہ کس قدر برا آدمی ہے۔ دنیا کا خبیث ترین آدمی ہے۔ تم نے بہت اچھا کیا جو تم اس کے کہین میں نہیں گئیں۔ اس انسان نے تو ہمارا جانیائی حرام کر دیا ہے۔“

تم کیا جانو کتنی لڑکیوں کو کافی پلوانے کے بہانے برباد کر چکا ہے۔ ایسے لوگوں کو تو اپنے مرتبے اور مقام کا احساس بھی نہیں ہوتا۔“ نگہت کی باتیں مریم کے لیے کسی قدر انوکھی تھیں اور دل دہلا دینے والی بھی مگر پھر بھی وہ مطمئن تھی کہ نگہت جیسی دوست اس کے ہمراہ تھی جو اسے بہت سی مشکلات سے بچا سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

چھٹی والے روز خلاف توقع اس کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا کیونکہ وہ ایک دن پہلے سب کام کر کے فارغ ہو چکی تھی۔ وہ مہینہ بھر بعد ہی گھر جاتی تھی، اس لیے اپنے میلے کپڑے وہ ہاسٹل میں ہی دھو لیتی تھی۔ اس نے کل ہی ہفتہ بھر کے میلے کپڑے دھوئے تھے پھر رات کو انہیں پرلیں بھی کر لیا تھا۔ وہ چونکہ ذرا جلدی اٹھنے کی عادی تھی اس لیے روینہ اور ترمین کے اٹھنے سے پہلے ہی اس نے اپنی الماری میں کتابوں وغیرہ کی ترتیب درست کی، رات کی چائے کے جھوٹے برتن دھوئے اور اس کے بعد اس نے پرلیں کیا ہوا یونیفارم بھی دوبارہ پرلیں کر لیا تھا مگر روینہ اور ترمین ابھی بھی گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہی تھیں۔ ان کو جگاتے جگاتے اسے بھی نیند آگئی اور اس وقت وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تینوں چھٹی کے روز ایک ساتھ ناشتہ کیا کرتی تھیں اور تقریباً ہر اتوار ہی اسے ناشتے کی طلب میں بہت دیر تک بھوکے رہنا پڑتا تھا کیونکہ اس کی دونوں روم میٹس بہت لیٹ اٹھنے کی عادی تھیں۔

ان دونوں کو کونسنے دیتی وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آگئی۔ سارے ہاسٹل میں دیرانی چھائی ہوئی تھی۔ ویک اینڈ پہ بہت سی لڑکیاں گھروں کو چلی جاتی تھیں یا پھر اپنے رشتہ داروں کے یہاں وقت گزارنا پسند کرتی تھیں۔ مریم کو ریڈرو سے گزرتے ہوئے ارد گرد کے کمروں کے دروازوں پہ لگے موٹے موٹے تالے دیکھتی لان میں آگئی، مگر ساڑھے نو بجے ہی سورج کی تاباں کی عروج پر تھی۔ صبح کی تیز دھوپ اسے تپتی دھوپ کا مزہ دے رہی تھی۔ وہ اکتا کر دوبارہ کوریڈور کی سمت آگئی۔

”اماں! میری میٹھس کی نوٹ بک پہ دو اشارز ملے ہیں۔ ٹیچر کہتی ہیں، ساری کلاس میں علیزے کا میٹھس سب سے اچھا ہے۔ میں ہمیشہ ٹین آؤٹ آف ٹین لیتی ہوں اماں۔“

ایک کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے مریم کے کانوں میں آواز پڑی۔ وہ کمرہ کس کا تھا، مریم نہیں جانتی تھی مگر ادھ کھلے دروازے سے فرش پر بیٹھی ایک بچی اسے واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اس بچی کے سامنے جکسا پزل پڑی تھی۔ وہ فرش پر سے اس کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر جکسا پزل کے فریم میں جمع کرنے میں مصروف تھی۔ وہ صحت مند سی کپلو بچی، مریم کو پہلی نظر میں ہی بے حد کیونٹ لگی۔ اس کا دل چاہا کہ کمرے کے اندر جا کر اس بچی کو پیار کرے۔ ابھی وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ بچی کی اماں کی آواز سنائی دی۔

”اماں کی چندا! اردو کے بارے میں بھی تو بتاؤ۔ تمہاری اردو کی ٹیچر کہہ رہی تھیں کہ تم اردو میں بہت غلطیاں کرتی ہو۔“

مریم کے لیے یہ آواز بہت جانی پہچانی تھی۔ میڈم زینت کی آواز تو وہ سینکڑوں آوازوں میں بھی

پہچان سکتی تھی۔ اُسے حیرت ہوئی میڈم زینت کی بیٹی بالکل بھی ان پر نہیں گئی تھی۔ اس بچی کی رنگت بے حد سرخ و سفید تھی جبکہ میڈم زینت کافی سانولی تھیں۔ مریم نے اندر کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا کہ بہر حال میڈم زینت کبھی بھی اس کی گڈ بکس میں شامل نہیں رہی تھیں۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ میڈم زینت نے اسے اپنے کمرے کے باہر کھڑا دیکھ لیا تھا۔
”السلام علیکم۔“ اس نے گڑبڑا ہٹ میں سلام کر ڈالا۔ حالانکہ یہاں اس طرح سے سلام کرنے کا رواج ذرا کم ہی تھا۔

”وسلام..... خیریت؟“ انہوں نے دروازے کے قریب آ کر استفہامیہ انداز میں پوچھا۔ وہ انہیں کوئی مناسب جواب دینے ہی والی تھیں کہ پیون اسے بلانے آگیا۔

”تسی اٹھے کھڑے او، میں تہاڑے کمرے وچ لب ریاسی۔ تہاڑے پائی ہوراں آئے نیں۔“
(آپ یہاں کھڑی ہیں اور میں آپ کو آپ کے کمرے میں تلاش کر رہا تھا۔ آپ کے بھائی آئے ہیں)

اسے خوشگوار جھٹکا لگا۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے گیسٹ روم کی جانب آئی۔ حیدر اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔

”ایہہ بیٹھے نیں تہاڑے پائی جان۔“ پیون بھی اس کے ساتھ ہی بھاگ کر گیسٹ روم تک آیا تھا۔ لڑکیوں سے ملنے کے لیے آنے والے لوگوں سے ٹپ وغیرہ ملنے کی توقع اس کو بہت مستعد کر دیتی تھی۔

”اس احمق سے کہو، میں تمہارا پائی جان نہیں ہوں۔“ حیدر چڑ کر بولا۔ مریم کو اس کے انداز پر خواہ مخواہ کی ہنسی آئی۔ گزشتہ بار جب وہ گھر گئی تھی تو اس کی امی نے سرسری سا ذکر کیا تھا کہ اس کی بھیمو، حیدر کے لیے اس کا رشتہ مانگ رہی ہیں۔ ظاہر ہے یہ بات حیدر بھی جانتا تھا، اس لیے اس کے انداز پہلے کی نسبت کچھ بدل سے گئے تھے۔

”میں تمہیں لینے کے لیے آیا ہوں۔“ ابتدائی علیک سلیک کے بعد حیدر نے کہا۔ سفید لٹھے کے کڑے کٹے کٹے شلوار قمیص میں وہ خود کو کسی ریاست کا راجہ سمجھ رہا تھا۔ اسے اپنی وجاہت کا بے حد احساس تھا اور گیسٹ روم میں آتی جاتی جھانکتی لڑکیاں اسے باور کر رہی تھیں کہ وہ اچھا لگ رہا ہے۔ مریم نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

”تمہیں کچھ احساس ہے گلابی سنڈی! اس بار تمہیں پورا ڈیڑھ مہینہ ہو گیا ہے گھر سے آئے۔ وہاں سب تمہارے لیے کتنے اداس ہو رہے ہیں۔“

حیدر نے اتنا کہہ کر ملک شیک کے گلاس میں موجود آخری گھونٹ بھی اپنے اندر منتقل کر لیا اور پھر تب تک گلاس منہ سے لگائے رکھا جب تک آخری قطرہ بھی اس کے منہ میں منتقل نہیں ہو گیا۔

”حیدر کے بیچے..... شرم کرو..... سب لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔“ اس نے جل کر کہا۔ اسے افسوس ہوا کہ اس نے حیدر کو ملک شیک آفر ہی کیوں کیا۔

”ارے تو اس میں شرم والی کیا بات ہے، ماشاء اللہ اتنا خوبصورت ہو۔ لڑکیوں نے دیکھ بھی لیا تو کیا ہوا اور پھر لڑکیاں ہی دیکھ رہی ہیں نا، ان کی مائیں تو نہیں، مائیں دیکھتیں تو میں شرماتا بھی کیونکہ ہمارے معاشرے میں داماد تو مائیں ہی پسند کرتی ہیں نا“ وہ ڈھٹ بنا کہہ رہا تھا۔

”یہ لاہور ہے حیدر صاحب! آپ کا بھائی پھیر نہیں۔ یہاں لڑکیاں اپنی مرضی سے اپنی ماؤں کے لیے داماد چنتی ہیں۔“

وہ اسی کے انداز میں بولی مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

”اچھا یہ تو بڑے مزے کی بات ہے..... تم نے بھی کچھ سیکھ لیتا تھا ہمارا بھی کوئی فائدہ ہو جاتا۔ اب ہم کہاں تمہارے لیے خوار ہوتے پھریں گے۔“ وہ اسے چڑاتے ہوئے بولا۔

”ارے تم فکر مت کرو..... میں نے سب سیکھ لیا ہے..... میرے لیے تمہیں کوئی خوراک نہیں اٹھانی پڑے گی۔“

مریم نے شرارت کا بدلہ شرارت سے لیا مگر حیدر کے حیرے کا رنگ بدلا، ایک لمحے کے لیے وہ خاموش ہو گیا پھر گہری سانس لے کر بولا۔

”یہ بات تو تم دل سے نکال دو مریم بی بی میں جانتا ہوں یہ خوراک تو مجھے ہی اٹھانی پڑے گی کیونکہ یہ میری قسمت میں لکھی ہوئی ہے..... یہ دیکھو میرے ہاتھ پر کتنا واضح ”M“ لکھا ہے“

اس نے اپنی پتلی اس کے سامنے پھیلا دی۔ اس کے دل اور دماغ کی لائن اس طرح سے آپس میں ملتی تھی کہ اگر زندگی کی لائن کو ساتھ ملا کر دیکھا جاتا تو ایسا ہی محسوس ہوتا تھا جیسے ”M“ لکھا ہے۔ حیدر کے چہرے پر پھیلی ہنسی کی بنیاد میں مریم کو عجیب سے احساسات سے دوچار کیا وہ بچی نہیں تھی کہ حیدر کے محسوسات کو سمجھ نہ سکتی۔ وہ پہلے کی نسبت خود کو بہت مچھو محسوس کرتی تھی۔ حیدر جب تک بیٹھا رہا اسی طرح کی بے سرو پا باتیں کرنا رہا۔ حیدر کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئی تو اس کا موڈ بے حد خوش گوار ہو چکا تھا۔

”تو پیا سے مل کر آئی ہے بس آج سے نیند پرانی ہے۔“ تزئین نے اسے دیکھتے ہی گنگناٹا شروع کر دیا۔ روبینہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔

”وہ کون تھا؟“ تزئین نے شرارتی انداز میں پوچھا۔ وہ شاید گیسٹ روم میں اسے کسی لڑکے کے ساتھ بیٹھا دیکھ چکی تھی۔

”کزن تھا میرا..... حیدر..... میرے بھائی کے جیسا ہے۔“ وہ ذرا چڑ کر بولی۔ اسے پتا تھا اب تزئین مزید سوالات کرے گی، اس لیے فوراً بھائی کا حوالہ دیا مگر تزئین نے بات ہی پکڑ لی۔

”جین..... سچ تمہارا بھائی بھی ایسا ہی ہے۔ اس کا مطلب تمہارا بھائی بھی پینڈم ہے۔ تم نے اس کی متکلفی وغیرہ تو نہیں کی ہوگی ابھی، یار پلیز ایسا کرتے وقت ایک بار میرے متعلق ضرور سوچنا۔ میرا اور تمہارے بھائی کا پرفیکٹ کپل بنے گا۔ وہ کیا کہتے ہیں پرفیکٹ کچ“ وہ آنکھیں بند کیے کہہ رہی تھی۔ مریم کو ہنسی آگئی۔

”بکونیں..... تم سے چھوٹا ہو گا وہ۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”ہائے ہائے ایک تو ہر پینڈم لڑکا مجھ سے چھوٹا ہوتا ہے اور جو مجھ سے بڑا ہوتا ہے وہ ”کزن“ ہوتا ہے اور ”کزن“ پہ پہلا حق تمہارا ہے۔ میں تمہارے حق پہ ڈاکہ نہیں ڈال سکتی۔“

وہ آنکھ مارتے ہوئے بولی۔ مریم خاموش ہی رہی۔ وہ پہلے کئی حیدر کا غائبانہ تعارف کروا چکی تھی اور تزئین، مریم کو اکثر حیدر کے نام سے چھیڑتی تھی۔ چونکہ روبینہ کا بھی کزن اس سے ملنے آتا رہتا تھا اس لیے وہ ان دونوں سے کہا کرتی تھی۔

”یار! ویسے تم لوگ اس معاملے میں کتنے خود کفیل ہو جسے دیکھو اس کا ہی ایک عدد کزن ضرور ہے۔ ایک میں ہی ”بے کزن“ پیدا ہوگئی ہوں، اس بھرے جہاں میں۔“

”مریم نے چائے اور ناشتے کے لوازمات دیکھنے شروع کیے پھر تزئین سے پوچھا۔“

”روبینہ کہاں ہے؟“

”وہ بھی گیسٹ روم میں ہی تھی..... اس کا بھی کزن آیا ہوا ہے۔“

تزئین نے جل کر جواب دیا۔ مریم خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہی وہ روبینہ کو گیسٹ روم میں ایک لڑکے کے ساتھ بیٹھا دیکھ چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

”آپ سب لوگ انتہائی نکلے، کام چور اور انسانیت سے عاری لوگ ہیں۔“

سرجن مرتضیٰ کی آواز قدرے اونچی تھی۔ مریم چند لمحے پہلے وارڈ میں داخل ہوئی تھی اس نے حیرانی سے ان کی جانب دیکھا۔ اس نے انہیں پہلی مرتبہ اس قدر غصے میں دیکھا تھا۔ دھیمے لہجے اور شفقت انداز میں بات کرنے والے سرجن مرتضیٰ اس کے پسندیدہ ترین ڈاکٹر تھے۔ مستقل فکلیٹی کا حقہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ آرتھوپڈک وارڈ کے ہیڈ بھی تھے۔

مریم کی ڈیوٹی اسی وارڈ میں لگ رہی تھی اس لیے ان سے اکثر سامنا رہتا تھا۔ ان کا اتنا غصیلاروپ وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

”میں نے الطاف سے کہا تھا سراسر! مگر وہ کہنے لگا کہ.....“ آخر منمنایا۔

”مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو آخر! تم جانتے ہوئے کہ غلطی تمہاری ہے۔“

سرجن مرتضیٰ نے اس کی بات کاٹی۔

”میں نے انیسکرے رپورٹ دیکھ کر پر سکڑ پٹن لکھا تھا۔ اس بچی کے جوائنٹس ابھی اس قابل بھی نہیں تھے کہ ایک سوئی کا بوجھ اٹھاسکیں اور تم نے کمال جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے پلستری ہٹا دیا۔ مجھے یہ بتاؤ سرجن میں ہوں یا تم۔ ہفتہ بھر سے پہلے تم نے ایک مریض کی پٹیاں نہیں کھولنی۔“ ان کا لہجہ اب کی بار پہلے سے بھی زیادہ اونچا تھا۔ مریم کو اصلاحات سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ آخر علی آرتھوپڈک وارڈ کا سینئر ماسٹریل نرس تھا۔ اسے اکثر معاملات میں اپنی من مانی کرنے کی عادت تھی۔ وہ رشوت لیکر بہت سے غلط سلط کام کر دینے کا عادی تھا جس کا خمیازہ اسے بعد میں بھگتنا پڑتا تھا۔

”میں نے خود پٹیاں نہیں کھولی تھیں سر! ان کے گھروالوں کا اصرار تھا کہ اب پٹیاں کھول دی جائیں۔ وہ میری منت سماجت کر رہے تھے بس اس لیے میں نے.....“

”پہلے تمہاری منت سماجت کر رہے تھے اور اب میری منت سماجت کر رہے ہیں کیونکہ اب کوئی آرتھوپڈک ایسا نہیں جو ان کی بیک یون کے اس مہرے کو دوبارہ پوزیشن پر لاسکے۔ تمہاری غلت کے باعث ایک اچھا بھلا صحت مند انسان ساری زندگی کے لیے مفلوج ہو گیا۔“ سرجن مرتضیٰ نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”میں آپ سے کہہ تو رہا ہوں سر کہ.....“

”اچھا چلو ایک لمحے کے لیے فرض کر لیتا ہوں کہ اس مریض کے گھروالے اصرار کر رہے تھے مگر اس بچی کا کیا قصور تھا جس کا پلستر ہٹا دیا تم نے اس بچی کے پیرٹنس سے میری بات ہوئی ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ تم نے زبردستی اس کا پلستر ہٹایا تھا کیونکہ وارڈ میں کوئی بیڈ خالی نہیں تھا اور تمہارا کوئی رشتہ دار ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہونے والا تھا اس لیے تم نے اس بچی کا پلستر کھول دیا۔“

سرجن مرتضیٰ چبا چبا کر کہہ رہے تھے۔ مریم کے علاوہ الطاف، نگہت وغیرہ بھی ارد گرد کھڑے تاسف بھری نظروں سے اختر کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ہفتہ بھر پہلے سرجن مرتضیٰ نے اسے تنبیہ کی تھی مگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔

”سرجن مرتضیٰ اب کی بار اختر کو معاف نہیں کریں گے۔“ نگہت نے مریم کے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا۔ اس کا انداز بالکل درست ثابت نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر مرتضیٰ اختر کو گھورتے ہوئے اپنے کیمین کی سمت چل دیے مگر چند لمحوں بعد آرتھوپڈک وارڈ کے آن ڈیوٹی پیرامیڈیکل اسٹاف کو طلب کیا گیا تھا۔ ان کے کیمین میں ان کے علاوہ ڈاکٹر عادل، ڈاکٹر تحریم سرجن ظہور بھی موجود تھے۔ وہیں مریم کو پتا چلا تھا کہ جس بچی کا پلستر وقت سے پہلے کھول دیا تھا وہ سیاسی وارث و سوخ رکھنے والے خاندان کی بچی تھی اور اس کے گھروالوں کی شکایت بہت اوپر تک پہنچ گئی تھی جہاں سے ایم ایس تک خاص ہدایت آئی تھیں اور ایم ایس نے سرجن مرتضیٰ کو طلب کر کے ٹھیک ٹھاک قسم کی جواب طلبی کی تھی۔

”میں اب کی بار تمہیں پھر معاف کر دیتا ہوں۔ میں نے ایم ایس کے سامنے کہیں تمہارا نام نہیں لیا بلکہ خاموشی سے تمہاری غلطی کو اپنے کھاتے میں ڈال کر ان کی بری بھلی سن آیا ہوں مگر آج کے بعد تم نے اس قسم کی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا تو پھر تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔“

سرجن مرتضیٰ نے سب کی موجودگی میں اختر کو معاف کر دیا تھا مگر اختر کے ساتھ ساتھ ان سب کو بھی اپنی اپنی ذمہ داری مکمل ایمانداری کے ساتھ نبھانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس سارے معاملے میں ڈاکٹر عادل کے انداز نے مریم کو بے حد سلگایا۔ انہوں نے ساری گفتگو کے دوران کچھ بھی کہنے کے بجائے مریم کو گھورنے پر اکتفا کیا۔ نگہت نے ان کا یہ انداز دیکھ کر مریم سے آنکھوں ہی آنکھوں میں یقین دہانی چاہی تھی کہ یہ وہی ڈاکٹر ہیں جو ملک صاحب والے پرائیویٹ روم میں آئے تھے۔ مریم پہلے ہی ان کے اوپر آل پر لگے بیج سے ان کا نام

پڑھ چکی تھی۔ اس روز سارے وارڈ میں سرجن مرتضیٰ کے جذبہ ایثار کی تعریف ہوتی رہی جبکہ مریم دل ہی دل میں ڈاکٹر عادل کے رویے سے خوفزدہ رہی۔ اچھا سمجھا پڑھا لکھا شخص اس قسم کی چال نہ کرتا اسے ذرا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

☆ ☆ ☆

”روبینہ کی بات پکی ہو گئی ہے۔“ تزئین نے سینڈل کا اسٹریپ بند کرتے ہوئے پُرسرت لہجے میں اطلاع دی۔ وہ دونوں مارکیٹ تک جا رہی تھیں۔

”اتنی خوشی کی خبر اتنی دیر سے سنارہی ہو اور یہ محترمہ روبینہ کہاں ہیں؟“ مریم نے چادر اوڑھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

”محترمہ روبینہ اپنے کزن کم منگیت کے ساتھ آؤنگ کے لیے گئی ہیں۔ میں نے پوچھا کہاں جا رہی ہو تو کچھ بولی نہیں پھر شرماتے ہوئے کہنے لگی کہ اجمل کے ساتھ باہر جا رہی ہوں پھر خود ہی کہنے لگی کہ بات پکی ہونے کی خوشی میں اجمل مجھے ٹریٹ دینا چاہتا ہے۔“

”تزئین نے تفصیل کے ساتھ بتایا۔ وہ دونوں ہاسٹل کے کارڈور سے ہوتی ہوئی گیٹ تک آگئی تھیں۔“

”اجمل اس کا وہی کزن ہے نا جو ہر ایک اینڈ پلٹے کے لیے آتا ہے؟“

مریم نے پوچھا تو تزئین نے اثبات میں سر ہلادیا۔ وہ دونوں مین روڈ کی طرف جا رہی تھیں جہاں سے انہوں نے وین پکڑنا تھی۔

”ہاں یار وہی کزن ہے..... اچھا ہینڈم لڑکا ہے..... میرا تعارف تو نہیں ہے مگر میں نے بہت مرتبہ گیسٹ روم میں اور ہاسٹل کے لان میں اسے روبینہ کے ساتھ دیکھا ہے۔“

تزئین جلد دل کے پھپھو لے پھوڑنے میں ماہر تھی۔ وہ دونوں وین میں سوار ہوئیں تو کچھ دیر کے لیے خاموش بھی ہو گئیں پھر مارکیٹ میں بھی خریداری کرتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ سب ضروری چیزیں خرید لینے کے بعد مریم کو بھوک ستانے لگی۔ تزئین کو بھی بھوک تو لگ رہی تھیں مگر ہاسٹل میں آج اس کی فوریٹ مسکد سبزی بن رہی تھی اس لیے وہ ڈنر ہاسٹل میں ہی کرنا چاہتی تھی۔ وہ دونوں متفقہ فیصلہ کر کے جوس پینے کے لیے ایک چھوٹے سے کھوکھے کی جانب آگئیں جہاں ملک شیک بھی دستیاب تھا۔ ان دونوں نے اسٹار بک کا آرڈر دیا پھر آپس میں باتیں کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ موسم میں اوائل نومبر کی مخصوص خشکی شامل تھی۔ لوگوں کا کافی رش لگا تھا۔ لاہور شہر کے بایوس کی یہ روایت مریم کو بہت عجیب لگتی تھی۔ موسم میں جیسے ہی کوئی خوشگوار تبدیل آتی سارا لاہور گھروں سے باہر اٹھ آتا۔ ہوٹلز، ریسٹورنس، کھوکھے، چھوٹے چھوٹے فاسٹ فوڈ کارنز سب جگہ گویا میلہ سالگ جاتا تھا۔ سب لوگ تقریباً ہم کھانے کے لیے زندہ ہیں، کی عملی تصویر بنے نظر آنے لگتے۔ اب بھی کم وبیش یہی صورتحال تھی۔ وہی چوک کے ارد گرد جھیلے یا فوڈ کارنز نظر آ رہے تھے وہاں بے تحاشا رش تھا۔ وہ دونوں مین جگہ کھڑی تھیں تب ہی ان سے پہلے پرایک بایک آ کر کی۔ اس پرایک لڑکا لڑکی سوار تھے۔ لڑکے

سے تو وہ دونوں انجان تھیں رزل کی روبینہ تھی۔ مریم نے تزمین کو ٹھوکا دے کر متوجہ کیا۔

”ارے..... یہ تو روبینہ ہے۔“ وہ خوشگوار حیرت میں گھر کر بولی۔ روبینہ پہلی نظر میں تو پہچانی ہی نہیں جا رہی تھی۔ دوپٹہ نکلے میں ڈالے سن گلاسز بالوں میں اٹکائے وہ ایک الزما ڈرن لڑکی کے روپ میں آس پاس کھڑے بہت سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ وہ اونچا لمبا ہینڈم لڑکا بھی کافی اچھا لگ رہا تھا۔

”آؤ ان سے ملنے ہیں۔“ وہ مریم کا ہاتھ تھام کر فوراً ہی دو قدم آگے ہوئی۔ روبینہ نے اسی لمحے ان کی جانب دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کے چہرے پر عجیب سی گھبراہٹ نمایاں ہوئی۔

”مجھے تزمین نے بتایا تھا تمہاری انجمنٹ کا..... مبارک ہو روبینہ.....“ مریم نے اتنا ہی کہا تھا کہ روبینہ نے اس کی بات کاٹی۔

”یہ کامران تو صیف ہیں۔“

اس شخص کی پوری ہنسی باہر نکل آئی جبکہ تزمین نے حیرت سے روبینہ کی جانب دیکھا۔ وہ اس سے کہہ کر آئی تھی کہ وہ کسی اجمل نامی کزن کم منگیتر کے ساتھ باہر جا رہی ہے جبکہ اس کے ساتھ موجود شخص کا نام کامران تو صیف تھا اور پھر اس شخص کا انداز بھی عجیب و غریب تھا۔

”تم نے بتایا ہی نہیں روٹی کہ تم انکیجڈ ہو..... بہر حال مبارک ہو یار! اب ان دونوں کا انٹروڈکشن بھی تو کرواؤ۔“

وہ لپچائے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔ مریم تو مریم تزمین بھی کچھ حیرانی کے عام میں اسے تنکے لگی۔

”یہاں ایک بہت اچھا ریستورنٹ ہے آئیے آپ کو کولڈ ڈرنک پلو اتا ہوں روبینہ کی انجمنٹ کی خوشی کو کہیں بیٹھ کر سیلبرٹ کرتے ہیں۔“ وہ حقیقتاً سوڑا تھا۔ مریم اور تزمین معذرت کرتے آگے بڑھ گئیں جبکہ روبینہ نے انہیں روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

”مریم! روبینہ جھوٹ بول رہی تھی؟“ تزمین نے ناسمجھی کے انداز میں پوچھا۔ مریم خود سمجھ نہیں پائی کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ اس نے جس لڑکے کو ایک آدھ بارگیٹ روم میں روبینہ کے ساتھ دیکھا تھا وہ یہ لڑکا تو نہیں تھا جبکہ روبینہ نے تزمین کو بتایا تھا کہ اس کا صرف ایک ہی کزن اس سے ملنے آتا ہے۔

وہ دونوں عجب شش و پنج میں گھر کر واپس ہاسٹل آگئی تھیں۔

”وہ میرا دوست ہے یار؟ اچھا شخص ہے۔ فرینڈ لی اور کیئرنگ۔“ رات کو واپس آ کر روبینہ نے تزمین کے ایک بار پوچھنے پر بہت آرام سے تسلیم کر لیا تھا۔ اس کا انداز اتنا دو ٹوک تھا کہ مریم اور تزمین کو مزید کچھ پوچھنے کی جرات ہی نہیں ہوئی۔

”مریم! تم کامران کو بہت پسند آئی ہو۔ وہ تم سے دوستی کرنا چاہتا ہے۔“ تزمین کے کمرے سے نکل جانے کے بعد روبینہ نے اسے اطلاع دی۔

”یار! ایسی ازوری رچ..... بہت دیا لو بندہ ہے۔ ایسے دوست قسمت والوں کو ملتے ہیں۔“

وہ مریم کے چہرے کی جانب دیکھے بغیر اپنا ہی راگ الاپ رہی تھی جبکہ مریم کا غصہ انتہا کو پہنچنے لگا۔

یہ روبینہ اس روبینہ سے کس قدر خائف تھی جو اسے پہلے دن کلاس میں ملی تھی اور جسے تزمین پر نرسز آف چک جمبرہ کہا کرتی تھی۔

”میں یہاں دوستیاں کرنے نہیں آئی مجھے تو معاف ہی رکھو۔“

وہ ناک چڑھا کر کہتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ روبینہ نے کندھے اچکا کر اپنی مخصوص الماری میں منہ گھسایا۔

☆ ☆ ☆

”میں مایہن ہوں..... میرے فرینڈز مجھے مایہ کہتے ہیں۔“ اس کے ساتھ بیٹھی اس خوبصورت لڑکی نے مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کر دیا۔ مریم ایک ہفتے کی چھٹیاں گزارنے کے بعد بھائی پھیرو سے واپس لاہور جا رہی تھی۔ وہ جب کوچ میں سوار ہوئی تو مایہن نامی یہ لڑکی پہلے سے کوچ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی اس لیے مریم سہولت سے اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ حیدر قلی کر کے ہی کوچ سے اترتا تھا کہ اسے کسی خاتون کے ساتھ جگہ ملی ہے ورنہ بعض اوقات کوچ والے اس بات کا دھیان نہیں رکھتے تھے۔ کوچ اسٹارٹ ہوئی تو اس لڑکی نے اپنا تعارف کر دیا۔

اعلا تراش خراش کے ڈریس میں ملبوس نفیس سے میک اپ کے ساتھ وہ کوچ میں بیٹھی ہوئی باقی سب خواتین سے بے حد مختلف لگ رہی تھی۔ اس نے باقی خواتین کی طرح دوپٹہ سر پر اوڑھنے کے بجائے کندھوں پر پھیلا رکھا تھا کوچ میں سفر کرتے ہوئے مریم کو عام طور پر بہت سی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا مگر آج ان کی سیٹ کی طرف کچھ زیادہ ہی نگاہیں اٹھ رہی تھیں۔

”میں مریم ہوں اور میرے فرینڈز مجھے مریم ہی کہتے ہیں۔“

”ہائس ٹومیٹ یو مریم..... لاہور جا رہی ہو؟“ مایہن نے بے تکلف ہونے میں پہل کی۔

”ہاں“ مریم نے اختصار سے جواب دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ خود سے مایہن سے کوئی سوال کرتی وہ خود ہی بولنے لگی۔

”میں بھی لاہور جا رہی ہوں..... ان فیکٹ میں لاہور ہی کی رہنے والی ہوں۔ یہاں ساہیوال اپنے ننھیال آئی ہوئی تھی۔ مجھے تو کوچ میں سفر کرنے سے دھشت ہوتی ہے۔ پہلے ماموں کا دربار، پھر چھوڑنے کے لیے آنے والا تھا مگر ماموں کے کسی فرینڈ کی ڈیوٹی تھی۔ سب لوگوں کو وہاں جانا پڑا۔ میں نے سوچا ڈرائیور کے فارغ ہونے کا انتظار کون کرے اس لیے مجبوراً کوچ سے آنا پڑا۔“

وہ کافی تفصیل سے بات کرنے کی عادی معلوم ہوتی تھی۔

”تم لاہور میں کہاں رہتی ہو؟“ اس نے مریم کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”ہاسٹل میں پڑھتی ہوں۔“

”ویری گڈ..... تعلیم ضرور مکمل کرنی چاہیے۔ تم کیا پڑھتی ہو۔ میں نے لاہور کالج سے گریجویشن کیا ہے۔ اس کے بعد میں نے این سی اے سے کچھ آرٹ کورسز بھی کیے۔ آج کل اپنے ایک فرینڈ کے ساتھ اس کے

مریم کو اس ”ٹوبان نامہ“ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر ماہین نے اس کے چہرے کے بدلنے تاثرات سے قطع نظر اسے ٹوبان قدوائی کے متعلق بتانا شروع کر دیا تھا۔ بات ابھی ٹوبان کے پسندیدہ ٹوٹھ پیسٹ تک پہنچی تھی کہ موبائل پر پھر سے بپ بجی۔

”ارے سفیر کا پیج ہے۔ ایک تو میں اس لڑکے سے بھی بہت تنگ ہوں ہر دو گھنٹے بعد مجھے SMS کرنے کا شوق ہے اے۔“

ماہین نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا۔ وہ میسج چیک کرنے کے بعد خود بھی کچھ دیر تک موبائل کے مٹن پیش کرتی رہی۔

”وہ کہتا ہے کہ وہ مجھے مس کر رہا ہے اور اسے یقین ہے کہ آج میں بہت اچھی لگ رہی ہوں۔“

ماہین نے اپنا موبائل دوبارہ سے پرس میں رکھتے ہوئے کہا۔

”سفیر تمہارا بھائی ہے؟“ مریم نے اس کے چہرے پر پھیلی مسرت کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اؤکم آن مریم! آئی بیٹ مائی برو (برادر) سفیر از مائی فرینڈ۔“ وہ کوفت سے بولی۔

”بلے بھی بلے۔ سفیر از جسٹ اے فرینڈ۔“ مریم نے حیرت میں گھر کر سوچا۔

”میری اور میرے بھائی کی آپس میں کبھی نہیں بنی۔ اسے میری ہر بات پر اعتراض کرنے کی عادت

ہے حالانکہ چار سال چھوٹا ہے مجھ سے مگر باتیں ایسے کرتا ہے جیسے چودہ سال بڑا ہو یہ مت کرو۔۔۔۔۔ وہاں کیوں جاتی

ہو۔۔۔۔۔ اس سے کیوں ملتی ہو۔۔۔۔۔ لیٹ کیوں آئی۔ فلاں کے ساتھ ریٹورنٹ میں کیوں تھی۔ فلاں کے ساتھ گاڑی

میں کیوں تھی۔ بس اس لیے اچھا نہیں لگتا مجھے۔ حالانکہ میں نے کبھی اس کی کسی بات پر اعتراض نہیں کیا۔ اس کی کتنی

گرل فرینڈز ہیں، وہ نیٹ پر کون سی ویب سائٹس کا وزٹ کرتا ہے۔ پاکٹ منی کے علاوہ اس کے پاس روپے

کہاں سے آتے ہیں۔ اس کو تنگ بھی کرتا ہے۔ میں یہ سب باتیں جانتی ہوں مگر میں نے کبھی اس کی شکایت نہیں

لگائی۔ جبکہ وہ تو ہمہ وقت میری شکایت لگانے کو بے تاب رہتا ہے۔ ممی نے طے کیا تھا اسے آسٹریلیا بھجوا دیں گی

مگر ابھی اس کا آئی ڈی کارڈ نہیں بتاؤن فیکٹ وہ بنانا ہی نہیں چاہتا، حالانکہ اس منٹھ کی ٹیلٹھ کو پورے اٹھارہ سال کا

ہو چکا ہے۔ پاپا کی فیور بھی اس کے ساتھ ہے نا۔“

وہ دلچہ بھر کے لیے رکی۔ اس بار اس کی خاموشی عجیب سی تھی۔ افسردہ سی، تا سلف بھری۔ شاید وہ کچھ مزید

وقت اسی خاموشی میں گزار دیتی مگر موبائل کی بپ نے پھر اسے الٹ کر دیا تھا۔

”سفیر نے دوبارہ SMS کیا ہے۔“ وہ ایک بار پھر موبائل چیک کرتے ہوئے اونچی آواز میں مریم

کو مطلع کر رہی تھی۔

مریم اب بالکل ہی لائق ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ ویسے بھی تھوڑا سا سفر ہی باقی رہ گیا تھا۔ اس نے ماہین

عرف ماہی کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالنا شروع کر دیا۔ کچھ سفر ماہین کے رشتہ داروں

کے تعارف میں گذر رہا تھا کچھ اس کے ”فرینڈز“ کے تعارف میں گزر گیا۔

”تم سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ تم میرے گھر ضرور آنا۔ میرا بھائی تم سے مل کر بہت خوش ہوگا۔ وہ

فادر کی فرم میں کام کر رہی ہوں۔ میں تو کہتی ہوں سب لڑکیوں کو جاب کرنی چاہیے۔ اس دور میں سب لوگوں کا انڈیپنڈنٹ ہونا بہت ضروری ہے۔“

وہ خود ہی سوال کر رہی تھی اور خود ہی جواب بھی دیتی جا رہی تھی۔

”ان فیکٹ ہماری فرم ابھی بہت وسیع پیمانے پر کام نہیں کر رہی۔ خرم بہت ہارڈ ورکنگ اور ٹیلنٹڈ ہے۔ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہے اسے پورا کر کے ہی چھوڑتا ہے، اس لیے میں بہت ہو پفل ہوں کہ ہم جلد بہت آگے آجائیں گے۔ ویسے بھی میں تو کام کے سلسلے میں آج کل کچھ غیر سنجیدہ ہوتی جا رہی ہوں۔“ وہ دلچہ بھر کے لیے رکی۔ اپنے پرس میں سے ایک ننھا سا آئینہ اور لپ اسٹک نکال کر میک اپ درست کرنے لگی۔ مریم کو از حد کوفت ہوئی۔ اس کا پالا ایک عجیب و غریب ”چیز“ سے پڑا تھا۔

”یار سچ بتاؤں۔۔۔۔۔ نیکسٹ انیر میری شادی ہو جائے گی پھر مجھے لندن چلے جانا ہے۔ ٹوبان وہاں ہوتا ہے نا۔ میں تب تک ہی جاب کر پاؤں گی جب تک وہ آئیں جاتا۔ اس کے بعد کیا کرنا ہے یہ میں لندن جا کر ڈیپانڈ کروں گی۔ سنا ہے وہاں پہ کام کرنا بہت ضروری ہے ورنہ گزرا نہیں ہوتا۔ خیر جو کام کل ہوتا ہے اس کے بارے میں فکر مند بھی کل ہی ہونا چاہیے۔ تم بتاؤ تمہاری انجمنٹ وغیرہ ہوئی ہے ابھی تک یا نہیں۔ ویسے اتنی کیوٹ لگ رہی ہو آئی ایم شیور تم بھی ”بک“ ہو چکی ہوگی۔“

وہ پھر سے شروع ہو چکی تھی۔ مریم بس ”ہوں، ہاں“ کرتے ہوئے اسے سننے چلی جا رہی تھی۔

”تمہارا تعلق بھائی پھیرو سے ہے نا تم وہیں سے کوچ میں بیٹھی تھیں نا، کیا شہر ہے یہ؟ ساہیوال تو قسم سے بہت ہی بورنگ جگہ ہے۔ اتنی ڈل لائف ہے وہاں کی۔ میں تو آکتا جاتی ہوں مگر میرے خیال والے سمجھتے ہی نہیں اصرار کیے جائیں گے کہ آؤ آؤ اس لیے مجبوراً مجھے جانا پڑتا ہے۔ ویسے سب کزنز مجھے پیار بہت کرتے ہیں خصوصاً اطہر وہ میرا ہم عمر ہے۔۔۔۔۔ آئی ٹی میں ماسٹر ز کر رہا ہے۔ طارق بھی اسی کا کلاس فیلو ہے۔“

وہ پروفیشن سے فیلو ریلیشن شپس تک آگئی تھی۔ مریم نے آکتا کرکھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

اسے پتا چل گیا تھا کہ اس کے بولنے کے چانسز بہت ہی کم ہیں۔ لاہور کے قریب پہنچنے تک وہ اپنے آدھے

خاندان کا غائبانہ تعارف کروا چکی تھی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس کی ساری گفتگو میں ماں باپ کے علاوہ سب

رشتہ داروں کا چیدہ چیدہ ذکر آچکا تھا۔ اسی دوران اس کے موبائل کی بپ بجنے لگی۔

”اوہ۔۔۔۔۔ ٹوبان کی کال ہے۔“ اس نے پرس میں سے موبائل نکال کر CLI پر نمبر چیک کر کے خوشی

سے کہا۔ اگلے چندر منٹ تک وہ ٹوبان سے باتیں کرتی رہی۔

”آئی مس یو ٹوبان۔“ خدا حافظ کہنے سے پہلے اس نے موبائل کے ماؤتھ پیس کو ہونٹوں سے لگا کر

کہا۔

”لا حول ولا قوۃ۔“ مریم بھری کوچ میں اس حرکت پر شرمندگی سے جڑبڑھوتے ہوئے بڑبڑائی۔

”ٹوبان کی جان ہے مجھ میں۔۔۔۔۔ بہت محبت کرتا ہے مجھ سے۔“

ماہین نے مریم کی معلومات میں اضافہ کیا۔

کہتا ہے کہ یہ لڑکوں کی ہمت ہے کہ وہ مجھ جیسی دوست برواشت کر لیتے ہیں ورنہ کوئی لڑکی تو کبھی میری دوست بننے پر تیار نہ ہو۔ اب میں اسے جا کر بتا دوں گی میں نے ایک بہت اچھی لڑکی کو دوست بنایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حیران ہو جائے گا۔“

اس کی مطلوبہ جگہ پر پہنچ کر ماہین نے کہا تھا۔ یہ آخری بات تھی۔ جو مریم نے سنی۔ وہ اسے خدا حافظ کہے بنا کوچ سے اتر گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

”السلام علیکم..... کیسی ہیں آپ سسز؟“ ڈاکٹر عادل ایک دم اس کے سامنے آئے۔ یہ ان کی بہت اچھی عادت تھی۔ کہ وہ سلام میں ہمیشہ پہل کرتے تھے جبکہ مریم نے انہیں دیکھتے ہی راستہ بدل لینے کی عادی تھی اب بھی ان کے سلام کے جواب میں اس نے چہرے پر مسکراہٹ سجا کر ”علیکم السلام“ کہا اور آگے کی سمت بڑھ گئی۔ ڈاکٹر عادل کا آج کل کسی نئی میڈیکل آفیسر کے ساتھ زبردست انفریئر چل رہا تھا اور نگہت کے پاس اس انفریئر کی لمحہ بے لمحہ رپورٹ ہوتی تھی۔ جس طرح وہ تفصیل سے مریم کو یہ سب بتاتی تھی اس سے تو ایسا لگتا تھا جیسے ڈاکٹر عادل کا انفریئر خود اس کے ساتھ چل رہا ہے، مریم ڈاکٹر عادل کو نظر انداز کرتے ہوئے سرجن مرتضیٰ کے کیمین کی سمت چل دی۔ کیمین کے قریب پہنچ کر اس نے گہری سانس بھری اور پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ خنکی کا ایک لطیف احساس اس کے رگ و پے میں اتر آیا۔ کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا مگر کھڑکیاں کھلی تھیں جن سے ٹھنڈی ہوا کی سیج قدم اٹھا کر آ رہی تھی۔ موسم کچھ برا آلودہ ہو چلا تھا۔ اسے وہاں بیٹھے ابھی پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہا ایک نسوانی ہنسی کی مترنم آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ اس نے حیرانی سے چار جانب دیکھا مگر کمرے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ ابھی وہ اس ہنسی کو اپنا وہم سمجھ کر ذہن سے جھٹکتے ہی والی تھی کہ ایک بار پھر وہی ہنسی سنائی دی۔ چند لمحوں بعد ریٹائرنگ روم کا دروازہ کھلا اور سرجن مرتضیٰ باہر آئے گھرے ڈریس پینٹ کے ساتھ لائٹ میروں رنگ کی شرٹ پہنے اپنے اونچے لمبے سر اپنے کے ساتھ وہ بہت سچ رہے تھے۔ بلاشبہ وہ نہایت شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ سرجن تھے مگر کسی بھی ڈاکٹر سے کم عمر دکھائی دیتے تھے۔

”السلام علیکم سر! کیسے ہیں آپ؟“ مریم نے مسکرا کر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے انہیں سلام کیا۔ ”علیکم السلام..... الحمد للہ خیریت سے ہیں اور آپ؟“ وہ اپنے مخصوص شفیق سے انداز سے دریافت کرنے لگے۔ پیرامیڈیکل اسٹاف سے لے کر آرتھوپڈک وائرڈ کے تمام چھوٹے بڑے ڈاکٹر زبان کے رعب میں تھے مگر یہ رعب و دب کہیں ان کے لہجہ پر حاوی نہیں ہوا تھا۔

”ڈاکٹر نائلہ نے عباس رضوی کی فائل بھجوائی ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ عباس صاحب کی ڈسچارج شیٹ پر سائن کرو دیجئے۔“

اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل کو ان کی میز پر رکھتے ہوئے ڈاکٹر نائلہ کا پیغام دیا۔ جب سے اختر کو ڈانٹ پڑی تھی سب ہی لوگ محتاط ہو گئے تھے۔

”اتنی جلدی میں کیوں ہیں مریم! اطمینان سے بیٹھ کر بات کیجئے۔“

سرجن مرتضیٰ نے ریو الونگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ تو گئی مگر ریٹائرنگ روم کے ادھ کھلے دروازے سے نظریں ہٹانے میں پائی تھی۔ اس نے واضح طور پر سفید کپڑوں میں ملبوس کسی لڑکی کی جھٹک دیکھی تھی۔ سرجن مرتضیٰ نے عباس رضوی کی فائل پیک کرنا شروع کر دی تھی جو بے حد تلی بخش تھی۔

”مریم!“ سرجن مرتضیٰ نے میز کی سطح کو انگلی سے بجا کر اسے متوجہ کیا۔ اس کا سارا دھیان ریٹائرنگ روم کی جانب تھا۔

”آریو اوکے.....؟“ وہ اپنے مشفق انداز میں پوچھنے لگے۔ ”وہ..... وہاں کوئی ہے؟“ اس نے عجب بے یقینی میں گھر کر کہا۔ کیونکہ سرجن مرتضیٰ اس بات کو مانڈ بھی کر سکتے تھے۔

”وہ نگہت ہے..... میرے ریٹائرنگ روم کا کارپنٹ بہت گرد آلود ہو رہا تھا۔ وہ کارپنٹ صاف کر رہی ہے۔“

سرجن مرتضیٰ نے مریم کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے وضاحت دی۔ ”نگہت..... نگہت..... بس کرو بھیجی، بہت ہو چکی ڈسٹنگ باہر آؤ۔“ انہوں نے آواز دے کر اسے باہر بلایا۔

نگہت باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں سچ جج جھاڑو تھی۔ وہ ویکيوم سے صفائی کرنے کے بجائے جھاڑو سے صفائی کر رہی تھی۔

”سرجن مرتضیٰ نے کبھی کسی خاکروب سے اپنے کمرے کی صفائی نہیں کروائی کیونکہ انہیں تو روم میں نماز بھی پڑھنی ہوتی ہے اور ان کے روم میں قرآن کریم بھی رکھا ہے اس لیے یہاں کی صفائی ہمیشہ میں کرتی ہوں۔“

مریم کے استفسار کی نوبت بھی نہیں آئی تھی اور نگہت خود ہی صفائی دینا شروع ہو گئی تھی۔ مریم نے دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا۔

سرجن مرتضیٰ نے فائل پر سائن کیے تو وہ ڈاکٹر نائلہ کے کیمین کی طرف چلی آئی ریسپشن کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے ڈاکٹر عادل کو تڑپنے کے پاس کھڑے دیکھا۔ اس نے نگہت کے علاوہ ڈاکٹر عادل کے بارے میں کبھی کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی، بلکہ نگہت سے بھی دو ایک باری بات ہوئی تھی اور ان دو ایک بار کی بات نے ہی مریم کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ روہینہ سے مریم کی ایسی خاص دوستی تھی مگر تڑپنے کو سمجھنا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی۔ اس نے سوچا تھا ہاسٹل جا کر تڑپنے سے تفصیلی بات کرے گی مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ ہاسٹل واپس پہنچی تو تڑپنے الماری میں منہ گھسائے نجائے کیا تلاش کر رہی تھی۔ وہ مریم سے کچھ دیر پہلے ہی ہاسٹل واپس آئی تھی۔

”کیا کر رہی ہو؟“ مریم نے بستر پر بیٹھ کر جوتے کے تسمے کھولتے ہوئے سرسری لہجے میں دریافت

کیا۔

ترتین کو شاید مریم کی کمرے میں آمد کے بارے میں پتا نہیں چلا تھا اس لیے وہ کچھ چونک سی گئی۔

”یار میں گھر جا رہی ہوں اتنی کاٹون آیا تھا وہ مجھے بلا رہی ہیں۔“ ترتین نے لحد بھر کے لیے الماری

میں سے منہ نکال کر جواب دیا۔

”خیریت؟“ ترتین کے گھر سے ایسے بلاوا آنا کچھ اجنبی کی بات تھی۔

”میں نے خود فون ریسو نہیں کیا۔ ریسپشن پہ شبیر بھائی تھے۔ انہوں نے پیغام نوٹ کر لیا تھا۔ مجھے

بس یہی پتا چلا کہ وہ مجھے یاد فرما رہی ہیں۔“

وہ خاصے اکتائے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ جب سے اس کی امی نے اس کی بڑی بہن کی

زبردستی شادی کی تھی۔ ان کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں طنز نمایاں ہوتا تھا۔

مریم اس کے ساتھ مل کر پکنگ میں مدد کرنے لگی۔ اس کے چلے جانے کے بعد مریم نے یونیفارم

تبدیل کیا اور کمرے میں بکھرا ہوا پھیلا واسٹینے لگی۔ ترتین جا چکی تھی اور روبینہ سے یہ توقع رکھنا ہی فضول تھا کہ وہ

کمرے کی صفائی وغیرہ جیسے کسی کام کو ہاتھ لگائے گی۔ مریم نے پہلے بستر درست کیا پھر ترتین کے بستر کی طرف

آگئی۔ اس کو ٹھیک کرنے کے بعد روبینہ کا بیڈ کو درست کیا، ٹیکے کی پوزیشن درست کر کے ہوتے ہوئے اسے ایک جھکیلی سی

چیز نظر آئی۔ روبینہ کو اپنی رسٹ وچ ٹیکے کے نیچے رکھ کر سونے کی عادت تھی اسی لیے وہ اکثر اوقات اپنی رسٹ وچ

لگاتا ہی بھول جاتی تھی۔ مریم نے اس رسٹ وچ کو ہاتھ میں تھام لیا۔ اس قدر قیمتی رسٹ وچ کاروبار کے پاس ہونا

کوئی حیران کن بات نہیں تھی۔ اس کے پاس اب ایسی بہت سی قیمتی اشیاء کا انبار رہنے لگا تھا اس کا حلقہ احباب بے حد

وسیع تھا اور اسے ایسے شاندار گفتگوں ملنے ہی رہتے تھے۔

مریم اس رسٹ وچ کو بے حد قیمتی خیال کرتے ہوئے میز پر رکھنے سے ہچکچا رہی تھی۔ اس نے کچھ

سوچ کر روبینہ کی الماری کا دروازہ کھول لیا۔ رسٹ وچ رکھتے ہوئے اس کی نگاہ ایک چھوٹے سے پیکٹ

پر پڑی۔ وہ اتنی احتیاط سے چھپا کر پکڑوں کی تہہ کے نیچے رکھا گیا تھا کہ مریم تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود کو اس

پیکٹ کو دیکھنے سے روک نہیں پائی۔ اس پیکٹ کے اندر موجود چیز کو دیکھ کر مریم کو بے حد شاک لگا۔

”مخصوص گولیاں“ تھیں جو آدھی استعمال کی جا چکی تھیں۔ ایک غیر شادی شدہ لڑکی کی الماری میں

ان کی موجودگی نے مریم کے حواس گم کر دیے تھے۔

”کیا نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے؟“ اس نے انتہائی تاسف میں گھر کر خود سے کہا۔ خود ترتین نے

روبینہ کی معنی والے جھوٹ کے بعد اسے بار بار نصیحت کرنے کی کوشش کی مگر روبینہ اس قدر خود مر ہو چکی تھی کہ اب

نصیحتیں اس پر اثر نہیں کرتی تھیں۔ مریم اس سے کچھ بھی کہہ کر اپنے ہاتھوں اپنی ذلت کا سامان نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے وہ گولیاں دوبارہ اسی جگہ رکھ دیں اور الماری کو پہلے کی طرح بند کر دیا۔

”روبینہ بری لڑکی نہیں تھی۔ بد قسمتی سے اس کی دوستی بری لڑکیوں سے ہو گئی۔ اس کے گھر کے

حالات بھی کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ وہ سہیلیوں کی چچی چڑی باتوں میں آکر ساری حدیں پار کرتی چلی گئی۔“

ترتین کی واپسی پر جب مریم نے اسے اشاروں کتابوں میں یہ سب بتانے کی کوشش کی تو اس کے انداز میں حیرانی کی کوئی رقع نہیں تھی۔

”تم یہ سب باتیں پہلے سے جانتی تھیں؟“ مریم نے مضطرب لہجے میں پوچھا تو ترتین نے نظر سے جدا کر

ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”ہم روبینہ کو سمجھا سکتے ہیں ترتین!“ مریم نے موہوم سی امید میں گھر کے کہا۔

”دکس کس کو سمجھاؤ گی اور پھر تمہاری بات سمجھے گا کون؟“ ترتین نے دھیسے لہجے میں کہا۔ مریم ہکا بکا

اس کی شکل دیکھنے لگی۔

”کیا ترتین بھی روبینہ کی طرح.....“ اس سے زیادہ اس کا ذہن کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھا۔

ترتین خاموشی سے اپنے بستر پر منہ لپیٹ کر بڑ گئی۔ ترتین کا انداز بہت حوصلہ شکن تھا۔ وہ جب سے گھر سے واپس

آئی تھی عجب کشمکش کا شکار تھی ان کے پہلے سال کے امتحان بھی ہونے والے تھے۔ مریم ہر خیال کو ذہن سے جھٹکنے

کی کوشش کرتے ہوئے کتابوں میں خود کو گم کرنے کی سعی کرنے لگی۔

اگلے بہت سے دن امتحانات کی نذر ہو گئے۔ بہترین پرنسپل کے ساتھ مریم سیکنڈ ایئر میں پروموٹ

کر دی گئی اس کے ساتھ ساتھ ترتین، روبینہ، رینا، لیزا، ستارہ وغیرہ بھی پروموٹ ہو کر پارٹ ٹو میں آئی تھی،

حالانکہ بہت سی لڑکیاں پڑھائی اور کلاسز کے معاملے میں ریگولر نہیں تھیں اور یہی بات مریم کے لیے اجنبیہ کا

باعث تھی کہ جن لڑکیوں کے بارے میں قیاس کیا جاتا تھا کہ وہ ڈس کو ایفائی کر دی جائیں گی وہ اتنے اچھے

مارجن سے پاس کیسے ہو گئیں۔

سال دوم ابتدا سے ہی مشکل تھا۔ کورس میں جہاں میڈیسن، سرجری اور اخلاقیات کے مضامین کا

اضافہ ہوا، وہاں وارڈ شفٹس کا دورانیہ بھی بڑھ گیا تھا، سرخ Sash اور سفید دوپٹے کے ساتھ مریم خود کو پہلے سے

زیادہ پر اعتماد ذمہ دار محسوس کرتی تھی۔ سیکنڈ ایئر کی کلاسز شروع ہوتے ہی روبینہ نے اپنا روم تبدیل کر لیا تھا۔ اس

لیے مریم نے بھی سکون کا سانس لیا کیونکہ روبینہ کی موجودگی اسے الجھن میں مبتلا کرنے لگی تھی۔ دوسری طرف

ترتین بھی پہلے کی نسبت کافی ذمہ دار ہوتی جا رہی تھی۔ ہر وقت امیر ہونے کے خواب دیکھنے کے بجائے وہ اب

زیادہ تر خاموش رہنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس روز اس کی ڈیوٹی ای این ٹی وارڈ میں تھی۔ شدید سردی کی لہر نے پورے شہر کو ناک کان اور گلے

کے امراض میں مبتلا کر دیا تھا۔ جس روز مریم کی شفٹ تھی، اسی روز تھائی لینڈ سے آئے ہوئے جو نیئر ڈاکٹرز کی

ایک ٹیم نے بھی فری کیمپ لگا رکھا تھا، اس وجہ سے بھی آؤٹ ڈور مریضوں کا تاننا بندھا ہوا تھا۔ مریم کی شفٹ دو

سے آٹھ بجے والی تھی۔ لیج آورز کے بعد ایک چھ سال کے بچے کی ناک کی ہڈی کی میجر سرجری تھی۔ یہ اپنی

نوعیت کا منفرد سا آپریشن تھا جس میں کل ملا کر چھ جو نیئر اور سینئر سرجن اپنی اپنی مہارت کا مظاہرہ کرنے والے

تھے۔ مریم اس آپریشن کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی کیونکہ اس کی ڈیوٹی ای این ٹی کی بجائے وارڈ میں تھی،

فون بند کیا پھر بھنجلا کر بولے۔

”عورتوں کو کوئی بات سمجھنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔“

”سرجن! آپ کو؟“ میں بارہا ہے میں۔ صبر تحمل مزید خراب ہو رہی ہے۔“ ہارڈسٹرارم نے آکر کہا۔ وہ چند لمحوں قبل آپریشن تھیرے لگی تھی۔

”ڈاکٹر عادل کا نمبر ابھی بھی رسپانس نہیں کر رہا؟“ انہوں نے ثروت سے استفسار کیا۔ ثروت کا جواب نفی میں تھا۔

”او کے..... اب مجھے اپنا کام کرنا ہے..... آپ میرے گھر کا نمبر ملائیے اور میری وائف سے کہیے آئی وائٹ ٹوسی ہران دی ہاسپٹل رائٹ ناؤ۔“

وہ حکمیہ انداز میں کہتے ہوئے آپریشن تھیر کی سمت چل دیے۔ مریم اور ثروت نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

”یار! سرجن! داؤد کیسے خطی آدمی ہیں۔ میں ان کی وائف سے مل چکی ہوں..... وہ تو خود اتنی ویک ہیں، وہ کیسے بلڈ ڈونٹ کریں گی۔“ شائستہ اس دوران پہلی مرتبہ بولی۔ مریم کسی بھی رائے کا اظہار کیے بغیر ایس ٹی لیب کی سمت چل دی۔ وہاں سخاوت پہلے سے کسی کا بلڈ گروپ چیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دوران ایک ایکس بائیس سال کا لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا رنگ گندمی تھا اور اس کے سیاہ سلکی بال کندھوں تک آ رہے تھے۔ مٹلی سی ٹائٹ جینز کے ساتھ وہ سفید اور سیاہ لائٹنگ والی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی دائیں کلائی میں لیدر کی موٹی سی بربلٹ تھی، جبکہ بائیں کلائی میں قیمتی سنبری ڈائل والی رسٹ واچ تھی۔ اس شاندار قد کاٹھ والے لڑکے کی شخصیت کی سب سے مضحکہ خیز چیز اس کے نچلے ہونٹ اور ٹھوڑی کے عین درمیان میں موجود بالوں کا وہ ننھا سا گچھا تھا جسے داڑھی کہنا داڑھی کی توہین تھی۔

”ہائے..... میں سمجھ مرتضیٰ ہوں..... مجھے عادل بھائی نے بھیجا ہے۔“ اس نے مریم کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆

”تم میری بات غور سے کیوں نہیں سن رہیں؟“

مریم نے چائے کا خالی گلاس پر رکھتے ہوئے مصنوعی غصے سے سوال کیا۔ ترمین جواب دینے کے بجائے مسلسل گلاس نوچنے میں مصروف رہی۔ فضا میں ٹھیک ٹھاک خنکی تھی مگر ترمین کے اصرار پر وہ چائے پینے کے لیے لان میں آ بیٹھی تھی۔ ساڑھے دس کے قریب کا ناٹم تھا مگر گلاس ابھی سے شبخی ہو رہی تھی۔ مریم نے اوٹی شال اوڑھ رکھی تھی مگر ترمین کاٹن کا سوٹ پہنے، ڈوپٹے کو ایک کندھے پر ڈالے دنیا جہان سے بے خبر گلاس کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

”تم میری بات سن بھی رہی تھیں یا نہیں۔“ مریم اب کی بار منہ پھلا کر بولی۔ کبھی کبھی اسے ترمین کی اس مست ملنگ حالت پر تشویش ہونے لگتی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ دن کے بارہ گھنٹے اسی حالت میں گزارتی تھی مگر

مگر اس آپریشن کی وجہ سے ای این ٹی وارڈ کا سارا عملہ ہی متحرک تھا۔ سب لوگ عام دنوں کے مقابلے میں زیادہ الارٹ نظر آ رہے تھے اور مریم بھی ان سب میں شامل تھی۔

لچے آورز کے بعد چائے کا دور چل رہا تھا۔ ریسپیشن پر شیر بھائی اور شائستہ کے پاس آگئی۔ ان دونوں سے اس کی کافی اچھی علیک سلیک تھی۔ آیا اماں نے ابھی ان کے سامنے چائے کے کپ رکھے تھے کہ سرجن داؤد آتے دیکھائی دیے۔

”سسر! ڈاکٹر عادل کا نمبر ملائیے۔“ انہوں نے ثروت کی طرف دیکھ کر بجلت کہا تھا۔ ثروت ٹیلی فون سیٹ سے چکی بیٹھی تھی۔

”ڈاکٹر عادل از ناٹ آن ڈیوٹی سر“ ثروت نے نمبر ملانے کے بعد بتایا تھا۔

”ہاں میں جانتا ہوں اس کا آج آف ہے مگر پیسٹ اس کے کسی دوست کا بیٹا ہے اور میں نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ وارڈ کا وزٹ ضرور کر لے وہاں بلڈ بینک میں اونگھو نہیں ہے اور یہاں بچے کی ماں نے واویلا مچا رکھا ہے عادل ہی سنبھال سکتا ہے ان لوگوں کو، آپ پلیز عادل کے سیل کا نمبر ملائیے۔“

سرجن داؤد نے اکتا کر کہا۔ وہ اس وارڈ کے جونیئر مونسٹ سرجن تھے۔

”مجھے ایک گلاس پانی دیجئے۔“ سرجن داؤد نے مریم سے کہا۔ مریم نے فوراً گلاس میں پانی اٹھیل کر انہیں تھمایا۔

”ڈاکٹر عادل از ناٹ ریپانڈنگ سر۔“ ثروت نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ سرجن داؤد کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔ انہیں ڈاکٹر عادل کی غیر ذمہ داری پر غصہ آ رہا تھا۔ مریم ان کے چہرے کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر ہونٹ بھینچتے ہوئے انہوں نے شہادت کی انگلی سے اپنی کینٹی کو چھوا، جیسے کسی فیصلے پر پہنچ چکے ہوں۔

”ڈاکٹر شیریں جبار کا نمبر ملائیے۔“ انہوں نے ایک مشہور گانا کو لو جسٹ کا نام لیا۔ ثروت کے پاس موجود انڈیکس میں ان کا نمبر نہیں تھا۔ ڈاکٹر داؤد نے اپنی جیب سے اپنا سیل فون نکال کر ثروت کو ڈاکٹر شیریں کا نمبر نوٹ کروایا۔

”ڈاکٹر شیریں از آن لائن سر!“ ثروت نے فون ملتے ہی ریسپوران کو دیا۔

”ییس ڈاکٹر! میں سرجن داؤد، ایک پرائلم ہے۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے دوسری طرف کی بات سننے کے لیے رکے۔

”میری وائف کا بلڈ اونگھو ہے مگر دو ماہ قبل اس کا مس کیریج ہوا تھا اب وہ بالکل نارمل ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کیا میری وائف بلڈ ڈونٹ کر سکتی ہے۔ آپ کی پیسٹ ہے، اس لیے پوچھ رہا ہوں۔“ سرجن داؤد نے ایک بار پھر توقف کیا۔

پھر ٹھوڑی دیر ڈاکٹر شیریں کی بات سننے کے بعد بولے۔

”او کے ڈاکٹر ظاہر ہے، آپ زیادہ بہتر سمجھتی ہیں۔ ٹھیکس۔“ انہوں نے الجھن بھرے انداز میں

کبھی کبھی اچانک اس پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ وہ ارد گرد سے بالکل ہی بے نیاز ہو جاتی، ایسے میں مریم کو اس کی اصل حالت میں واپس لانے کے لیے بہت جتن کرنا پڑتے۔ مریم نے دو ایک بار اس سے یو جھا تھا کہ وہ کیوں بریشان ہے، مگر اس نے ہنس کر بات ٹال دی پھر مریم نے بھی مزید کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

”اے بی بی! کہاں گم ہو؟“ وہ اس کے ہنکے سر پر چپت رسید کرتے ہوئے بولی

”میں بیہوش ہوں اور تمہاری بات سن رہی ہوں۔ تم یہ کہہ رہی تھیں کہ.....“ تزئین کو مریم کی بتائی ہوئی بات کا اصل متن یاد کرنے میں کچھ توقف کرنا پڑا۔

”ہاں، تم یہ کہہ رہی تھیں کہ سرجن داؤد بہت اچھے ہیں۔ وہ دراصل انسانی روپ میں فرشتہ ہیں اور تم ان کے جذبہ ایثار سے بہت متاثر ہوئی ہو۔“

”جی نہیں..... بات فرشتے کی دریافت سے بہت آگے نکل گئی تھی۔ میں تمہیں یہ بتا رہی تھی کہ.....“

”مجھے یاد ہے مریم! تم یہ بتا رہی تھیں کہ تمہارا بھی دل چاہا کہ اگر تمہارا بلڈ گروپ سیم ہوتا تو تم فوراً سے میٹر بلڈ ڈونیت کردیتیں۔“ تزئین اس کی بات کاٹ کر بولی تو مریم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری۔

”ہاں بالکل..... قسم سے میرا اتنا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی اس کا ذخیرہ میں حصہ لے سکتی۔ سرجن داؤد کے جذبہ ایثار نے مجھے حقیقتاً بہت متاثر کیا مریم کے ذہن میں پھر سے ساری کارروائی محترک ہوئی تھی۔ وہ عام طور سے اتنی تفصیل سے بات کرنے کی عادی نہیں تھی مگر آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ تمام تر جزئیات کے ساتھ تزئین کو ہر بات بتائے۔“

”تم جی جی پاگل ہو مریم!“ تزئین اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی پھر اس کی خاموشی کا فائدہ اٹھا کر مزید گویا ہوئی۔

”اس فیلڈ میں جذباتی ہو کر کام کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہاں ہر روز سینکڑوں ایسے مریض آتے ہیں جنہیں خون کی ضرورت ہوتی ہے تو کیا سب ڈاکٹر ز اپنا م خون دینا شروع کر دیں یا پھر پیرامیڈیکل اسٹاف اس جہاد میں حصہ لینے لگے۔ میرا ذالی.....“

”تم خاموش رہو تو بہتر ہے اور جس چیز کو تم جذباتیت کہہ رہی ہو اس چیز کو میری زبان میں انسانی ہمدردی کہتے ہیں۔“

مریم اس کی بات کاٹ کر بولی۔ تزئین مسکرا دی پھر شرارتی انداز میں اسے دیکھ کر بولی۔

”تم سرجن داؤد سے زیادہ ہی امپریس نہیں ہوتی جا رہیں۔ ان کے خلاف کبھی گئی کوئی بات تمہیں اتنی بری لگتی ہے کہ تمہارا چہرہ ای لٹک جاتا ہے۔ خیر تو ہے؟“

مریم اس کی پشت پر دھب رسید کرتے ہوئے بولی۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی برا آدمی بھی بلڈ ڈونیت کرے تو تم اس کی بھی عزت کرنے لگو گی اور عزت کروانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان خون دینے کا حوصلہ رکھتا ہو۔“

تزئین ابھی بھی تنگ کرنے کے موڈ میں تھی مگر اب کی بار مریم مسکرا دی۔

”مجھے ان سب باتوں کا نہیں پتا مگر مجھے ایسے لوگ اچھے لگتے ہیں جو انسانی ہمدردی کے تحت ہی سہی ایثار کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ سمجھ مرتضیٰ کی ہی مثال لے لو۔ میں عام حالات میں اس لڑکے کو دیکھتی تو وہ مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا، مگر اس کا یہ عمل مجھے اتنا اچھا لگا کہ وہ لڑکا میری نظر میں خود بخود اچھا ہو گیا۔“

مریم مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ تزئین کو ساری گفتگو میں شاید پہلی بار دلچسپی محسوس ہوئی۔

”اچھا..... انٹریٹنگ..... ہائی داؤدے سمجھ مرتضیٰ میں ایسی کیا برائی تھی کہ وہ تمہیں عام حالات میں اچھا نہ لگتا؟“ تزئین متحسّس ہوئی۔

”استغفر اللہ..... میں نے یہ نہیں کہا کہ اس لڑکے میں کوئی برائی تھی..... بس مجھے اس طرح کے لڑکے اچھے نہیں لگتے۔ اس لڑکے کا قد کاٹھ تو اچھا تھا۔ رنگ انتہائی گورا۔ کندھوں تک آتے سکی بال اور سب سے دلچسپ چیز اس کی ٹھوڑی پر موجود داڑھی جیسی کوئی چیز تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے پیٹنسل سے دائرہ بنا دیا ہے۔ پہلے میں سمجھی کہ کسی پرائیویٹ روم کا وزیٹر ہے مگر جب اس نے بتایا کہ وہ بلڈ ڈونیشن کے لیے آیا ہے تو مجھے بہت ہی حیرانی ہوئی۔“

مریم نے لمحہ بھر کا توقف کیا پھر تزئین کی رائے کا انتظار کیے بغیر بولی۔

”ایک مزے کی بات بتاؤں اس کے ہاتھ بالکل لڑکیوں جیسے تھے۔ لمے اور نازک سے جب میں نے اس کے ہاتھ پر ڈرپ پن وغیرہ سیٹ کی تب ہی دیکھا تھا۔ اس نے اٹھلیوں میں سنہری اور سیاہ رنگز پہن رکھے تھے۔ کلائی میں برہ سلت بھی تھا۔“

مریم بات کرتے کرتے ذرا کی ذرا کی تھیر سے تزئین کی جانب دیکھا جو ٹٹکی باندھے مسکراتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”تم مجھے گھور کیوں رہی ہو؟“ اس نے آنکھیں سکیڑ کر سوال کیا۔

تزئین ایک بار پھر مسکرائی۔

”میں تمہیں گھور نہیں رہی، بلکہ بغور تمہاری باتیں سن رہی ہوں۔ تم نے پہلے تو کبھی کسی لڑکے کے بارے میں اتنی تفصیل سے بات نہیں کی۔“

وہ ملا۔ سخت سے ہنستے ہوئے بولی۔

”لڑکا؟ وہ بالکل بھی لڑکا نہیں تھا۔ یقین کرو اگر اس کے چہرے پر ٹھوڑی کے اوپر داڑھی کے بھایا جات موجود نہ ہوتے تو میں اسے ”مسٹر سیج“ کے بجائے ”مس سیج“ کہہ کر مخاطب کرتی۔“

مریم کے اس طرح کہنے پر تزئین خوب ہنسی۔

”تم نے اس لڑکے کا فون نمبر کیا؟“ وہ ہنستے ہوئے پوچھنے لگی۔

”ارے..... میں کیوں لیتی اس کا فون نمبر۔“ مریم نے اسے گھورا۔

”یار! میرے لیے لے لیتیں۔ میرا کوئی چانس بن جاتا۔“ وہ مصنوعی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے

بولی۔ مریم نے اسے ایک اور دھپ رسید کی۔ تزئین کو اس طرح کی اوٹ پناگ باتیں کرے گا بہت شوق تھا۔
”اب دوبارہ کہاں ملے گا ایسا سناٹا لڑکا! جاؤ مریم تم تو بالکل بھی کام کی لڑکی نہیں ہو۔“

وہ مسلسل بولی۔

”ڈاکٹر عادل رحیم کے ریفرنس سے آیا تھا۔ تم ان سے اس لڑکے کا کنٹیکٹ نمبر لے لینا۔“

مریم نے تجویز دی۔

”آہاں..... پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے یار! ان سے تو میں خود ہی لے لوں گی۔“

تزئین مصنوعی عنیدگی سے کہہ رہی تھی، مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ مریم ابھی مزید کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اسے بیون اپنی سمت آتا دکھائی دیا۔

”تزئین باجی! تہا ڈافون اے؟“ (تزئین باجی آپ کا فون ہے) اس نے قریب آ کر اطلاع دی تھی۔

”کس کا ہے؟“ تزئین اطمینان سے پوچھا۔

”گوجرانوالہ توں تہا ڈی ماں جی دا۔“ (گوجرانوالہ سے آپ کی امی کا)

”انہیں کہہ دو میں ہاسٹل میں نہیں ہوں۔ میری ٹائٹ شفٹ ہے آج۔“ تزئین نے سابقہ پرسکون انداز میں کہا۔ بیون کو شاید ایسے احکامات آگے پہنچانے کی بہت پریکٹس تھی، اس لیے وہ خاموشی سے واپس چل دیا جبکہ مریم نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

”ابھی کوئی سوال مت پوچھنا مریم! میں تمہیں اپنے رویے کی وجہ بتا دوں گی۔“ وہ سر جھکائے ہوئے کہہ رہی تھی۔ مریم خاموشی کی خاموش رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

”اپنے ہاتھ کو سیدھا کر لیں اور انگلیوں کو پھیلالیں..... شاباش..... شاباش درد بالکل بھی نہیں ہوتا۔“

کسی نے نرم لہجے میں بہت محبت سے اس کے آس پاس سرگوشی کی تھی۔ اس نے گہری سانس بھر کر اپنا بایاں ہاتھ نظروں کے سامنے کیا جس کی پشت پر بینڈیج ہوئی تھی۔ وہ عجیب سی نظروں سے اپنے ہاتھ کی پشت کو تک رہا تھا، پھر دھیرے دھیرے وہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بائیں ہاتھ کی انگلیوں اور پشت پر پھیرنے لگا۔ کمرے کے نیم تاریک مگر گرم سے ماحول میں بستر پر چٹ لیٹا وہ اپنے آپ کو ایک غیر مرمی طاقت کے زیر اثر محسوس ہو رہا تھا، ایک بیٹھا سانس ابھی بھی اسکے ہاتھ کی پشت پر تھا۔

سفید دوپٹے کے بالے میں چھپا ہوا چاند چہرہ، چھوٹا چھوٹا کرتی براؤن زلفیں پھر اس کا وہ اپنا اپنا نہایت بھر انداز، نہایت نفاست اور محبت سے ڈرپ پن سیٹ کرنا، اسے ننھا سا بچہ سمجھتے ہوئے محبت بھری تلقین کرنا۔ سب سے اب تک کچھ بھی بھلا نہیں پار ہا تھا، حالانکہ ہاسٹل سے واپس آئے ہوئے اسے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔

وہ بیٹن کے مطابق پاپا سے ملنے آیا تھا۔ پاپا اپنے کیمپن میں موجود نہیں تھے۔ وہ اپنی پرسنل ڈائری پاپا

کی میز پر رکھ کر عادل بھائی سے ملنے چلا آیا۔ عادل بھائی اس کے پاپا کے کوئی گھٹے اور اس سے بہت محبت سے ملتے تھے، حالانکہ پاپا نے اسے منع کیا تھا کہ وہ ان سے زیادہ نہ ملا کرے پاپا، عادل بھائی کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے، مگر پھر بھی وہ ان کی نصیحت کو نظر انداز کرتے ہوئے اکثر وہ شرمیلے عادل بھائی سے مل لیتا تھا۔ وہ اس کی مٹی کے کزن بھی تھے۔ اور سڈنی نہ جانے والے معاملے میں اور پھر بعد میں اپنے پسندیدہ جینیکٹ کے ساتھ اولیول کرنے کے سلسلے میں انہوں نے ہی اس کی مٹی کو کنوینس کیا تھا۔ عادل بھائی اپنے کیمپن میں کافی پریشان بیٹھے تھے۔

”یار! اونٹیکو کی ضرورت ہے۔ بلڈ بنک میں بھی نہیں ہے۔ کیا کروں موبائل بھی آف کر کے گھر بھول آیا ہوں۔ پریشانی ہو رہی ہے۔ داؤد سے وعدہ کیا تھا کہ میں اریج کر دوں گا۔ وہ بندہ آیا ہی نہیں یار..... حد ہے غیر ذمہ داری کی۔“

وہ مسلسل فون ملانے، جھنجھلانے اور اس سے بات کرنے میں مصروف تھے۔

”عادل بھائی! میرا گروپ اونٹیکو ہے۔“ اس نے اپنی طرف سے ان کی الجھن دور کرنے کے لیے خوشخبری دینے والے انداز میں کہا تھا، مگر وہ مزید جھنجھلا گئے۔

”ارے یار! کیوں سرجن مرتضیٰ سے ڈانٹ پڑا دانا چاہتے ہو مجھے۔ میں تو ویسے بھی ان کی گڈ بکس میں نہیں ہوں۔“

”ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا عادل بھائی۔“ وہ ان کے انداز پر مسکرا کر بولا۔ ان کے بتائے ہوئے وارڈ کی سمت آگیا اور اسی وارڈ میں اسے وہ پری ویش نظر آئی جواب مکمل طور پر اس کے حواسوں پر سوار تھی۔

اس کی عمر ابھی بمشکل انیس سال تھی مگر اپنے اونچے قد کے باعث وہ عمر سے کچھ بڑا دکھائی دیتا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ دھان پان سی حسینا سے ایسے ٹریٹ کر رہی تھی جیسے وہ کوئی پانچ سالہ بچہ ہوا۔

”ان کا نام کیا ہے؟“ اس نے اس لڑکی کے روم سے چلے جانے کے بعد پوچھا۔

”سسر مریم!“ وہ ادھیر عمر کمپاؤنڈرناک چڑھا کر بولا۔

دل ہی دل میں وہ خود بھی لفظ ”سسر“ پر چڑھا گیا۔

”کسی نرس سے محبت کرنے میں یہ سب سے نقصان والی بات ہے۔“

دوبارہ سے یہی بات یاد آنے پر وہ اونچی آواز میں بڑبڑایا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک سرساز کر رہا تھا۔ کیبل کلچر سے بہت بری طرح متاثر سمجھ مرتضیٰ پہلی نظر کی محبت کا شکار ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

”میں کوئی منفرد اور مختلف سی چیز خریدنا چاہتی ہوں۔“

تزئین نے بلا مبالغہ پانچویں مرتبہ یہی ایک جملہ دہرایا تھا۔ مریم نے اکتا کر اس کی جانب دیکھا، مگر وہ اثر لیے بغیر ایک جانب ترتیب سے ہنگ کی ہوئی شرٹس دیکھنے لگی۔

”وہ والی شرٹ دکھائیے۔“ ادھر ادھر نظر دوڑاتے شاید اسے کوئی شرٹ پسند آئی تھی۔ سیزمین نے

پھرتی سے شرٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔

”مریم! یہ کیسی ہے۔ سانو لے رنگ پر سوٹ کرے گی یا نہیں؟“

وہ شرٹ کو اٹ پٹ کرتے ہوئے مریم سے رائے لے رہی تھی۔ مریم کو شرٹ تو پسند آئی تھی مگر تزئین کے سوال کا جواب نہیں تھا اس کے پاس۔ اس نے کبھی اس طرح خریداری نہیں کی تھی۔ وہ گورے اور سانو لے کی تخصیص کے بغیر خریداری کرنے کی عادی تھی۔ ویسے بھی وہ جانتی تھی کہ اس کے مشورے کا تزئین پر کوئی اثر نہیں ہونے والا۔ گزشتہ ڈیڑھ گھنٹے سے وہ لہری مارکیٹ کے مختلف شاپنگ سنٹرز میں گھوم رہی تھیں مگر تزئین کو کوئی چیز ہی پسند نہیں آ رہی تھی۔ پہلے انہوں نے پرفیومز دیکھے تھے، پھر رسٹ وایج اس کے بعد کتابوں کی باری آئی مگر کوئی ”منفرد“ اور مختلف چیز ابھی بھی نہیں ملی تھی۔

”اس کی پرائس کیا ہے؟“ تزئین نے شرٹ کو فائل کر لیا تھا۔

”ریزن ایل پرائس ہے میم؟ آپ نے ایک زبردست پسند کیا ہے۔ کوالٹی میں شاندار اور قیمت میں بے حد کم۔ میں بیک کروا دیتا ہوں۔“ وہ قیمت بتائے بغیر شرٹ کو پیکنگ میں پائل کرنے لگا۔

”پہلے قیمت تو بتا دیجئے؟“ تزئین نے سلاز مین کے خوشامدانہ رویے کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”اولٹی ٹائن ہنڈرڈ میم۔“ وہ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا جبکہ تزئین کو چند لمحوں کے لیے چپ لگ گئی۔

”ارے یہ بہت سستی ہے۔ کوئی مہنگی چیز دکھائیے جناب۔“

تزئین نے منہ ہٹا کر کہا، بلاشبہ قیمت سن کر اسے مایوسی ہوئی تھی۔ شرٹ اسے پسند آئی تھی مگر آؤٹ آف بجٹ تھی۔ پہلے اسے پرفیوم پسند آیا تھا اور اس کی قیمت اس شرٹ سے بھی زیادہ تھی۔ وہ پہلے ہی غصے میں بھری ہوئی تھی شرٹ کی قیمت سن کر مزید غصے میں آ گئی۔

”اس شرٹ کی خوبی کیا ہے بائی داوے..... اس کو پہن کر انسان نام کروڑ لگنے لگتا ہے؟“

وہ تنک کر بولی مگر سلاز مین نے اس کے لہجے کی تختی کا برامانے بغیر ایک اور شرٹ اس کے سامنے رکھی۔

”آپ۔“ یہ دیکھ لیجئے یہ اس سیزن کا سوٹ فیورٹ کلر ہے۔ اولٹی ایٹ ہنڈرڈ روپیہز۔

مگر وہ دونوں شرٹس تزئین کی جیب کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔ وہ مایوسی سے ”تھینک یو“ کہہ کر اپنی ہی دھن میں مزی اور پیچھے آنے والی لڑکی سے ٹکرا گئی۔

”آئی ایم سوری۔“ اس لڑکی نے کندھا سہلاتے ہوئے معذرت کی..... حالانکہ غلطی اس کی نہیں تھی۔ مریم نے بھی اس صورتحال سے اکتا کر لڑکی کی جانب دیکھا اور چونک سی گئی۔ وہ لڑکی بھی شاید مریم کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

”تم..... تم..... ہم پہلے بھی مل چکے ہیں نا۔ آئی تھنک ہم پی سی میں ملے تھے بسنت ایونگ پر؟“

وہ لڑکی ذہن پر زور دیتے ہوئے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”کیسا عجیب اتفاق ہے۔ میں نے سوچا تھا ہم دوبارہ کبھی نہیں ملیں گے۔“ اس کی بات پر مریم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”تھھارے گروپ کا عطف لوگوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کی تو بعد میں خوب بے زنی ہوئی تھی اور پھر.....“

”ہم پی سی میں نہیں ملے تھے۔ ہم کوچ میں ملے تھے، ایک بار۔“ مریم نے منمننا کر کہا۔ اس کا سارا زور ”ایک بار“ پر تھا۔ ماہین عرف مائی کا اس قدر بے تکلف انداز اسے پہلی ملاقات میں بھی ہضم نہیں ہوا تھا اور اب بھی نہیں ہو رہا تھا۔

”اولس..... گڈ گاڈ..... مائی پور میموری..... یہ میرا بچپن کا پرائلم ہے شکل اور نام تو یاد رہ جاتی ہیں مگر واقعات بھول جاتی ہوں۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ تزئین بھی حیرت سے اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اتنی طرح دار اور ماڈرن لڑکی اس نے مریم کے حلقہ احباب میں ابھی تک نہیں دیکھی تھی۔

”یہ کون ہے؟ تمہاری فرینڈ؟ تم لوگ شاپنگ کر رہے ہو؟ اس شاپ سے کیا لینا ہے۔ یہاں تو خالصتا سینس کلکیشن ہوتی ہے اچھا اچھا۔ اب سمجھی کسی فرینڈ کے لیے کچھ لینا ہوگا۔“

ماہین کا وہی انداز تھا۔ زیادہ بولنا اور کم سننا۔

”یہ تزئین ہے میری دوست۔ اس کو اپنے بہنوئی کے لیے گفٹ خریدنا تھا اسی لیے۔“

اس کے خاموش ہونے پر مریم جلدی سے بولی۔ مبادا وہ پھر سے بولنا شروع ہو جائے۔ اس کی بات سن کر ماہین نے ساری توجہ تزئین کی طرف کر لی۔

”ارے یار! یہ بھائی اور بہنوئی سب ایک سے ہوتے ہیں نخریلے اور مغروران کو گفٹ مشکل سے ہی پسند آتے ہیں۔ بائی داوے کیا خرید تم لوگوں نے کچھ پسند آیا یا نہیں؟“

اس کا انداز بالکل بچپن کی سہیلیوں والا تھا۔ تزئین کی آنکھوں میں بھی حیرت تھی۔

”مے آئی ہیلپ یو اس طرف بہت اچھے کرشل پیسز ہوتے ہیں، اس طرف چلتے ہیں“

وہ خود ہی سوال کر کے خود ہی جواب دینے کے بعد آگے کی سمت بڑھی۔ مریم اور تزئین نے ایک دوسرے کی آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھا پھر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ شاپنگ سنٹر کے ہیومنٹ میں اتر کر آگے کی جانب چلتے ہوئے ماہین اس سے شکوہ کرنے لگی۔

”تم نے مجھ سے کانٹیکٹ نہیں کیا۔ میں نے تمہیں اپنا سیل نمبر دیا تھا نا۔ وہ تزئین تم کیا کرتی ہو مریم کی طرح ابھی پڑھ رہی ہو یا جناب کرتی ہو میری طرح؟“

ایک جگہ پر رکتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

”یہ میری کلاس فیلو ہے“ جواب ایک بار پھر مریم نے دیا۔ وہ تینوں اب گلاس شوکیس میں سجے کرشل کے ڈیکوریشن پیسز دیکھ رہی تھیں اس سیکشن میں حقیقتاً ایک سے ایک زبردست چیز موجود تھی۔ وہ مختلف چیزوں کو

دیکھتی دوسرا ہتی آگے بڑھتی رہیں، مگر کچھ خریدنے کی ہمت ترائین میں نہیں تھی۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کے ساتھ بھی اس کا بڑی سی رقم والا پراس ٹیگ چسپاں تھا، جبکہ ماہین ہر چیز خریدنے پر اصرار کر رہی تھی۔
”یہ باری ڈول دیکھو، کس قدر کیوٹ ہے۔“ اس نے کرٹل کی ایک نازکی گڑیا کی طرف اشارہ کیا۔ اس گڑیا کا ہر نقش اور ہر عضو نہایت مہارت کے ساتھ تخلیق کیا گیا تھا، مگر اس گڑیا کے ساتھ لگا پراس ٹیگ ان دونوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

”میں نے ٹوبان کی برتھ ڈے پر یہیں سے گفٹ پسند کر کے دیا۔ آئی ایم شیور تمہارے بہنوئی کو یہ چیز بہت پسند آئے گی۔ ایکسکیوز می اسے پیک کر دیجئے۔“

اس نے ہلڑمین کو اشارہ کرتے ہوئے کہا، جبکہ ترائین نا نا کرتی رہ گئی۔

”کیوں پسند نہیں آیا؟ یار..... میرا مشورہ مانو تو لے لو بہت کیوٹ چیز ہے۔“

وہ لا پرواہی سے بول رہی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ ترائین کی ہچکچاہٹ کا اصل محرک کیا ہے۔

”نہیں یہ بات نہیں ہے پسند تو آیا ہے عادل کو بھی بہت پسند آئے گا۔ مگر دراصل۔“

ترائین کہتے کہتے پھر خاموش ہو گئی، جبکہ مریم حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگی اتنی دیر سے اس کے ساتھ بازار میں گھومتے ہوئے اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا کہ وہ اتنی دلجمعی سے کس کے لیے گفٹ خریدنا چاہ رہی ہے۔ ہاسٹل سے نکلنے سے پہلے اس نے مریم سے صرف یہ کہا تھا کہ وہ اپنے بہنوئی کے لیے کوئی گفٹ خریدنا چاہ رہی ہے۔ مریم کو حیرت تو ہوئی تھی کہ جس بہنوئی کو وہ ہمہ وقت ”گنجابھالو“ اور ”بد صورت دیو“ کے نام سے پکارتی رہتی ہے آخر وہ اس قدر توجہ کا مرکز کیسے ہو گیا۔ اسے دکھ تو بہت ہوا مگر کچھ کہنے کی بجائے وہ ان دونوں کے ساتھ چلتی رہی پے منٹ کا مرحلہ کیسے طے ہوا اسے کچھ نہیں پتا تھا بس اس نے ترائین کو بیگ سے اپنی ساری جمع پونجی نکال کر گنتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاپنگ سنٹر سے نکل کر وہ ماہین کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں آگئیں۔ ماہین یا تو حقیقتاً بہت دوستانہ مزاج کی مالک تھی یا پھر آج وہ گھر سے بور ہو کر نکلی ہوئی تھی اسی لیے ان کے ساتھ اتنی فراغت سے وقت گزار رہی تھی۔ یہ عقدہ بھی بہر حال تھوڑی دیر بعد کھل ہی گیا

”میں نے اپنا موبائل آف کیا ہوا ہے۔ یار! محسن نے آج کل میری بہت جان کھائی ہوئی ہے۔ اسے شاید کسی عامل بابا نے کہہ دیا ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں تب ہی جب ملتا ہے، ایک ہی بات کہتا ہے ٹوبان سے قطع تعلق کرلو۔ یار! بھلا میں کیوں ایسا کروں؟ ٹوبان میری پہلی اور آخری محبت ہے اور پھر اتنا دِل آف لڑکا، میں پھٹ پھر محسن کی وجہ سے تو نہیں چھوڑ سکتی نا۔ بس میں اسی سے چھپ کر گھر سے نکلی تھی وہ ڈرائنگ روم میں آیا بیٹھا تھا میں پچھلے دروازے سے نکل کر آگئی۔ موبائل بھی اسی لیے گھر پہ چھوڑ دیا کہ مجھے کاٹیکٹ نہ کر سکے۔“

وہ نہایت اطمینان سے تفصیل بتا رہی تھی۔ ترائین اور مریم خاموش بیٹھی رہیں۔

”میں تم لوگوں کو ڈراپ کر دیتی ہوں۔“ چائے پی کر اس نے ان دونوں کو آفر کی۔ شام نے رات کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ وہ دونوں بھی لوکل وین سے جانا نہیں چاہتی تھیں اور آنور کشتہ پہ کافی پیسے خرچ ہو جاتے اسی

لیے ماہین کی آفر قبول کر لی گئی۔ مریم پیچھے بیٹھ گئی جبکہ ترائین نے اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ سنبھال لی۔ سفر کے دوران ہی فون نمبر کا تبادلہ ہوا۔ ترائین نے چند دن پہلے ہی موبائل خرید ا تھا اس نے بھی اپنا نمبر ماہین کو دیا۔ اسے مریم کی طرح ترائین سے کوئی کونٹ نہیں ہوئی تھی، بلکہ اسے وہ لڑکی کا پیسہ اور خوش اخلاق لگی تھی۔

”تم دونوں یہاں رہتی ہو؟“ ان کی منزل پر پہنچ کر ماہین نے کسی قدر تحیر سے پوچھا حالانکہ وہ ترائین سے پوچھ کر ہی یہاں تک آئی تھی۔ مریم نے اس کے سوال پر ناک چڑھا کر اس کی جانب دیکھا۔ پہلی ملاقات میں اس نے واضح طور پر اسے بتایا تھا کہ وہ ہاسٹل میں رہتی ہے۔

”ہاں..... ہم یہیں رہتے ہیں۔ تمہیں اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے؟“ ترائین نے دروازہ کھولنے سے پہلے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”نہیں حیرت نہیں ہو رہی، ان فیکٹ میرے فادر اسی ہاسٹل کے ایسپلائی ہیں۔ وہ آرتھو پیڈک سرجن ہیں۔ سرجن مرتضیٰ احسن نام تو سنا ہوگا؟“

وہ بہت سنجیدہ اور عجب لائق والے انداز میں کہہ رہی تھی جبکہ مریم اور ترائین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ بلاشبہ وہ دونوں چونکی تھیں۔

”ڈاکٹر عادل تمہارے ماموں ہیں؟“ ترائین نے پوچھا۔ وہ تجس نظر آرہی تھی۔ ماہین نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر انہیں ہاتھ ہلا کر گاڑی آگے بڑھا لے گئی۔ ترائین نے مریم کی جانب دیکھا۔ شاید اس نئی اطلاع پر تبصرہ کرنا چاہ رہی تھی مگر مریم کے چہرے پر پہلی سنجیدگی دیکھ کر اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

☆ ☆ ☆

”سرجن مرتضیٰ آپ کو اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔“ وہ آڈیٹوریم سے نکل کر کوریڈور کی سمت جاری تھی جب وارڈ بوائے نے اسے پیغام دیا۔ اس کی آج سارے دن میں کوئی شفٹ نہیں تھی اس لیے اسے اس کال پر حیرت کے ساتھ ساتھ تشویش بھی ہوئی۔ وہ گزشتہ ایک ہفتے کی تمام شفٹس کو ذہن میں دہراتی اور قیاس آرائیاں کرتی سرجن مرتضیٰ کے کمرے کی سمت چل دی۔ اس نے کس مریض کو کس طرح ڈیل کیا تھا اور اس نے کیا غلطیاں کی تھیں۔ یاد کرنے پر بھی اسے کوئی قابلِ گرفت بات یاد نہیں آئی۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرتی سرجن مرتضیٰ کے کمرے میں داخل ہوئی۔

”یہ سرجن! آپ نے مجھے بلایا تھا۔“ اس کے انداز میں غلٹ اور تشویش نے سرجن مرتضیٰ کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

”آؤ بیٹھو مریم! جلدی میں ہو کیا؟ مجھے تم سے تفصیلی بات کرنی ہے۔“ وہ اپنا سنہری چشمہ آنکھوں سے اتارتے ہوئے بولے۔ مریم ابھی شش و پنج میں تھی کہ سرجن مرتضیٰ پھر بولے۔

”تم اگر جلدی میں ہو تو میں پھر بات کر لوں گا۔ آج میں سارا دن وارڈ میں ہوں۔ نیکساس سے جو ڈاکٹرز کی ٹیم آئی ہے جس نے فری ڈائمیٹک کمپ لگایا ہوا ہے میں ان کی میزبانی کر رہا ہوں۔ اگر تم ابھی مصروف ہو تو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد آ جانا۔“

”نہیں سرجن.....! اس اوکے..... آپ ابھی بات کر لیجئے۔“ ان کے لہجے نے اسے کسی قدر مطمئن کر دیا۔

”اچھا..... تم بیٹھو تو سہی۔“ انہوں نے کرسی کی سمت اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ کر ان کی جانب دیکھنے لگی۔ لائٹ گرین شرٹ ان کے سر پہ کو بے حد وقار بخش رہی تھی۔ انہوں نے اپنے سامنے بڑے کاغذات کو ترتیب سے رکھ کر چشمہ دوبارہ سے آنکھوں پر نکال لیا۔ ان کی کپٹیوں پر چند ایک سفید بال نمودار ہو رہے تھے اور ان کے وقار میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔

”در اصل بات یہ ہے کہ میرے ایک دوست کا بیٹا ایکسڈنٹ میں کافی زخمی ہو گیا تھا۔ کافی فریکچر تھے۔ یہیں کسی ایک روم میں کچھ دن ایڈمٹ رہا تھا۔ میرا خیال ہے تمہاری بھی ایک دن ڈیوٹی رہی تھی اس روم میں، آج کل وہ ہیڈریسٹ لے رہا ہے۔ اسے ایک میڈیکل کیئر ٹیکر کی ضرورت ہے۔“

وہ رک رک کر بات کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ مریم کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ بھی لے رہے تھے۔ مریم یقیناً ان کی نامکمل بات کا کوئی رخ سمجھ نہیں پاتی تھی۔

در اصل میرا وہ دوست ایک معروف اور مصروف سیاسی رکن ہے۔ اس کی بیوی بھی ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ دونوں میاں بیوی زیادہ وقت گھر سے باہر ہوتے ہیں بچے کی مناسب دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ان لوگوں نے مجھ سے ریکویسٹ کی ہے کہ میں ایک نرس کا بندوبست کر دوں۔“

انہوں نے پھر توقف کیا اور اب کی بار مریم نے اس توقف کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔

”ان فیکٹ میں تمہیں جاب آفر کر رہا ہوں۔ رات نو سے صبح نو تک کی ڈیوٹی ہوگی۔ تمہیں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ میرے بھروسے کے لوگ ہیں تمہیں کافی ہینڈسم سیکریٹنگ لے گا اور اجازت تمہیں میں دلوا دوں گا۔“ انہوں نے اب کی بار کافی وضاحت کی تھی مگر مریم کو ان کی بات پسند نہیں آئی۔

”میں پیسے کی خاطر اس فیلڈ میں نہیں آئی سرجن۔“ وہ لہجہ کو بے شکل نارمل رکھتے ہوئے بولی۔

”نہیں، نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں تم ایک اچھی روشن خیال فیملی سے تعلق رکھتی ہو۔ پیسہ تمہارا مسئلہ نہیں..... اسی لیے تمہیں یہ ذمہ داری سونپنا چاہ رہا تھا۔ تم بہت ڈیوٹی فل ہو اور تم یہ ذمہ داری بخوبی نبھاسکتی ہو۔“

مریم کو نجانے کیوں ان کے لہجے میں عجیب سا اسرار محسوس ہوا۔

”سر! آپ گھٹت کو کیوں نہیں کہتے، وہ مجھ سے زیادہ ذمہ دار اور زیادہ ڈیوٹی فل ہے اور سب سے بڑھ کر وہ مجھ سے بہت سینئر ہے اور اس کا تجربہ مجھ سے زیادہ ہے۔ اسے اس قسم کی ڈیوٹیز ویسے بھی پسند ہیں۔“ مریم نے نرمی سے کہا۔ واضح انکار کر کے وہ سرجن مرتضیٰ کو بھی ناراض نہیں کر سکتی تھی۔

”گھٹت کو تو بہت کچھ پسند ہے مگر میرے دوست کو تم پسند آئی ہو۔“ سرجن مرتضیٰ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے نجانے کس خیال کے تحت بولتے چلے گئے۔ مریم نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”کیا مطلب؟“ اب کی بار وہ اپنے لہجے کو سخت ہونے سے بچانہ سکی۔

”در اصل بچہ بہت خمدی ہے۔ وہ اپنی ماں کے علاوہ کم ہی کسی کے ہاتھ سے کچھ لے کر کھانے پینے پر تیار ہوتا ہے اس لیے ان لوگوں کی ڈیمانڈ تھی کہ کسی کیوٹ نرس کا بندوبست کیا جائے تاکہ اس سے بچے کی دوستی بھی ہو جائے اور تیار داری بھی ہوتی رہے۔ آج کل کے بچوں کو تمہا جانتی ہی ہو کہ کھانا کھانا کھانا کھانا نہیں ہوتے کجا کہ کچھ کھانے پینے پر تیار ہوتا۔ اسی لیے میں نے تمہیں اپروچ کیا ہے تاکہ یہ پریشانی ختم ہو سکے۔“

سرجن مرتضیٰ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے مگر مریم دیر تک نہ بول سکی۔

”دیکھو، میری بات کا غلط مطلب مت لو۔ میں تمہیں گزشتہ ایک ڈیڑھ سال سے اس ہسپتال میں دیکھ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم میں کام کرنے کی، آگے بڑھنے کی لگن ہے بس اسی لیے“

انہوں نے بہت رسانیت سے کہا۔ ان کی بات میں اور ان کے انداز میں کچھ تو ایسا تھا کہ مریم غصہ کرنے کی بجائے ان کی بات پر غور کرنے لگی۔ وہ کوئی متبادل نام سوچ رہی تھی، جو اپنے بجائے سرجن مرتضیٰ کے سامنے پیش کر سکے۔ اسے یکدم لیزا کا خیال آیا جو چند دن پہلے اسے بتا رہی تھی کہ وہ کسی پارٹ ٹائم جاب کی تلاش میں ہے۔ لیزا کے علاوہ سلویا اور ساجدہ اور پھر سب سے بڑھ کر تزئین بھی ضرورت مند لڑکیوں کی فہرست میں آتی تھی اور اکثر اس کے پاس بیٹھ کر اپنی اپنی ضرورتوں کا رونا روتی رہتی تھیں۔

”آپ لیزا سے بات کیجئے سر یا پھر ساجدہ یا تزئین وغیرہ سے۔ وہ بھی میری طرح بہت ڈیوٹی فل ہیں، خاص کر تزئین وہ ہم سب میں سب سے زیادہ اچھی ہے، بلکہ وارڈ میں اک وہی لڑکی ہوتی ہے جو بچوں کو بہترین طریقے سے ہینڈل کرتی ہے۔“ اس نے اپنی دو تین کلاس فیلوز کا نام لیا۔

”تم اپنی بات کرنے کے بجائے دوسروں کی بات کیوں کر رہی ہو؟“

سرجن مرتضیٰ گویا زچ ہو کر بولے۔

”آپ دوسروں کی بات کرنے کے بجائے میری ہی بات کیوں کر رہے ہیں؟“

اس نے بھی دوبارہ جواب دیا۔ سرجن مرتضیٰ کے انداز نے اسے جرات سے بات کرنے کا حوصلہ دیا تھا۔ سرجن مرتضیٰ ایک دم ہنس دیے۔ مریم کو اس سنجیدہ صورتحال میں اس قسم کے قہقہے کی امید نہیں تھی۔

”ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔“ وہ اس کے چہرے پر مکمل ارتکاز کرتے ہوئے بولے۔ انہوں نے چشمہ ایک بار پھر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

”تم اچھی لڑکی ہو، اس لیے میں نے تم سے بات کی ورنہ یہاں لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ بہت سی ایسی لڑکیاں ہیں جو میرے ایک بار کہنے پر فوراً تیار ہو جائیں گی۔“

مریم خاموشی سے بیٹھی رہی۔ ان کی اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، جبکہ سرجن مرتضیٰ مسلسل اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

”اب میں جاؤں۔“ اس نے ان کے اس طرح سے دیکھنے پر مدہم سی آواز میں اجازت طلب کی۔

سرجن نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”تم واقعی معصوم ہو یا صرف پوز کرتی ہو۔“ وہ میز پر قدرے جھک کر بولے۔ مریم نے حیرانی سے ان کی شکل دیکھی۔ وہ نجانے اس کے ساتھ پہیلیاں بوجھنے والا یہ کھیل کیوں کھیل رہے تھے۔

”اے!..... میں تم سے مذاق کر رہا تھا۔ صرف تمہیں جانچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم اتنی ہی اچھی لڑکی ہو جتنا کہ میں نے سوچا تھا۔ دراصل مجھے تمہیں یہ پیچہ دینے تھے۔“ انہوں نے کچھ پیپرز اس کے سامنے رکھے۔

”سری لنکا میں پیرامیڈیکل اسٹاف کے بنیادی انفراسٹرکچر کے لیے ایک پندرہ روز کورس ہو رہا ہے۔ سارے جنوبی ایشیاء سے لوگ آرہے ہیں ہمارے یہاں سے بھی چند منتخب لوگوں کو بھیجا جا رہا ہے۔ مبارک ہو، تمہارا نام بھی ان لوگوں میں شامل ہے۔“

انہوں نے وہ بات بتادی جس کے لیے انہوں نے مریم کو بلایا تھا۔ مریم نے اپنی سینئرز سے ایسے کورسز کے بارے میں سن رکھا تھا اور وہ ان کورسز کی اہمیت و افادیت سے بخوبی واقف تھی۔

”میں..... مجھے..... میرا مطلب میں تو ابھی اسٹوڈنٹ نرس ہوں۔ میرا سلیکشن کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ بے پناہ خوشی پر قابو پا کر بولی۔

”تمہارا گزشتہ ریکارڈ بہت شاندار ہے مریم..... اس کے علاوہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے تم بہت ریگولر ہو، بہت ذمہ دار اور فرض شناس ہو، اسی لیے تمہیں چنا گیا ہے۔“

وہ ریو لوگ چیئر کی پشت سے کمرٹکائے اس کے خوشی سے سرخ پڑتے چہرے کو مسکراتے ہوئے بغور دیکھ رہے تھے۔ مریم کچھ کہنے ہی والی تھی کہ کمرے کا دروازہ بنا دستک کے کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔

”آؤ..... نگہت! آجاؤ۔“ سرجن مرتضیٰ ایک دم سے اپنی سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

مریم نے بھی مڑ کر دیکھا۔

”تم بہت خوش لگ رہی ہو..... خیریت؟“ وہ مریم کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں تحیر، پیشانی پر تیوریاں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”اور کیا میں پوچھ سکتی ہوں، تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو..... آج تو تمہاری شفٹ بھی نہیں ہے؟“

اس کے لہجے میں عجیب سا طنز گھلا ہوا تھا۔

”مجھے ایک کام تھا اسی لیے میں نے بلوایا تھا۔ سری لنکا والے کورس کے لیے مریم کو سلیکٹ کیا گیا ہے۔“

سرجن مرتضیٰ نے نگہت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مریم کو؟ مگر مریم تو..... میرا مطلب ابھی تو یہ سینڈ ایر میں ہے اس کورس کے لیے تو وارڈ سسٹرز کو سلیکٹ کیا جا رہا تھا اور مریم تو ابھی اسٹوڈنٹ نرس ہے۔“

اس کی ساری توجہ مریم کے بجائے سرجن مرتضیٰ کی طرف مبذول تھی۔

”ہاں..... تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر کبھی کبھی وارڈ سسٹرز سے کوتاہی ہو جاتی ہے تو پھر اس کا ازالہ کرنے کے لیے اسٹوڈنٹ نرس کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔“ سرجن مرتضیٰ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا مگر ان کی مسکراہٹ اور الفاظ میں عجیبی کاٹ تھی جسے مریم ہوش جذبات میں محسوس بھی نہیں کر پاتی تھی۔

”آپ جاسکتی ہیں مریم!“

سرجن مرتضیٰ نے اسے جانے کا عندیہ دیا۔ اور وہ ان پیپرز کو اٹھا کر دروازے کی سمت چل دی۔

”یہ سب آخر ہو کیا رہا ہے؟“ عقب میں اس نے نگہت کی غراتی ہوئی آواز سنی تھی۔

☆ ☆ ☆

”کیا کر رہی ہو؟“ نگہت دروازے کے پتوں بچ کھڑی پوچھ رہی تھی۔ مریم نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا پھر بڑاشت سے مسکرائی۔

”شکر ہے! تمہاری شکل تو نظر آئی۔“ وہ نگہت کے چہرے پر پھیلی ہوئی بیزاری و غلطی کو محسوس کیے بغیر کہنے لگی۔ اس کی بات سن کر نگہت کے چہرے پر استہزائیہ ہنسی نے ذرا کی ذرا جھلک دکھائی۔

”کیوں، خیریت؟ اتنا مس کر رہی نہیں مجھے؟“ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے قریب آگئی۔ مریم نے بستر پر پڑے سفری بیگ کا رخ بالکل اس کی جانب کر دیا۔

”ہاں نا..... یہ دیکھو، میں نے یہ سب سامان رکھا ہے۔ مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے کون سی چیزیں ساتھ لے جانا چاہئیں۔ میں تو کنفیوز ہو گئی ہوں۔“

وہ بے چارگی سے کہہ رہی تھی۔

”اوہ..... اس کا مطلب، تم نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ نگہت نظریں گھماتے ہوئی بولی۔ اس کا انداز مریم کے لیے کسی قدر اجنبی تھا۔ مریم نے نا سمجھی کے انداز میں اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔

”آئی مین تم سری لنکا کے ٹور پر جا رہی ہو؟“ نگہت نے ایک اور سوال کیا۔

”ہاں یار..... تب ہی تو یہ پھیلاوا پھیلا کر بیٹھی ہوں۔“ مریم نے نفاس سے تہہ کر کے رکھا ہوا ایک اور سوٹ بیگ میں ٹھونسا۔ وہ بہت خوش اور بہت مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔

”بائی داؤے تمہارے گھر والوں نے اجازت دے دی؟“ اس کا انداز خاصا طنز یہ تھا۔

”ہاں، دے دی۔ ابو جی تو بخوشی رضامند ہو گئے تھے، بس حیدر دواویلا کر رہا تھا مگر میں نے کوئی پروا نہیں کی۔ ایسا چانس روز روز نہیں ملتا۔“ وہ بات کرتے کرتے الماری کی جانب چل دی اور ضرورت کی دوسری چیزیں نکال کر ایک شا پر بیگ میں رکھنے لگی۔

”چانس؟“ نگہت نے استفہامیہ انداز میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ساری گفتگو میں پہلی مرتبہ مریم نے ٹھنک کر اس کی طرف دیکھا پھر سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”نگہت! مجھے لگتا ہے، تم نے آج چائے نہیں پی اسی لیے سست ہو رہی ہو۔ میں ذرا اس پیکنگ سے فارغ ہوں پھر مل کر چائے پیتے ہیں، میں نے بھی ابھی تک چائے نہیں پی۔“

”تو آج چائے نہیں پی اسی لیے سست ہو رہی ہو۔ میں ذرا اس پیکنگ سے فارغ ہوں پھر مل کر چائے پیتے ہیں، میں نے بھی ابھی تک چائے نہیں پی۔“

فادریغ ہولوں پھر مل کر چائے پیتے ہیں، میں نے بھی ابھی تک چائے نہیں پی۔“

شاہر کو گرہ لگا کر بیک میں رکھنے لگی۔ میز کے ایک کارنر پر اس کا ٹوٹا ہوا برش اور پیسٹ وغیرہ پڑے تھے۔ وہ انہیں اٹھانے کے لیے نگہت کی دائیں جانب سے گزر رہی تھی کہ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ نگہت کی گرفت میں عیب نہ تھی۔ سریم نے حیرانی سے اس کی شکل دیکھی۔

”کافی ہو چکا مریم! اب بس کرو..... بتا دو مجھے کہ یہ چکر کتنے دن سے چل رہا تھا اور مرتضیٰ نے اس ٹور کے بدلے تم سے تمہارے علاوہ مزید کیا ڈیمانڈز کی ہیں؟“ اس کے لہجے میں عجیب سی تھکن اور الفاظ میں کاٹ تھی۔ نگہت کے منہ سے سرجن مرتضیٰ کے لیے صرف ”مرتضیٰ“ سننا بھی مریم کے لیے کافی اچنبھے کا باعث تھا۔

”تم..... تم کسی باتیں کر رہی ہو نگہت..... مجھے.....“

”بس، بہت ہو چکا مریم۔“ وہ مریم کی بات کاٹ کر غرائی۔

”اب یہ مت کہنا کہ تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تمہارا یہ ڈیالگ بہت پرانا ہو چکا ہے۔ بہتر ہو گا کہ اب اس معصومیت کے جوئے کو اتار بیٹھو..... بہت برداشت کر لیا میں..... تم کیا سمجھتی ہو نگہت کوئی دودھ جیتی بنی ہے نہ تم؟ بد وقت بنا لوگی۔ مجھے چلانا اتنا آسان نہیں ہے مریم! اب مجھے بتاؤ کہ تم نے مرتضیٰ کو کس حد تک اپنی منہی میں کیا ہوا ہے۔ وہ فیض جو صرف زیرِ ندامت کی تسبیح پڑھتا تھا وہ اب تمہارے نام کی مالا کیوں چبنے لگا ہے۔“ اس کے انداز میں اس قدر تصحیک تھی کہ مریم اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی۔

”یہ بات میں ابتدا سے جانتی تھی کہ مرتضیٰ تمہیں پسند کرتا تھا۔ میں نے سوچا کوئی بات نہیں لڑی اچھی ہے اور اچھی چیز ہر کسی کو اچھی لگتی ہے مگر میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ اچھی چیز مجھے ری پلٹیں کر دے گی۔“

وہ چپا چپا کر بول رہی تھی۔ مریم نے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔

”خدا کے واسطے نگہت چپ ہو جاؤ، تمہاری یہ بکواس مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تمہیں میری عزت کا پاس نہیں نا سہی مگر سرجن مرتضیٰ تو تمہارے لیے قابلِ عزت ہیں نا۔ ان کا ہی احساس کر لو۔“

”میں کیوں کسی کا احساس کروں۔“ نگہت نے اس کی بات کاٹی۔

”میں کسی کا احساس نہیں کروں گی اور یہاں کون ایسا ہے جس کی میں عزت کروں۔“

”تم اپنی مثال لے لو۔ اتنی بڑی کانفرنس کے لیے کسی عام سی اسٹوڈنٹس کال سلیکشن کسی کرم نوازی کے بغیر تو نہیں ہوا ہو گا اور پھر مرتضیٰ کو میں تم سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ فیض تو مطلب کے بغیر کسی کے سر پر ہاتھ نہ رکھے۔“ نگہت کی سانس بے تحاشا پھول رہی تھی مگر اس کے غیض میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ مریم کی آنکھ سے جھرجھرائی نہ ہوئی۔ اس کے خیال میں نگہت کا دماغی توازن خراب ہو گیا تھا۔

”اس کورس میں شرکت کے لیے مجھے سلیکٹ کیا جانا تھا۔ مجھے اس کے بعد آرٹھو پیڈک میں ہی ایڈیشنل تزیین کرنی تھی۔ مرتضیٰ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ میرا ہی نام دے گا اور جیئر میں تک پہنچائے گا مگر پھر بیچ میں تم آ گئیں اور میرا نام واپس لے لیا گیا۔ مرتضیٰ.....“

اس کی بات ابھی نامکمل تھی کہ ترنم کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں کچھ شاہر بیگز پکڑے

ہوئے تھے۔ وہ اندر کی صورت حال سے بالکل بے خبر تھی اس لیے ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے وہ ان دونوں کی سمت بڑھی تو مریم کے بہتے آنسوؤں نے اسے حیران کر دیا۔ نگہت کے چہرے کے تاثرات بھی کچھ نارمل نہیں لگ رہے تھے۔

”تم دونوں کو کیا ہوا ہے؟“ اس نے نرمی سے پوچھا۔ مریم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آئی اور اس کے بازو کو تھام لیا۔

”ترنم! نگہت کو کوئی غلط فہمی.....“

”مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی اور اس ترنم سے کیا پوچھتی ہو یہ تو خود اس غلاظت میں تھڑی ہوئی ہے۔“

نگہت نے پھر مریم کو بولنے کا موقع نہیں دیا۔

”کیا بکواس کر رہی ہو نگہت! تم اپنے ہوش میں تو ہو؟“ ترنم اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”اوہو، تو اب آپ مجھے سمجھائیں گی کہ میں اپنے ہوش میں رہوں..... کیا میں آپ سے پوچھ سکتی ہوں کہ میٹرن کے کہنے پر جب آپ پہلی مرتبہ ڈین کے گھر گئی تھیں آپ ہوش میں تھیں اور پھر اب جب.....“ ترنم نے بات کاٹی۔

”مزید ایک لفظ نہیں نگہت..... میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔ تم.....“

”میرا منہ توڑ دوں گی کیونکہ میں سچ بول رہی ہوں۔ بہت خوب۔“ مریم نے حیرانی سے ان دونوں کی جانب دیکھا۔ وہ دونوں اب آپس میں لڑنے لگی تھیں۔

”تمہیں جو بات کرنی ہے مجھ سے کر لو مگر مریم کے سامنے نہیں۔“ ترنم اس کے قریب آ کر بہت دھیمی آواز اور مصالحتانہ انداز میں بولی، مگر نگہت نے اس کی بات کاٹ دی۔

”مریم کے سامنے کیوں نہیں، یہ بھی ہم میں سے ایک ہے، اسے بھی تو سب کچھ پتا ہے۔ اس سے یہ پردہ داری کیوں۔ دراصل تم سب لوگ بھی میری طرح دھوکے میں ہو۔ مریم وہ نہیں ہے جو یہ نظر آتی ہے۔ اس کا صرف چہرہ معصوم ہے، درنہ اندر سے یہ بھی پوری ہے۔“ ترنم نے اس کے چہرے پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا پھر اسے بستر پر دکھانے والے انداز میں بیٹھنے ہوئے چلا کر بولی۔

”اب اگر ایک لفظ بھی تمہارے منہ سے نکلا تو میں تمہارا حشر بگاڑ دوں گی۔“ نگہت نے اس کی بات سن کر عجیب سے انداز میں قہقہہ لگایا۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے سے رال نکلنے لگی تھی۔ ترنم اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی دیوانگی نے ترنم کو مزید چونکا دیا۔

”تم نگہت کی باتوں کو انکور کر دو مریم! یہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے یہ نشے میں ہے۔“ وہ مریم کی طرف رخ کر کے بھی آنکھوں کے ساتھ بے حد دھیمی آواز میں بولی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں مریم! میں نے ہر بات مکمل ہوش و حواس میں کہی ہے۔ میں نشے میں نہیں

ہوں۔ ایک دوپگ چڑھانے سے مجھے اب نشہ نہیں ہوتا۔ تم میرے بجائے تزئین کی باتوں کو انور کرو، یہ تمہیں کبھی حقیقت نہیں بتائے گی۔ دراصل یہ بے چاری بھی میری طرح تمہیں بہت معصوم سمجھتی ہے۔“

الفاظ اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ مریم، کاکا، کاکا، دونوں کی شکل دیکھ رہی تھی۔ ان کی باتیں اس کے لیے پریشان کن بھی تھیں اور حیران کن بھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے غمت اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے قدموں میں آکر بیٹھی۔ مریم بدک کر پیچھے ہٹی۔

”تمہیں خدا کا واسطہ مریم! میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں نے بہت غلط کام کیے ہیں، بہت لڑکیوں کو غلط راہ لگایا، بہت گناہ کمائے مگر میں اللہ سے معافی مانگ لوں گی۔ تم میری راہ سے ہٹ جاؤ۔ مرتضیٰ کو مجھے واپس کر دو۔ مجھے اس سے بہت محبت ہے، سچی محبت، میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں مریم!“

”تم یہ کیا کر رہی ہو غمت! ہوش میں آؤ۔ چلو، میں تمہیں تمہارے کمرے میں چھوڑ آؤں، اٹھو یہاں سے۔ پاگل مت، بنو، مریم وہی کرے گی جو تم چاہو گی۔“ تزئین بہت کر کے آگے بڑھی اور اس کے شانوں پہ ہاتھ رکھ کر اسے کھڑا کرنا چاہا۔

”وعدہ کرو کہ مریم وہی کرے گی جو میں چاہوں گی، پہلے وعدہ کرو۔ میں جانتی ہوں مریم تمہاری ہر بات مانتی ہے۔ وہ تمہاری بہت اچھی سبیلی ہے نا۔ تم مجھ سے وعدہ کرو۔“ وہ تزئین کا ہاتھ پکڑ کر نہایت استغاثیہ انداز میں بولی۔ آنسو ابھی بھی اس کی آنکھوں سے بہت روانی سے بہہ رہے تھے۔

”ہاں میں وعدہ کرتی ہوں۔“ تزئین نے بالآخر اسے کھڑا کیا۔ مریم نے اس کی جانب حیرانی سے دیکھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو نہایت جارحانہ موڈ میں تھی، مگر جب کمرے سے جاری تھی تو اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ وہ برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ وہ تزئین کے ہاتھ کا سہارا لے کر کمرے سے باہر نکل گئی، جبکہ مریم تھکے ماندے انداز میں بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے ہی بیگ کھلا پڑا تھا جس میں اس نے اپنے کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں رکھی تھیں۔ وہ خود کو پاتال کی گہرائیوں میں اترتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اس کے قدموں کے نیچے سے کسی نے زمین کھینچ لی تھی۔

☆ ☆ ☆

”پاپا! آپ نے کبھی محبت کی ہے؟“ اس نے ان کے کلین شیڈز تو تازہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ جواب میں انہوں نے بلند و بانگ قہقہہ لگایا۔ وہ کچھ جھل سا ہو گیا۔ وہ ان کے گھرویک اینڈ گزرنے کے لیے آیا تھا اور پہلی مرتبہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ان سے ان کی اور اپنی باتیں کرنے کے بجائے کسی ”اور“ کی باتیں کرے۔ وہ ان سے اس پری چرے لڑکی کے متعلق کرید کرید کر بہت سے سوالات کرنا چاہتا تھا، مگر پھر ہمت نہیں ہو پاتی تھی۔ تھک ہار کر اس نے گھما پھرا کر یہ سوال پوچھ ہی ڈالا تھا مگر ان کے اس قہقہے نے اسے بد مزہ کر دیا۔

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ اس نے ناک چڑھا کر سوال کیا۔ اس کے پاپا ناٹنگ بے ناٹنگ چڑھاتے ہوئے مسکرائے اور ٹی وی کا چینل چینج کرنے لگے۔

”یار سنی! کبھی کبھی تم عجیب الجھا دینے والی باتیں کرنے لگتے ہو۔“ مسکراہٹ ابھی بھی ان کے

ہونٹوں کے کناروں پر کہیں کئی تھی اور یہی مسکراہٹ سبز مرتضیٰ عرف سنی کو حوصلہ دے رہی تھی۔

”میں نے ایک سادہ سا سوال پوچھا۔ اس میں الجھا دینے والی کیا بات ہے۔ محبت میں کچھ عجیب نہیں ہوتا پاپا! جو سمجھ نہ آئے۔“ اس نے آرام دہ صوفے کی بیک کے ٹیکے پر لیٹ کر دونوں ہاتھوں کے انٹرنیٹ پر رکھ لیا۔ اس کے پاپا اب کی بار مسکرائے۔

”ٹیک مین..... آریو اوکے..... سب خبریت ہے نا میرے بچے؟“ وہ اس کے سلکی بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے نرم لہجے میں استفسار کر رہے تھے۔ سب کچھ جھینپ سا گیا۔

”لیس پاپا! آئی ایم فائن۔ وہ میرا دوست ہے نا زوہیب..... سی ازان لو..... آج کل اس کی چھب ہی زرا ہے۔ آئی سوڑ پاپا! وہ بالکل تبدیل ہو چکا ہے۔ ایسی عجیب و غریب باتیں کرتا ہے۔ آئی مین بہت پوٹیکل لیکوئج استعمال کرنے لگا ہے۔ کبھی کبھی تو بالکل پاگل لگنے لگتا ہے۔ مجھے اس کو دیکھ کر بہت حیرت ہوتی ہے۔ ایسا ممکن ہے پاپا کہ کوئی ہر وقت کسی کے تصور میں کھویا رہے۔ ہر وقت کسی اور کی باتیں کرتا رہے۔ ہر وقت کسی اور کے بارے میں سوچتا رہے؟“ وہ دونوں ہاتھ سر کی پشت پر باندھے خلا میں دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ مرتضیٰ احسن نے حیرت سے اپنے بیٹے کی جانب دیکھا۔

”پاپا! آپ پہلی نظر میں محبت پر یقین رکھتے ہیں۔ اس نے سابقہ انداز میں سوال کیا۔“

”ہاں۔“ اس نے یکدم کہا پھر فوراً سنسبل کر بولا۔

”میرا مطلب ہے، میں نہیں کرتا مگر زوہیب کرتا ہے۔ اس نے اس لڑکی کو ایک بار دیکھا ہے اور بس۔ وہ محسوس ہو کر رہ گیا ہے۔ جب بھی ملتا ہے، اسی لڑکی کے بارے میں بات کرتا ہے۔ ایک دم ڈفر گئے لگا ہے۔ جس لڑکی کا نام تک نہیں جانتا، اس سے محبت کیسے ہو سکتی ہے؟“ مرتضیٰ احسن نے ٹی وی کا والیوم بالکل کم کر دیا اور اس کی طرف رخ پھیر کر بولے۔

”یہ تو محبت نہیں ہوتی، کسی کو ایک بار دیکھو اور پھر اس کے سحر کا شکار ہو جاؤ۔ ارے بھئی! لڑکی سے محبت کر رہے ہو یا جادو گرئی سے۔ تم کو سمجھانا تھا اسے کہ ابھی اس کی عمر عشق و محبت والی نہیں ہے۔ ابھی وہ صرف گرل فرینڈز سے کام چلائے۔“ ان کا انداز بہت کھوجتا ہوا تھا۔ سب کچھ سنسبل کر بیٹھ گیا۔

”لیس پاپا! میں اسے سمجھاؤں گا اور میں اسے سمجھاتا بھی ہوں مگر.....“ وہ تذبذب کا شکار ہوا۔

”مگر وہ نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے یقین ہے، وہ اب کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ وہ بہت آگے جا چکا ہے۔“ سب کچھ کی آواز میں تسلسل نہیں تھا۔

”وہ لڑکی کون ہے؟“ انہوں نے انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا۔

”میں نے آپ کو بتایا تو ہے وہ لڑکی کے متعلق بہت زیادہ نہیں جانتا۔ اس نے اسے صرف دو بار دیکھا ہے۔ ایک بار کے ایف سی میں بہت سرسری سا پھر ایک بار.....“ وہ بات کرتے کرتے رکھا پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ”دوسری ملاقات بھی شاید کے ایف سی میں ہی ہوئی تھی۔“

وہ اب بات ختم کر کے وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے پاپا کو بھنگ بھی پڑے

کہ زہیب کے پردے میں وہ ان سے اپنی ایک طرفہ محبت ڈسکس کرتے ہوئے ان کے خیالات سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ اس کے باپا اس سے بھی زیادہ چالاک تھے۔

”وہ ایک اس کی کلاس زیادہ تو نہیں ہوگی؟“ انہوں نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر استفسار کیا یہ انداز میں پوچھا۔

”نہیں، نہیں کلاس فیلو تو نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کلاس فیلوز کو میں گھاس نہیں..... اومانی گڑ نیس..... میرا مطلب.....“ وہ اپنا راز اپنے منہ سے اگل چکا تھا۔ اس کے باپا نے اس کی بات اچکی۔

”تمہارا مطلب ہے، تم نہیں، زہیب..... ہے نا؟“ وہ اس کی حالت کا مزہ لیتے ہوئے بولے۔

”سمجھ سے تم کچھ نہیں چھپا سکتے برخوردار! اب سیدھی طرح اگل دو کہ وہ کون ہے جس نے ہمارے صاحبزادے کا یہ حال کر دیا ہے؟“ ان کے انداز میں شرارت تھی۔ وہ خواہ مخواہ شرماسا گیا۔ شاید اس کی عمر کا تقاضا تھا مگر وہ اپنے باپا سے اتنے واضح انداز میں بات نہیں کر سکتا تھا جبکہ زہیب کا حوالہ دے کر وہ اپنی ہر الجھن بھی دور کرنا چاہتا تھا مگر اس کی بے وقوفی نے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔

”میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا باپا! مگر آپ اپنے سری لنکا والے ٹور سے فارغ ہو لیں پھر ماہین کا نکاح ہے، اس کے بعد ہم اس بارے میں تفصیل سے بات کریں گے۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ وہ جانتا تھا اس کے باپا اپنے ہاسٹل میں کام کرنے والی کسی معمولی نرس کو اتنی جلدی قبول نہیں کریں گے پھر می تو شاید اس کی شکل ہی بگاڑ دیتیں۔ اگر انہیں اس کی اس خواہش کا پتا چل جاتا۔ ابھی وہ اس کی بات کا جواب بھی نہیں دے پائے تھے کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ انہوں نے فون اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

”ہاں..... میں بات کر رہا ہوں..... ہاں ٹھیک..... تم کیسی ہو؟“ انہوں نے سمجھ کی جانب دیکھتے ہوئے محتاط سے انداز میں جواب دیا۔

”واٹ..... محبت؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ واٹ رہش۔ ٹھیک! تم ایسا کچھ نہیں کر دو گی۔ واٹ..... اوکے کو ٹو ٹیل۔“ وہ بہت دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے، مگر پھر بھی سمجھ تک آواز بخوبی پہنچ رہی تھی مگر اسے ان کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا ذہن کسی اور ہی سمت میں پرواز کر رہا تھا۔ وہ اٹھ کر اپنے لیے مخصوص بیڈروم کی سمت آ گیا۔ اس کے باپا لاؤنج میں ابھی بھی فون کان سے لگائے بیٹھے تھے۔

☆ ☆ ☆

”میں نے زمرنگ اس لیے جوائن کی کہ میں دھمی انسانیت کی خدمت کر کے یسوع مسیح کے نیک اور پیارے بندوں میں اپنا نام لکھوانا چاہتی ہوں۔“ کمرے میں گہری تاریکی تھی اور اس گہری تاریکی میں ستارہ یوسف کی آواز نے گویا روشنی ہی کر دی تھی۔ مریم نے ٹھنڈی سانس بھر کر پلٹیں جھکیں تو یہ روشنی گل ہو گئی۔ اسی تاریکی میں ستارہ یوسف کا ہیولانا نمایاں ہونے لگا۔ ستارہ یوسف جب زمرنگ اسکول میں آئی تھی تو اس کا حلیہ اب والی ستارہ یوسف سے بہت مختلف ہوا کرتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نجانے کون سی ”دھمی انسانیت“ کی

خدمت کی تھی کہ دھن اس پر بارش کی طرح برسے لگا۔

”یہ صرف اور صرف میری ضرورت ہے مریم!“ اب کی بار ترین کی آواز گونجی تھی۔ وہ برملا اس بات کا اعتراف کیا کرتی تھی کہ وہ زمرنگ کی طرف اس لیے آئی کہ اپنی امی اور بہن کے برعکس ایک ”نقشِ طرزِ زندگی“ اپنا سکے۔ وہی ترین اس کے ساتھ اس کے کمرے میں رہتی تھی۔ اس کے ساتھ والے بستر پر سوئی تھی، اس کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی تھی اور اسے کچھ پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ گندگی میں اس قدر تضرع کی تھی۔

”کیا گناہ اتنا شفاف بھی ہو سکتا ہے کہ نظری نہ آئے۔“ مریم نے نجانے کس سے سوال کیا۔ جب پردہ ہٹا ہے تو ایک بھید نہیں کھلتا بلکہ کئی بھید کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ مریم کے سامنے سے پردہ تو ہٹ گیا مگر کوئی بھید نہیں کھل سکا تھا۔ ہر بھید ایک نئے بھید کو جنم دیتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنے بستر پر اس طرح سے لیٹی تھی جیسے صدیوں کی بیمار ہو۔ اس کو لگنے والا دھچکا اتنا شدید تھا کہ اپنی ذات ہی زلزلوں کی زد میں محسوس ہو رہی تھی۔ ٹکھٹ اور ترین کو کمرے سے گئے کافی دیر ہو چکی تھی اور وہ ابھی تک اپنے بستر پر ساکت بیٹھی تھی۔

ڈاکٹر عادل اور ترین، سرجن مرتضیٰ اور ٹکھٹ، روبینہ اور کارمان تو صیف، سرجن بخاری اور میڈم زینت..... کیا سب ہی لوگ ایک جیسے تھے، کیا کوئی اس جیسا نہیں تھا اور اگر تھا تو نظر کیوں نہیں آ رہا تھا وہ اچانک ہی اپنے بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ یہ کمرہ جو آج تک اسے اپنے گھر جیسا لگا کرتا تھا، آج اچانک جیل کے بیرک کی طرح کیوں لگنے لگا تھا۔

”کیا میں اس قدر بے وقوف ہوں کہ مجھے آج تک کچھ سمجھ نہ آ سکا؟“ وہ ایک بار پھر خود سے سوال کر رہی تھی۔ وہ کسی اور کے پاس جا کر استفسار کر بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے ٹکھٹ اور ترین کو اپنا دوست سمجھا تھا اور دونوں نے ہی اسے دھوکا دینے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، فی الفور ہر چیز کو جو ان کا توں چھوڑ کر کہیں بھاگ جائے لیکن کیا اس چیز سے فرائض ممکن تھا جو اس کا شوق تھا، اس کا نصب العین تھا۔

”کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟“ کسی نے دروازہ کھول کر دستک دیے بنا اجازت طلب کی تھی۔ دروازہ کھلنے سے چاند کی چاندنی دے پاؤں اندر چلی آئی تھی، مگر اس چاندنی نے دروازے میں کھڑے وجود کو مزید ناقابلِ شناخت بنا دیا تھا۔

”مریم! تم جاگ رہی ہو نا؟“ آنے والی شخصیت نے کمرے کے عین وسط میں آ کر پوچھا اور پھر مزید چند قدم چل کر ٹیوب لائٹ آن کر دی۔ مریم کی آنکھیں لمحہ بھر کو چند ہیائی تھیں، مگر پھر سب کچھ واضح ہو گیا۔ اندر داخل ہونے والی شخصیت ترین بخاری تھی۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا مریم؟“ اس نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔ وہ مریم کی طرف دیکھنے سے احتراز برت رہی تھی۔ مریم نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کیا جواب دیتی، طبیعت تو اتنی اچھی صاف ہوئی تھی کہ شاید اب زندگی بھر ”ٹھیک“ رہتی۔

”یہ پانی پی لو۔“ اسے نجانے کیسے خبر ہوئی کہ اس کی طلب پانی ہے۔ مریم نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے پانی کا گلاس تھام لیا۔ ترین اس کے بستر پر ہی بیٹھ گئی۔ اس کے انداز میں شرمندگی کے ساتھ ساتھ

تذبذب بھی تھا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر مریم نے پانی پی لینے کے بعد اس کی جانب ایک بار بھی نہیں دیکھا۔
”کیا تم مجھ سے کچھ بھی پوچھنا نہیں چاہتیں مریم! مجھ سے ناراض ہی ہو لو، غصہ کرو مگر اس طرح خاموش رہو۔“ تزئین نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر جھنجکے ہوئے کہا۔ مریم اب بھی خاموش رہی۔ اس کے وجود میں ذرا سی بھی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے تزئین کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ بھی نہیں نکالا تھا۔

تزئین! نگہت نے جو کہا، تمہارے بارے میں اور ڈاکٹر عادل.....“ ٹوٹے لہجے میں بولتی مریم اپنی بات مکمل نہیں کر پائی۔

”نگہت جھوٹ بول رہی تھی تا تزئین؟“ اس نے رک کر گہری سانس بھری اور پھر پوچھا، تزئین خاموش رہی۔ وہ مریم کی بات کی تائید کیسے کر سکتی تھی، جبکہ وہ جانتی تھی نگہت نے چند گھنٹے قبل جو کچھ کہا تھا، وہ حرف بہ حرف سچ تھا۔ نگہت نشے میں نہ ہوتی تو شاید اتنی بے باکی سے سچ بھی نہ بولتی۔

”تزئین! مجھے بتا دو پلیز..... میرا دل پھٹ جائے گا۔“ مریم اس کے شانے کو ہلاتے ہوئے بولی۔
”میں نے ڈاکٹر عادل سے کورٹ میرج کر لی ہے مریم!“ تزئین نے بہت دھیمی آواز میں انکشاف کیا۔ مریم کو جھٹکا لگا۔ شاید وہ تزئین کے منہ سے یہ سب نہیں سنا چاہتی تھی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے تزئین کو دیکھا۔

”میرے پاس..... اس کے علاوہ.....“ تزئین نے بات ادھوری چھوڑ کر مریم کی جانب دیکھا، جو اس سے یکدم ہی دور ہٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی بڑھ رہی تھی۔

”مریم! تم میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ میں نے گناہ نہیں کیا۔ میں نے ڈاکٹر عادل سے شادی کی ہے۔ میں تمہیں بتانا چاہتی تھی مگر مجھے موقع ہی نہ مل سکا۔ دراصل تم عادل کو ناپسند کرتی ہو، یہ بات میں بہت شروع سے جانتی تھی۔ میں نے بار بار کوشش کی تمہیں سمجھانے کی، تمہیں حقیقت بتانے کی کہ عادل برے انسان نہیں ہیں مگر تم میری کوئی بات سننے پر تیار نہ ہوئیں، بس اسی لیے۔ تم خود بتاؤ مریم! میں تمہیں کس طرح یہ سب بتاتی۔ تم تو میڈم زینت کو بھی بری عورت سمجھتی تھیں۔ تم تو ان کی کسی اچھائی کو بھی ماننے کو تیار نہیں تھیں۔ حالانکہ وہ کتنی اچھی ہیں۔“

”مجھے کچھ مت بتاؤ تزئین! مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔ تم جن لوگوں کو اچھا کہہ رہی ہو، وہ سب برے لوگ ہیں۔ مجھے خود نگہت نے بتایا تھا“ مریم اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی اور پھر تزئین کی شکل دیکھنے لگی۔ نگہت کی آج والی حالت دیکھ کر کیا وہ اس کی کسی بات پر اعتبار کر سکتی تھی۔ نگہت آج سے پہلے اسے جو کچھ سمجھا رہی تھی۔ وہ سچ تھا تو آج جو کچھ وہ نشے کی حالت میں کہہ گئی تھی، وہ سب کیا تھا۔ مریم کے سامنے انہیں انتہائی شریف بنا کر کیوں پیش کرتی تھی؟ وہ کس کی بات کو سچ مانتی، نگہت کی یا تزئین کی۔ یہ کیسی بھول بھلیاں تھی، جس میں وہ پھنس کر رہ گئی تھی۔

”تمہارا مسئلہ یہ ہے مریم! کہ تم ہر چیز کو اپنی آنکھ سے دیکھنے اور سمجھنے کے بجائے دوسروں کی آنکھ سے

دیکھنا پسند کرتی ہو۔ نگہت کی دوستی نے تمہیں بہت سے اچھے لوگوں کی دوستی سے محروم کر دیا۔ مجھے خود بھی یہ بات بہت دیر سے سمجھ میں آئی تھیں اور میں تمہیں بتانا بھی چاہتی تھی مگر.....“ وہ لہجہ بھر کر کہی۔
”تمہیں یاد ہے مریم! جب وہ دن تھا تو میں کوئی ایسی بات شروع کرتی تو تم مجھے خاموش کر دیا کرتی تھیں۔ ایسی صورت حال میں کیا کیا جاسکتا تھا؟“ وہ جتاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تمہیں یاد ہے ایک بار تم نے نگہت کی جگہ ٹائٹ شفٹ میں ڈیوٹی کی تھی۔ تب تم نے خود کو کتنی بڑی مشکل میں پھنسا لیا تھا؟ تم خود بھی نہیں جانتی تھیں۔ اس دن اگر عادل اس روم میں نہ آتے تو اس حریص شخص سے کوئی تمہیں نہیں بچا سکتا تھا تم شکر کرو مریم! کہ تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اللہ نے تمہاری بہت بہت مدد کی ہے اور جن بندوں کے ذریعے اس نے یہ مدد کی ہے تمہیں ان بندوں کا شکر گزار ضرور ہونا چاہیے۔ میڈم زینت اور عادل نے کبھی تمہارا برا نہیں چاہا مگر یہ دونوں کبھی تمہیں اچھے نہیں لگے جبکہ نگہت اور سرجن مرتضیٰ نے کبھی تمہارا اچھا نہیں چاہا اور وہ دونوں کبھی تمہیں برے نہیں لگے۔ غلطی تو سر اسر تمہاری ہے مریم! بہت ساری گتھیاں تو خود بخود سلجھ جاتی ہیں لیکن اگر انہیں طریقے سے سلجھایا جائے تو۔ اگر تم غور کر تیں تو جان لیتیں کہ تمہیں پھانسنے کے لیے پلان بنایا گیا ہے۔ سب سینئر ریک کی نرسز کے ساتھ ایک جونیئر ریک کی اسٹوڈنٹ نرس کا کیا کام؟ مگر تم شاید.....“ دروازے پر ہونے والی دستک سن کر تزئین خاموش ہو گئی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا پھر تزئین نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

”تم دونوں یہاں اطمینان سے بیٹھی ہو، وہاں غضب ہو گیا ہے۔ نگہت نے خود کٹمی کر لی ہے۔“ دروازے کے پتوں بچ کھڑے واڈیوائے نے گویا دھماکہ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”تم ٹھیک کہتے تھے حیدر! میں سچ سچ بہت بے وقوف ہوں۔“ اس نے بمشکل آنکھوں میں اٹھتی نمی کو پیتے ہوئے کہا۔ دوسری جانب سے حیدر نے گفتگو لہجے میں کچھ کہا۔ مریم لہجہ بھر کر خاموش ہو گئی پھر ریسیور کو تقریباً کان میں گھسا کر دھیمی آواز میں بولی۔

”یہ بات نہیں ہے، بس تم لوگوں کی یاد آ رہی ہے۔ میں جلدی گھر واپس آ جاؤں گی، بہت جلدی۔“ پی سی او کے مالک نے ساری توجہ مریم کی جانب ہی لگائی ہوئی تھی۔ آواز دھیمی کرنے والی اس حرکت کو اس نے بہت دلچسپی سے دیکھا اور پھر سیٹی بجانے لگا۔ مریم کا بس نہیں چل رہا کہ فون پر ہی حیدر کو الف سے بے تک ہر بات بتا دے اور ٹیلی فون ریسیور کو اس کا کندھا سمجھ کر زار زار رونا شروع کر دے مگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے غلت میں حیدر کو خدا حافظ کہا اور پھر پیسے ادا کر کے پی سی او سے باہر نکل کر تیز قدم اٹھاتی مین گیٹ کی جانب چل دی۔ ہاسپٹل کے بالمقابل بنے اس پی سی او پر زیادہ تر نرسز یا مریضوں کے رشتہ دار ہی آیا کرتے تھے۔ مریم بھی یہیں سے گھر فون کیا کرتی تھی۔ وہ ہاسپٹل کا لان کراس کر کے اب کوریڈور کی طرف جا رہی تھی۔ صبح کے نو بجے تھے۔ گیٹ نمبر 6 پر آئی وارڈ کے آؤٹ ڈور پشٹس کا تاننا بند تھا۔ پہلے جب کبھی وہ

کورڈورز میں پیشکش کے قریب سے گزرتی تو ان کو دیکھ کر دل ہمدردی کے جذبات سے لبالب بھر جاتا، مگر آج نجانے کیوں دل اتنا بوجھل تھا کہ کسی ننھے مریض کو دیکھ کر دل محبت سے ترپا نہ ہمدردی سے۔ وہ جھکے ہوئے سرو اور نرزیہ قدموں سے میٹرن کے روم کی جانب بڑھ رہی تھی۔

مریم کی آنکھوں میں کم فنی کی عینک لگی ہوئی تھی تو ہر شخص کی آنکھوں میں صرف اور صرف عزت دکھائی دیتی تھی مگر اب جب یہ عینک اتری تھی اور ایک انوکھی مگر شرمناک حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوئی تھی تو ہر شخص کی آنکھیں ننگی تلوار کے مانند دکھائی دے رہی تھیں۔

گھٹ کے انتقال نے تو اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی خودکشی سب ہی کے لیے معمر بن کر رہ گئی تھی۔ ہر دم خوش رہنے والی۔ سینئر ڈاکٹر ز اور میٹرن کی پسندیدہ گھٹ کو آخر کیا غم لاحق تھا کہ اس نے اپنے آپ کو مار ڈالا اور مریم کو یہی دکھ مارے ڈال رہا تھا کہ گھٹ نے اس کی وجہ سے اپنے آپ کو مار ڈالا۔ وہ شخص جسے وہ باپ کے برابر عزت دیتی تھی، وہ ایک دم سے شیطان بن گیا تھا۔

وہ گھٹ کے انتقال کے فوراً بعد ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر واپس چلی جانا چاہتی تھی، مگر میڈم زینت کا خیال تھا کہ اگر وہ اس طرح سے واپس گئی تو خواہ مخواہ یہ فرض کیا جانے لگے گا کہ وہ شاید گھٹ کی موت کی ذمہ دار ہے کیونکہ یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ گھٹ کی وفاداریاں سرجن مرتضیٰ کے ساتھ تھیں اور سرجن مرتضیٰ کی نظر التفات گھٹ کے بجائے اب مریم پر ہو چکی تھی۔ پہلے تو شاید مریم نے ایسی باتیں ہی نہیں تھیں مگر وجہی آواز میں ہونے والی چنگوٹیاں بھی اب اسے بخوبی سنائی دینے لگی تھیں۔

”آئیے مریم! بیٹھیے۔“ میٹرن نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ نے مجھے بلوایا تھا؟“ مریم نے بیٹھے ہوئے پوچھا۔

”مجھے گھٹ کی موت کا بہت دکھ ہے، اچھی لڑکی تھی۔“ وہ دیرے سے بولیں۔ مریم خاموش رہی۔

”تمہارا گھٹ سے کیا جھگڑا تھا؟“ ان کا اگلا سوال مزید خطرناک تھا۔ مریم ہکا بکا ہو کر ان کی شکل

دیکھنے لگی۔

”میں نے سنا ہے کہ تم دونوں کے درمیان کوئی تنازعہ تھا۔ گھٹ اتنے کمزور اعصاب کی مالک نہیں تھی کہ کسی عام سی بات پر اپنے آپ کو مار ڈالتی جبکہ..... جبکہ وہ پریکٹس بھی تھی۔“ مریم ششدر بیٹھی ہوئی تھی۔

”تمہارے مرتضیٰ سے کس قسم کے تعلقات تھے۔ دیکھو مجھ سے کچھ مت چھپانا، مجھے صاف صاف بتاؤ، تب ہی میں تمہیں اس سے بچا پاؤں گی لیکن اگر تم نے غلط بیانی سے کام لیا تو تمہارے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔“ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے مریم کی آنکھیں برسے لگیں۔ وہ آج کل اتنی زود رو بخ ہو چلی تھی کہ ڈرافٹر اسی بات پر رونے لگتی۔ تزئین کا ساتھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ دور دراز قبل اپنے شوہر ڈاکٹر عادل کے ساتھ دام رواں ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر عادل نے بہت عرصہ سے وہاں ایلانی کر رکھا تھا اور اب ان کو وہاں اچھی جاب مل گئی تھی۔ میٹرن نے اس کے آنسوؤں کو خاطر میں لائے بغیر اگلا سوال کیا۔

”کیا میں سمجھ لوں کہ تمہارے اور مرتضیٰ کے.....“

”نہیں میڈم! ایسا مت کہئے، ایسی کوئی بات نہیں، میں ایسی نہیں ہوں۔ میں تو.....“ وہ ان کی بات کاٹ کر ٹوٹ کر بولی۔

”ہاں ہاں، میں جانتی ہوں تم بہت شریف لڑکی ہو۔ مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی ہے کہ اگر تمہارا اور مرتضیٰ کا کوئی سلسلہ نہیں ہے تو وہ کس برتے پر اکڑ رہا ہے۔ وہ یہ کیوں کہہ رہا کہ اس کا تم پر حق ہے۔ مجھے آج کل ایک اچھی لڑکی کی بہت ضرورت ہے۔ میرے ذہن میں شروع سے تمہارا نام تھا مگر اب یہ مرتضیٰ نے نیا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ اچھا تم اب جاؤ، میں خود سنبھال لوں گی۔“ انہوں نے بے رحم لہجے میں گویا خود ہی مقدمہ شروع کیا اور خود ہی ختم کر کے فیصلہ سنا دیا۔ وہ اٹھ کر ایک بار پھر وہی مردنی چال چلتی ان کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ ابھی چند قدم چل کر مڑنے لگی تھی کہ سامنے سے اختر آتا دکھائی دیا۔

”سسر مریم! آپ کو سرجن مرتضیٰ یاد فرما رہے ہیں۔“ اس نے آنکھیں گھما کر شوخی سے بھر پور لہجے میں کہا۔ اس کے انداز میں یہ شوخی پہلے کبھی مریم کو محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اختر کو ٹال کر آگے بڑھنا چاہا مگر وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔ اس نے اصرار پر وہ مجبوراً سرجن مرتضیٰ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی کہ جب تک وہ یہاں تھی، کسی قسم کے نئے مسئلے میں الجھنا نہیں چاہتی تھی۔

”اب گھما پھرا کر بات کرنے کا وقت ہے نہ موقع۔ میں تم سے دو ٹوک اور واضح بات کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ایک دوست ہے جس کا بیٹا چند روز پہلے یہاں ایڈمٹ رہا ہے۔ میرے دوست کو تم پہلی نظر میں بہت پسند آئی ہو۔ میرے اس دوست کی رسائی ہیلتھ سنٹری تک ہے۔ میں اس کی اسی اپروچ کا فائدہ اٹھا کر اس ہاسپٹل کا اگلا چیئر مین بننا چاہتا ہوں۔ اس کو خوش کرنے میں ہی میری خوشی ہے۔ تم سمجھ رہی ہونا۔ تمہیں اب میرا کام کرنا ہی ہوگا مریم!“ سرجن مرتضیٰ اس کی شکل دیکھتے ہی شروع ہو گئے۔ ان کا انداز حکمیہ تھا نہ التجائیہ۔ بس ایسے جیسے کوئی بہت ہی عام سی بات کر رہے ہوں۔

”آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے سر! میں آپ کی کوئی بات.....“

”ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی سسر مریم!“ انہوں نے اس کی بات کاٹ کر ”سسر مریم“ پر زور دیتے ہو کہا۔

”میں نے تم سے تمہاری رضامندی نہیں پوچھی۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ تمہیں یہ سب کرنا ہوگا۔ تمہارے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں ہے۔ میں نے گھٹ سے کہا تھا کہ تم سے طریقے سے بات کر لے مگر وہ آخری دنوں میں کچھ زیادہ ہی اونچا اڑنے لگی تھی مگر تم تو جیج اڑیل ٹو ہو مگر خیر.....“ انہوں نے لمحہ بھر رک کر سانس لیا۔

”گھٹ کی موت نے سارا کھیل ہی بگاڑ دیا لیکن ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ یوں سمجھو کچھ ہوا، یہی نہیں۔ کل ویک اینڈ ہے۔ میرے دوست کا ڈرائیور تمہیں آکر لے جائے گا اور وہاں.....“ ایک بار پھر توقف کیا گیا۔

”تمہیں ایک اور بہت ضروری بات بتانی ہے۔ دراصل نگہت نے مرنے سے پہلے میرے نام ایک مہینے چھوڑا تھا، جس میں اس نے اعتراف کیا ہے کہ اس کا اور تمہارا جھگڑا چل رہا ہے اور اس کی جان کو تم نے بہت خطرہ ہے۔ یہ پیغام میرے نیکی فون سیٹ کے ریکارڈز میں ابھی بھی محفوظ ہے۔ اگر تم میرا یہ چھوٹا سا کام نہیں کرو گی تو میں یہ پیغام پولیس کو دے دوں گا۔ باقی تم خود سمجھ دار ہو۔“

مریم کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ اس ایک ہفتے میں مریم کو پے در پے جتنے جھکے لگے تھے، اس نے اس کے حواس بخل کر دیے تھے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

”میں..... بری لڑکی..... نہیں ہوں۔“ لفظ بہت ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکلے۔

”ہم میں سے کوئی بھی برائی نہیں ہوتا، بس کبھی کبھی ہماری قسمت بری ہو جاتی ہے۔“ زینت آرانے بہت محبت سے کہتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگایا۔ اس کی حالت نہایت خراب ہو رہی تھی۔ آنکھیں بے تحاشا رونے کے باعث سوخ چکی تھیں۔ وہ ایسے بچے کی مانند لگ رہی تھی جس کا پسندیدہ کھانا اس کی اپنی غلطی سے ٹوٹ گیا تھا۔ زینت مسلسل اس کے کندھے کو سہلا رہی تھیں۔ آج سے پہلے وہ جب تک اس سٹم کو سمجھ نہیں پائی تھی تو یہی زینت آرا اسے اس سٹم کا سب سے ناکارہ حصہ لگتی تھیں اور اب جب وہ اس سٹم کو سمجھ گئی تھی تو زینت آرا ابی سب سے کارآمد حصہ لگ رہی تھیں۔

”میں نے جب تمہیں پہلی بار دیکھا، تب ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم اس جگہ کے لیے ”مس فٹ“ ہو، تم بہت معصوم ہو اور کسی قدر احمق بھی۔ بہت سی باتیں جو خود بخود سمجھ میں آنے لگتی ہیں، وہی باتیں تمہاری سمجھ میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔ تم اچھے گھر کی لڑکی ہو، کوئی معاشی مجبوری بھی لاحق نہیں، اس لیے جب تم جاب چھوڑ کر نہیں گئیں تو مجھے تم پر غصہ آنے لگا اور ساتھ ساتھ تجس بھی۔ میرا خیال تھا کہ تم لڑکیوں کی اس قسم میں سے ہو جو ایڈونچر اور تھرلر میں اس فیلڈ کو جو آن کرتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے میں نے تمہاری ایک بے ضروری غلطی پر تمہیں وارڈز میں سب کے سامنے ڈانٹا تھا۔ میرا مقصد تمہیں دل برداشتہ کرنا تھا تاکہ تم خائف ہو کر واپس چلی جاؤ مگر تم نہیں گئیں۔“ وہ اسے ہر بات سے آگاہ کر دینا چاہتی تھیں۔

”اس کے بعد تمہاری آنکھوں میں روز بروز میرے لیے نفرت بڑھنے لگی۔ اس کی وجہ بھی مجھے بہت جلد سمجھ آ گئی۔ تمہاری نگہت سے دوستی ہو چکی تھی۔ وہ سرجن مرتضیٰ کی منظور نظر تھی اور وارڈ میٹرن کی جیتی۔ اس نے دونوں طرف اچھی خاصی پی آر بنا رکھی تھی۔ وہ بہت ابتدا سے نئی نرسز کو میرے اور ان بہت سے دوسرے لوگوں کے خلاف بہکا دیا کرتی جو انہیں غلط راستوں پر نہ چلنے کی تاکید کرتے تھے، پھر میں خود ہی تمہارے سامنے سے ہٹ گئی کیونکہ اگر میٹرن کو پتا چل جاتا کہ میں ”شر“ پھیلا رہی ہوں تو وہ میری نوکری کی دشمن ہو جاتی۔ میں اس نوکری کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں مریم! میری بچی کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہے۔ ایسی صورت حال میں، میں لڑکیوں کو نصیحت ضرور کر سکتی ہوں مگر اس کے علاوہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔“ ان کی آخری بات پر مریم نے

چونک کر ان کی شکل دیکھی۔ اس کا ”آخری ٹکا“ بھی ڈو بتا دکھائی دے رہا تھا۔

”یہاں اور بھی بہت سے اچھے لوگ ہیں۔ سٹم مکمل طور پر ناکارہ نہیں ہوا ابھی، مگر تمہارا کیس کچھ مستف ہے۔ تم بہت بری طرح جھنسن چکی ہو۔ لڑکی دراصل اب میٹرن اور سرجن مرتضیٰ کے درمیان ہے۔ وہ دونوں اپنے اپنے مقصد کے لیے تمہیں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ سرجن مرتضیٰ ترقی چاہتا ہے جبکہ میٹرن کو ٹر مینیجمنٹ کا ڈر ہے۔ اس سے کچھ غلطیاں ہوئی ہیں جن کی پاداش میں اسے کبھی بھی نکالا جاسکتا ہے۔ وہ دونوں اب اسی لیے ان جھکندوں پر اتار آئے ہیں۔ تم کسی سے جا کر شکایت کرو گی تو تمہاری بدنامی کا زیادہ ڈر ہے۔ میٹرن کو تو میں بھی سنبھال سکتی ہوں مگر سرجن مرتضیٰ تو بہت آفت شے ہے۔ اس کے تو بیوی بچے بھی اس کے ساتھ نہیں رہتے کہ ان سے جا کر بات کر لی جائے۔“

زینت آرا خود بھی اس الجھن کی سلجھن ڈھونڈنے میں ناکام ہو گئی تھیں مگر مریم ان کی آخری بات پر قدرے چونگی۔ اس کے ذہن میں اس مسئلہ کا ہلکا سا حل نظر تو آیا تھا۔ ماہین مرتضیٰ لڑکی تھی اور اس کے مسئلہ کو بخوبی سمجھ سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

کال نیل بجانے کے بعد وہ بے صبری سے دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ علامہ اقبال ٹاؤن میں واقع یہ چھوٹا مگر نہایت خوبصورت گھر سرجن مرتضیٰ کی بیوی کا تھا۔ مریم کو یہ گھر ڈھونڈنے میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔ اس نے پہلے فون کر کے گھر کی ملازمہ سے ایڈریس سمجھا تھا اور پھر وہ زینت آرا کے ساتھ یہاں تک چلی آئی تھی مگر زینت آرا گھر کے اندر جانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ وہ ڈاکٹر عادل کی وجہ سے سرجن مرتضیٰ کی اہلیہ سے ایک آدھ بار مل چکی تھیں کیونکہ ڈاکٹر عادل ان کی اہلیہ کے فرسٹ کزن تھے۔

”ان دونوں میاں بیوی کے درمیان علیحدگی بھی دراصل ڈاکٹر عادل کی وجہ سے ہوئی تھی۔ جن دونوں ڈاکٹر عادل نے اس ہاسپٹل میں اپنا ہاؤس جاب شروع کیا، ان ہی دونوں سرجن مرتضیٰ فارن سے اسپیشلائزیشن کر کے لوٹے تھے۔ سرجن مرتضیٰ کا ذہن شروع سے ہی کچھ مغربی اپروچ رکھتا تھا۔ ان کا چال چلن ابتداء سے ہی مشکوک تھا جسے وہ اپنی شاندار پرسنلٹی سے کیو فلاج کر کے رکھتے تھے۔ ڈاکٹر عادل نے ان کی وائف سے بس دو ایک انیئر زکی داستانیں کہہ ڈالیں، جن کی بنا پر ذرا سا تنازعہ طلاق تک جا پہنچا۔ ان حضرات نے طلاق دینے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ بے چاری شریف عورت بچے لے کر الگ ہو گئیں۔ اب تو خیر اپنا کوئی بھلا بزنس چلا رہی ہیں۔“ زینت آرا نے اسے بہت تفصیل سے سرجن مرتضیٰ اور ان کے گھریلو حالات کا قصہ سنا تے ہوئے بتایا تھا۔

”جی..... آپ کو کس سے ملنا ہے؟“ دروازہ کھلنے کے بعد آواز پہلے سنائی دی تھی اور شکل بعد میں نظر آئی۔ وہ جو کوئی بھی تھیں، کافی پر نور چہرے والی خاتون تھیں۔ ہلکے فیروزہ شلوار قمیض میں سفید کڑھائی والا دوپٹہ اوڑھے شاید جائے نماز سے ہی اٹھ کر آ رہی تھیں۔

”مجھے..... وہ..... مسز مرتضیٰ..... مابین سے..... میرا مطلب مابین مرتضیٰ سے؟“ ان کی کھوتی آنکھوں نے مریم کو گڑ بڑا دیا۔

”مابین بیٹا؟ تم کون ہو بیٹی! مابین کی کوئی بی بی دوست ہے؟“ انہوں نے دروازہ پورا وا کر کے استفسار کیا۔ گویا اندر آنے کی اجازت بھی دی تھی اور ساتھ ہی ساتھ انکو آڑی بھی کر رہی تھیں۔

”جی..... جی میری ان کی زیادہ پرانی دوستی نہیں ہے۔“ وہ ان کے پیچھے چلتے ہوئے بول رہی تھی۔ انہوں نے اسے جس کمرے میں لا کر بٹھایا وہ دیکھنے میں ٹی وی لاؤنچ لگ رہا تھا۔ دو ایک دروازے دکھائی دے رہے تھے اور عین درمیان سے بیڑھیاں بھی اوپر جاتی نظر آ رہی تھیں۔ مریم ان کے اشارے پر صوفے پر بیٹھ گئی۔ دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ جو بات وہ مابین سے کرنے آئی تھی، اگر مابین اس پر یقین نہ کرتی تو پھر مریم کے پاس کوئی جائے پناہ نہیں بچتی۔

”تمہاری اور اس کی پرانی دوسری ہوتی تو یقیناً وہ تمہیں اپنی شادی پر ضرور بلاتی اور تمہیں پتا ہوتا کہ دور و قبل اس کی شادی ہو چکی ہے۔“ انہوں نے بہت اطمینان سے اس کا اطمینان غارت کیا۔

”شاید.....؟ مگر..... کچھ روز قبل..... وہ ملی تھی، تب تو اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔“ مریم نے بے حد پریشانی کے عالم میں کہا۔ چاہنے کے باوجود بھی وہ گھبراہٹ پر قابو نہیں پاسکی تھی۔ ان خاتون نے اس کے انداز کو بخور دیکھا پھر گہری سانس بھر کر بولیں۔

”ارے بس، یہی تو ملال ہے۔ ہر کام جلدی میں کر دیا بڑی بیگم نے۔ بچی کے دل میں کتنے ہی ارمان تھے مگر بڑی بیگم کو کچھ نہ کیا خدا شت لاحق تھے۔ فون پر بس ٹوپان بیٹے کی آواز سنائی دی۔ یہاں ہمیں بیٹھے بیٹھے بتا دیا کہ مبارک ہو، نکاح ہو گیا ہے۔ اگلے دن بچی کو جہاز پر چڑھا آئیں کہ جاؤ اپنے میاں کے پاس رہو، وہی تمہیں سنبھال سکتا ہے۔ بڑی بیگم کسی بات کی ٹھان لیں تو پھر کوئی طاقت انہیں نہیں روک سکتی۔ بچی کو لال جوڑا پہننے دیا نہ سنگھار کرنے دیا۔ خیر تم بتاؤ، خیریت سے آئی تھیں۔ آج کل روزی فون کر رہی ہے۔ کہتی ہے، اماں بی! میرا دل نہیں لگ رہا۔ بے چاری وہاں اتنی اداس ہے اور یہاں اماں جان اور بھیا کو پرواہی نہیں۔ تم بتاؤ کوئی پیغام ہے تو میں پہنچا دوں گی۔ خوش ہو جائے گی۔“ وہ مابین کو یاد کر کے سچ سچ آبدیدہ ہو رہی تھیں۔ مریم کے جسم سے جان نکلتی جا رہی تھی۔ مابین کے نام پیغام تو بہت اہم تھا مگر وہ پیغام دے نہیں سکتی تھی۔

”پانی، والی لاؤں تمہارے لیے۔ ٹھہرو، میں تمہارے لیے کچھ لاتی ہوں۔“

انہیں شاید بہت دن بعد کوئی جلے دل کے پھپھو لے پھوڑنے کے لیے دستیاب ہوا تھا۔ وہ بات مکمل کر کے کچن کی سمت چل دیں۔ مریم نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کیونکہ حقیقتاً اسے بہت پیاس لگ رہی تھی۔ ان کے جانے کے بعد بھی وہ اپنے ہاتھوں کو کھتی رہی۔ قسمت اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی خوفناک مذاق کر رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا سب چھوڑ چھاڑ کر گھر بھاگ جائے پھر اس کے سارے ڈائیکو منٹس جو ایڈیشن کے وقت رکھ لیے گئے تھے۔ الاؤنس میں ملنے والی رقم جو مریم کے لیے تو صرف پاکٹ منی تھی، مگر بہت سی لڑکیوں کے لیے وہ ان

کی گھر میں آنے والی واحد کمائی تھی۔ ابتدا میں لیا جانے والا وہ حلف، سرجن مرتضیٰ کی دھمکی، پولیس کا خوف اسے نجانے کیا کیا چیز ڈر رہی تھی۔ اسے بیٹھے بٹھکے پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ دھڑکے سے گنگناٹے کی آواز آئی جو لمحہ بے لمحہ تیز ہو رہی تھی۔ یقیناً کوئی گنگناٹا ہوا بیڑھیاں اتر کر آ رہا تھا۔ مریم مزید چونکا ہو کر بیٹھ گئی۔ اپنی سیاہ چادر کو اس نے کانوں کے قریب سے مزید آگے کی طرف سرکالیا۔ حالانکہ جو کوئی بھی تھا، اس کی پشت کی طرف تھا۔ چند لمحے بعد مریم نے ایک لمبے مگرد بلے پتلے لڑکے کو اپنے عقب سے ہو کر اسی سمت میں جاتے دیکھا جہاں وہ عمر رسیدہ خاتون تشریف لے گئی تھیں۔ اسے ان دونوں کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔

”تمہیں وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھے گھر کی بچی لگتی ہے، کیسے اپنے آپ کو ڈھک کر بیٹھی ہے۔ کیا پتا تمہاری موجودگی پسند نہ کرے۔“ انہی خاتون کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ مابین کی نانی تھیں مگر وہ مابین کی والدہ کے لیے بڑی بیگم کا لفظ استعمال کر رہی تھیں۔ مریم ان کے دور مابین کے رشتے کے متعلق زیادہ نہیں جان پاتی تھی۔

”یہ بھی خوب کہی آپ نے۔ میں آپ کو ایسا لڑکا لگتا ہوں اور مجھے دیکھتے ہی ان کی نینٹ نما چادر میں بھی شگاف پڑ جائیں گے۔ حد کرتی ہیں آپ بھی اماں بی! محترمہ کے بارے میں اچھی طرح سے چھان بین بھی کی ہے کہ نہیں۔ کون ہیں، کہاں سے تشریف لائی ہیں، کس مقصد سے تشریف لائی ہیں؟“ وہ شاید جان بوجھ کر اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ ”اماں بی“ کے نام سے پکاری جانے والی خاتون نے کیا جواب دیا، مریم سن نہیں پاتی۔

”واٹ، مابین کی سبیلی.....؟ اماں بی! محترمہ بتا رہی ہیں آپ کو۔ اللہ معافی، میں نے تو ساری زندگی مابین کی ایسی کوئی سبیلی نہیں دیکھی۔ اتنی دقناوسی تو اس کی سبیلی کی دادی بھی نہیں ہوں گی۔ دیکھو ذرا لاؤنچ میں بھی اس طرح نینٹ اوڑھ کر بیٹھی ہیں، جیسے کسی کے چہلم میں دعا مانگ رہی ہوں۔ ارے اماں بی! مجھے تو یہ فراڈ لگ رہی ہیں۔ مابین کی سہیلیاں ایسی نہیں ہیں۔“ وہ تیز تیز بول رہا تھا۔ مریم کا دل چاہا وہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے۔

”اچھا اب یہ اپنی بک بک بند کرو۔ سنی بیٹے! ہر ایک کو خشکی نگاہ سے مت دیکھا کرو۔ میں دیکھ رہی ہوں چند دن سے بہت بدلے بدلے دکھائی دیتے ہو۔ ارے میرے بچے ہنستے کھیلتے اچھے لگتے ہو۔ شکر کرتی ہوں کہ اب بڑی بیگم سے بھی زیادہ درازی نہیں کرتے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بے وجہ بولتے چلے جاؤ۔“

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد وہی خاتون اس کے سامنے ایک ٹرے میں جگ اور گل اس لیے کھڑی تھیں۔ مریم نے بس ایک نظر ان کی جانب دیکھا اور پھر دوبارہ سے اپنے ہاتھوں کو کتنے لگی، کیونکہ وہ لڑکا بھی لاؤنچ میں آکر اس کے بالکل سامنے بیٹھ گیا تھا۔ مریم نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا مگر شارٹس میں لمبوس ہونے کی وجہ سے اس کی گھٹنوں تک برہنہ ٹانگوں سے ایک نظر ضرور پڑی تھی۔ اس کے بعد اس نے دوسری نظر نہیں ڈالی، مگر خواہے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس لڑکے کی گھورتی ہوئی نگاہوں کا مرکز ہے۔

”پانی پی لو بیٹی!“ شربت سے بھر ایک گلاس اسے انہی شفیق سجدہ والی خاتون نے پکڑ لیا۔
 ”نہیں، اب میں چلتی ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ وہ یکدم ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے بیٹھا وہ لڑکا بھی ہڑبڑا کا اٹھا۔

”آ..... آپ..... بیٹھے تو..... سہی..... پلیز.....“ اس نے عاجزی سے کہا۔ اس کا لہجہ یکدم ہی بدلا تھا۔ مریم نے بہت وقت سے اس کی جانب دیکھا۔ نجانے کیوں اس لڑکے کے انداز نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس کے گورے رنگ پر بڑھی ہوئی شیو، ننھی ننھی چوٹیوں کی مانند لگ رہی تھی۔ اس کے بال بے حد چکنے ہو رہے تھے اور اس نے انہیں کچھ باندھ رکھا تھا۔ مریم کو یاد آیا کہ یہ لڑکا اس نے شاید پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔
 ”آپ مایہن کی فرینڈ ہیں؟ آپ کو پہلے تو کبھی مایہن کے ساتھ نہیں دیکھا۔ آپ..... آپ تو شاید نرس ہیں نا۔ میرا مطلب آپ جاب کرتی ہیں نا؟“

وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ مریم نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی خوشی اور اشتیاق پھیلا ہوا تھا۔ اماں بی نے بھی کسی قدر حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ لفظ ”نرس“ پر وہ بے طرح چوکی تھیں۔

”ہیں بیٹا! تم نرس درس ہو کیا؟ مایہن سے کہاں ملاقات ہو گئی تھی تمہاری؟“ جن شلوک کا اظہار وہ لڑکا کچن میں کر رہا تھا، اماں بی ان شلوک کا شکار اب ہونے لگی تھیں۔

”اماں بی! آپ پہلے انہیں پانی تو دیجئے۔“ اس نے اماں بی سے کہا اور پھر ان کا انتظار کیے بغیر خود اٹھ کر گلاس اسے پکڑ لیا۔

”آپ پلیز کوئلڈ ڈرنک پیجئے۔“ بائی واوے، آپ نے مجھے پہچانا۔ آئی ایم سمج..... آپ میرے پاپا کے ہاسپٹل میں ہی ہوتی ہیں نا..... میں بلڈ ڈونیشن کے لیے آیا تھا آپ کا نام مریم ہے نا؟“ وہ لہجے میں بے پناہ چاہت سمونے کہہ رہا تھا۔ اس کے انداز لہجہ مریم کو مزید محتاط کر رہے تھے۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ لڑکا جانا پہچانا کیوں لگ رہا ہے۔ یہ وہی لڑکا تھا، جسے ”لطیفہ“ سمجھ کر اس نے تزئین کو بہت شوق سے سنایا تھا۔

”آپ کو یاد آیا..... ہم پہلے مل چکے ہیں نا؟“ وہ امید کا ایک جہان آنکھوں میں بسائے پوچھ رہا تھا۔ مریم نے مشکل مسکرانے کی کوشش کی۔

”مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ آپ مایہن کی دوست ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ سرجن مرقضی کا بیٹا تھا مگر ان کی نسبت وہ کسی قدر معصوم دکھائی دیتا تھا۔ اس کے انداز میں بچپنا بہت زیادہ تھا۔ مریم نے آدھا گلاس اسکو اش پینے کے بعد اسے میز پر رکھ دیا۔

”مجھے جانا ہے۔“ اس نے بس یہی کہا تھا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ پلیز ابھی مت جائیئے۔“ وہ لڑکا اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

”نہیں، مجھے بہت کام ہے۔“

اس نے بجلت سے کہا اور پھر خود ہی باہر کی سمت چل دی۔ سمجھ عرف سنی اس کے پیچھے پیچھے تھا جبکہ اماں بی وہیں صوفے پر بیٹھی حیران پریشان ان دونوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ مریم کا انداز تو حیران کن تھا ہی، سنی کا انداز حیران کن ”ترین“ تھا۔

☆ ☆ ☆

”اماں بی! میں کیسا لگ رہا ہوں۔“ اس نے قدم آدم آئینے میں اپنے سر اپے کوتقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے ان سے دریافت کیا۔ وہ چند منٹ قبل اس کے بیڈروم میں اسے کھانے کے لیے بلانے آئی تھیں مگر اب اس کی جج دجج دیکھ کر حیران کھڑی تھیں۔ سیاہ ڈنڑو پیس میں اپنی لہرائی زلفوں کو اس نے بلوڈائی کر کے کندھوں پہ پھیلا رکھا تھا۔ اپنے پارلر سے وہ خاص طور سے آج فرنیچ کٹ بنوا کر آیا تھا۔ اس کے دوستوں کا خیال تھا کہ وہ فرنیچ کٹ میں بہت ڈسینٹ اور مرد لگتا ہے۔ وہ ویسے بھی اپنی ”لڑکوں“ والی لک سے تنگ تھا۔ اس کا ذاتی خیال تھا، لڑکیاں لڑکوں کے بجائے مردوں کو زیادہ پسند کرتی ہیں۔

”میں ڈشنگ لگ رہا ہوں نا اماں بی!“ اس نے Eternity کی بوتل اٹھا کر اپنے اوپر خوب اسپرے کرتے ہوئے پھر پوچھا۔

”ارے بیٹا! اس وقت اتنی خوشبو لگائے کدھر جا رہے ہو۔ تمہارے بالوں سے تو میں غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ کسی جن بھوت نے پشت سے دیکھ لیا تو عاشق ہونے میں لمحہ بھر ہی لگے گا بیٹا!“ اماں بی کو کافی سے زیادہ حیرت ہو رہی تھی۔ اماں بی کی بات پر اس نے زبردست قہقہہ لگایا جو کہ اس کے اچھے موڈ کی غمازی کر رہا تھا۔

”میں ایک پری کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہا ہوں، جن بھوت کا چانس ہی نہیں بنتا۔ آپ فکر مت کیجئے۔“ وہ پلٹ کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوا پھر اپنا سیل فون اٹھایا، گاڑی کی چابی اٹھائی۔ آئینے میں خود کو ایک بار پھر دیکھا اور دروازے کی سمت بڑھا مگر ایک دم سے دوبارہ پلٹ کر آیا اور اماں بی کے قریب آکر ان کی گردن میں بانئیں حائل کرتے ہوئے پیشانی کو چوما۔

”اماں بی! پلیز پلیز می کو نہیں بتائیے گا۔“ وہ سفارشی انداز میں کہہ رہا تھا پھر ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گیا۔ ”یہ حادثاتی ڈیٹ“ تو اس کی زندگی میں بغیر کسی منصوبہ بندی کے آئی تھی۔ آج دوپہر کو مایہن کی کسی دیرینہ سبیلی کی صورت میں اس مہربان پری کو دیکھ کر وہ حیران و پریشان ہو گیا تھا۔ ایسا تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ لڑکی جس کے عشق میں وہ گوڈے گوڈے ڈوب چلا ہے، خود چل کر اس کے گھر آسکتی ہے۔ اس کی تو گویا لارڈی نکلی تھی مگر مریم نے شاید اس کے اور اماں بی کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو سن لی تھی، تب ہی وہ کافی کنفیوز دکھائی دے رہی تھی۔ سمجھ کو پہلی مرتبہ اپنی بڑبولی طبیعت پر غصہ آیا۔ وہ اپنے رویے کا الزام کرنا چاہتا تھا۔ سمجھ اسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔

”آپ..... مایہن کے بھائی ہیں؟“ اس نے اچانک پوچھ لیا تھا اور سمجھ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”آپ کے مہمان آئے ہیں۔“ وہ زینت آرا کی طرف یاس بھری نگاہ ڈالتی باہر کی سمت چل دی۔
 سچ مرتضیٰ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولے باہر ہی کھڑا تھا۔ اس کی ”تیاری“ دیکھ کر مریم کو عجیب سی
 الجھن ہوئی۔ وہ ”ویسے کا دولہا“ لگ رہا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر وہ بیثبات سے مسکرایا مگر پھر آنکھوں میں
 الجھن آمیز مایوسی نے ذرا کی ذرا جھلک دکھائی۔ اس نے مریم کو سر سے پیر تک بغور دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں
 وائٹ لٹی کا بوکے تھا۔

”میں لیٹ تو نہیں ہوانا؟“ گاڑی کے بالکل قریب پہنچنے پر اس نے پوچھا۔ مریم نے صرف نفی میں
 گردن ہلائی اور پھر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے وہ بوکے تمام لیا۔
 اس نے خود مریم کے لیے گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے اندر بٹھایا۔ اپنی نشست سنبھالنے کے بعد
 اس نے سب سے پہلے کیسٹ پلیئر آن کیا۔ ایک انگلش نمبر دہیسی آواز میں بجنے لگا۔ اس نے بہت تیز پرفیوم لگا
 رکھا تھا۔

”ایک بات پوچھوں؟“ سچ نے سگنل پر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ مریم کو اس کے انداز پہلے ہی کچھ
 چونکا رہے تھے۔ اس سوال نے اسے مزید چونکایا۔

”آپ ہمیشہ اتنی بڑی بیڈشیٹ..... میرا مطلب ہے اتنی بڑی چادر لے کر باہر نکلتی ہیں؟“ مریم نے
 اس کی جانب دیکھا، جہاں کسی قدر خفشت کی سرخی نمایاں تھی۔ وہ اس پر طنز نہیں کر رہا تھا، مگر اس کے چلیے سے عجب
 سی تذبذب میں گھرا ہوا ضرور نظر آ رہا تھا۔

”آئی ایم سوری..... پلیز آپ میری بات کا غلط مطلب مت لیجئے گا۔ آپ اس طرح بھی بہت
 اچھی لگ رہی ہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ مریم خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی۔ باقی کا راستہ خاموشی میں کٹا۔
 وہ دل ہی دل میں الفاظ ترتیب دیتی رہی۔

گاڑی ایک وسیع و عریض ہوٹل کے سامنے جا کر تھیں۔ مریم نہیں جانتی تھی، وہ کون سا ہوٹل ہے مگر
 اس کے باہر ایک بڑا سا پارکنگ لاث اور وہاں گاڑیوں کی لمبی قطار ثابت کر رہی تھی کہ کوئی شاندار جگہ ہے۔ سچ
 نے پارکنگ لاث میں بڑی مشکل سے جگہ حاصل کی تھی، لیکن جب دروازہ کھول کر باہر اترنے کی باری آئی تو مریم
 نے گھبرا کر کہا۔

”مم..... میں اندر نہیں جاؤں گی۔ ہم یہیں بات کر لیتے ہیں۔“
 ”آپ اتنا گھبرا کیوں رہی ہیں مریم! اندر چل کر بیٹھیں ہیں۔ اطمینان سے بات کریں گے۔ فکر مت
 کیجئے میں آپ کو کھانا نہیں جاؤں گا۔“ اس کے لیے سچ میں شوخی در آئی۔ اس شوخی کا مفہوم مریم کے لیے قطعاً ناقابل
 فہم تھا۔ وہی خوف جو اس کے دل میں سرجن مرتضیٰ کے حوالے سے تھا، ایک دم ہی سچ مرتضیٰ سے ویسا ہی خوف
 محسوس ہوا۔

”نہیں، آپ واپس چلیے۔ پلیز آپ واپس چلیے۔“ مریم نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ سچ نے الجھ

”سگے بھائی؟“ مریم نے ایک اور سوال پوچھا۔
 ”جی..... ایک دم سگ بھائی۔“ سچ نے لہجے میں شرارت سموی تھی۔
 ”مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے مگر یہاں پر نہیں۔“ اس نے گردن جھکا کر بہت دھیمی
 آواز میں کہا۔ سچ کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ بات تو اسے بھی کرتا تھی۔

”پھر کہاں پر..... کسی ریسٹورنٹ میں..... میں آپ کو پک کر لوں گا۔“ اس نے فٹ پتھر پر گرام
 ترتیب دیا۔ بات ڈنر پر منتج ہوئی۔ سچ نے مریم کا ایڈریس وغیرہ سب پہلے ہی حاصل کر لیا تھا بلکہ وہ تو دو تین
 مرتبہ ہاسٹل جا کر اسے دیکھ بھی چکا تھا۔ عشق کا بھوت اس کے سر پر سوار تھا، اسی لیے اب وہ سچ دھجج کرنی آن بان
 سے گھر سے نکلا۔ اس کی ذاتی گاڑی نہیں تھی مگر وہ اپنے پاپا کی گاڑی مانگ کر لایا تھا۔ ہوٹل کا بل ادا کرنے کے
 لیے کچھ اپنی پاکٹ مٹی تھی اور کچھ می سے منت ساجت کر کے حاصل کی تھی۔ اس کی جیب میں ٹھیک ٹھاک رقم سے
 بھرا والٹ، موبائل فون اور بہترین برانڈ کی سگریٹ کی ڈبیا بھی تھی۔ ایک دوست نے کسی اچھے وقت میں یہ گر کی
 بات بتائی تھی کہ لڑکیاں سگریٹ پینے والے لڑکوں کو بہت پسند کرتی ہیں۔ وہ بہت دھیمی رفتار میں ڈرائیو کر رکھا
 تھا کیونکہ جو ٹانگو سیٹ ہوئی تھی، اس کے مطابق ابھی کچھ وقت باقی تھا اور پھر ابھی اسے مریم کے لیے کچھ بھی
 لینا تھا۔

☆ ☆ ☆

”مجھے ڈر لگ رہا ہے زینت آپ! میں کیا کروں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ اس نے تقریباً روتے
 ہوئے زینت آپ سے فریاد کی۔ وہ جب سے سرجن مرتضیٰ کی اہلیہ کے گھر سے آئی تھی، اسی ایک فقرے کی گردان
 کر رہی تھی۔ زینت آپ آرا خود سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ اس کی مدد کریں تو کیسے کریں۔ میٹرن کو تو انہوں نے مریم کی
 جھوٹی سچی رشتہ داریوں کے متعلق بتا کر کسی قدر محتاط کر دیا تھا، مگر سرجن مرتضیٰ کا وہ کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ تھک ہار کر
 یہی حل نظر آ رہا تھا کہ ان کے نو عمر بیٹے کو ساری صورت حال سے آگاہ کر کے مدد مانگی جائے۔ مریم اس سے
 ملاقات کا وقت طے کر آئی تھی مگر اب الجھن میں پڑی تھی کہ اس لا ابالی لڑکے کو بتائے تو کیا بتائے۔

”اسے میری بات سمجھ میں ہی نہیں آئے گی اور سمجھ میں آ بھی گئی تو وہ میری بات کا یقین نہیں کرے
 گا۔ وہ بدھو سال لڑکا ہے، میں اسے کیسے یہ سب بتاؤں گی۔“ اس نے پھر کہا۔ اس کی آنکھیں روتے رہنے کے
 باعث بہت سرخ ہو رہی تھیں۔ اور گوری رنگت پر یہ سرخ آنکھیں اس کے جن کو مزید دواؤں سے کر رہی تھیں۔

”تمہارے پاس یہی ایک آخری موقع ہے۔ اس کو بھی گناہ دو گی تو پھر کیا کرو گی۔ اچھا چل میرے
 کہنے پر ایک بار اس سے بات کر کے تو دیکھو۔“ انہوں نے سرجن مرتضیٰ کے بیٹے کے بارے میں ڈاکٹر عادل
 سے کافی کچھ سن رکھا تھا۔ انیس سالہ سچ مرتضیٰ اپنے باپ سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتا تھا۔ مریم ان کے کہنے
 پر بمشکل آئی۔ منہ ہاتھ دھونے اور بال باندھنے میں اسے بمشکل دس منٹ لگے تھے۔ وہ اپنی سیاہ چادر اوڑھ کر
 تیار ہو گئی تھی۔ سوا سات کے قریب اسے بلاوا مل گیا تھا۔

کر اس کی جانب دیکھا۔

یہ کیسی ڈیٹ تھی جس میں لڑکی نے ایک بار بھی مسکرا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا، اس کی تیاری کی تعریف کی تھی نہ ہی اس کے لائے ہوئے پھولوں کو سراہا تھا۔ وہ تو گھر سے نہ جانے کتنے پلان بنا کر آیا تھا مگر یہاں تو سب کچھ الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔

”لڑکیاں غرے بہت کرتی ہیں۔ آرام سے کبھی اپنے دل کی بات نہیں کہتیں۔ ایک لڑکی آئی لو یو کہنے میں جتنا وقت لیتی ہے، ایک لڑکا اتنی دیر میں کسی دوسری لڑکی سے شادی کر کے ابا جان بھی بن چکا ہوتا ہے۔“ اسے کاشف نے یہ بات خاص طور پر بتائی تھی۔ سمجھ نے گہری سانس بھر کر مزید کوئی استفسار کیے بغیر گاڑی واپس موڑ لی۔ اسے کاشف کی بات کا یقین آتا جا رہا تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ مریم کچھ تو بولے کہ بہر حال یہ ”ڈیٹ“ اس کے کہنے پر رائج کی گئی تھی، مگر وہ خاموش تھی بادل خواستہ وہ بھی خاموش تھا۔ گاڑی اس نے دوبارہ وہیں جا کر روکی، جہاں مریم کو پک کیا تھا۔ مریم اب بھی گاڑی میں ہی بیٹھی رہی۔ اپنی انگلیوں کو مروڑتی وہ عجب شش و پنج میں گہری تھی۔

”مجھے..... آئی ایم سوری..... میں نے آپ کا قیمتی وقت..... ضائع کیا۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بات کر رہی تھی۔

”اودہ کم آن مریم؟ میں پریڈیٹ نہیں ہوں کسی ملک کا، اور میرا وقت بھی بالکل قیمتی نہیں ہے۔“ اس نے سر جھٹک کر کہا۔ مریم نے سراٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے نقوش میں سرجن مرتضیٰ کی شباهت تھی۔ وہ ماہین مرتضیٰ کی طرح باتوں کی نہیں تھا بلکہ وہ کسی قدر معصوم اور کھلنڈر اسالڑکا لگتا تھا۔ مریم اس سے اس کے والد محترم کے بارے میں کیسے بات کرتی۔

”میں جانتا ہوں آپ کو مجھ سے کوئی بات کرنی ہے۔ ان فیکٹ بات تو مجھے بھی کرنی ہے۔ اینڈ آئی ایم شیور، ہمیں ایک دوسرے سے ایک ہی بات کرنی ہے۔ مجھے بھی آپ ہی کی طرح..... یونو..... میں بھی تھوڑا..... کانٹس ہو رہا ہوں۔“ وہ کندھے اچکا کر مسکراتے ہوئے بولا۔ مریم نے پوری آنکھیں وا کر کے اس کی جانب دیکھا، وہ کیا کہنے والا تھا۔

”آپ کچھ مت کہیے، میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ بس مجھے اتنا بتا دیجئے میرے اسٹمپلش ہونے کا انتظار کر لیں گی؟“ اس نے آخری بات بہت تیزی سے کہی۔ مریم اس نئی افتاد پر حیران پریشان ہونے کی طرح منہ اٹھائے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”ویسے تو می کی سب دولت میری ہے، پاپا کا بھی سب کچھ میرا ہے لیکن پھر بھی میں ابھی شادی نہیں کر سکتا۔“ وہ مزید کہہ رہا تھا۔ اس سے زیادہ سننے کی مریم میں ہمت نہیں تھی۔ وہ بے وقوف سالڑکا بات کو کہاں سے کہاں لے گیا تھا۔

”آپ..... آپ میری بات سمجھ نہیں۔“ اس نے وضاحتی انداز میں لب کھولے، مگر پھر بھی کچھ کہہ

نہ پائی۔ لا تعداد آنسو پلکوں کی بازوؤں نے کو بے تاب تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونا شروع کر دیا اور لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے نکلنے لگے۔ ب بھی وہ خاموش رہتی تو نجائے مزید کیا نقصانات ہوتے۔

سکیوں کے انک انک کر وہ اسے سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

”آپ جھوٹ بول رہی ہیں، بکواس کر رہی ہیں آپ!“ سمجھ مرتضیٰ نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چلا کر کہا۔ اس کا چہرہ بے انتہا سرخ ہو رہا تھا یقیناً وہ ضبط کی آخری منزل پہ تھا۔

☆ ☆ ☆

”مے آئی کم اپا پاپا!“ اس نے ذرا سی گردن دروازے سے اندر کرتے ہوئے اجازت طلب کی۔ مرتضیٰ احسن کسی ایکسرے رپورٹ کو دیکھ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر بے طرح چونکے۔ فوراً گھڑی کی جانب نظر کی۔ اس وقت تو وہ کبھی بھی ان سے ملنے ہاسپٹل نہیں آیا تھا۔

”آؤ یگ مین، اندر آ جاؤ۔“ تمھیں کب سے اجازت کی ضرورت پڑنے لگی۔ انہوں نے بٹاش لہجے میں کہا۔ سمجھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ انہوں نے حیرانی سے اس کے حلیے کا جائزہ لیا۔ اس نے خود کو اس حلیے میں ڈھالنے کے لیے یقیناً ٹھیک ٹھاک محنت کی تھی۔

”بہت ہینڈم لگ رہے ہو۔“ انہوں نے مسکرا کر اس کی تعریف کی مگر وہ مسکرایا تک نہیں۔ اس کی آنکھوں میں ناقابل فہم قسم کے تاثرات تھے۔ وہ خاموشی سے ان کے مقابل بیٹھ گیا۔

”ماہین کے نکاح کا فنکشن کیسا رہا۔ سنا ہے تمہاری می نے بہت رقم خرچ کی ہے۔ جھوٹے منہ ہمیں انوائس کر لیتیں۔ ان کے خزانے میں کوئی کمی تو واقع نہ ہوتی اور پھر ماہین کو دیکھو، جاتے ہوئے ایک بار مجھ سے مل ہی لیتی مگر وہ بھی اپنی می کی طرح مجھے کچھ خاص پسند نہیں کرتی۔“ وہ شکوہ کنائے انداز میں کہہ رہے تھے۔ سمجھ نے ان کی بات کی تائید کرنے کے بجائے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اس کے اندر اٹھل پھٹھل مچی ہوئی تھی۔ مریم چوہدری نے اسے جو کچھ بتایا تھا، وہ بہت شرمناک تھا۔ اس کے پاپا کے بارے میں اس کی می کی رائے ہمیشہ ہی کچھ مشکوک رہی تھی۔ عادل بھائی سے اس نے کئی مرتبہ اپنی می اور پاپا کے بیچ موجود اصل تنازعے کی بابت پوچھا مگر انہوں نے بھی اسے ہمیشہ ٹال دیا تھا۔

”تمہاری ماں میں بہت برداشت ہے بیٹا! مگر کچھ باتیں عورتیں کبھی برداشت نہیں کرتیں۔“

اماں بی نے ایک بار اس سے کہا تھا اور تب وہ ان کی بات بالکل بھی نہیں سمجھا تھا۔ اس کے پاپا اتنے قابل، اتنے ڈشک، اتنی شائدار انسان تھے۔ ان میں کوئی ایسی خامی نہیں تھی جسے ناقابل برداشت کہا جاتا۔ وہ آج تک اپنی می کو ہی ناقابل برداشت سمجھتا تھا جو انتہائی جذباتی عورت تھی۔ انہیں ہمیشہ یہ خوف لاحق رہتا تھا کہ ان کا بیٹا انہیں چھوڑ کر ان کے سابقہ خاوند کے ساتھ رہنے لگے گا۔ سمجھ ہمیشہ سوچتا تھا کہ اس کی می صرف اس لیے خائف ہیں کہ وہ غلطی پر ہیں۔ اگر وہ غلط نہ ہوتیں تو اس قسم کے خدشات کا شکار کیوں ہوتیں۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ اس طرح سے میری طرف یاد دیکھ رہے ہو۔“ انہوں نے مسیح کی آنکھوں میں پھیلی سرد مہری کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں..... آئی ایم فائن..... آپ کیسے ہیں؟“ اس نے شہادت کی انگلی سے میز کی ہموار سطح کو کھرچتے ہوئے کہا۔

”میں بھی ٹھیک ہوں۔ یہ کیس ہسٹری اسٹڈی کر رہا تھا۔ یہ بہت کمپلیکسڈ کیس ہے۔ میری زندگی میں تو بس یہی کچھ رہ گیا ہے۔ آج کی رات اسی کیس کو اسٹڈی کرتے گزر جائے گی۔ کبھی کبھی تو شکر کرتا ہوں کہ لوگ ہڈیوں کے عارضے میں کثرت مبتلا ہوتے ہیں، وگرنہ زندگی میں میرے پاس تو کرنے کے لیے کچھ نہ ہوتا۔ میرا تو وقت ہی نہ گزرتا۔“ انہوں نے ہمیشہ کی طرح لہجے میں تمام تر محرومی کو سموتے ہوئے دکھڑا دیا۔

”میں خود بھی اکثر یہی سوچتا ہوں کہ آپ کا وقت گزرتا کیسے ہوگا۔“ اس نے سابقہ انداز میں کہا۔

اب کی بار مرتضیٰ احسن دل ہی دل میں کچھ جبریز ہوئے۔ مسیح بات بہت سادہ کر رہا تھا مگر اس کا انداز قطعاً سادہ نہیں تھا۔

”اچھا اب میرے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بس دس منٹ میں یہاں سے آف ہو رہا ہوں پھر کسی اچھی جگہ ڈنر کے لیے چلتے ہیں۔“ انہوں نے اسے تسلی دی۔ مسیح نے گہری سانس بھری۔ اس کا باپ اس کے سامنے تھا۔ اسے ان کے چہرے پر ہمیشہ ایک تازگی، ایک نور بکھر نظر آتا تھا جو بہت خوش قسمت لوگوں کے چہرے پر ہوتا ہے۔ وہ اس چہرے سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ چہرہ تھا جو اسے زندگی میں کسی مقام پر مایوس نہیں ہونے دیتا تھا اور اب یہی چہرہ اسے یکدم سیاہ کیوں لگنے لگا تھا۔ تمام تر وجاہت و وقار کے باوجود اس کا سراپا یکدم دھندلا کیوں ہو رہا تھا۔ اس کی مئی تمام زندگی اشاروں میں اسے بہت کچھ بتانے کی کوشش کرتی رہی، مگر اسے کبھی یقین نہ آیا اور گھنڈہ بھر پہلے ایک لڑکی نے آنسوؤں کی روانی میں اسے جو کچھ بتایا تھا، وہ نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں تھا۔

”پاپا! مجھے..... آپ کے ساتھ ڈنر نہیں کرنا۔“ اس نے قطعیت سے کہا۔ مرتضیٰ احسن نے استفہامیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

”مجھے آپ کے ساتھ..... ایک بات کرنی ہے..... بہت ضروری۔“ وہ اب کی بار ان کی جانب دیکھ کر بات نہیں کر پایا تھا۔ وہ گناہ گار نہیں تھا مگر شرمساری اسے اس طرح گھیرے ہوئے تھی جیسے وہی گناہ گار ہے۔

”مجھے آپ کو کسی سے ملوانا ہے۔“ اس کی بات پر مرتضیٰ احسن نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اس کا کوئی افیئر چل رہا تھا، یہ بات تو وہ جانتے ہی تھے۔

”شیوور..... وائی ناٹ ڈیر! تمہاری خاطر میں کسی سے بھی مل سکتا ہوں۔“ انہوں نے بہت محبت سے کہا۔

”پاپا! میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے لڑکی بھی پسند کر لی ہے۔ اندر آ جائیے مریم!“ اس کی

آواز مزید دھیمی ہوئی تھی۔ لہجے میں نمی کی آمیزش تھی۔ مرتضیٰ احسن نے اسے چونک کر دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کی سمت چل دیا۔ دروازہ کھول کر اس نے کسی کو اندر آنے کے لیے کہا۔

”پلیز مریم! اندر آ جائیے، کوئی آپ کو کچھ نہیں کہے گا اور اگر کوئی آپ کو کچھ کہے گا تو میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گا۔“ آخری بات اس نے ان کی جانب دیکھ کر کہی تھی۔ کمرے کے اندر آنے والی شخصیت کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ ان کو لگنے والا حیرت کا جھٹکا بہت شدید تھا۔

”پاپا! میں مریم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، آپ ان کو بخوبی جانتے ہیں۔ مجھے امید ہے آپ کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔ لیکن مریم کو ذرا سا اعتراض ہے۔ آپ کے کسی دوست کو کچھ دن..... کے لیے مریم کی ضرورت.....“ وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پایا تھا جبکہ مرتضیٰ احسن ہکا بکا ہو کر اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

”مریم کی ضرورت ہے نا آپ کے دوست کو..... آپ ہی کی عمر کا ہوگا نا وہ۔ میں نے مریم سے کہہ دیا ہے۔ وہ آپ کے دوست کے پاس جاسکتی ہے۔ جاسکتی ہے نا پاپا! بولیے نا پاپا؟“ اب کی بار شاید اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے تھے۔

”کیا بکواس ہے یہ سب۔ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کون ہے یہ لڑکی، دو ٹکے کی نرس۔ یہ مجھ پر ہمت لگا رہی ہے۔“ وہ چلا کر بولے۔

”پاپا! میں..... آپ کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ آپ ایسے تو نہیں تھے پاپا! یہ تو آپ کی بیٹی کے جیسی ہے۔ یہ تو آپ کے لیے مایہ ناز کے جیسی ہے۔ مایہ ناز کہتی تھی، آپ اسے اچھے نہیں لگتے۔ آپ کی موجودگی میں اسے الجھن ہوتی تھی۔ کیا اسے بھی ایسی ہی الجھن ہوتی ہوگی جیسی مریم کو آپ کی موجودگی میں ہوتی ہے۔ کہئے نا پاپا!“ وہ رونے لگا تھا۔ اچھا خاصا لبا چوڑا لڑکا رو رہا تھا اس قدر عجیب لگ رہا تھا۔

”یہ بکواس کر رہی ہے سنی! میرے بیٹے..... یہ چالاک عورتیں تم ان کی چالاکی کو نہیں سمجھ سکتے یہ.....“ مرتضیٰ احسن کو خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو کس طرح وضاحت دیں۔ وہ صفائی سے مکر گئے تھے۔ انہوں نے مریم کی کہانی کو گھڑا ہوا افسانہ قرار دیا تھا مگر کب تک..... وہ بہت دیر تک مسیح کے سامنے ڈٹے نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ ان کے سامنے بیٹھا بلک بلک کر رو رہا تھا۔ نفس کے مارے ہوئے، برائی کی ذلت سے مالا مال شخص کو بیٹے سے محبت تھی، اسی لیے اس نے اب تک خود کو بیٹے کے سامنے دیوتا بنا کر پیش کیا ہوا تھا اور اب سیاہ چادر میں لپیٹی سفید لباس میں ملبوس میحانی کی علامت ایک نرس ان کے سارے جموٹے وقار کو کچھ بھر میں منی میں ملا گئی تھی۔ انہیں بازی کے اس طرح پلٹ جانے کی امید نہیں تھی۔ ان کا بیٹا ان کا حریف کے روپ میں ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ مریم چوہدری نے ان دونوں کی جانب دیکھا۔

”شیطان کے یہاں ہمیشہ ہی شیطان جنم نہیں لیتا۔“ اس نے اپنی نم آنکھوں کو صاف کیا۔ اس کا مسئلہ کسی اور کا مسئلہ بن چکا تھا۔ وہ ان دونوں کو چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس بات کو تقریباً ساڑھے تین سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ان ساڑھے تین سالوں میں اس کہانی سے بڑے تمام افراد کی زندگی میں کسی قدر سکون آچکا ہے۔ مریم چوہدری جو اسی روز واپس اپنے گھر بھائی پھیرو چلی گئی تھی، اس کے لیے وہ خونخوار جھوٹا سا عادی ہی کافی تھا۔ اس کے سارے عزائم، سارے خواب پل بھر میں خاک ہو گئے تھے۔ اس نے اگرچہ بھائی پھیرو جانے سے قبل تمام باتوں کو اپنے اندر دفن کر دیا تھا مگر پھر بھی اس کی ذہنی حالت کافی منحوس تھی۔ اس نے حیدر کو سب واقعات مکمل تفصیل کے ساتھ بتا دیے تھے۔ اس کی اور حیدر کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔

ترتین بخاری اپنے شوہر کے ساتھ دام میں مستقل سیٹل ہو چکی ہے۔ اس کے دل میں اگرچہ اپنی ماں سے چھپ کر کورٹ میرج کرنے کا ملال باقی ہے۔ مگر پھر بھی وہ مطمئن ہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو اس کی شادی بھی اس کی بہن کی طرح ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ کر دی جاتی۔

روبینہ پائین کو نرسنگ کا چار سالہ کورس مکمل کیے ایک سال ہو چکا ہے۔ وہ اب بھی وہیں ہے۔ سچی مرتضیٰ آج کل سڈنی میں ہے۔ اس کی زندگی میں بہت ٹھنڈا آچکا ہے۔ وہ پہلے کی طرح غیر ذمہ دار اور کھلنڈر نہیں رہا۔ اس کی کمی بھی اس کے ساتھ سڈنی میں ہوتی ہیں۔ انہیں اپنے بیٹے پر فخر ہے۔ گزشتہ ساڑھے تین سالوں نے اسے ایک فرمانبردار بیٹے کے روپ میں ڈھال دیا ہے۔ اس کی کمی کو اپنے ان بے جا خدشات پر ہنسی آتی ہے جو انہوں نے خواہ مخواہ سچی کے حوالے سے پال رکھے تھے۔ وہ بھی اپنے پاپا سے اتنی ہی نفرت کرتا ہے جتنا کہ اس کی مامی۔

سلطانہ (میٹرن) کا چند دن پہلے بائی پاس ہوا ہے۔ ڈاکٹر ز بہت زیادہ پر امید نہیں ہیں۔ تمام تر کوشش کے باوجود ان کی صحت میں کوئی بہتری نہیں آ پارہی۔ ان کے گھر میں ان کے لیے بہت ”پڑھائی“ ہو رہی ہے مگر ”پڑھائی“ بھی ادویات کی طرح بے اثر ہے۔

سرجن مرتضیٰ اب بھی اس ہاسپٹل کے ایک اہم ستون گردانے جاتے ہیں۔ وہ اب بھی اتنے ہی شاندار ہیں جتنے کہ ساڑھے تین برس پہلے تھے۔ ان کو دیکھ کر یقین آ جاتا ہے کہ کچھ لوگوں کا وقت بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ اب بھی اسی طرح پارٹیز میں شرکت کرتے ہیں اور سوشل سرکل میں مود کرتے ہیں جیسے پہلے کرتے تھے۔ ان سے کسی کو شکایت نہیں ہے، سوائے ان سائیکو تھراپسٹ کے جن کی ہدایات پر سرجن مرتضیٰ بالکل عمل نہیں کرتے۔ سرجن مرتضیٰ کو رات بھر نیند آنے کی بے ضروری بیماری ہے، جس کا اثر ان کی آئی سائٹ پر پڑا ہے اور اب انہیں زیادہ موٹے عرصے والا چشمہ استعمال کرنا پڑتا ہے مگر ایسی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کی رسی لٹھ نے ابھی تک ڈھیلی رکھی ہوئی ہے۔

زیانت آرا ابھی تک اسی ہاسپٹل میں ہیں۔ ان کے عزم اور حوصلے میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔ وہ آج بھی نئی آنے والی اسٹوڈنٹ نرسز کے لیے مشعل راہ ہیں۔ وہ آج بھی چھوٹے چھوٹے دیہاتوں سے آنے والی لڑکیوں کو بڑے بڑے مصائب سے بچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کے پاس بہت سے روپے نہیں ہیں مگر وہ

رات کو بہت پرسکون نیند سوتی ہیں۔ ایسی نیند جو بہت نصیب والوں کو نصیب ہوتی ہے۔

ان سب چیزوں کے علاوہ جو چیز ابھی تک ویسی کی ویسی ہے، وہ ہے نرسنگ کے پرفیشن اور نرسز کی طرف ہمارا عمومی رویہ۔ جی ہاں، ہم سب کا رویہ۔ ہم آج بھی نرس کو سسٹر کہتے ضرور ہیں، مگر اسے سسٹر والی عزت نہیں دیتے۔ حالانکہ ایک نرس اتنی ہی قابل عزت ہے جتنا کہ ایک ڈاکٹر۔

ہم ایک ڈاکٹر کی تو عزت کرتے ہیں مگر ایک نرس کی عزت ہم سے نہیں ہوتی۔ حالانکہ یہ ایک عام فہم سی بات ہے کہ جیسے سب ڈاکٹر ز اچھے نہیں ہو سکتے، اسی طرح سب نرسز بھی بری نہیں ہوتیں۔ کم عمری میں اس فیلڈ کو جان کرنے والی معصوم بچیوں کی مانند نازک لڑکیاں جب اپنی اپنی مجبوریوں کی گٹھڑیاں سینے یہاں آتی ہیں تو ان کو بہکانے کے لیے آسان سے فرشتے نہیں آتے بلکہ ان کے ارد گرد موجود لوگ ہی فریضہ سرانجام دیتے ہیں مگر ایک بات ہم سب دھڑلے سے کہتے ہیں کہ ”نرسیں اچھی نہیں ہوتیں۔“ ہم ایک بار بھی نہیں سوچتے کہ نرس نہ ہو تو مریض کی دیکھ بھال کون کرے۔ ایم بی بی ایس کر کے پانچ پانچ سال کتابوں کی دنیا میں غرق رہنے والے میڈیکل آفیسرز جب ہاؤس جابز کے لیے ہاسپٹلوں میں قدم رکھتے ہیں تو انہیں آپریشن تھیمز کی سمت بھی معلوم نہیں ہوتی۔ آپریشن تھیمز کے اندر وہ ایک عام سی فینچی پکڑنے کے لیے بھی نرس کے محتاج ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود ایک نرس کبھی بھی ایک ڈاکٹر کے جتنی قابل عزت نہیں ہوتی۔ دراصل قصور ہم سب کا ہے۔ ہم ڈاکٹر کو باوقار سمجھ کر عزت دیتے ہیں تو ہمیں اس کی مددگار کو بھی اتنی ہی عزت دینی چاہیے تاکہ ایک باوقار پروفیشن کو تمام تر غلاطت سے پاک کیا جاسکے کیونکہ اچھے لوگ ہر جگہ ہو سکتے ہیں، جو ہڑ کے کنول کی طرح۔

یہ کہانی اپنے احوالے اختتام کے ساتھ ہمیں ختم ہو جاتی ہے۔ شاید کچھ کہانیاں بہت جلد اختتام تک نہیں پہنچ پاتیں، ان کو ختم کرنے کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ آئیے ہم سب مل کر انتظار کرتے ہیں۔



احدنا الصراط المستقیم

قرآن کریم کے پانچویں پارے کی چوتھی سورۃ، سورۃ النساء کی 34 ویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا

ہے۔

”مرد محافظ و نگراں ہیں عورتوں پر۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر اس لیے فضیلت دی ہے کہ مرد ان پر اپنے مال خرچ کرتے ہیں تو نیک عورتیں اطاعت گزار ہوتی ہیں۔ وہ (شوہر کی غیر حاضری میں) وفادار رہتی ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے وفاداری کا حکم دیا اور اگر عورتوں کی نافرمانی کا اندیشہ ہو تو (پہلے نرمی سے) انہیں سمجھاؤ اور (پھر) انہیں خواب گاہوں سے الگ کرو (اور پھر بھی باز نہ آئیں تو) اور انہیں مارو (صرف غیر شدید) پھر اگر وہ اطاعت کرنے لگیں تو ان پر کوئی زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ بڑا بلند ہے۔“

آسمان پر ستاروں کا سفر ابھی پوری طرح سے اختتام کو بھی نہیں پہنچا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ نیند کا غلبہ اس قدر حاوی تھا کہ چند لمحے تو وہ بے حس و حرکت پڑی رہی پھر بادل خواستہ جلتی ہوئی آنکھوں سے پلکیں جھپک جھپک کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔

چاند کی تیز روشنی اور ستاروں کا گھٹنا ہوا باہمی فاصلہ ظاہر کر رہا تھا کہ رات کا آخری پہرہ اختتام کو ہے۔ اس کے خوابیدہ چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے اطمینان ہوا کہ وہ مزید کچھ دیر سو سکتی ہے۔ صحن میں رات کی رانی کی مہک پھیلی ہوئی تھی، جو اس کی مدہوشی میں اضافہ کرنے لگی۔ اس نے پورا منہ کھول کر جمائی لی اور پھر دوبارہ سے آنکھیں موند لیں۔

اس کے اندازے کے مطابق اذان ہونے میں ابھی تقریباً آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ وہ وقت کا اندازہ عموماً مظاہر فطرت کی مدد سے لگایا کرتی تھی۔ گھڑی پر وقت دیکھنے کی نوبت بہت ہی کم آتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسے گھڑی میں وقت دیکھنا ہی نہیں آتا تھا۔ اگرچہ اس کے گھر میں ایک بہت خوبصورت سنہرے فریم والی دیوار

گیر گھڑی موجود تھی مگر اس پر وقت دیکھنے کے لیے وہ ساجد کی محتاج رہا کرتی۔

یہ گھڑی ساجد نے شادی کے بعد اسے کسی میلے سے دلوائی تھی اور اس بات سے ناخبر ہونے کے بعد کہ زینب وقت نہیں دیکھ سکتی وہ وقافو قفا سے سکھاتا رہتا۔

”ساجی! تو اپنا وقت کیوں برباد کرتا ہے..... مجھے یہ دل (طریقہ) نہیں آنے کا۔ وہ پانچ اور پانچ برابر دس کے اس کھیل سے بہت جلد اکتا جاتی تھی۔ ساجد نے بھی اس کی عدم دلچسپی محسوس کر کے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

گھڑی ہی کے ذریعے وقت دیکھنا اتنا ضروری بھی تو نہیں تھا۔ زینب کوئی وزیرِ سفیر تو نہیں تھی جو گھڑی کی سوئیوں کے مطابق کام کرتی۔

دراصل زینب کا تعلق انتہائی غریب گھرانے سے تھا۔ ان کے جھونپڑے میں پانی پینے کا گلاس بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس نے اپنے میکے میں گھڑی جیسی کسی چیز کا وجود نہیں دیکھا تھا اس کا گزارا سڑکوں سے کوڑا کرکٹ چن کر ملنے والی رقم سے ہوا کرتا تھا۔

شادی نے اس کے حالات بدل دیے تھے۔ اسے کبھی اس بات کی پروا نہیں ہوتی تھی کہ وہ اس طرح کی نئی نئی چیزیں سیکھے۔ وہ ستاروں کی چال سے سائے کے ڈھلنے سے اور اکثر اوقات گھر میں لگے نیم اور رات کی رانی کے پودے سے وقت کا حساب کتاب کر لیا کرتی تھی اور دلچسپ بات یہ تھی کہ اس کا یہ حساب کتاب ہمیشہ درست ہوتا تھا۔

وہ مزید کچھ دیر اسی سوئی جاگی حالت میں پڑی رہی پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا تھا۔ اس نے ایک دم سے پوری آنکھیں کھول کر آسمان کی طرف دیکھا، آسمان پر ستاروں کی وہی پوزیشن تھی۔ اس نے گہری سانس بھر کر کروٹ بدلی اور پھر اپنی ساتھ والی چارپائی کی طرف دیکھا۔

اس چارپائی پر ایک شخص گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے خراٹوں کی بہت دھیمی سی آواز زینب کے کروٹ بدلتے ہی صاف سنائی دینے لگی۔

”اے..... اٹھو نا..... اذان ہونے والی ہے۔“

اس نے بہت دھیمی آواز اور پیار بھری آواز میں اس شخص کو بیدار کرنے کی کوشش کی مگر توجہ کے عین مطابق وہ شخص کسمسا یا بھی نہیں۔ زینب کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ میں اضافہ ہوا۔

”کئی اوکھی نیند ہے تمہاری..... ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتی..... اٹھ جاؤ اب..... دن چڑھ گیا تو فیہ مجھے الزام نہ دینا کہ جگایا نہیں۔“

اب کی بار اس نے ہاتھ بڑھا کر اس شخص کا کندھا ہلایا۔ اس شخص نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

”دیکھ تھوڑی دیر ہو سو لینے دے..... جیسے ہی پہلی بانگ ہوگی۔ میں چلا جاؤں گا..... آج زیادہ کام نہیں ہے چوہدری غصہ نہیں کرے گا۔“ اس نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ مدھوشی اس کی آواز پر غالب تھی۔

”مجھے کیا، سوتا رہ..... چوہدری نے غصہ کیا تو مجھ پر بڑبڑمت کرتا۔“ وہ دوبارہ سے رخ بدل کر سیدھی ہوتے ہوئے بولی پھر دونوں بازوؤں کو پھیلا کر انگڑائی لی اور آسمان کو تنکے لگی۔

وہ عموماً اذان کی آواز کے ساتھ اٹھنے کی عادی تھی مگر جس روز ساجد کو چوہدری دوسری ذمہ داریاں سونپ دیتا تو وہ جلدی بیدار ہو جایا کرتی تھی۔ اس نے تساہل سے لیٹے لیٹے ایک بار پھر بڑا سامنہ کھول کر بجائی لی اور سامنتوں پر زور دیتے ہوئے کچھ سننے کی کوشش کی۔

جھینگر اور مینڈکوں کی آوازیں بھی نہیں آ رہی تھیں گویا سناٹا ہی سناٹا تھا جسے کسی کے خراٹے توڑنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ زینب نے دوسری سمت کروٹ بدل لی۔ اب اس کے سامنے نیم کا ننھا سادرخت تھا۔ وہ اس کی شاخوں کو ہوا سے لڑتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں نیند دوبارہ حملہ کر رہی تھی مگر اسے جاگنا تھا جب تک کہ ساتھ والی چارپائی پر سویا شخص نہ جاگ جاتا۔

چند لمحوں بعد ہی مرغ کے بانگ کی آوازیں آنے لگیں پھر ساتھ ہی اکلوتی مسجد کا اکلوتا مولوی بھی اونکتے کھانٹے اذان دینے لگا۔ زینب کو مولوی باقر قطعاً پسند نہ تھا۔ وہ جھونٹے قد، چھریرے بدن اور سانولی رنگت والا عام سا آدمی تھا، اس کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ نہایت شریف تھا اور اس کی سب سے بری بات یہ تھی کہ ہمہ وقت اس شرافت کا تذکرہ کرنا پسند کرتا تھا۔

ساجد کی مولوی باقر سے گاڑھی چھتی تھی اس لیے زینب کو اسے برداشت کرنا پڑتا تھا۔ وہ اذان کے کلمات پر غور کرنے لگی۔ اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ وہ سونا نہیں چاہتی تھی مگر نجانے کیسے اسے نیند نہ گھیر لیا۔ اور جب دوبارہ آنکھ کھلی تو صبح کی نیلگوں روشنی دیواروں پر اتر آئی تھی۔

”ہائے بڑا“ زینب نے بے حد گھبرا کر ساتھ والی چارپائی کی طرف دیکھا۔ وہ چارپائی خالی تھی۔ زینب نے سینے پر ہاتھ رکھ کر گہرا سانس بھرا۔

ساجد کے غصے سے وہ ہی نہیں اور بھی ڈرتے تھے۔

☆ ☆ ☆

”Walk in interview“ اس نے اخبار کا اندرونی صفحہ کھولتے ہی اس کیپشن کی طرف دیکھا پھر دلچسپی سے تفصیل پڑھنے لگی۔ مگر کچھ ہی لمحوں بعد اس کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ وہ مارکیٹنگ مینجر کی پوسٹ تھی جس کے لیے کمپنی کی طرف سے MBA مارکیٹنگ کی ڈیپانڈ کی گئی تھی۔

اس کے علاوہ وہ لوگ بھی اپلائی کر سکتے تھے جو کامرس میں ماسٹرز ڈگری ہو لڈر تھے۔ عشا۔

ناک چڑھا کر اپنی مطلوبہ وکیلنسی کا ایڈ تلاش کرنے لگی۔ اس نے سوشیا لوجی میں ماسٹرز کر رکھا تھا بلکہ ڈسٹنکشن کے ساتھ کر رکھا تھا اور اس بات کا اسے زعم بھی بہت تھا۔

وہ بے حد ذہین اور پرمعز و واقع ہوئی تھی۔ اس کا ذاتی خیال تھا کہ وہ قوم کی تقدیر بدلنے کے لیے پیدا کی گئی ہے مگر پڑھائی کے فوراً بعد شادی نے اس کے عزائم کو خاک میں ملا کر رکھ دیا تھا اسی لیے اس خاک کا غبار جب کبھی اس کے دماغ کو چڑھتا تو وہ بے حد قنوطیت کا شکار ہو جاتی تھی۔

”Challenging Career“ اب اس کی توجہ اس ایڈ کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔ اس نے با آواز بلند پڑھا پھر ٹپکی سطروں پر نظر دوڑانے لگی۔

”شخصیت کا پروتار ہونا ضروری ہے..... شخصیت تو میری کافی پروتار ہے۔ انگلش کے علاوہ علاقائی زبان بولنے میں مہارت ہونی چاہیے..... ہاں ٹھیک ہے، نوپرا بلیم..... میں کر سکتی ہوں..... مقامی لوگوں کو ترجیح دی جائے گی ہم.....“

وہ ہنکارا بھر کر کمپنی کا پتہ دیکھنے لگی۔

”مین بولیوارڈ، دوسری منزل گلبرگ III لاہور یعنی عادل کے آفس کے قریب..... ارے یار! یہ تو مسئلہ ہی کوئی نہیں..... مجھے ضرور اہلائی کرنا چاہیے..... میں ضرور اہلائی کروں گی۔“

اس نے دل ہی دل میں تہیہ کیا پھر اس اشتہار پر نشان لگانے کے لیے بال پوائنٹ تلاش کرنے لگی۔ اس نے صوفہ کم بیڈ سے ٹانگیں نیچے فرش پر کیس اور نظریں اخبار کی سمت مبذول کیے پاؤں کی مدد سے ٹول کر سلپر تلاش کرنے لگی اچانک اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا اور ایک ہلکے سے چھنا کے آواز بھری۔

اس نے اخبار چہرے سے ہٹا کر فرش کی طرف دیکھا۔ بیٹھنے سے پہلے بالوں میں تیل ڈالنے کے لیے اس نے تیل کی بوتل فرش پر رکھی تھی۔ پھر اخبار نظر آ گیا تو اخبار میں ایسی مہمک ہوئی کہ تیل کو بھول ہی گئی۔

”کیا مصیبت ہے..... فٹے منہ تمہارا عشاء خاتون۔“

اس نے کوفت سے ناک چڑھا کر فرش کی طرف دیکھا۔ ماسی کچھ دیر قبل ہی صفائی کر کے گئی تھی اور اب فرش پر ٹھیک ٹھاک پھیلاوا کھڑچکا تھا چونکہ غلطی اپنی تھی اس لیے اسے زیادہ غصہ نہیں آیا تھا اگر یہی حرکت خدا نخواستہ عادل سے سرزد ہوئی ہوتی تو اس نے اپنے مجازی خدا کے احترام کو بالائے طاق رکھ کر اسے سخت سست سنائی۔

بڑبڑاتے ہوئے اس نے فرش صاف کیا پھر پاؤں دھوتے ہوئے ناخنوں پر نظر پڑی جو ضرورت سے زیادہ لمبے ہو رہے تھے۔ ان کی تراش خراش سے فارغ ہوئی تو کال بیل بج اٹھی۔

”اس وقت کون آ گیا“ وہ ناگواری سے بڑبڑائی۔ نجانے کیا بات تھی اسے آج صبح سے ہی بہت غصہ آ رہا تھا۔

”آئی! آج کا نیوز پیپر دے دیں۔“ مسز خواجہ کی چھوٹی سی ملازمہ بچی دروازے پر کھڑی کہہ رہی تھی۔

”نجمہ! جلدی واپس کر جانا..... یاد سے ہاں.....“

وہ نیم دلی سے اخبار اسے تھما کر تاکید کرتے ہوئے بولی۔ حالانکہ جانتی تھی اس کی تاکید بے کار ہے۔

دروازہ بند کر کے وہ دوبارہ لوگ روم میں آ گئی۔ مسز خواجہ ان کی مکان مالک تھیں، محترمہ حد سے زیادہ تنگ مزاج اور کنجوس واقع ہوئی تھیں۔ دراصل عادل کو کمپنی کی طرف سے گھر ملا ہوا تھا مگر وہ صدر کے علاقے میں تھا اور پھر عادل کو مناسب نہیں لگتا تھا کہ عشاء اکیلی رہے کہ وہ خود تو صبح کا گیا شام کو واپس آتا تھا اسی لیے جو ہر ناؤن میں یہ گھر کرایہ پر لیا گیا تھا۔

ایچھے وقتوں میں مسز خواجہ کے شوہر نے اپنے اور اپنے بھائی کے لیے ایک سی طرز پر ساتھ ساتھ دو گھر بنوائے تھے مگر ان کے بھائی شادی کے کچھ عرصہ بعد بوسٹن (امریکہ) سدھار گئے تب سے یہ گھر کرائے پر چڑھا رہا تھا۔

عادل نے یہ گھر ڈیڑھ سال قبل کرایہ پر حاصل کیا تھا مگر تب وہ اکیلا یہاں رہتا تھا۔ عشاء کو یہاں شفٹ ہوئے چھ ماہ کا عرصہ ہوا تھا اس سے پہلے وہ راولپنڈی میں سرال والوں کے ساتھ رہتی تھی۔ سرال میں روٹین لائف بہت مختلف تھی وہاں اسے کبھی یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ بے مصرف سی زندگی گزار رہی ہے۔ مگر جب سے وہ لاہور شفٹ ہوئی تھی۔ تب سے اسے لگنے لگا تھا کہ وہ بہت کچھ کر سکتی ہے مگر کچھ کر نہیں پا رہی۔

صفائی ستھرائی اور کپڑے دھونے کے لئے ماسی تھی پھر دو افراد کا کام ہی کتنا ہوتا ہے کہ وہ اس میں مصروف رہتی۔ ٹی وی سے اسے زیادہ شغف نہیں تھا۔ وہ حقیقتاً آج کل ایک سنجیدہ قسم کے مشاغل کی تلاش میں تھی۔

لوگ روم میں آ کر وہ کچھ دیر منہ بسورے بیٹھی رہی، پھر ٹائم دیکھا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب کا وقت تھا۔ اس کی کوفت میں مزید اضافہ ہوا۔

”اف میرے خدا..... اب میں کیا کروں.....“ اس نے گویا بے حد زچ ہو کر سوچا۔ پھر لوگ روم سے اٹھ کر وہ بیڈ روم میں آ گئی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے آپ پر نظر ڈالی، ماتھے پر آئی لٹوں سے چھینڑ چھاڑکی، انہیں سنوارا بگاڑا پھر آئی بروڈ کو دیکھنے لگی کہ آیا انہیں ”چھاننی“ کی ضرورت تو نہیں۔

اس کام سے بھی اکتا کر وہ بیڑ پر آڑی ترچھی لیٹ گئی، کچھ دیر چھت کو تکتی رہی پھر سر ہانے پڑے اپنے پرس سے موبائل نکال لیا۔
 "i hate you" کچھ لمحوں بعد وہ کسی کو sms کے ذریعے یہ پیغام دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شرارتی سی مسکراہٹ تھی۔

☆ ☆ ☆

”اس بار واڈیوں (کٹائی) کے بعد میں نے تجھے بہت اچھا سا تحفہ لے کر دینا ہے، بس دعا کر زینب کہ اس بار مولا اپنا کرم کر دے میں نے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔“ اس نے دیسی گھی میں چڑی موٹی سی روٹی کا لقمہ منہ میں رکھ کر کھکی پیاز کو دانتوں سے کترا۔

اس کے انداز میں بے حد غلٹ تھی اور وہ بے حد رغبت سے کھا رہا تھا۔ نیم کے نیچے بھی چار پائی پروہ اور زینب بیٹھے دوپہر کا کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ دور کہیں سے آنے والی چکی کی آواز چار پائی کے قریب بڑے پیڈسٹل فین کی کھڑکھڑ میں گم ہو کر ایک نئی آواز کو جنم دے رہی تھی۔

”مثلاً کیا.....؟ کیا سوچ رکھا ہے؟“ زینب نے دلچسپی سے پوچھا۔

اس کی روٹی دیسی گھی کی عیاشی کے بغیر تھی اور اس کا انداز بھی ساجد علی کے انداز کی طرح زغبت لیے ہوئے نہیں تھا۔ گود میں بیٹھے ایک سالہ احمد علی کو اس نے باپ کی روٹی سے لقمہ توڑ کر تھما رکھا تھا جسے بچہ چوس چوس کر کھانے میں مگن تھا۔

”مجھے امید ہے اس واری چنگی رقم ہو جائے گی..... اس سال چوہدری پر اللہ نے بڑا کرم کیا ہے..... بڑی شاندار فصل کھڑی ہوئی ہے۔“

وہ اچار کے تیل میں روٹی کا ٹکڑا بھگوتے ہوئے بولا۔

”ہائے ساجی! ماشاء اللہ تو کہہ دے..... نظر ہو جاتی ہے.....“ زینب نے ننھے احمد کو دائیں سے بائیں ٹانگ پر منتقل کرتے ہوئے ٹوکنا ضروری سمجھا۔

”ہاں..... ہاں..... ماشاء اللہ۔“ اس نے غلٹ میں کہہ کر لقمہ منہ میں رکھا اور پھر پیاز کترنے لگا۔ اگلے کچھ لمحے اس کے منہ سے آنے والی چپ چپ کر آوازیں ہی گونجتی رہیں۔

زینب اسی کی طرف متوجہ تھی۔

”اس واری روپے ہاتھ آئیں گے تو سب سے پہلے سارے گھر کی لپائی کروانی ہے۔ اور پچھلے کمرے میں باری (کھڑکی) کی مرمت کروانی ہے۔ کوٹھے کا بنیر (منڈیر) بھی اونچا کرنا ہے۔“

زینب نے چونک کر سر اٹھایا مگر بولی کچھ نہیں، ساجد خود میں مگن کہہ رہا تھا۔

”میرادل چاہتا ہے ہمارا گھر بوت اچھا لگے..... میں نے اس بار وہ موڑے تو ضرور لینے ہیں

جو مائی حابراں کا دیور شہر سے لایا تھا..... سامنے والے کمرے میں رکھیں گے..... تو ان پر کوئی پھول شول والی کڑھائی کر کے غلاف ڈال دینا..... ہمارا کمرہ سج جائے گا اور ہاں یاد آیا..... مولوی باقر کہہ رہا تھا اس کا بیٹا اگئے مہینے گیس والا چولہا لائے گا..... اس کے ساتھ سنڈر ہوتا ہے۔ گیس سستی ہو گئی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا ہزار بارہ سو میں سب ہو جائے گا۔ میں تیرے لیے اس واری وہ چولہا ضرور لاؤں گا..... بس تو دعا کر زینب۔“ وہ بڑے بڑے نوالے کھاتے ہوئے اپنی خواہشات بھی بیان کرتا جا رہا تھا۔

زینب کو ابھی تک ساری گفتگو میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی، حتیٰ کہ اسے گیس والے چولہے نے بھی خوش نہیں کیا تھا۔

”میں نے..... تجھے ایک اور چیز کا بھی کہا تھا ساجی!“ وہ روٹی کے ٹکڑے کو مسلتے ہوئے فرمائشی لہجے میں بولی۔ ساجد نے استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”ٹی وی.....“ وہ بغور اس کی جانب دیکھ کر بولی۔ ساجد نے گردن کے گرد لپٹا میلا سارو مال اتار کر ہاتھ میں پکڑا، پھر ہاتھ اور منہ اچھی طرح صاف کر کے بولا۔

”نہ زینب..... ہم نے دوزخ کا ٹکٹ نہیں لینا..... یہ بات نہ کیا کر مجھ سے۔“ اس کے انداز میں قطعیت تھی۔ اپنی بات مکمل کر کے اس نے زینب کی مٹکی اٹھا کر منہ سے لگائی اور غٹ پینے لگا۔ اس کے بعد اسی لمبی سے کلمے کے اس نے پانی فرس پر تھوکا۔ زینب نہایت بے دلی سے لقمے توڑ رہی تھی۔

”تجھے بھوک نہیں ہے کیا؟ ٹھیک سے کیوں نہیں کھاتی..... یا نہیں حکیم جی نے کیا کہا تھا، تو نے کی تو احمد علی پہ ماس بوٹی نہیں چڑھنے کی..... ایسا ماڑا (دبلا) ہی رہ جائے گا..... تجھے دودھ پلانا ہوتا ہے..... رچ کے کھایا کر زینب۔“

ساجد کا پیٹ بھر چکا تھا اسے یکدم ہی بیوی کی بے دلی کا اندازہ ہوا۔ اس نے ہاتھ کی کھروری جلد کو چار پائی کی بان سے رگڑ کر کھجایا پھر زینب کو پیار بھرے لہجے میں نصیحت کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے بھوک نہیں لگتی۔“ اس نے سر جھکا کر کہا جیسے بھوک نہ لگنا کوئی گناہ ہو۔ ساجد نے حیرانی سے اس کی جانب دیکھا۔

اس کے نزدیک بھوک نہ لگنا مسئلہ نہیں، چونچلے تھے اور یہ تو بڑے لوگوں کے چونچلے تھے۔

”تجھے گرمی ہو گئی ہے زینب..... کام بھی تو اتنا کرتی ہے..... گرمی بھی تو غضب کی پڑ رہی ہے یہ لے گنڈا کھا..... ماں کہتی تھی..... گنڈا جی ٹھنڈا..... مطلب اس سے جی ٹھنڈا رہتا ہے۔ چل پکڑ لے اب۔“

اس نے چپتیر سے اٹھا کر پیاز کا ٹکڑا اس کی سمت بڑھایا۔

اس ٹکڑے پر ساجد علی کے دانتوں کے نشاں نمایاں تھے۔ چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی

پھر اس کے ہاتھ سے پیاز پکڑ کر دوبارہ چنگیر میں رکھ دی۔

”مجھے نہیں کھانا..... گھنٹوں منہ سے ہمک آتی ہے، ایویں جی خراب ہوتا ہے۔“

وہ سادہ سے لہجے میں بولی مگر اس کے چہرے پر جو تاثرات تھے وہ ہرگز سادہ نہیں تھے۔ ساجد حیرت سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ نزنب کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

”ہائے نزنب! تجھے کیا ہو گیا ہے؟ مجھے تیری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی، خیر تو ہے؟ وہ والی بات تو نہیں ہے نا۔“ وہ اس کے سر آپے میں الجھ کر بولا۔

نزنب کو اس کی بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا پھر پہلے کی طرح مراقبہ میں جا کر بولی۔

”ہاں ساجی! سب خیر ہے.....“ وہ بات نہیں ہے۔“

ساجد کی بے اطمینانی میں مزید اضافہ ہوا۔ ”وہ“ بات ہوتی تو اتنی پریشانی بھی نہ ہوتی۔ احمد کی دفعہ بھی نزنب کو بھوک نہیں لگتی تھی اور ہر چیز کی ہمک اس کے دماغ کو چڑھنے لگتی تھی۔

”مجھے تیری بوڑی فکر ہو رہی ہے نزنب!“ اس نے نزنب کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پریشانی سے کہا پھر نزنب کی خاموشی سے مزید الجھ کر بولا۔

”مغرب ویلے مولوی باقر کے پاس چلیں گے۔ وہ دم کر دے گا..... تجھے آرام آ جائے گا۔“ وہ مشکور سا اٹھ کر ایک طرف لگے ہینڈ پمپ کی طرف آ گیا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالنے کے بعد وہ دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

”جلدی آؤں گا..... راب را کھا.....“ اس نے نزنب کی طرف دیکھے بغیر کہا تھا۔

نزنب بھی اس کی جانب دیکھنے کی بجائے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چنگیر میں ایک ہی روٹی رہ گئی تھی جو گھی کے بغیر تھی۔ احمد ہمک ہمک کر اچار والی پیالی میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نزنب نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ایک ہی انداز میں بیٹھی بنائے کیا سوچ رہی تھی۔

احاطے میں جگالی کرتی بھینیس منتظر نگاہوں سے اسے تک رہی تھی۔ یکا یک دروازے کی کنڈی پھرنج اٹھی اور اس بار اس کا انداز مختلف تھا۔ نزنب ایک جھٹکے سے چار پائی سے اتری اور فوراً احاطے کی سمت چل دی۔ وہاں بھی باہر کی سمت جانے کے لیے ایک دروازہ تھا۔ نزنب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆ ☆ ☆

”میں نے جب ایم اے پاس کیا تو بڑے بڑے اخبارات میں میری تصویریں چھپی تھیں۔“

آلیٹ والی پلیٹ عادل کے سامنے رکھتے ہوئے وہ جتانے والے انداز میں بولی۔

یہ اس کا پسندیدہ ڈائلاگ تھا۔ آلیٹ عادل کے سامنے رکھ کر وہ پراٹھا پلٹنے کے لیے دوبارہ سے کاؤنٹر کی سمت چل دی۔ عادل کچن میں موجود ڈائنگ ٹیبل پہ بیٹھا بے چینی سے ناشتے کا منتظر تھا۔ اس نے عشاء کے انداز کا بغور ملاحظہ کیا۔ مطلع کچھ ابرا آلودہ لگ رہا تھا۔

”بڑے بڑے اخبارات.....“

”مطلب قالمین جتنے بڑے..... کمال ہے مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ 1980ء میں اتنے بڑے بڑے اخبارات نکلا کرتے تھے۔“

اس نے بے حد عام سے لہجے میں کہا تھا۔

بیشتر مردوں کی طرح اسے بھی ہر غیر سنجیدہ بات نہایت سنجیدگی سے کرنے کی عادت تھی۔ تو بے پر پراٹھا پلٹتی عشاء نے نخل سے اس کی بات سنی مگر زیادہ غور نہیں کیا کہ ساری توجہ پراٹھے کی طرف تھی۔ جب پراٹھا تو بے سے اتار کر پلیٹ میں منتقل کیا تو سمجھ میں آیا کہ وہ کہہ کیا رہا تھا۔

”تو بے 1980ء میں ایم اے نہیں کیا تھا میں نے..... تب تو میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔“

وہ تنک کر بولی اور پراٹھے والی پلیٹ کاؤنٹر پر رکھ کر ساس پین میں دودھ نکالنے لگی۔

”پیدا نہیں ہوئی تھی مگر تیاری میں تو تھیں نا۔“ وہ سابقہ لہجے میں بولا۔ عشاء نے اس کی بات سمجھی تو ہنسی بھی آئی مگر پھر تاک چڑھا کر استغفہامیہ انداز میں بولی۔

”مطلب؟“

اب کی بار عادل نے کوفت میں مبتلا ہو کر اس کی جانب دیکھا پھر آلیٹ کا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔

”مطلب انڈر پروسیس..... 1980ء میں یقیناً تم پیدا ہونے کی تیاریاں کر رہی ہو گی مجھ سے ایک ہی سال تو چھوٹی ہو اور میں 1979ء میں پیدا ہوا تھا۔“

اس کی بات پر عشاء کھل کر مسکرائی مگر عادت سے مجبور تھی۔ تھجج کر نا ضروری سمجھا۔

”ایک سال نہیں ڈیڑھ سال چھوٹی ہوں۔“

”اچھا بھئی! ماننا ہوں ڈیڑھ سال چھوٹی ہو..... حلف بھی اٹھا سکتا ہوں کہ ڈیڑھ سال چھوٹی ہو مگر پلیز اب وہ پراٹھا مجھے عنایت کر دو..... مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے..... آنتیں پہلے ہی ادم چار ہی ہیں اب تو معدے نے بھی دہائی دینا شروع کر دی ہے۔“

وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے منت بھرے لہجے میں بولا۔

”تو بے عادل! آپ بہت ندیدے ہوتے جارہے ہیں۔“

وہ اس کے سامنے پراٹھا رکھتے ہوئے بولی پھر ساس پین کے نیچے آنچ دھبی کر کے عادل کے

ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھی۔ وہ ناشتے میں چائے کے ساتھ سلاکس لیتی تھی۔ جب کہ عادل کافی بھاری بھر کم ناشتہ کرنے کا عادی تھا۔

”یار! کیسی بیوی ہو تم..... بھوک سے نڈھال شوہر تمہیں نذیدہ لگتا ہے۔ مشرقی بیویاں شوہروں کو کھانا پیتا دیکھ کر خوش ہوتی ہیں بلکہ.....“

”بلکہ گانا بھی گاتی ہیں..... ہے نا.....“ عشاء نے ڈانٹنگ ٹیبل پر پڑے کرٹل کے جار میں سے۔ بادام نکال کر منہ میں رکھتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

عادل مسکرایا پھر منہ میں موجود نوالہ نگلتے ہوئے۔

”ہاں نا.....“

”کون سا گانا.....؟ وہ والا؟..... بچے میں ہندی ڈھولنا..... ڈھولنا ہائے..... سونے دی تو تیزی..... ٹیاؤں..... ٹیاؤں..... سونے دی تو تیزی.....“

عشاء نے پوچھا پھر مزاحیہ انداز میں گنگنا نے لگی۔ اس کا انداز اس قدر بے سرائی تھا کہ عادل کو ہنسی آ گئی۔

”بس کر بھی، محلے والوں نے سن لیا تو تعزیت کرنے آ جائیں گے کہ بہن جی، بہت افسوس ہوا آپ کے شوہر انتقال کر گئے۔“

اس کی بات پر عشاء نے ناگواری سے اسے دیکھا پھر اس کندھے پر چیت رسید کر کے بولی۔

”تو بے عادل! استغفر اللہ..... کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔“

اس کے انداز میں اس قدر محبت تھی کہ عادل کے چہرے پر شرارتی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”ہو تو تم بھی مشرقی بیوی..... پکی مشرقی بیوی.....“ وہ اس کے ناک کی پھٹنگ کو انگلی سے چھوتے ہوئے بولا۔

”مجھ ایسی باتیں مت کیجئے..... میرا دل دہل جاتا ہے۔“ وہ ابھی بھی گزشتہ بات کے زیر اثر تھی۔ عادل کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”ہاں ٹھیک ہے، مجھ ناشتے کی باتیں کرو اور بس.....“ وہ پراٹھا ختم کرنے کے بعد آلیٹ کے بقایا جات پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ عشاء نے پھر ناک چڑھائی۔

”مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ صبح اتنا کچھ اندر کیسے جاتا ہے..... مجھے تو بالکل بھوک نہیں لگتی۔“

”تم کبھی مارننگ واک کے لیے گئی ہو؟“

عادل نے سنجیدگی سے دریافت کیا جیسے اس کی روٹین۔ سے بے خبر ہو۔

عشاء نے مصنوعی حیرانی سے اسے دیکھا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ صبح اتنی جلدی نہیں اٹھتی تھی جب کہ عادل نا صرف جاگنگ کے لیے جاتا تھا بلکہ اس نے فٹ رہنے کے لیے باقاعدہ جم بھی جوائن کر رکھا تھا۔

”کبھی جاگنگ کی ہے؟“ اس نے دوسرا سوال پوچھا۔

”نہیں.....“ اس نے نفی میں جواب دیا۔

”ویٹ لفٹنگ“

وہ اکتانے لگی ”نہیں“

”تو پھر تمہیں کیا پتا کہ ناشتا کس چیز کا نام ہے..... ارے تم کیا جانو کہ ڈیڑھ گھنٹہ جاگنگ کے بعد جب انسان ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھتا ہے تو پیٹ میں جو ہے کون سی بیٹ (Beat) پر روک اینڈ رول کرتے ہیں۔“

عشاء نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں اسے دیکھا پھر چائے لانے کے لیے اٹھ کر کاؤنٹر کی سمت آ گئی۔ عادل ہاتھ دھونے والے سنک کی سمت بڑھ گیا۔

”آج میں لیٹ ہو جاؤں گا۔“ عادل نے چائے پیتے ہوئے اسے مطلع کیا۔

”آج پھر.....؟“ عشاء نے بیزاری سے اسے دیکھا۔ گزشتہ کچھ دنوں سے عادل کچھ زیادہ ہی مصروف ہوتا جا رہا تھا۔

”ہاں یار!.....“ فقط دو دن کی بات ہے اس کے بعد انشاء اللہ تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“

وہ محبت سے لبر لہجے میں بولا۔ عشاء چپ چاپ بغیر چائے کے کپ کو دیکھتی رہی۔

”یہ بات تو آپ تب سے کہہ رہے ہیں جب سے مجھے پنڈی سے لے کر آئے ہیں۔“ اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ عادل نے ہونٹ سیکڑ کر اس کی جانب دیکھا پھر مسکرا دیا۔ وہ کسی چھوٹی پنڈی کی طرح روٹھی ہوئی لگ رہی تھی۔

”اے موڈ آف نہیں کرونا.....“ وہ اپنا سر دھیرے سے اس کے سر سے ٹکرا کر بولا۔ عشاء خاموش رہی۔

”آئی پرامس جان..... جسٹ ٹو مورڈیز.....“ وہ چاشنی بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

”عادل! صبح سے شام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ قسم سے سارا دن اس کمرے سے اس کمرے میں پریڈ کرتی رہتی ہوں۔“

”آئی پرامس نا..... اس ویک اینڈ کے بعد میں انور صاحب سے خود کہہ دوں گا کہ سر! میری بیوی

میرے بغیر اداس ہو جاتی ہے۔ اس لیے براہ مہربانی مجھے جلدی فارغ کیا کریں۔“ وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ بیوی کے موڈ کو مزید نہ بگڑنے دے۔

”اسی لیے تو کہتی ہوں مجھے جاب کر لینے دیں..... میں اس فراغت.....“

”اوہ..... آئی ایم سوری یار..... Getting late پھر بات کریں گے ہاں..... لو یو..... ٹیک

کیئر..... اللہ حافظ۔“

وہ اس کی بات کاٹ کر تیزی سے مڑا اور لاؤنج کی سمت چل دیا۔ چند لمحے بعد عشاء نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔

”لو یو..... ہونہ..... بات کرنے کی فرصت نہیں ہے اور محبت کریں گے یہ مجھ سے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے ٹیبل سے اٹھ گئی تھی۔ اس کا منہ پھول کر غبارہ ہو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

”ڈھور ڈنگر آج کل بندے سے زیادہ نخرے والے ہو گئے ہیں..... ان کی بھی اتنی ہی خدمت کرنی پڑتی ہے جتنی کہ اپنے ماں پیو (والدین) کی اور اتنے ہی لاڈ اٹھانے پڑتے ہیں جتنے کہ اولاد کے۔“

ساجد بھوری کی پیٹھ سہلاتے ہوئے زینب سے مخاطب تھا۔ بھوری ان کی اکلوتی بھینس کا نام تھا۔ بھوری کچھ دنوں سے کافی سست ہو رہی تھی۔ دودھ دینا بند نہیں کیا تھا مگر مقدار بہت کم ہو گئی تھی۔ ساجد علی کو اس کی بہت فکر ہو رہی تھی۔ زینب ایک طرف بنی کھر لی میں گتاوا (بھینس کی خوراک) گھولنے میں مشغول تھی۔

وہ جب کھر لی میں ہاتھ چلاتی تو دائیں بازو میں موجود درجن بھر سرخ اور سنہری چوڑیاں کھٹکنے لگتیں۔ اسے چوڑیوں کی یہ کھٹکنا ہٹ بہت بھلی لگ رہی تھی جب کہ ساجد علی کو بھوری سے ہی فرصت نہیں تھی کہ وہ زینب کی کلائی میں موجود چوڑیوں کو دیکھتا اور سراہتا۔ وہ بھوری کی فکر میں ہلکان ہوا جا رہا تھا۔

”میں نے کہا ڈھور ڈنگر بھی آج کل بندے سے زیادہ.....“ ساجد زینب کی عدم توجہی محسوس کر کے دوبارہ بولا۔ زینب نے سراٹھا کر اسے دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔

”ٹھیک کہتا ہے ساجی!“

”اس بھوری کو بھی دیکھ لے..... بیچ سال سے میرے ساتھ ہے۔ تجھے بیاہ کر اس گھر میں لانے سے دو سال پہلے اس کو جندرا کہ سے لایا تھا۔ میرے نانے نے مجھے قرآن ختم کرنے پر اس کا تحفہ دیا تھا مگر میری ماں بیمار رہتی تھی فی اس کو کون سا لتا (سنبھالتا) اسی لیے نانے نے اپنے پاس ہی رکھ

لی۔ اس نے سوچا کہ دوپتے (نواسے) کو تحفہ تو دے دیا مگر کچھ عرصہ مال پانی بنالے بس فیروزہ وہیں جندرا کہ میں رہی۔ سارا جندرا کہ اسی نمائی کا دودھ پیتا تھا۔ فیروزہ سال پہلے میں اس کو یہاں کو ہلے لے آیا۔

چوہدری کے باڑے میں کام کر کے مجھے بھینس پالنے کا بڑا تجربہ ہو گیا تھا..... تب سے اب تک یہ دودھ سوئی ہے (بچے دیے ہیں) پر دونوں ہی کٹے تھے۔ قصائی کو دے دیے۔ دودھ ہزار کے بکے تھے۔ فائدہ تو میرا ہی ہونا..... اس واسطے مجھے یہ نمائی بڑی عزیز رہی ہے مگر اب اس کو اتنا سست دیکھتا ہوں تو دل دکھتا ہے۔ کہتے ہیں بندے کے گناہوں کی سزا اس کے ڈھور ڈنگروں کو ملتی ہے..... پتا نہیں ہماری غلطی کی سزا میں تو یہ بیمار نہیں پڑ گئی، ہائے بھوری میری چندا تجھے کیا ہو گیا ہے۔“

وہ بھینس کی پشت سہلاتا ہوا بولتا چلا جا رہا تھا۔ زینب نے یہ قصہ پہلے بھی بہت مرتبہ سن رکھا تھا۔ اسے اس قصے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر ساجد کی آخری بات پر وہ پرسوج انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگی۔ پھر اپنے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔

”اس کو قصائی کو دے دے ساجی..... یہ کھا کھڑ (بانجھ) ہو گئی ہے۔“

”ابھی اس کی عمر نہیں ہے کھا کھڑے والی..... صرف دو کٹے دیے ہیں ابھی..... دیکھنا انشاء اللہ میں اس ایک بھوری سے چار بھوریاں دلاؤں گا تجھے۔ بس موسم گرم ہے نا اس لیے یہ ذرا سست ہو گئی ہے۔ گرمی ہو گئی ہے اس کو۔“

وہ بھوری کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

زینب نے ناک چڑھا کر نخوت سے اسے دیکھا پھر جان بوجھ کر دائیں ہاتھ سے پیشانی کو صاف کیا تاکہ چوڑیوں کی کھٹکنا ہٹ سے ساجد علی کو متوجہ کر سکے مگر وہ جھک کر بھینس کو کھونٹے سے آزاد کرنے میں مصروف تھا تاکہ اسے کھر لی کے قریب باندھ سکے۔

”اس کو بھی مولوی باقر سے دم کروالے۔“ زینب سے جل کر مشورہ دیا۔

”ہاں ٹھیک..... بہت پتے کی بات کی ہے تو نے..... شام کو مولوی باقر کو گھراؤں گا۔ اس کے دم میں بہت برکت ہے۔ بھوری انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی۔“ بھوری کو مناسب جگہ پر باندھتے ہوئے بولا۔

قریب ہی بکری اور اس کا مینا بھی بندھے ہوئے تھے۔ ساجد نے بکری کے پٹھے اٹھانے کے لیے تسلی کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ وہ احاطے کے بیرونی دروازے کے قریب پڑا تھا۔ تسلا اٹھاتے ہوئے اس کی نگاہ دروازے کے بالکل پیچھے پڑے ہوئے زرد رنگ کے چھکوں پر پڑی۔ دور سے دیکھنے پر یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ چھلکے کس چیز کے ہیں۔ تسلا وہیں رکھ کر وہ دو تین قدم چل کر

دروازے کے بالکل پیچھے پہنچ گیا اور جھک کر جوتے سے ہلا کر ان چھلکوں کو دیکھنے لگا۔ نزدیک آنے پر خوشبو سے ہی ہتا چل رہا تھا کہ آم کے چھلکے ہیں۔

یہ تو آم کے (چھلکے) ہیں..... زہنے یہ کہاں سے آئے؟“

اس نے مڑ کر عقب میں کھڑی زنب سے پوچھا۔

زنب کی پیشانی پر پہلے ہی پسینہ چمکنے لگا تھا۔ وہ گڑبڑ اسی گئی۔ گھر میں پھل ساجد علی ہی لاتا تھا۔ وہ آم نہیں لایا تھا تب پھر یہ چھلکے کہاں سے آئے تھے۔

”یہ..... پودے کر گیا تھا..... بکری کو ڈالنے کے لیے..... کہہ رہا تھا بکری کو ڈال دینا..... وہ اکثر پھل اور سبزیوں کے چھلو دے جاتا ہے..... میں نے یہاں رکھ دیے کہ پھلوں کے ساتھ یہ بکری کو ڈال دوں گی۔“ وہ لکنت پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

ساجد بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ ”پوپ؟“ اس نے استفہامیہ انداز میں یہ نام دہرایا۔ محلے میں تین چار پورہ جتے تھے۔

”پوپ..... بٹ کا پتر..... خالد بٹ کا..... جوگلی میں کچے کھیتا رہتا ہے۔ وہی اتنے نخی ہیں کہ ایسے پیلے پیلے آم کھا سکیں۔ ہم جیسے تو بس ان کے چھلڑی دیکھ کر خوش ہو سکتے ہیں۔“ اس نے آواز کو دھیمہ کرتے ہوئے لہجے میں حسرت سمو کر کہا۔

ساجد اس کی بات پر تڑپ اٹھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچے کو دنیا بھر کی آسائش فراہم کرنا چاہتا تھا مگر جب زنب ایسے بگا ہے بگا ہے اس کی غربت کا احساس دلانی تو وہ بے چین ہو جاتا تھا اور خصوصاً جب کبھی خالد بٹ کا ذکر ہوتا تو اسے خواجواہ جلن ہونے لگتی۔ وہ خالد بٹ کو سخت ناپسند کرتا تھا۔

”تیرا دل ہے آم کھانے کا تو مجھے کہہ..... میں بھی لے آؤں گا، لیکن دی پچی (میں پچس) روپے کے لیے ہر ایرے غیرے سے جلنے کی ضرورت نہیں۔ وہ غبیٹ کمینہ آدمی اس قابل نہیں کہ اسے دیکھ دیکھ کر اپنا دل جلائیں، ہم اس سے بہتر ہیں۔“ ساجد نے بے حد خشک لہجے میں کہا۔

زنب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر ساجد کے چہرے پر خشکی کے تاثرات دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

”وہ گناہوں کی پوٹلی ہے، سیدھا جہنم میں جائے گا..... پکا دوزخی..... تجھے کیا پتا اس کے کہ تو توں کا..... چوہدہری کا خاص آدمی ہے..... آدمی نہیں بلکہ کتا ہے چوہدہری کا..... چوہدہری نے اسے چھوٹ بھی بہت دے رکھی ہے اس کے جومن میں آتا ہے وہی کرتا ہے اور چوہدہری اس سے پوچھ گچھ بھی نہیں کرتا۔ خیر! میں اس کے بارے میں زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا۔ خراب آدمی کے بارے میں زیادہ بات کرنے سے زبان بھی خراب ہو جاتی ہے۔ اب دوبارہ اس کا پوپ یا چند اپنے حرام مال کی زکوٰۃ نکال کر

لائیں تو صاف انکار کر دینا۔ کہہ دینا حرام مال سے خریدے گئے پھل کا چھلکا بھی حرام ہوتا ہے اور ساجد علی خود حرام کھاتا ہے نا اپنے دھوڑ مگر کو کھانے دیتا ہے۔“

وہ پھلوں والا تسلا بکری کے قریب لاکر بیٹھے ان کے سامنے ڈالتے ہوئے بولا۔ زنب خاموشی سے یہ تقریر ہضم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اب مجھے پتا چلا کہ یہ بھوری جوست ہو رہی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ اتنے دن سے یہ حرام مال اس کے آس پاس پڑا ہے۔ کیا پتا اس کے کھابے (خوراک) میں اڑ کر کتنا کچھ گیا ہو..... سب حرام مال کی وجہ سے ہے زنب! امیری مال کہا کرتی تھی حرام مال پر نگاہ بھی پڑ جائے تو خون تک اثر ہو جاتا ہے۔ اللہ بخشنے بہت سیانی عورت تھی۔ سو آنے کی بات ایک آنے میں کہہ جاتی تھی۔ دیکھ ابھی یہ چھلڑ یہاں پڑے تھے تو ان کا کتنا اثر ہوا ہے۔ بھوری کتنی کمزور لگ رہی ہے اور میں نے صرف قریب ہو کر جانچنے کی کوشش کی تھی کہ یہ ہے کیا چیز تو نجانے کیوں سرگھومتا ہوا محسوس ہو رہا ہے، عجیب گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ مجھے تو سچی بات ہے ایسی باتوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ جب تک نہا نہیں لوں گا سکون نہیں ملے گا۔“

اس نے گردن کے گرد پڑا صاف کھینچ کر اتارا اور جھک کر دوبارہ سے ان چھلکوں کو گھور کر دیکھنے لگا۔ ساجد علی کا احاطہ بھی گاؤں کے دوسرے گھروں میں موجود احاطوں کی طرح تھا۔ ایک بھینس، ایک بکری، ایک مینا اور سات آٹھ مرغیاں اپنے چودہ پندرہ چوزوں کے ساتھ اس احاطے میں مقیم تھیں۔ اسی حساب سے یہاں گندگی اور بدبو بھی تھی مگر ساجد علی کو جس قدر کراہیت ان چھلکوں سے آرہی تھی اتنی اور کسی چیز سے محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے اپنا صاف سر، گردن اور ناک منہ کے گرد لپیٹا اور پھر ان چھلکوں کو ایک غلیظ سے کاغذ کے لفافے میں منتقل کرنے لگا۔

”یہ دیکھ..... یہ کرنا چاہیے ایسی گندی چیزوں کے ساتھ۔“ اس نے احاطے کے کونے میں جا کر وہ لفافہ گھما کر دیوار سے باہر سے پھینک دیا۔ زنب لافعلی سے چار پائی پر جا کر بیٹھ گئی۔

اسے ساجد علی کے وعظ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اکتاہٹ میں مبتلا ہونے لگی تھی۔ چھلکوں سے نمٹنے کے بعد ساجد ہنڈ پمپ کے پاس کھڑے ہو کر نہانے کے لیے بالٹی بھرنے لگا۔ اس کے چہرے پر سوچ کی گہری پر جھانپاں تھیں۔ زنب چار پائی پر لیٹے احمد کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔ وہ کھیلتے کھیلتے سو گیا تھا۔ ساجد نے بالٹی بھری اور کونے میں بنے ہوئے غسل خانے میں نہانے کے لیے چل دیا۔

زنب نے ٹین کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تو مڑ کر دیکھا پھر چند لمحے اسی پوزیشن میں بیٹھی دروازے کی سمت دیکھتی رہی۔ جب اسے تسلی ہو گئی کہ ساجد نے نہانا شروع کر دیا ہے تو وہ بہت آہستگی سے چار پائی سے اتری اور مرغیوں کے ڈبے کی طرف آ گئی۔ مرغیاں احاطے میں پھر رہی تھیں۔ ایک

بھی مرغی دڑبے کے اندر نہیں تھی۔ نرنب نے ایک نظر غسل خانے کی طرف دیکھا پھر آواز پیدا کیے بغیر دڑبے کا جالی والا دروازہ کھول لیا۔

دڑبے کے نچلے خانے میں کالی سی کوئی چیز پڑی تھی۔ اس نے بہت احتیاط سے وہ چیز باہر نکال لی۔ کن اکھیوں سے وہ غسل خانے کی دیوار کو مسلسل دیکھ رہی تھی۔ وہ کالی سی چیز ایک شاپریک تھا اور اس شاپریک میں ایک بڑا سا تازہ آم تھا۔

نرنب نے وہ آم نکالا اور دھوئے بغیر دانتوں کی مدد سے کاٹ کاٹ کر کھانے لگی اس کے انداز میں بے حد عجلت تھی۔ وہ جلدی جلدی جتنا کھا سکتی تھی اس نے کھایا پھر اس شاپریک میں ادھ کھایا آم منتقل کر کے اسے دروازے سے باہر پھینک دیا اور دے قد مومں چلتی ہوئی بینڈ پمپ کے پاس آ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر کلی کی اور اس کے بعد دوبارہ چار پائی پر اسی انداز میں آ کر بیٹھ گئی جس طرح پہلے بیٹھی تھی۔ کچھ لمحوں بعد ساجد غسل خانے سے نکل آیا۔ اس کے جسم پر قمیص نہیں تھی اور ٹانگوں کے گرد وہ تہہ بند لپیٹے ہوئے تھا۔

”زینبے..... میرا دماغ چل گیا ہے، مجھے تو اب یہاں سے بھی آم کی خوشبو آ رہی ہے..... جانے کتنے دن میں اس کا اثر ختم ہوگا۔“

وہ اسی صاف سے بال خشک کرتے ہوئے چار پائی کے نزدیک آ کر بولا اور ساتھ ہی سانس کھینچ کر کچھ سونگھنے کی کوشش کی..... نرنب مسکرا دی جیسے اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔

”قسم اللہ کی..... بے شک سونگھ کر دیکھ لے۔“ وہ چار پائی پر اس کے بالکل نزدیک بیٹھ کر بولا تھا۔ نرنب نے زحف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ ساجد علی بھی مسکرا دیا پھر کچھ سوچ کر بولا۔

”نرنب! تو نے بٹ کے گھر کی کوئی چیز تو نہیں کھائی نا..... تیری طبیعت (طبیعت) بھی تو کچھ دنوں سے ٹھیک نہیں چل رہی..... صورت بھی کیسی اتری ہوئی لگ رہی ہے۔ تجھے بھی گرمی ہے نا..... مجھے بہت فکر ہو رہی ہے زینبے!“

”نہیں ساجی! میری فکر مت کر..... مجھے بس اپنے شوہر کی کمائی کی روٹی اچھی لگتی ہے۔“

اس نے احمد کے بالوں کو پیٹانی سے ہٹا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

ساجد، احمد کے ساتھ لیٹ گیا جبکہ نرنب اپنی کلائی میں موجود چوڑیوں سے کھیلنے لگی۔

☆ ☆ ☆

”یہ کھیرا کاٹ دیں۔“ اس نے عقب سے ایک پلیٹ عادل کے چہرے کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ عادل نے مڑ کر اس کی سمت دیکھا اور مسکرا کر پلیٹ پکڑی جس میں چھری اور چھلا ہوا کھیرا موجود تھا۔

عادل کی مسکراہٹ کے جواب میں عشاء کا چہرہ بے تاثر رہا تھا۔ پلیٹ اسے تھما کر وہ واپس کچن کی سمت چل دی۔ اس کے انداز میں عجلت تھی۔ وہ ایسے نااہل کر رہی تھی جیسے اسے کچن میں بہت زیادہ کام ہے مگر دراصل وہ عادل سے ناراضی کا اظہار اس طرح سے کر رہی تھی کہ خود کو بے وجہ کام میں مصروف کر رکھا تھا۔

پہلے ماسی کو بے وجہ چھٹی دے دی اور سارے گھر کی صفائی کی، پھر واشنگ مشین لگائی۔ سارے گھر کے پردے، صوفہ کورز اور بینڈ کورز دھو ڈالے۔ حالانکہ جانتی تھی کہ عادل کو چھٹی والے روز اس قسم کے کاموں سے نفرت تھی۔ وہ اتوار کے دن بھی زیادہ دیر سونے کا عادی نہیں تھا۔ جام لنگ اور جم سے واپس آ کر وہ گارڈنگ وغیرہ میں لگ جاتا یا پھر CDs اور DVDs کی ترتیب درست کرنے اور اپنے ہفتہ بھر کے کپڑے پر پریس کرنے میں مگن رہتا۔

وہ حقیقتاً شوہروں کی نہایت معصوم قسم سے تعلق رکھتا تھا لیکن یہ عادل کی خود اپنے بارے میں رائے تھی۔ عشاء کا خیال تھا عادل ایک ایسا مرد ہے جو بیویوں کو کتنی کا ناچ نچائے رکھتے ہیں۔ اسی بات کو لے کر گزشتہ رات بھی ان کی بے وفائی نے چھوٹے سے جھگڑے کی شکل اختیار کر لی تھی اور اسی لیے اب عشاء نے منہ پھلا رکھا تھا۔ بول چال بند تھی لیکن اتنی بھی بند نہیں تھی کہ وہ ایک دوسرے کو مخاطب ہی نہ کرتے۔

”میں کھیرا کاٹوں؟“ عشاء کے ہاتھ سے پلیٹ پکڑ کر عادل نے مصنوعی خشکی سے کہا۔ درپردہ مقصد عشاء کو تنگ کرنا تھا۔ عشاء کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

عادل نے ریوٹ سے ٹی وی کی آواز کم کی اور پلیٹ ہاتھ میں لے کر کچن میں آ گیا۔ عشاء نے برز کے پاس کھڑی پریشر کریم میں چھچھلا رہی تھی۔ عادل نے ڈائننگ ٹیبل کی چیر کھینچی اور اس رخ پر بیٹھ گیا جہاں سے عشاء کی شکل بھی نظر آ رہی تھی۔

”میں کھیرا کاٹوں.....؟ یعنی کہ میں..... بی بی میں تمہارا شوہر ہوں شوہر..... اردو میں جسے مجازی خدا بھی کہتے ہیں..... میری خدمت تم پر واجب ہے اور تم مجھ سے کھیرا کٹا رہی ہو..... تمہاری گردن نہ کاٹ دوں۔.....“ وہ جان بوجھ کر قدرے اونچی آواز میں بولا۔ عشاء کے کان پر جوں تک نہیں رہتی۔ وہ ہرا دھنیا کترنے لگی تھی۔

عادل کھیرے کے سلائسز کرنے کے ساتھ ساتھ کن اکھیوں سے اس کی جانب بھی دیکھ رہا تھا۔ عشاء نے دھنیا کے پتوں کو پکے ہوئے سالن میں چھڑکا اور ڈھکن سے ڈھانپ دیا پھر نچلے کینٹ سے روٹیاں پکانے کے لیے بیلن اور توانکا لے لگی۔

”عشاء!“ عادل نے آواز میں دنیا بھر کی مٹھاس سمو کر اسے پکارا۔

عشاء خاموش رہی مگر دل ہی دل میں مسکرائی کیونکہ عادل کا لہجہ اور انداز چیخ کر کہہ رہا تھا

کہ وہ صلح میں پہل کرے گا، ان کے درمیان یہ پہلا جھگڑا تھا جو گزشتہ اٹھارہ گھنٹے سے چل رہا تھا۔
 ”ناراض ہو؟“ وہ اس کی پکار کو نظر انداز کرتے ہوئے برز آن کر رہی تھی، جب عادل نے
 پوچھا، پلان کے مطابق عشاء کو اب بھی خاموش رہنا تھا۔

”یار! جواب تو دو“ بے شک مجھ سے بات مت کرو مگر سوال کا جواب تو دے دو، میں بھی
 مسلمان ہوں..... دینی اسلامی بھائی سمجھ کر ہی مگر جواب تو دو یار.....! اچھا بابا ماموں زاد بھائی سمجھ کر
 یار! کچھ تو بولو۔“

وہ نہایت لاڈ سے اپنے مخصوص انداز میں بات کر رہا تھا۔ عادل اس کے ماموں کا بیٹا تھا۔ وہ
 انجان بنی روٹی بیلتی رہی۔

”ارے کہیں تم چار آپشنز کا انتظار تو نہیں کر رہیں.....؟ اس ٹی وی شو نے ہماری قوم کا دماغ
 خراب کر دیا ہے، کوئی سوال پوچھو چار آپشنز مانگتے لگتے ہیں لوگ..... اب اس بات سے ایک لطیفہ یاد
 آ گیا ہے مجھے..... ذرا غور سے سننا بلینز..... عرض کیا ہے۔ ایک دفعہ کسی سکھ سے کسی نے.....“

”آپ کھانا شروع کریں، میں گرم گرم روٹی اتارتی ہوں۔“ عشاء نے اس کی بات کاٹ کر
 کوفتوں والا باؤل اس کے سامنے رکھا اور پلٹ کر دوبارہ برز کے پاس آ گئی۔ بقیہ برتن اور لوازمات وغیرہ
 وہ پہلے ہی ٹیبل پر سجا چکی تھی۔

عادل خاموشی سے کوفتوں کے باؤل کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے اکیلے کھانا کھانا اچھا نہیں لگتا تھا
 اور عشاء اس بات سے بخوبی واقف تھی۔

”تم نہیں آؤ گی؟“ عادل نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔ عشاء کا انداز اسے اب برہم کرنے
 لگا تھا۔

”نہیں۔“ روٹی بیلتے ہوئے اس نے یک لفظی جواب دیا۔

”کیوں؟“ عادل نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے پھر پوچھا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے..... آپ کھا لیجئے..... میں بعد میں کھاؤں گی۔“ وہ روٹی توے پر
 ڈالتے ہوئے بولی۔

عادل اس کے بالکل قریب پہنچا پھر کینٹ سے ٹیک لگا کر بغور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ عشاء
 نے اپنی توجہ توے پر ہی رکھی کیونکہ اگر وہ عادل کی جانب دیکھ لیتی تو اسے ہنسی آ جانی تھی اور پھر وہ بات
 نہیں ہو سکتی تھی جو عشاء اس سے کرنا چاہ رہی تھی۔

عادل کا ارتکاز اسے بے چین کر رہا تھا کیونکہ اب وہ خاموشی سے اسے دیکھنے میں مگن تھا۔
 ”اب کیا ہے.....؟ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے؟“ چٹنے کی مدد سے وہ روٹی ہاٹ پاٹ میں

رکھتے ہوئے بولی۔

”بھوک کیوں نہیں ہے؟“ عادل نے دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے اس کی طرف
 دیکھا۔

”صبح ناشتے میں پراٹھا کھا لیا تھا۔“ عادل نے آگے بڑھ کر برز بند کر دیا پھر شیف سے پانی
 کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ ایک سانس میں گلاس خالی کر کے اس نے فنج کر شیف پر رکھا پھر منہ پھسلا
 کر بولا۔

”مجھے بھی بھوک نہیں ہے۔“ وہ کہہ کر رکائیں بلکہ تیزی سے لاؤنج کی سمت بڑھ گیا۔ عشاء
 دل دھڑکا۔ وہ خفگی کو اس فنج پر لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

”کم آن عادل! میں نے یہ کوفتے آپ کے کہنے پر بنائے تھے.....“ اس نے لہجہ کو نرم
 کر کے عادل کو پکارا تھا مگر اب اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔

”بہت مہربانی آپ کی..... شکریہ آپ نے اتنی زحمت کی۔“ وہ تڑخ کر بولا۔
 عشاء چند لمحوں کے لیے اس راستے کی طرف دیکھتی رہی، جہاں سے گزر کر عادل لاؤنج کی طرف گیا
 تھا پھر کچھ سوچ کر خود بھی لاؤنج کی طرف آ گئی۔

”آئی ایم سوری عادل.....! کھانے سے کیا ناراضی..... چلے کھانا کھا لیجئے۔“ اس نے
 مصالحتی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

عادل چہرے کے سامنے اس طرح اخبار پھیلانے بیٹھا تھا کہ اس کا چہرہ بالکل چھپ گیا تھا۔
 ”اوہ ریکلی..... مطلب کھانے سے کوئی ناراضی نہیں ہوتی..... ساری ناراضی شوہر سے ہوتی

ہے..... ایک برکت والا دن ہوتا ہے سنڈے کہ جس روز بیوی کے ساتھ اطمینان سے بیٹھ کر لہجہ کرنے کا
 موقع ملتا ہے اور وہ بھی بیوی صاحبہ کی ناراضی میں نکل جاتا ہے..... کہہ دینا مجھے کچھ بھی نہیں کھانا۔“

وہ اخبار ہٹانے بغیر بولا۔ عشاء آگے بڑھی اور جھپٹ کر اخبار اس کے چہرے سے ہٹا دیا۔
 اخبار ہٹتے ہی عادل کو ہنسی آ گئی کہ عشاء کا چہرہ غصے سے مارے لال ہو رہا تھا۔

”کیوں نہیں کھانا؟“ وہ دونوں ہاتھ کمر پر ٹکا کر بولی۔ عادل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور
 اسے صوفے پر اپنے ساتھ بٹھالیا۔

”اس لیے میری ناراض سہیلی کہ مجھے اکیلے کھانا کھانا بالکل اچھا نہیں لگتا اور.....“
 ”اور جو میں سارا ہفتہ اکیلے کھانا کھاتی ہوں.....؟ کبھی سوچا ہے آپ نے کہ مجھے یہ اچھا لگتا

ہے یا نہیں..... میں ناراض ہوں مگر آپ کے سامنے تو ہوں اور آپ تو یہاں موجود ہی نہیں ہوتے۔ میں
 دیواروں سے باتیں کرتی ہوں اور دیواروں کی باتیں سنتی ہوں..... ذرا سوچئے مجھے غصہ آتا چاہیے یا

نہیں۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

عادل خاموشی سے اس کی بات سنتا اور اس کی جانب دیکھتا رہا۔

”اتنا خنصر نہیں کرتے جان! مجھے احساس ہے کہ تم بہت اکیلی ہوتی ہو..... بور ہو جاتی ہو..... اس روٹین لائف سے اکتانے لگتی ہو..... یقین کرو آفس میں بھی تمہاری طرف دھیان لگا رہتا ہے اسی لیے.....“ عادل کے محبت بھرے لہجے کا ٹوٹا لے بغیر عشاء نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اوہ ہاں..... تب ہی تو آپ مجھے ایک ہزار ایک فون کرتے ہیں آفس سے..... میں کام کرنے لگتی ہوں آپ کا فون آ جاتا ہے، ہم گھنٹہ بھر باتیں کرتے ہیں پھر فون رکھ کر میں کچن کی طرف جا نے لگتی ہوں کہ آپ کا فون کر لیتے ہیں اور دوسری بار ہم دو گھنٹے تک باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ مجھے موبائل میسیجیز کرتے رہتے ہیں۔ میں میسیج کرتی ہوں تو آپ فوراً جوابی میسیج دیتے ہیں۔“ اس کا طنزیہ لہجہ عادل کو کھل کر ہنسنے پر مجبور کر گیا۔

”یار! سرتاج“ مجازی خدا ہوتا ہے، اس کو بھگو بھگو کر نہیں لگاتے..... گناہ ہوتا ہے۔“ اس کی بات پر عشاء کچھ دیر اس کی جانب دیکھتی رہی پھر گہری سانس بھر کر بولی۔

”وہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ اس سے پہلے کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھتی عادل نے دوبارہ ہاتھ کھینچ کر اسے بٹھا دیا پھر بغور اس کی جانب دیکھ کر بولا۔

”اوکے..... یز فائر..... آئی ایم سوری..... دیکھو کان پکڑ رہا ہوں۔“ اس نے جج جج کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”آئندہ کبھی لیٹ نہیں آؤں گا..... آفس سے تمہیں ایک ہزار ایک مرتبہ نہ سہی مگر کم از کم دو بار ضرور فون کر لیا کروں گا۔ تمہارے ہر SMS کا فوراً جواب دوں گا“ چاہے تم مجھے I hate you کیوں نہ ٹائپ کر کے بھیجو..... روزانہ ڈرائیو پر لے جاؤں گا۔ اگر تم چاہو گی تو کھانا بھی باہر کھالیا کریں گے، ورنہ تمہاری فیورٹ آئس کریم تو تمہیں ضرور کھلایا کروں گا، ہر ہفتہ شاپنگ کروایا کروں گا۔ جب تمہاری کسی سیمپلی کا فون آیا کرے گا تو میں یاد سے اس کے ہسینڈ کی خیریت دریافت کیا کروں گا بلکہ انہیں گھر آنے کی دعوت بھی دوں گا، اور بتاؤ۔“ آنکھوں میں شرارت کے رنگ لیے وہ باتوں باتوں میں عشاء کے تمام گلے دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کے اتنے لمبے چوڑے وعدوں پر بھی عشاء کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں ابھری تھی۔ وہ اپنے بانیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں موجود نازک سی رنگ کو کبھی اتار اور کبھی پھین رہی تھی۔ یہ اضطرابی کیفیت اس کی عادت تھی۔ وہ جب بھی کسی الجھن میں ہوتی تھی تو اسی طرح اس رنگ کو پریڈ کروانے لگتی جبکہ عادل کو اس کی اس حرکت سے چڑھتی تھی۔ اب بھی اس نے عشاء کے بانیں ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں

تھام کر اس پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا۔ عشاء کا ہاتھ اس کے دونوں ہاتھوں میں سینڈوچ ہو کر رہ گیا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو.....؟ کہہ دو نا۔“ عادل اس کے ہر رنگ سے واقف تھا۔

”عادل! تجھے ضائع نہ کریں عادل..... مجھے میں بہت پوئینٹل ہے، اسے زنگ نہ لٹنے دیں..... اللہ نے مجھے اس چار دیواری میں رہ کر ایک لگے بندھے معمول کے لئے پیدا نہیں کیا۔ پلیز عادل! لیٹ می ڈوسم تھنک پوزیو..... پلیز.....“ وہ التجائیہ لہجے میں بولی۔

عادل کچھ لمبے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کر کچن کی سمت چل دیا۔ عشاء وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی انگلی میں موجود انگلی کو تنگنے لگی۔

☆ ☆ ☆

”سو گیا؟“ چار پائی پر چٹ لینے ساجد نے بہت دھیمے لہجے میں احمد کی بابت استفسار کیا۔ وہ نینب کی طرف دیکھنے کے بجائے ایک نلک آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہے۔

”نہیں۔“ نینب نے بغور اس کی جانب دیکھ کر جواب دیا۔

وہ گود میں لینے احمد کو مسلسل تھکنے میں مصروف تھی۔ مغرب کی اذان ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اور اب گھرے نیلے آسمان پر سیاہ رنگ غالب آنے لگا تھا۔ ساجد نے ابھی تک کھانے کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اسے مغرب کے فوراً کھانا کھانے کی عادت تھی۔ احاطے میں جھینگر اور مینڈک کی آوازوں کے علاوہ بھوری کے گلے میں بندھی گھنٹی کی وقفے وقفے کے بعد آنے والی ٹن ٹن ارتعاش پیدا کر دیتی ورنہ وہ دونوں میاں بیوی اپنی اپنی سوچوں میں الجھے ہوئے تھے۔

احمد کو صبح سے بخار تھا۔ وہ سویا نہیں تھا مگر دوا کے باعث مدھوشی کے زیر اثر تھا۔ دو دو تین تین منٹ کے وقفے سے وہ سکاری بھر کر کراہنے لگتا تو نینب کے ہاتھوں میں چستی آ جاتی اور وہ متا بھرا لہجے بچے کو چند لمحوں کے لیے پرسکون کر دیتا۔ اس کا جسم اب بھی بخار کے باعث تپ رہا تھا۔ حالانکہ دوا کھلائے گھنٹہ ہو چلا تھا۔ نینب نے کن اکھیوں سے ساجد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر نکھری الجھن کی پرچھائیاں نینب کو اندھیرے میں بھی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے ساجد کے رویے سے پریشانی ہو رہی تھی ساجد جب سے احمد کو دم کر دیا تھا تب سے پریشان بیٹھا تھا۔ نجائے مولوی باقر نے ایسا کون سا فتویٰ صادر کر دیا تھا کہ ساجد اس قدر الجھن میں گھر گیا تھا۔

”لاا سے مجھے دے..... اپنے پتر کو میں اپنے ساتھ سلا لیتا ہوں۔“ اس نے یکدم گردن موڑ کر نینب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نینب اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس اچانک فرمائشی جملے کے لیے تیار نہیں تھی سو گڑبڑ اسی گئی۔ اس

نے ساجد کے چہرے سے بمشکل نظر ہٹائی پھر اس سے پہلے کہ وہ خود اٹھ کر احمد کو اس کی گود میں دیتی، وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور احمد کو تھام لیا۔

”میرا منا..... میرا کا کا..... میرا چاند..... تاپ (بخار) چڑھ گیا میرے شیر کو..... ابھی ٹھیک ہو جائے گا..... سو جا میری جان۔“

چند لمحوں بعد وہ احمد کو سینے پر لٹائے بہت محنت سے چھپکنے میں مصروف تھا۔

نہب اس کے انداز اب بھی بغور دیکھ رہی تھی۔ ساجد کا برہم مزاج اسے اپنی ان تمام غلطیوں کا اعتراف کرنے کے لیے مجبور کر رہا تھا جو اس سے ہوتی رہی تھیں۔

اس نے ساجد کے بار بار کہنے پر بھی گیارہویں شریف کا ختم نہیں دلایا تھا اور ساجد کے پوچھنے پر کہہ دیا تھا کہ وہ ختم دلا چکی ہے۔

اس نے ساجد کی غیر موجودگی میں بھوری کا دودھ خالد بٹ کی بیوی کے ہاتھ بیچ دیا تھا کیونکہ ان کا گوالا دودھ دے کر نہیں گیا تھا پھر آج سارا دن احمد دھوپ میں کھیلتا رہا تھا اور اب بخار میں پھنک رہا تھا، ان سب سے بڑھ کر ساجد پچھلے احاطے میں سویا ہوا تھا اور نہب نے مولوی باقر کو یہ کہہ کر گھر نہیں آنے دیا تھا کہ ساجد شہر گیا ہوا ہے، جب وہ آجائے تب آتا۔ حالانکہ وہ نہب ہی کے لیے تعویذ لکھ کر لایا تھا۔

مولوی باقر کو دھوپ کی وجہ سے آنکھوں کی بیماری لگ گئی تھی۔ اس نے ساجد سے شہر سے سرمہ لانے کے لیے کہا تھا اور ساجد پچھلے چکر میں سرمہ لایا بھی تھا مگر نہب نے نرنگ میں وہ چھوٹی سی شیشی چھپا کر رکھ دی تھی اور ساجد کو کہہ دیا تھا کہ احمد نے وہ شیشی توڑ دی ہے۔

وہ ان تمام باتوں کو سوچنے کے بعد اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ جملے سوچنے لگی۔ پریشان کن بات یہ تھی کہ ساجد کچھ بول ہی نہیں رہا تھا۔ وہ نجائے کون سی پہیلیاں سلجھانے میں غرق تھا۔

وہ خود سے سوال جواب شروع کر کے اپنے پاؤں کلبھاڑی نہیں مار سکتی تھی، اسی لیے انتظار کر رہی تھی کہ وہ خود گفتگو کا آغاز کرے۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر مولوی باقر کی کسی شکایت کی وجہ سے ساجد خفا ہے تو وہ سب کچھ صاف صاف بتا دے گی۔

مولوی باقر کے خلاف نہب نے یک طرفہ ایک محاذ بنالیا تھا۔ حالانکہ وہ بے چارہ اسے تو کچھ بھی نہیں کہتا تھا۔ فقط ساجد کو اچھی باتیں بتاتا رہتا تھا تا کہ ساجد صراط مستقیم پر چل سکے۔ نہب کو مولوی باقر پر اس لیے بھی شک ہو رہا تھا کہ جب سے ساجد، احمد کو بخار توڑنے والا دم کروا کر لایا تھا تب سے ہی خاموش خاموش سا تھا۔

”ساجی! تیرے لیے روٹی لے آؤں؟“ اس نے بہت ہمت کر کے پوچھا۔

ساجد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہب اٹھ کر بیٹھی پھر ٹانگیں چار پائی سے لٹکا کر جوتے پہنے لگی۔

ساجد نے پھر سے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔

نہب کو چار پائی سے اترتا دیکھ کر اس نے گہری سانس بھری پھر ہاتھ کے اشارے سے احمد کو اٹھا لینے کے لیے کہا۔ احمد گہری نیند میں تھا۔

”میں نے پوچھا تھا تیرے لیے روٹی لے آؤں یا آج بھوکا سونا ہے۔“ احمد کو اس کے سینے سے اٹھا کر چار پائی پر منتقل کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

احمد کو لٹاتے ہوئے اس کی کلائی میں سوچ کا جج کی چوڑیاں کھٹکنے لگیں۔ ساجد نے چرکے سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا تاسف بھرا تھا۔ نہب، احمد کو لڑکے کے کپڑوں سے ڈھکنے میں مصروف تھی تاکہ مجھڑ اور کوڑے اسے تنگ نہ کریں۔

”مجھے تجھ سے ایک بات کرنی ہے نہب!“ نہب کا دل اچس کر حلق میں آ گیا۔

وہ بڑھی لکھی نہیں تھی مگر اس نے قرآن پاک پڑھ رکھا تھا مگر ناظرہ میں اسے فقط سورۃ فاتحہ ہی آتی تھی۔ اس نے وہی پڑھ لی۔

”یہاں میرے پاس آ کر بیٹھ۔“ ساجد کی اگلی فرمائش نے اس کے رہے سہے اداسان بھی خطا کر دیے۔ اسے ایک ایک کر کے اپنی غلطیاں یاد آ رہی تھیں جن کی بنا پر اسے ساجد سے ڈانٹ پڑ سکتی تھی۔

وہ اپنی چار پائی سے اٹھ کر ساجد کی چار پائی پر آ کر بیٹھ گئی۔ ساجد بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آسمان پر آخری تاریخوں کا زرد چاند تھا جس کی روشنی چہرے کے رنگوں کو پڑھنے کے لیے نا کافی تھی مگر پھر بھی نہب کو اپنے چہرے پر ساجد کی آنکھوں کی پیش صاف محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر نجائے کیا کھوج رہا تھا۔

”تیری چوڑیاں بہت اچھی ہیں..... ماسی برکتے سے چڑھوائی تھیں نا؟“ اس نے یک دم نہب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

نہب کو کرٹ سا لگا۔ بہت دن پہلے اس نے ساجد کو یہی بتایا تھا کہ اس نے یہ چوڑیاں ماسی برکتے سے تیس روپے درجن میں خریدی تھیں۔

”ہاں..... ہاں..... تجھے آج یاد آئی ان چوڑیاں کی..... اب تو آدمی رہ گئی ہیں۔“ وہ اٹھلا کر بولی جیسے ساجد سے شکوہ کرنا چاہتی ہو کہ اسے اتنے دن بعد چوڑیاں دیکھنے کا دھیان آیا۔

ساجد نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پھر اپنے ہاتھوں سے پیشانی کو مسلنے لگا۔

”نہب! آج میں چوہدری کے ڈیرے پر گیا تھا..... وہاں میں نے ایسی ہی چوڑیاں دیکھیں۔ اک کوٹے میں نوٹی ہوئی پڑی تھیں..... ڈھیر تھا ڈھیر۔“ وہ اس کی جانب دیکھ کر بولا مگر اس کے لہجے میں سختی نہیں تھی بلکہ عجیب بے چارگی تھی۔

نہب کا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ اسے لگا وہ مر جائے گی۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”آ..... ایسی..... ایسی چوڑیاں؟“ اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ ساجد نے جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیا۔ زینب کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اپنی صفائی پیش کرے۔ اس کی خاموشی ساجد کو مشکوک کر سکتی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ساجد نے جھکے ہوئے سر اور دھیسے لہجے میں انکشاف کیا۔

”ذریعے کے پیچھے والے کھو (کنویں) سے کسی زنانی کی لاش وی نکلی ہے۔“

”ہائے میں مر گئی..... تو بچ کھد رہا ہے ساجی!“ اس نے دہل کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

چوہدریوں کے ”کارنائے“ کوئی ایسی ”ننی“ یا ”انہونی“ بات نہیں تھی مگر لاش کا ملنا بچ بچ خوف ناک تھا۔ چوہدری باہمی رضامندی سے معاملات نبھانے والے لوگ تھے۔

”کسی ہور سے بات نہ کرنا زینب..... چوہدری سے دشمنی ہم جیسے لوگوں کو اس نہیں آ سکتی..... بس تو اپنی زبان بند رکھنا..... کسی سے کہنے کا فائدہ ہی کیا ہے۔“ ساجد نے اسے نصیحت کرنا ضروری سمجھا تھا۔

زینب دل ہی دل میں درد و شریف کا درد کرتی وہاں سے اٹھ گئی۔ اس کے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

میں نے کچھ عرصہ R-Lintas دالوں کے لیے بھی کام کیا ہے۔ وہ ایک زبردست ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے۔ وہاں آپ کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے اور پھر کام کے ساتھ ساتھ انجوائے منٹ کا بھی فیل مارجن..... میرے پاس ان کا دیا ہوا ”Experience Letter“ بھی ہے۔ ان کے MD میرے کام سے بہت امپر لیس تھے۔ ”تانیہ درانی نامی اس لڑکی نے اپنے کافی براؤن بالوں میں بایاں ہاتھ چلاتے ہوئے رسمی انداز میں مسکرائے ہوئے کہا۔

عشاء نے اپنے لبوں پر جوابی مسکراہٹ سجانے کی کوشش نہیں کی۔ اس لڑکی کے چہرے سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ صرف آس پاس بیٹھی لڑکیوں پر رعب ڈالنے کے لیے جھوٹ پر جھوٹ بول رہی ہے۔

”میرا ارادہ R-Lintas کو چھوڑنے کا نہیں مگر.....“ اس نے پھر بات شروع کی اور آنکھیں گھما کر عشاء کی جانب دیکھا پھر لحد کو رک کر بولی۔

”وہ لوگ میرے پیچھے ہی پڑ گئے تھے، اصرار کر رہے کہ میں ان کے کسی کلائنٹ کی خصوصی فرمائش پر ان کی کسی پراڈکٹ میں ماڈلنگ کروں.....؟ ہاں ٹھیک ہے یہ بھی ایک اچھا پروفیشن ہوگا مگر میرے جیسی لڑکی کے لیے مشکل تھا کہ میں ایک تھرڈ کلاس سٹارٹرل بن کر دانتوں کی نمائش کرتی پھرتی.....؟“ یہی تو ماڈلنگ کو سٹارٹرل ہی سمجھتی ہوں۔ اپنا آپ سچا سنوار کر کسی پروڈکٹ کی تسمیری مہم میں حصہ لینا بہت چپ لگتا ہے۔“

وہ اپنی دائیں ٹانگ پر رکھتے ہوئے بولی۔ انتہائی ٹائٹ جینز کے پانچ پر بنے کٹ نے پھیل کر اس

کی دودھیا ٹانگ کو پنڈلی تک نمایاں کر دیا تھا جبکہ شرٹ کے نام پر دھبہ اس کی شرٹ پشت کے قریب اکٹھی ہو کر اس کے پیٹ کو عمریاں کر رہی تھی مگر اسے پروا نہیں تھی۔

اس وینٹ روم میں ضرورت مند لڑکی تو کوئی بھی نہیں لگ رہی تھی۔ سب ہی اپنے جیبے اور رکھ رکھاؤ سے ”شوقیہ“ کے زمرے میں لگتی جاسکتی تھیں مگر تانیہ درانی کا تو انداز ہی نرالا تھا۔

”ویسے بھی ماڈلنگ کی مجھے اجازت نہیں ملتی تھی۔ میرے پیرٹس بہت مذہبی ہیں ہمارے گھر کا ماحول ایسا نہیں ہے کہ اس قسم کے کاموں کی اجازت اتنی آسانی سے مل جائے اور پھر میں ضد بھی کیوں کرتی جبکہ میں خود بھی انٹرنیشنل نہیں تھی۔ بائی واوے عشاء! آپ چہرے پر کیا لگاتی ہیں؟ آپ کی اسکرین بہت فریش ہے۔“ اپنی داستان امیر حمزہ سناتے سناتے وہ پھر عشاء کو چھیڑ بیٹھی تھی۔

عشاء نے مصنوعی رسمی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا پھر بولی۔

”اللہ کی رحمت ہے جی..... بس جھوٹ بولنے سے پرہیز کرتی ہوں۔“ تانیہ درانی نے سر ہلا کر تانیہ کی پھر وہ جھوٹ کی برائیاں کرنے میں لگن ہو گئی تھی۔

عشاء کو کچھ دیر بعد ہی کال کر لیا گیا۔ وہ اپنے بے شکن لباس کو جھاڑتے ہوئے اٹھی اور اس کمرے کی سمت چل دی جہاں انٹرویو ہوتا تھا۔ اس کمرے کا ماحول قطعاً آفس کی طرز کا نہیں تھا۔ وہ آفس سے زیادہ ایک پرتعیش لوگ روم لگ رہا تھا۔

لائٹ گرین کورڈ والے بھاری صوفے، لائٹ اور ڈارک گرین کنفرانس ٹیبل پر دے کارنر میں موجود قیمتی ان ڈور پلانٹس مینٹے ڈیکوریشن پیمز اور مینٹلو سب ہی کچھ مل جل کر اس ڈرائنگ روم نما آفس کی شان بڑھا رہے تھے۔

ہیٹل میں دو عورتیں اور ایک مرد شامل تھا۔ ان تینوں کے چہروں پر سختی اور رعونت کے بجائے دوستانہ سی مسکراہٹ تھی۔

”مس عشاء عادل..... بیٹھے پلیز۔“ اس شخص نے مسکرا کر اسے بیٹھنے کی دعوت دی۔ عشاء کے Particulars والی فائل پہلے سے ہی اس کی میز پر موجود تھی۔

”مسز عشاء عادل! عشاء نے بیٹھتے ہوئے صبح کرنا ضروری سمجھا۔ ان تینوں کے چہروں پر مسکراہٹ کی پرچھائیں گہری ہوئی۔

”اوہ سوری..... مسز عشاء عادل..... میں اسفند رحیم یہ مس شیریں اور وہ مس ضویا ہیں۔“ اس شخص نے مسکراتے ہوئے معذرت کی اور پھر اپنا اور ان دو خواتین کا تعارف کروانے لگا۔

عشاء نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ انٹرویو ہیٹل اس کی توقع سے زیادہ خوش اخلاق و خوش گفتار تھا۔

”میں ایک بات کی وضاحت کر دینا چاہتی ہوں۔ ہم ایک سی گورنمنٹ ادارہ چلا رہے ہیں ہمارا مقصد انسانیت کی خدمت ہے اور اس کے لیے ہمیں ایسے حوصلہ مند اور ہمدرد لوگوں کی ضرورت ہے جو اس مشن میں جارا ساتھ دے سکیں۔“

مس شیریں بغور اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ خاموش ہوئیں تو مس ضویانے اپنی زبان پر لگا قفل کھولا۔

”ہو سکتا ہے آپ کو یہ انٹرویو کچھ مختلف لگے۔ ان تمام انٹرویو سے مختلف جو آج تک آپ دیتی آئی ہیں۔ اس غیر رسمی انٹرویو کا مقصد دراصل امیدوار کی خصوصیات کو جانچنا اور ان کی ذہنی اپروچ کا پتا لگانا ہے۔ تاکہ یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ آیا آپ ہمارے ساتھ کام کر سکتی ہیں یا نہیں۔“

مس ضویا خاموش ہوئیں تو کمرے میں صرف فائل کھولنے اور بند کرنے کی ہلکی سی سرسراہٹ گونجتی رہی پھر اسفند صاحب صوفے پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

”What do you think about love“ اچانک اسفند صاحب نے پوچھا تھا۔

عشاء لہجہ بھر کے لیے سوچ میں پڑ گئی اسے اس قسم کے غیر روایتی انٹرویو کی امید نہیں تھی۔

”محبت.....؟“ عشاء نے ہونٹ سمجھجھک کر کچھ سوچنے والے انداز میں کہا۔

اس نے زندگی میں کبھی بھی دلچسپی سے کسی ادبی مصنف کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ انتہائی پریکٹیکل قسم کی ذہنی اپروچ رکھنے والی مسز عشاء عادل کے لیے اس سوال کا جواب دینا مشکل نہ سہی مگر مختلف ضرور تھا۔ اس نے ان تینوں کی جانب دیکھا وہ اسی کی طرف متوجہ تھے۔

”دراصل ہم محبت کو Defined نہیں کر سکتے..... یہ ایک ایسی چیز ہے جو کبھی جمود کا شکار نہیں ہوتی..... ہرگز رتے لمحے کے ساتھ Variations آتی ہیں جو اسے گھٹنے مڑنے نہیں دیتیں..... محبت جو کل تھی وہ آج نہیں ہے اور جو محبت آج ہے وہ کل نہیں ہوگی۔ آج کی محبت پریکٹیکل ہے۔ گزشتہ زمانے میں حکمران اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ”تاج محل“ جیسا شاہکار تخلیق کر سکتے تھے مگر آج کوئی بھی ایسی غلطی نہیں کرے گا۔“

اس نے بہت سوچ کر جواب دیا مگر اسفند صاحب کے چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی۔

اس شخص کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔

”تاج محل اور غلطی.....؟“ اس نے استہزاءیہ انداز میں مسکراتے ہوئے یہ دو لفظ دہرائے۔

”لیس سر! غلطی..... کم از کم میں تو اسے غلطی ہی کہوں گی۔ ایک عام سی عمارت کھڑی کر کے اس کے پیچھے ایک محبت بھری کہانی منسوب کر دی گئی اور اس کے بجائے اگر کوئی لائبریری کوئی انسٹی ٹیوٹ بنا دیا جاتا تو بہتر ہوتا..... لیکن بہر حال یہ میری ناقص رائے ہے۔ آپ کا کیا کسی کا بھی مجھ سے متعلق ہونا ضروری نہیں۔“ اسفند نے اپنی آنکھوں میں در آنے والی ستائش کو چھپالیا تھا۔

”مس عشاء..... آئی میں مسز عشاء عادل.....! کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہے کہ گزشتہ زمانے کے لوگ محبت کے معاملے میں اتنے Calculative نہیں ہوا کرتے تھے۔“ اس نے بغور عشاء کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

”جی..... میں یہی کہنا چاہتی تھی۔“ عشاء نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

ان بے تکلی باتوں سے اسے چڑھنے لگی تھی۔ عشاء کی بات سن کر وہ عجیب سے انداز میں مسکراتے لگا پھر میز پر بالکل آگے ہو کر بولا۔

”کیا آپ اس لفظ کی وضاحت کرنا پسند کریں گی؟“

عشاء دل ہی دل میں جزبہ ہوئی۔ اب وہ اس سوال کا کیا جواب دیتی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ اسے اس طرح کی باتوں کا کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ وہ کرنٹ افیئرز پر بات کر سکتی تھی۔ ملک میں امن و عامہ کی صورت حال پر ٹھیک ٹھاک تنقید کر سکتی تھی۔ سوشلزم اور کمیونزم کی وضاحت کر سکتی تھی۔ مگر محبت جیسی چیز کے بارے میں وہ کیا کہتی۔

”اسفند پلیز.....! اسٹاپ اٹ ہاں..... تم وہی اولڈ اینڈ اوڈ بائیں نہ شروع کر دینا..... ہم وہ الف لیلولی باتیں سننے کے موڈ میں نہیں ہیں! آئی؟“

مس ضویا نے اسفند کو کچھ کہنے کے لیے پر تو لے دیکھ کر فوراً ٹوکا جبکہ مس شیریں دھیسے سے مسکرائیں۔

”آپ کو میرج کواریج میرج کے مقابلے میں کتنے مارکس دیں گی۔“

”دہت تیرے کی..... وہی مرنگی کی ایک ٹانگ۔“ عشاء نے دل ہی دل میں ناگواری سے سوچا۔

اسے یکدم ہی اپنا آپ ہونق لگنے لگا۔

”میری ارینجڈ میرج ہے اور میں اپنی میرڈلائف سے ماشاء اللہ بہت مطمئن ہوں۔ اس لیے ظاہر ہے میں تو ارینجڈ میرج کو ترجیح دوں گی۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

وہ کوفت کا شکار ہونے لگی تھی۔ اس کے جواب پر دونوں خواتین نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا عشاء کا دل اچاٹ ہو چکا تھا۔

”اوکے مس..... آپ کے خیال میں آزادیء اظہار کیا ہے؟“ اسفند نے پھر گفتگو میں حصہ لیا۔

وہ شاید عہد کر کے اس جگہ پہنچا تھا کہ وہ کسی خاتون کو بولنے کا موقع نہیں دے گا عشاء ابھی اس سوال کا جواب سوچ رہی تھی کہ وہ پھر بول اٹھا۔

”اگر میں یہ کہوں کہ آزادیء اظہار یہ ہے کہ آپ مجھے اچھی لگ رہی ہیں تو مجھے بر ملا اس بات کا اظہار کر دینا چاہیے اور آپ کو بتا دینا چاہیے کہ سفید رنگ آپ کے لیے ہی بنا ہے اور یہ آپ پر بہت بچ رہا ہے۔“

آپ اس لباس میں بہت خوبصورت لگ رہی ہیں اور کیا آج رات آپ میرے ساتھ لاگ ڈرائیو پر چلنا پسند کریں گی تو آپ کیا کہیں گی..... ازس فریڈم آف اسپیج..... ہاں..... بولیں۔“ اس کا لہجہ سادہ تھا مگر آنکھوں کی اچھری عشاء کو اپنے وجود کے آ رہا رہتی..... محسوس ہوئی۔

عشاء کے حراج کو برہم ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی تھی اور جب وہ برہم ہو جاتی تھی تو پھر اپنے سامنے موجود کسی بھی شخص کو منٹوں میں کھری کھری سنا دیا کرتی تھی۔ جذباتیت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

”اس ساری بکواس کے جواب میں مجھے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ آپ عقل سے پیدل ایک گھٹیا اور جاہل شخص ہیں۔ آپ کو شاید میز کے اسپیکنگ بھی نہیں آتے ہوں گے اور یہ ساری باتیں جو آپ نے کی ہیں یہ بھی بکواس ہیں آپ نے شاید اسی ساری بکواس کی تشہیر کے لیے ملک کے اچھے اخبارات میں ایڈ دیا تھا۔ وہ تمام اخبارات جن میں یہ ایڈ چھپا تھا وہ بھی بکواس ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اب مجھے بھی اپنا آپ بکواس لگنے لگا ہے۔ کہ آخر میں یہاں کر کیا رہی ہوں۔ ویس آں..... میرے دل میں آپ کے حوالے سے جو جذبات ابھرے ہیں میں نے کہہ دیے۔“ عشاء نے خلاف توقع نہایت تحمل سے بات مکمل کی پھر گہری سانس بھر کر بولی۔

”میرا خیال ہے یہی آزادی اظہار ہے نا سر؟“

وہ یک ٹک اسفند کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات کر رہی تھی۔

اسفند صاحب کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ اس شخص کو شاید اپنے اعصاب پر مکمل کنٹرول تھا۔ اگر اسے برا بھی لگا تھا تو اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

”وٹڈ رفل مسز عادل.....! سہلی امیزنگ۔“ اس کے لہجے میں ستائش تھی۔ جبکہ مس شیریں مسکرا رہی تھیں۔

البتہ مس ضویا کا چہرہ ساٹ رہا۔

”اوکے..... جھینک یو مسز عادل!“ اس نے ساٹ چہرے کے ساتھ گویا عشاء کو پروانہ آزادی دیا تھا۔ عشاء اٹھ کر باہر نکل آئی۔

اس کے قدموں میں کم ہمتی یا مایوسی والی لرزش نہیں تھی۔ وہ اس جاب کو گویا ”طلاق“ دے کر باہر آئی تھی۔ دروازے سے باہر نکلنے تک دو آنکھوں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”تیرا آج گھر جانے کا ارادہ نہیں ہے؟“ نذیراں نے ٹاک چڑھا کر اس کی سست روی پر تنقید کی۔

وہ مرے مرے ہاتھوں سے گھاٹ پر ایک میلی قمیض رگڑنے میں مصروف تھی جبکہ نذیراں سمیت اس کے ساتھ آئی باقی عورتیں ناصر ف کپڑے دھو کر فارغ ہو گئی تھیں بلکہ ایک دوسرے کے سر سے جوئیں نکالنے تیل ڈالنے اور بچوں کو نہلانے کے ساتھ ساتھ لگائی بھائی جیسے اہم فرائض بھی نبھا چکی تھی۔ یہ دھوئی گھاٹ آبادی سے

ذرا ہٹ کر چوہدری کے کھیتوں کے قریب ہی واقع تھا چونکہ اندر ہی اندر سب ہی چوہدری کی تازہ واردات سے واقف تھے۔ اس لیے تمام عورتیں آج کل اکٹھی گھاٹ پر آتی تھیں۔ سب کے مردوں نے رازداری سے سب کو ہی خبردار کر رکھا تھا۔

”ارادہ کیوں نہیں ہے.....؟ ہے ارادہ..... گھر نہیں جاؤں گی تو ہو رکھہ جاؤں گی۔“ نذیراں کی طرف دیکھتے بغیر اس نے جواب دیا پھر گدلے پانی میں پڑے پتھر پر صابن لگی قمیض کو زور سے ملنے لگی۔

وہ فطرتاً لڑا کا نہیں تھا مگر اس کے ماضی سے واقفیت کی بنا پر کم ہی عورتیں اس سے میل جول رکھتی تھیں۔

”میں نے آج بڑی سستی دکھائی..... گھر جانے کی جلدی نہیں تھی نا..... ساجی شہر گیا ہے..... شامی (شام) واپس آئے گا..... ہانڈی میری پکی ہوئی ہے سویرے کی..... ہم تو جی دو (افراد) ہیں۔ روٹی میں ساجی کے لیے تازی بناتی ہوں۔“ وہ صابن لگی قمیض کو خشک قمیض پر نچوڑ کر سارا جھاگ اس پر منتقل کرتے ہوئے بولی۔

”اس کا مطلب تجھے تو آج بہت ٹیم (ٹائم) لگ جائے گا، ہم سب تو کام مکا کر فارغ ہو چکی ہیں۔ وہ سب تو گھر جا رہی ہیں۔“ نذیراں نے عقب میں اپنی چیزیں سینٹی دوسری عورتوں کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہاتھ میں پکڑی کیری کتر نے میں مصروف تھی۔

زینب اس کی کسی بات کا جواب دیے بغیر وہ دونوں قمیضیں نتھار کر دوسری طرف پڑی سوکھی جھاڑیوں پر پھیلانے چل دی۔ اس کے واپس آنے تک نذیراں وہیں بیٹھی رہی۔

”اس کا مطلب تجھے ابھی ہو گھنڈہ چاہیے؟“ نذیراں نے بات دہرائی۔

زینب نذیراں کا تذہیب سمجھ رہی تھی۔ وہ یقیناً گھر جانا چاہتی تھی مگر زینب اکیلی تھی۔ اس وجہ سے وہ جانیں سکتی تھی۔ شاید وہ یہ چاہ رہی تھی کہ زینب اپنے منہ سے اسے جانے کے لیے کہہ دے۔

”باقی سب تو چل دی ہیں..... سب کے گھر کے کام پڑے ہیں..... میری اپنی ہانڈی پکانے والی پڑی ہے..... میری وڈی تو کسی کام کی نہیں..... یہ دو مہینے بعد پورے بارہ سال کی ہو جائے گی مگر عقل اس کو رتی دی نہیں آئی اس سے تو سادی موگ کی دال دی چنگی طرح نہیں پکائی جاتی..... اب گھر جاؤں گی تو خالی ہانڈی منہ چڑھا رہی ہوگی..... ہانڈی تو مجھے ہی پکانی ہے نا کہ موبھوک کا بڑا کچا ہے۔ دیر سویر ہو جائے روٹی کو تو اس کا غصہ دیکھنے والا ہوتا ہے۔ میں تیرے پاس رک جاتی مگر موم کا غصہ.....“ نذیراں لہجے میں بے جا رگڑی سموتے ہوئے بولی۔ یہ حقیقت تھی کہ اس کا خاندان بہت سخت حراج واقع ہوا تھا۔

”ہاں ہاں نذیراں! تو جا..... میرا تو ابھی اتنا کپڑا دھونے والا پڑا ہے..... مجھے تو ابھی دیر لگے گی۔ تیری ہانڈی کو دیر ہوئی تو بھائی کرم دین ذکر اتنا پھرے گا تو جا..... میری فکر نہ کر میں اکیلی سو پر بھاری ہوں اور اب تو میرا پتہ دی جوان ہو گیا اے..... مجھے کاہے کی فکر؟“ زینب نے احمد کی جانب محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

نذیراں مطمئن ہو کر اپنا سامان سینٹے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ سب اپنی اپنی پوٹلیاں سنبھالے آبادی کی

طرف چل دیں۔

گھاٹ کے دائیں بائیں چوہدری رب نواز کی ہی زمینیں تھیں وہ ایک اوسط درجے کا زمیندار تھا مگر اس پر اللہ کا فضل تھا۔ تھوڑی زمین پر بھی جو بوتادہ سوتا بن کر نکلتا تھا۔ دھوبی گھاٹ کے دائیں طرف مشرقی سمت میں کئی کی فصل تیار کھڑی تھی جبکہ مغربی سمت میں چاول کی پھیری لگ چکی تھی۔

نہن۔ جس جگہ بیٹھی تھی اس کے بالکل عقب میں پگڈنڈی پرسیدی طرف چوہدری کا ڈیرا تھا جبکہ اسی پگڈنڈی پر اگر کچے میں اکثر آگے کی سمت بڑھتے تو اس کا چھوٹا سا اصطبل تھا جس میں شاید ایک آدھ گھوڑی بھی موجود تھی۔ اصطبل کے ساتھ بھینسوں کا باڑہ تھا یہ باڑہ ملکوں کا تھا۔ ملکوں کی چوہدریوں سے ٹھیک ٹھاک یاری تھی اس لیے زیادہ لڑائی جھگڑے نہیں ہوتے تھے اور اگر ہوتے بھی تھے تو وہ لوگ مل بیٹھ کر سلجھا لیا کرتے تھے۔

ان عورتوں کے جانے کے بعد نہن اپنی میلی چنری کو گھاٹ پر شیخ کر دھوتی رہی پھر جب اسے اطمینان ہو گیا کہ سب جا چکی ہیں تو وہ گھاٹ سے اتر آئی۔ احمدی والی جگہ سے دور بیٹھا مٹی کھانے میں مصروف تھا۔ ابھی حال ہی میں اس کا بخارا اتر تھا اس لیے کافی چڑچڑاہور ہا تھا۔ نہن نے اسے مٹی کھانے سے نہیں روکا تھا۔ نہن نے اپنی چیزیں سینٹا شروع کر دیں۔ گیلے سوکھے کپڑوں کو اس نے ایک گھڑی میں باندھ کر ایک طرف رکھا اور پھر گھاٹ کے پانی سے منہ دھونے لگی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے دھلی صاف چادر اوڑھی اور کپڑوں والی گھڑی کو درخت کی کھوہ میں ایک طرف کر کے رکھ دیا کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ اس کے بعد اس نے احمد کو گود میں بھرا اور پگڈنڈی کی سمت چل دی۔ گھاٹ سے پگڈنڈی کا فاصلہ بیس پچیس قدموں کا تھا۔ وہ پگڈنڈی پرسیدی چلتی جا رہی تھی۔

”بھر جائی.....“ اسے کسی نے پکارا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس آواز کو وہ بخوبی پہچانتی تھی۔ بمشکل اپنے چہرے کے تاثرات کو قابو کرتے ہوئے وہ مڑی اور ترخ کر بولی۔

”ہاں۔“ مولوی باقر نے اس کے لٹھے مار کے انداز کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا۔

”اس ویلے کہ ہر جا رہی ہو بھر جائی۔“ جھکی آنکھوں کے ساتھ مولوی باقر نے بہت ملائم لہجے میں دریافت کیا تھا۔ نہن کے ماتھے کے بلوں میں کچھ اور اضافہ ہوا جسے مولوی باقر نے فوراً محسوس کر لیا تھا۔

”میرا مطلب تھا یہ راستہ تو چوہدری کے ڈیرے کی طرف جاتا ہے اس ویلے ڈیرے پر کیا کرنے جا رہی ہو؟ اگر یہ دیکھنے جا رہی ہو کہ وہاں تندور مل (جمل) رہا ہے یا نہیں تو میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ چوہدری نے ڈیرے والا تندور بند کر دیا ہے۔“ وہ وضاحت آمیز انداز میں بولا۔

اس کی پلکیں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔ وہ نہن کا ایسے احترام کرتا تھا جیسے نہن اس سے کئی سال بڑی ہو۔

”تمہاری مہربانی باقر بھائی! کہ تم نے مجھے بتا دیا کہ وہاں تندور بند ہے مگر تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ میں تندور پر نہیں جا رہی تھی۔ میں کسی ہو کام سے جا رہی تھی اور میں چوہدری کے ڈیرے پر نہیں جا رہی ہوں بھلا ایک زانی کا کیا کام..... اب تمہاری اجازت ہو تو میں چلی جاؤں؟“ وہ کاٹ کھانے والے انداز میں

بولی۔

مولوی باقر نے شرمندہ سی نظریں اٹھا کر اسے دیکھا، پھر دھیمی آواز میں بولا۔

”بھر جائی! تم میری چھوٹی بہنوں کی طرح ہو اور پھر تم ساجد علی کی بیوی ہو۔ مجھے بہنوں سے بڑھ کر عزیز ہو۔ میری بات کا غلط مطلب نہ لینا۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے تمہیں میری کوئی بات بری لگی ہے۔ تم مجھ سے نراض (ناراض) ہو تب ہی تمہارا رویہ میرے ساتھ بہت بدل گیا ہے۔ تمہیں کسی بات کا غصہ ہے تا تب ہی تم اپنے بھائی سے کچھ کھڑی سی رہتی ہو۔ میری طرف سے اگر کوئی بھول چوک ہوگئی تو میں معافی مانگ لیتا ہوں۔ بہنوں سے معافی مانگنے میں بھائیوں کا شملہ نیچا نہیں ہوتا۔“

اس کی اتنی لمبی تقریر بھی نہن کو پرسکون نہ کر سکی۔

”مجھے ایک بات بتاؤ بھائی باقر! تمہارا اصل کیا ہے؟ یہ جو تمہارے چہرے کے پیچھے ایک چہرہ ہے وہ کیا ہے بھائی باقر! تم مجھے بہن کہتے ہو اور اس طرح سے میرا پیچھا کرتے ہو۔ ساجد علی کو بتا چلے گا تو کیا عزت رہ جائے گی تمہاری۔ کہنے کو تم مجھے بہن کہتے ہو اور لفٹکوں کی طرح میرے پیچھے پیچھے آتے ہو..... اس بات کی ٹوہ میں رہتے ہو کہ میں کہاں جا رہی ہوں؟ کہاں سے آ رہی ہو؟ یہ عزت ہے تمہاری نظر میں میری؟“ نہن جھنجکی لمبی کی طرح غراتے ہوئے بول رہی تھی۔ نہن کے اس قدر سخت لہجے پر وہ ہکا بکا رہ گیا جبکہ نہن کو اس کی خاموشی سے مزید حوصلہ ہوا۔

”تم نے تو دین کی بہت سی باتیں پڑھ رکھی ہیں۔ تم تو مجھ سے زیادہ سیانے ہو۔ تم مجھے بتاؤ کہ یہ مناسب لگتا ہے کہ تم ایک زانی کے پیچھے پیچھے آؤ۔ اپنی عمر کا نہ سہی اپنے رہنے کا خیال کر لو۔ سارے زمانے کو نصیحتیں کرتے ہو کہ نیک انسان بن کر رہنے کا دل (طریقہ) کیا ہے اور خود تمہیں ایسی باتوں کا دل نہیں ہے۔ ساجد علی کو منع کر دیا کہ کئی وی نہ لو..... یہ دوزخ کا ٹکٹ ہے اس سے انسان غلط باتیں سیکھتا ہے۔ تمہارے گھر تو بی وی نہیں ہے تم نے یہ غلط باتیں کہاں سے سیکھیں؟“ وہ تیز آواز میں نہایت حقارت سے بات کر رہی تھی۔

اپنی بات ختم کر کے وہ لٹھ بھر بھی نہیں رکی تھی جبکہ مولوی باقر کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک رنگ جا رہا تھا۔ وہ تو ملکوں کی بھینسوں کو دم کرنے آیا تھا۔ بھر جائی کو اکیلے راستے پر جاتے دیکھا تو ہمدردی کے مارے پوچھنے چلا آیا اس ہمدردی کا یہ صلہ ملا تھا۔

”بھر جائی نے بی وی والی بات کو دل سے ہی لگا لیا ہے۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

نہن پیچھے مڑ کر دیکھنے بغیر آگے ہی آگے چلی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ چوہدری کا ڈیرا کہیں پیچھے رہ گیا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ وہ کافی آگے نکل آئی ہے تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ناگوار سی سے گہرا سانس بھرا اور دوبارہ سے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

☆ ☆ ☆

پونے بارہ بجے وہ انٹرویو دے کر آئی تھی اور ساڑھے پانچ بجے اسے ”فلاح“ والوں کی جانب سے فون آ گیا۔

”ہماری NGO کو آپ جیسی ایکٹو اور حوصلہ مند خواتین کی ضرورت ہے۔ ہمیں خوشی ہوگی اگر ہم آپ کی سروسز حاصل کر سکیں۔ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو کل آکر جو انٹنگ رپورٹ پر سائن کر کے کچنگ کے متعلق معلوم کر لیجئے گا۔“ مس ضویا کی سیکرٹری نے گھسے پٹے ڈائلاگ رپورٹ کی طرح سنا کر فون بند کر دیا۔

”ارے واہ..... مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔“ فون رکھ کر عشاء نے مسکراتے ہوئے خود کلامی کی۔ اگرچہ وہ ”فلاح“ والوں کے آفس کو چھوڑتے وقت اس جاب کو نہ کرنے کا تہیہ کر چکی تھی مگر اب ان کی جانب سے موصول ہونے والی ویلکم کال نے اسے متحرک کر دیا تھا۔ عادل آٹھ بجے تک آتا تھا اور اسے یہ خوشخبری تب تک سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اسے موبائل پر کال کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ کال ریسپونڈ نہیں کر رہا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب وہ آیا تو عشاء نے دروازہ کھولتے ہی اسے خوشخبری سنائی تھی۔

”اوہ..... واؤ..... مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا..... میں مٹھائی لے آتا۔“ وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

عشاء خوشی سے بے قابو ہوئی جاری تھی۔ اس نے عادل کے چہرے کے بیزار کن تاثرات پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ خود بخود لابی سے گزر کر لاؤنج میں آ گئی۔ عادل اپنی فائلز صوفے پر پھینک کر ٹائی ڈھیلی کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ شروع ہو گیا۔

”اب بھی دیر نہیں ہوئی..... میں اب لے آتا ہوں۔ ڈیڑھ گھنٹے کی تو ڈرائیو ہے، ابھی گیا اور ابھی آیا۔ کس کی مٹھائی کھانی ہے؟ نرالا سویش سے لاؤں یا فضل والوں کی چلے گی یا پھر بیٹ سویش تک جانا پڑے گا۔ ویسے اگر تم کہو تو گورے سے بھی کچھ لاسکتا ہوں۔ شیزان والوں کے ڈنٹس تمہیں ویسے بھی بہت پسند ہیں۔ بات بھی اس قدر خوشی کی ہے۔“

ٹائی کی ٹانگ ڈھیلی کر کے اس نے شرٹ کے سارے بٹن کھول دیے تھے اور اب لاؤنج میں رکھے ڈیپ فریزر سے پانی کی بوتل نکال رہا تھا۔ اس کی مسلسل چلتی زبان پر عشاء نے ہمنویں اچکا کر اس کی جانب دیکھا۔

”مذاق کر رہے ہیں؟“ وہ بے یقینی سے بولی۔ عادل کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ مذاق اور طنز کو الگ الگ چیز نہیں سمجھتا تھا۔

”ارے نہیں نہیں یار! میری یہ مجال..... توبہ توبہ.....“ صوفے پر مگر نے والے انداز میں بیٹھ کر وہ گھونٹ گھونٹ پانی اپنے اندر منتقل کرنے لگا۔

اس کا موڈ آف دیکھ کر عشاء کچن کی طرف آ گئی۔ واپس آئی تو پھر ہاتھ میں گلاس تھا۔ اس نے فریزر سے جگ نکالا اور صوفے پر عادل کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

”میں نے آپ کے لیے Tang بنا کر رکھا تھا..... بہت گرمی ہے نا۔“ وہ مصالحت کے موڈ میں تھی اس لیے نرمی سے بولی۔

”اوہ! بہت جلدی یاد آ گیا۔“ وہ ترخ کر بولا۔ عشاء نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

آج اس کا مزاج کچھ زیادہ ہی برہم تھا اور وہ اپنا غصہ چھپانے کی کوشش بھی نہیں کر رہا تھا۔ عشاء اس سے باقاعدہ اجازت لے کر انٹرویو دینے گئی تھی اور اب جب وہ کامیاب ہو چکی تھی تو عادل کی خفگی کی وجہ سے کچھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے گلاس بھر کر اس کے سامنے رکھا اور پیر پٹی کچن میں آ گئی۔

”اوہ..... پتا نہیں کیا سمجھتے ہیں اپنے آپ کو..... میں بھی اب بات نہیں کروں گی۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے چولہا جلایا۔

”آج کھانے کو کیا ملے گا؟“ عادل نے لاؤنج میں بیٹھے بیٹھے پوچھا تھا اور وہ جو اس سے بات نہ کرنے کا عہد کر کے کچن میں آئی تھی ایک لمحہ خاموش نہ رہ سکی۔

”طعنے.....“ اس کے بھانڈ کھاتے لیجے نے عادل کی طبیعت کو کافی فریش کر دیا۔

”کبھی میڈر چینیج بھی کر لیا کرو۔“ اس نے جوابی حملہ کیا۔ عشاء کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر عادل بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔ عشاء نے کھانا گرم کر کے ٹیبل بھی سجالی مگر وہ کمرے سے باہر نہیں تھا۔

”میں بس نوکرائی بنی رہوں ان کے کپڑے دھوؤں ان کے لیے کھانا پکاؤں ان کا انتظار کروں ان کی خدمت کروں..... یہ خوش؟“ تو میں بھی خوش ہوں..... یہ سانس لیں تو میں بھی سانس لے لوں..... میرا اپنا تو کوئی وجود ہی نہیں ہے..... میں بس گھٹ گھٹ کر مر جاؤں..... کسی کو کیا پروا..... اس کی بڑبڑاہٹ عروج پر تھی۔

”ابھی سے فاتحہ تم پڑھو..... ابھی تو میرے مرنے میں چالیس پچاس سال پڑے ہیں۔“ عادل نے دائیں طرف کی کرسی سنبھالتے ہوئے کہا تھا۔

لیجے میں پہلے جیسی کات نہیں تھی آنکھوں میں شرارت بھی تھی۔ اس کی دل دہلا دینے والی بات؛ عشاء نے اسے گھور کر دیکھا اور بے ساختہ ایک دھمو کا جڑا۔

”توبہ کتنا راتی ہو مجھے۔“ وہ شانہ سہلاتے ہوئے بولا۔

”آپ کی طرح لفظوں سے لہو لہان نہیں کرتی۔“ عشاء پر جواب دینا فرض تھا۔

”فلاح“ والوں کے ایڈ میں یہ بات درج تھی تاکہ انہیں ایک زبان دراز عورت کی ضرورت ہے اس لیے تمہیں اپائنٹ کیا گیا ہے ورنہ اس کے علاوہ اگر تم میں کوئی خصوصیت ہے تو بخدا بندہ اس سے قطعی لاعلم ہے۔

عادل نے پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے جان بوجھ کر بات کو یہ رخ دیا تاکہ پھر سے آج کی تازہ خبر کو زیر بحث لایا جاسکے۔

”عورت ہوں گے آپ خود۔“ عشاء چڑ کر بولی۔ سب عورتوں کی طرح اسے بھی خود کو عورت کہلوانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ عادل اس کی بات پر کھل کر ہنسا۔ یہ اس کی سب سے اچھی بات تھی کہ اس کا غصہ جلدی اتر جاتا تھا۔

”آہستہ بولو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اتنا بڑا راز اتنی اونچی آواز میں فاش نہیں کرو۔“ ڈیر۔

وہ رغبت سے کھاتے ہوئے بھی اپنی زبان کے جوہر دکھانا نہیں بھولتا تھا جبکہ عشاء اس معاملے میں ذراست واقع ہوئی تھی۔ سو وہ خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف رہی۔ عادل نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش بھی کی اور کھانے کی تعریف بھی کی مگر وہ ”ہوں ہاں“ میں جواب دیتی رہی۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔

اس کے بعد عادل ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا جبکہ عشاء کچن میں آگئی۔ پھیلاوا اسمیٹے کے بعد وہ عادل کے ساتھ لاؤنج میں ہی بیٹھ جایا کرتی تھی۔ دن بھر کی مصروفیت خمیر کرنے یا ٹی وی دیکھنے میں وقت گزر جاتا تھا یا پھر انٹرنیٹ پر گھر والوں سے بات ہو جاتی تھی مگر عشاء ناراضی کا اظہار کرنے کے لیے بیڈ روم میں چلی آئی۔ صبح پہننے کے لیے کپڑے منتخب کئے پھر استری کرنے لگی کیونکہ وہ جانتی تھی عادل جلد یا بدیر اسے جوائنٹنگ رپورٹ پر سائن کرنے کے لیے کہہ دے گا کیونکہ وہ اسے اجازت تو دے ہی چکا تھا۔

”آئس کریم کھانے چلو گی؟“ اس کی خاموشی سے اسکا عادل بیڈ روم میں آ کر بولا۔ عشاء نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ وہ انکار کرتی تو معاملہ کل پرسوں تک ٹل جاتا اور یہ اسے منظور نہیں تھا۔ سو فوراً تیار ہو گئی۔

”کب سے جوائن کرنا ہے۔“ گاڑی میں بیٹھ کر عادل نے پوچھا۔ عشاء کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کل۔“

”ٹھیک ہے۔“ عادل نے مسکرا کر گویا اپنے برے رویے کی تلافی کی تھی۔

”دل سے کہہ رہے ہیں نا؟“ عشاء نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں..... زبان سے.....“ وہ بولا پھر بایاں ہاتھ اسٹیرنگ سے ہٹا کر اس کے سر پر چیت لگا کر

بولا۔

”ظاہر ہے دل سے کہہ رہا ہوں۔“ عادل نے سنجیدگی سے کہا۔

عشاء کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس نے سی ڈی پلیر آن کر دیا اور ونڈ اسکرین سے گلے ملنے والی روشنیوں کو تنگنے لگی۔ اس کے چہرے پر کچھ، بہت خوب پالنے کی تمنا تھی۔ عادل نے دو ایک بار اسے دیکھا، کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر اس کے چہرے پر پھیلی خوشی کو دیکھ کر خاموش رہا۔

”کیا سوچ رہے ہیں۔“ ایسے ہی ایک لمحے میں جب وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا عشاء نے پوچھا۔

”ہاں میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں یہ کہوں کہ میں باپ بننے والا ہوں تو کیا تم جاب کا خیال دل سے نکال دو گی؟“ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ عشاء نے نا سمجھی کے انداز میں اس کی جانب دیکھا عادل مسکرایا۔

”موویز میں ایسے ہی ہوتا ہے نا..... ہیروئن..... اگر وہ شادی شدہ ہو تو..... کسی کام کا ارادہ کر لے تو اگلے روز اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ اور ڈاکٹر آ کر خوشخبری سنا تا ہے۔ کہ مبارک ہو جی.....“

”عادل! آپ پاگل ہیں۔“ اس کی بات نے عشاء کو بھی ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ وہ یہ سمجھنے کو تیار نہیں تھی

کہ عادل نہیں چاہتا کہ وہ جاب کرے مگر اس کے سامنے ہار مان کر وہ رضامند ہوا ہے۔

”ارے بھئی! اس میں ایسا کیا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔“ عادل نے آئس کریم پارلر کے آگے گاڑی پارک کر کے ہارن بجانے کے بعد کہا۔

”پارلر کا“ ”چھوٹا“ آ کر آرڈر لینے لگا۔ عشاء خاموش تھی۔ عادل کو یکا یک احساس ہوا کہ اس کی غیر سنجیدہ بات کو عشاء نے سنجیدگی سے محسوس کیا ہے۔

شادی کے دو سال بعد بھی ان کے گھر کوئی ”خوشخبری“ نہیں تھی۔ ایک دوسرے کا دل نہ دکھے، اس لیے وہ اس ایٹو پر کبھی بات ہی نہیں کرتے تھے۔ اب بھی عادل کا مقصد اسے ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں بس ایک خیال آیا اور اس نے کہہ ڈالا۔

”ارے واہ..... کتنی خوبصورت لڑکی ہے۔“ عادل نے اس کا موڈ بحال کرنے کے لیے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

عشاء بھی اس فیئر کے اثر کو ختم کرنے کے لیے فوراً سے غیرت دلانے لگی۔

”کعبہ کس منہ سے جاؤ گے عادل! شرم تم کو گھر نہیں آتی۔“ عادل نے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

☆ ☆ ☆

”میرا دل چاہ رہا ہے تجھے قتل کروں۔“ ساجد علی نے ہنکا کر کہا۔

زینب نے جھنجکی بھگی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا پھر اس کی آنکھوں میں لپکتی خفگی و بے اعتباری کے شعلے دیکھ کر وہ بارہ منہ پر میلا سادو پنڈہ رکھ کر رونے لگی۔

”یہ سوں سوں نہ کر..... مت دلا مجھے غصہ..... میں تیری ان باتوں سے بہلنے والا نہیں ہوں۔ مجھے سیدھی طرح سے بتا دے تو چوہدہری کے ڈیرے پر کیا کرنے لگی تھی۔“ وہ اس کے پاس کھڑا غراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

اس نے زینب سے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ اس کا یہ لب و لہجہ اور انداز زینب کے لیے بہت حیران کن تھا۔ وہ تو بڑی بڑی باتوں پر بھی صبر و برداشت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

”میں..... چوہدہری کے ڈیرے پر نہیں گئی تھی..... میں۔“ وہ کہہ سکتے ہوئے اسے حقیقت بتانا چاہ رہی تھی مگر ساجد نے اس کی بات کاٹ دی۔

”جھوٹ مت بول زینب! میرے ساتھ جھوٹ مت بول۔ دیکھ مجھے صاف صاف بتا دے تو اس جگہ کیا کرنے لگی تھی۔“ ساجد نے اس کے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔

اس کے ہاتھ کی ضرب اتنی شدید تھی کہ زینب اپنی جگہ سے ہل کر پیچھے کی طرف ہو گئی۔ اسے ساجد سے اب خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ مغرب سے پہلے ہی واپس آ گیا تھا اور اپنے ساتھ مولوی باقر کے لئے سرے کا تحفہ بھی لایا تھا۔

زینب نے بہت چاہا کہ وہ آج یہ تحفہ مولوی کو نہ دے پائے تاکہ زینب اپنے منہ سے اسے حقیقت بتا

دے مگر وہ ناکام رہی تھی۔ ساجد اسی وقت یہ تختہ لے کر مولوی باقر کے پاس گیا تھا اور واپسی میں شکوک سے بھرا دل لے کر واپس آ گیا تھا۔

”سامی! تو ایک بار میری بات سن لے..... اطمینان سے..... غصہ کیے بغیر۔ یہ غصہ بڑا شیطانی ہوتا ہے ساجی..... یہ گھر برباد کر دیتا ہے۔ تو میری بات آرام سے بیٹھ کر سن تو سہی۔“ زنب نے متواتر سوسوں کرتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔

احمد ماں باپ کی جنگ سے بے خبر زمین پر بیٹھ کر مٹی کھانے میں مصروف تھا۔ باپ کی آواز اونچی ہوتی تو سراٹھا کر دیکھنے لگتا پھر اکتا کر دوبارہ سے اپنے مشغلے میں مصروف ہو جاتا۔

”میں غصہ کیوں نہ کروں زنب! یہ جھوٹی بات نہیں ہے۔ مولوی باقر نے تجھے خود ڈیرے کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ وہ کہتا ہے جب اس نے تجھے روکنے کی کوشش کی تو تجھے غصہ آ گیا اور تو بھڑک اٹھی۔ تجھے اس لیے غصہ آیا کہ تو غلط تھی اسی لیے تو نے مولوی باقر کو ایک کی دس سنا دیں۔ وہ بھلا مانس تجھے سیدھی راہ دکھانا چاہتا تھا اور تو..... تو بھی ایسی ہو سکتی ہے زنب..... مجھے یقین نہیں آتا اور یہ..... یہ تیری چوڑیاں.....“ اس نے یکدم زنب کی کلائی پکڑ لی جس میں فقط دو چوڑیاں رہ گئی تھیں جبکہ صبح تک اس کی کلائی میں کافی ساری چوڑیاں تھیں۔ شہر کے لیے نکلنے سے پہلے ساجد نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اور تب ہی اس کے ذہن میں یہ بات رہ گئی تھی کہ زنب کی کلائی میں چوڑیاں موجود ہیں سوا سے شہر سے اس کے لیے چوڑیوں کے بجائے کچھ اور تختہ لانا چاہیے اور اب یہی کلائی چوڑیاں سے خالی تھی۔

زنب نے دکھ بھرے بوجھل دل کے ساتھ ساجد کی شک بھری نظروں کو برداشت کیا۔ زنب کی خاموشی کو اس کا خاوند پشمانی سمجھ رہا تھا۔ اس نے جھٹکے سے زنب کی کلائی چھوڑ دی چونکہ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ کلائی چار پائی کے جو کٹھے سے ٹکرائی تھی زنب نے درد کی لہر کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا مگر اب تک نہ کیا۔

اس کے لیے ساجد کی آنکھوں میں نظر آنے والے رنگ زیادہ تکلیف دہ تھے جبکہ اس کی سونی کلائی نے ساجد کے دل میں رہی سہی گنجائش بھی ختم کر دی وہ وہیں چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زنب کو الٹا لٹکا کر لچھ بھرے بھی بیشتر ساری حقیقت اگلا لیتا۔

اسے آج سے پہلے بھی زنب کی شرافت پر شک نہیں ہوا تھا اور اگر مولوی باقر اس کو آج اپنی اور زنب کی ہونے والی ٹڈ بھڑکے متعلق نہ بتاتا تو شاید ایسا کبھی نہ ہوتا۔

”میں تیری عورت ہوں ساجی..... میری فطرت بری نہیں ہے اور اگر میری فطرت بری ہوتی تو میں اب تک تیرے ساتھ نہ ہوتی شادی سے ہفتہ بعد ہی دھندہ شروع کر دیتی۔ تو نے آج تک مجھ میں کون سی ایسی بات دیکھی ہے کہ تو مجھ پر شک کر رہا ہے۔ تو نے مجھے اپنی آنکھوں سے ڈیرے کی طرف جاتے دیکھا۔ نہیں نا۔ صرف مولوی باقر نے تجھ سے کچھ الٹی سیدھی باتیں کہہ ڈالیں اور تو مجھ پر شک کرنے لگا۔ یہی ہے تیرا پیارا سی لیے بیاہ کر لایا تھا مجھے اسی لیے خاندان والوں سے پگھالیا تھا۔“ پھر رونے لگی۔

عشاء کی اذان ہونے لگی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی بہت جلد سو جانے کے عادی تھے بلکہ ان پر ہی کیا موقوف گاؤں کے سب ہی لوگ اسی طرح سرشام سو جانے والے لوگوں میں سے تھے کہ فجر کے وقت کے اٹھے ہوئے ہوتے۔ ایسے میں ساجد علی کی حواشی آواز اور گرجے گرجوں میں ایک۔ نئی اور چٹنی کہانی تخلیق کر رہی تھی۔

یہ کہانی اس لیے بھی تھی کہ اس سے پہلے یہاں کے لوگوں نے ساجد علی کو اپنی بیوی پر اس طرح چلاتے ہوئے کبھی دیکھا سنا نہیں تھا۔ زنب کی بات نے ساجد کو دل ہی دل میں کسی قدر شرمندہ ضرور کیا۔ واقعی اس نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا تھا مگر مولوی باقر اس کے اعتبار کا بندہ تھا۔ وہ اس سے جھوٹ کیسے بول سکتا تھا۔

”کیا تیری بیوی تیرے اعتبار کی نہیں..... کیا وہ تجھ سے جھوٹ بول سکتی ہے! وہ فطرتاً نیک انسان تھا اس لیے ضمیر کی آواز نے ساجد کو ذرا کی ذرا نرمی اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

”فیروز مجھے بتا کیوں نہیں رہی کہ تو ڈیرے پر کیا کرنے گئی تھی؟“ اب کی بار اس کا لہجہ پہلے کی طرح سخت نہیں تھا۔

”میں ڈیرے پر نہیں گئی تھی۔“ زنب نے اپنے بھگے رخساروں کو صاف کر کے قطعیت سے کہا۔

احمد کھیل کود سے جنگ آ کر ریٹکتا ہوا ماں کے قریب آ گیا تھا۔ زنب نے اسے زمین سے اٹھا کر گود میں بٹھالیا اور اپنے دوپٹے سے اس کا منہ صاف کرنے لگی۔ اس کے انداز میں عجیب سا استحقاق تھا جسے محسوس کر کے ساجد آگ بگولا سا ہو گیا۔

”کیوں جھوٹ بولتی ہے کیوں جھوٹ بولتی ہے زنب! مولوی باقر کہتا ہے اس نے تجھے اپر آنکھوں سے ڈیرے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔“ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ اس کی نظروں میں جو کٹھی وہ زنب کا دل جلا رہی تھی۔

”تجھے مجھ سے زیادہ مولوی کی بات پر یقین ہے..... تجھے مجھ پر اعتبار نہیں ہے..... میں تجھے سچ بتاؤں گی اور تو سمجھ گا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ میری گواہی کون دے گا ساجی! میرا تو بیٹا بھی بہت چھوٹا ہے..... ہائے احمد کاش تو جوان ہوتا..... کاش تو اس قابل ہوتا کہ اپنی ماں کی گواہی دے سکتا..... ہائے احمد.....“ اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔

ساجد کو اس کے رونے سے الجھن ہو رہی تھی۔ وہ اسے چپ کروانا چاہتا تھا مگر اسے حقیقت جاننے کی بھی بے چینی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زنب کے رونے سے گھبرا کر وہ اسے دلا سہ دینے میں مگن ہو اور حقیقت پھر غرق رہ جائے۔

”میں اس روز ڈیرے کی طرف گئی تھی۔“ زنب نے سسکیوں کے درمیان بالآخر اعتراف کر لیا۔

ساجد نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ دل ہی دل میں کہیں وہ پر یقین ہو چلا تھا کہ زنب باکر دار ہے مگر اب اس کا اعتراف دھماکے سے کم نہیں تھا۔

”مگر میں ڈیرے پر نہیں گئی تھی ساجی! دراصل ڈیرے والی زمین پر آج کل ایک باباجی نے اپنی جھونپڑی ڈال رکھی ہے۔ وہ پکا والا تعویذ دیتے ہیں جس سے من کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ میں ان کے پاس گئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا گیارہویں سے پہلے کسی کو اس تعویذ کے بارے میں بتایا تو وہ مراد پوری نہیں ہونے کی۔ میرا رب جانتا ہے میرے دل میں چور نہیں ہے میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا میرے دل میں چور نہیں ہے میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا میری ٹوٹی چوڑیاں دیکھ کر تو مجھ پر شک کر رہا ہے۔ آج سارے کپڑے دھوئے ہیں۔ گھاٹ پر کپڑے مل کر یہ ساری ٹوٹ گئیں مگر مجھے ان کے ٹوٹنے کا دکھ نہیں ہے دکھ اس بات کا ہے کہ تو.....“

اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔

اس کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ساجد علی کو اس کی بات پر یقین ہو چلا تھا کہ معاملہ غلط فہمی کا تھا۔ زینب اس طرف گئی تھی اور مولوی باقر نے اسے دیکھا بھی تھا مگر زینب اس طرف کسی غلط ارادے سے نہیں گئی تھی۔

”تو نے پہلے تو کسی بابے کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی تو نے مجھے یہ بتایا کہ تیرے دل میں ایسی کوئی مراد ہے کہ تجھے تعویذ مانگے کے لیے کسی بابے کے پاس جانا پڑے۔“ وہ پشیمانی چھپاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ مرد تھا شرمندہ ہونے سے اس کی مراد لگی پر حرف آتا تھا۔

”مجھے سویرے نذیراں نے بتایا تھا..... وہ بھی اس بابے سے تعویذ لائی تھی۔ تجھے یقین نہیں تو چل ابھی چل بھائی کرم دین کے گھر چلتے ہیں۔ تجھے سب پتا چل جائے گا اس نے مجھے بچھے دل سے کہا۔

اس کے انداز نے ساجد کو مزید شرمندہ کیا۔ وہ حقیقتاً معصوم انسان تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

”چل اب ختم کر اس فضول قصے کو۔ مولوی باقر سے ہو گئی غلطی اور میرا بھی کیا قصور..... تو خود بتا مولوی باقر غلط تو نہیں کہہ رہا تھا تو اس طرف گئی تھی مگر..... خیر دفع کر..... مٹی ڈال..... چل بہت بھوک لگی ہے..... روٹی لے آ..... تو بہ..... پتا نہیں کیا ہوا تھا مجھے..... آج کا دن ہی برا تھا.....“

وہ ساری بات سن کر بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر غسل خانے میں گھس گیا۔

زینب ایک طرف بنے مٹی کے چولہے کی طرف آ گئی۔ احمد اب بھی اس کی گود میں تھا زینب کا دل مطمئن ہو چکا تھا وہ رونا نہیں رہی تھی۔

”شکر ہے ساجی نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کس مراد کے لیے تعویذ لینے گئی تھی ورنہ..... میں کیا جواب دیتی؟“

وہ چولہے میں پھونکنی سے آگ سلگاتے ہوئے مسلسل سوچ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

”پاکستانی معاشرے میں عورت کی حیثیت کیا ہے؟“ اس سوئڈ بونڈ شخص نے آنکھوں پر لگا چشمہ اتار کر سب کی طرف دیکھتے ہوئے استہمامیہ انداز میں کہا۔

جواب شروع ہونے کے بعد یہ پہلا سہماں تھا جو عشاء اٹینڈ کر رہی تھی۔ سہماں روم میں عشاء کو کچھ

ایسے چہرے بھی نظر آئے جو اس نے اس سے قبل صرف میگزین اور ٹی وی پر ہی دیکھے تھے۔ ”ہالڈے ان“ میں ہونے والے اس سیمینار میں فائزر بھی نظر آرہے تھے۔ تاخیر سے آنے کے باعث عشاء کو پچھلی نشستوں پر جگہ ملی تھی۔ اس کی کوئی کویگ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسی لیے عشاء کی تمام توجہ ادھر ادھر کی بجائے ڈاکس کے پیچھے آنے والوں کی تقریروں کی طرف ہی تھی۔

”ابتدا سے ہی پاکستانی معاشرے کی تفہیم جنسی تخصیص کی بنا پر کی جاتی رہی ہے۔ مرد کو ہمیشہ سے عورت پر فوقیت دی جاتی ہے۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے تو یہ بہت ٹھکی پٹی بات لگتی ہے۔ لیکن بہر حال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ عورت سے روارکھے جانے والا متعصبانہ رویے کا اندازہ ہمارے لوکل رسم و رواج میں موجود خاص رویوں سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔

ہمارے یہاں عورت کو ہمیشہ سے ماں بہن بیٹی اور بیوی کے خانے میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے۔ مزید برآں اسے چار دیواری میں قید رکھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی تمام تر صلاحیتیں دب جاتی ہیں۔

عورت کو ایک کمزور مخلوق سمجھ کر اس پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں اور ریاست و خاندان کی طرف سے عورت کو بہت کم توجہ ملتی ہے۔ یہی عدم توجہ آدمی کی سو کا لڈ آئیڈ یا لوجی آف آنر کے ساتھ مل کر عورت کے اندر ایک احساس کسرتی کو جنم دیتا چلا جاتا ہے۔

وہ اپنے آپ کو ایک بے چاری قسم کی مخلوق سمجھتی رہتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عورت کے اندر آدمی کی نسبت کہیں زیادہ Potential ہوتا ہے مگر معاشرے کی نام نہاد متعصبانہ سوچ سونے پر سہاگہ کرتا ہوا عورت کا پردہ اور اس کی خود ساختہ سوچ مل جل کر اس کے اندر کی صلاحیت کو ختم کر کے اسے چار دیواری کے اندر محدود کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے عورت کے اندر وہ مثبت سوچ پنپ ہی نہیں پاتی جو کسی معاشرے کو صحت مند معاشرہ بناتی ہے اور یہی سب چیزیں مل جل کر پاکستان کے تمام لوگوں میں منفی تفریق کا باعث بنتی ہے۔“

وہ سوئڈ بونڈ شخص سانس لینے کے لیے رکا تو ہال میں تالیوں کی آواز گونجنے لگی۔

عشاء کے لیے یہ سب باتیں نئی نہیں تھیں۔ نئی بات یہ تھی کہ ایک مرد کے منہ سے اس طرح کی باتیں اس نے پہلی مرتبہ ہی سنی تھیں۔

”یارا یہ منفی تفریق کیا ہوتا ہے؟“

عشاء کے عقب میں بیٹھے کسی لڑکے نے بہت دھیمی آواز میں کسی سے پوچھا تھا۔ عشاء کی توجہ ناچاہتے ہوئے بھی پیچھے کی طرف مبذول ہو گئی۔

”مجھے کیا پتا کہ یہ سیاہ کیا ہوتا ہے۔ مجھے تو میرا کام کرنے دو اور پلیز یار! تم بھی اپنا کام کرو۔“

دوسری آواز نہایت اکتائی ہوئی تھی۔ عشاء کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر ہم یہاں کر کیا رہے ہیں۔ قسم سے مجھے تو دو دن تک بدقسمتی ڈنی ہے اتنی مشکل اور اسٹوپڈ باتیں سن کر۔“ یہ کوئی تیسری آواز تھی۔ جھلاہٹ اس میں بھی نمایاں تھی۔

”یار! تم لوگ اپنی بکواس بند کیوں نہیں کرتے۔ خدا کے لیے اپنا اپنا کام کرو۔“ پہلی والی اکٹھا ہٹ بھری آواز دوبارہ آئی۔

ڈاکس کے پیچھے کھڑا شخص تقریر کرنے میں مگن تھا جبکہ پیچھے بیٹھے لڑکے بھی مسلسل بول رہے تھے۔ اس لیے عشاء کا دھیان بھی بٹ رہا تھا۔

”قسم سے یار! میں کوئی کام وام کرنے نہیں آیا۔ میں گھر میں اطمینان سے کمپیوٹر کے آگے بیٹھا اپنے پراجیکٹ کے سلسلے میں امپروومنٹ آف سوشل لاز کے متعلق میٹیریل ڈاؤن لوڈ کر رہا تھا کہ جبار صاحب کا فون آ گیا۔ کہنے لگے۔ کسی این جی او کا پروگرام ہے کورج کے لیے اوپر سے فون آیا ہے۔ تم بھی چلے جاؤ۔ یقین کرو خاور! اگر یہ نہ کہتے کہ آخر میں زبردست ریفریٹیشن ہے تو میں کبھی نہ آتا۔“

”میرا دماغ خراب ہے کہ میں بغیر کسی لالچ کے یہاں ”عورت نامہ“ سن کر بیمار پڑوں۔ میرے تو کان پک گئے ہیں۔

”او بھئی! بس کرو..... دیکھ تجھے اللہ کا واسطہ..... تیری یہ فضولیات کوئی نہیں سن رہا۔ چپ کر جا اور ڈاکس سے ہٹ جا۔“ ابراہان میں بھی جھجلاہٹ تھی۔

عشاء نے بے ساختہ گردن رچھی کر کے ۱۰۱۱ کی جانب دیکھا۔ وہ تینوں ہی ایک دم الارٹ ہو گئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں اپنے کمرے تھے۔ ایک لڑکا مائیکرو ریکارڈر لیے بیٹھا تھا۔ جبکہ دوسرے کے ہاتھ میں Palmtop تھا۔

”یار! پٹوانہ دینا۔“ عشاء کی نظروں کو محسوس کر کے وہی لڑکا نہایت دھیمے لہجے میں بولا جس کے ہاتھ میں Palmtop تھا۔ عشاء مسکراتے ہوئے سیدی ہو گئی۔

”1973ء میں جو آئین پیش کیا گیا تھا وہ بھی عورتوں کو ان کے جائز حقوق دلوانے میں بری طرح ناکام ہوا۔ ایک طرف اس میں ایسی شق موجود تھی جو یہ کہتی تھی کہ ملک میں جس کی بنا پر کوئی تخصیص نہیں برتی جائے گی جبکہ دوسری طرف اس میں ایسی شقیں ہیں جو عدم مساوات کو پروان چڑھاتی ہیں۔

اس طرح حدود آرڈیننس متعارف کر دیا گیا اور جس میں تقریباً تقریباً زور زبردستی کو برابر قرار دینے کی کوشش کی گئی۔ عورت کو یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسے زبردستی نشانہ بنایا گیا چار مسلمان فرد گواہ پیش کرنے پڑتے ہیں۔ جبکہ زیادہ تر کمیز میں سزا بھی اسے ہی سہی پڑتی ہے۔

اس طرح کے قوانین نے معاشرے میں عورت کی حیثیت پر بہت اثر ڈالا۔ آج بھی پاکستانی جیلوں میں ایسی بہت سی خواتین ہیں جو ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہی ہیں۔“ وہ شخص تقریر کے دوران اب پانی پینے کے لیے رکھا تھا۔

عشاء نے پیچھے بیٹھے لڑکوں کی باتوں کی طرف دھیان لگانے کی کوشش کی مگر وہاں خاموشی تھی۔ اس نے کن اکھیوں سے ان کی جانب دیکھا۔ وہ تیزی سے نوٹس لینے میں مگن تھے۔ عشاء نے اپنی رسٹ وائچ کی طرف دیکھا ساڑھے چھ کے قریب کا وقت تھا۔ اس کے آفس ٹائمنگ بارہ سے چھ بجے تک کے تھے اور پک اینڈ

ڈراپ آفس کی طرف سے تھا مگر آج کانفرنس کی وجہ سے ساڑھے آٹھ تک کا ٹائم دیا گیا تھا۔ اس کا اور عادل کا پروگرام تھا کہ کانفرنس کے بعد وہ اسے ہائیڈے ان سے پک کرے گا پھر وہاں سے شاپنگ کے لیے جائے گا اور وہ تھا۔ عشاء بول رہے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ صرف باتوں سے کسی کی تقریر نہیں بدلی جاسکتی۔ سو اسے اس کانفرنس میں اور اس کے شرکاء کی باتوں میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

اس کا دل چاہا کہ عادل کو فون کر کے ابھی بلا لے مگر جانتی تھی کہ عادل آفس سے اس ٹائم نہیں آ سکتا تھا۔ سو وہ بے دلی سے تقریر میں دلچسپی لینے لگی۔ وہ شخص اب پاکستانی عورت کی ثانوی حیثیت پر بحث کر رہا تھا۔

”پاکستان کے جوڈیشل سسٹم میں عورتوں کی شمولیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ آپ کو بار کونسل میں صرف 5 فی نیل لازز جبکہ سپریم اور ہائی کورٹ میں صرف 2 فی نیل سول جرجس ہیں۔“

عشاء نے ابھی اتنا ہی سنا تھا کہ اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھے حضرات اٹھ کر پیچھے کی طرف چلے گئے اور پھر وہ نشست جس شخص نے سنبھالی اسے عشاء جانتی تھی اور وہ اسفند رحیم تھا۔

”کیسی ہیں آپ؟“ اس نے مسکرا کر بغور اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں عجب مقناطیت تھی۔ گرے رنگ کے ڈزسوٹ میں اس کی شصیت مزید شاندار لگ رہی تھی۔ اس کے بیٹھے ہی Eternity کی تیز مہک نے عشاء کا گھیراؤ کیا تھا۔

”فائن..... ٹھنکس..... آپ کیسے ہیں؟“ اس کی شاندار شخصیت سے مرعوب ہوتے ہوئے عشاء نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

”مجھے خوشی ہے کہ آپ ہمارے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ مجھے آپ کی آنکھوں میں وہ عزم نظر آتا ہے جو میں اپنے ساتھ کام کرنے والی سب خواتین کی آنکھوں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ یقیناً بہت آگے جائیں گی۔ میں ہر ایک کے بارے میں اس قسم کی پیش گوئیاں نہیں کرتا مگر جس کے بارے میں بھی کرتا ہوں وہ سو فیصد درست ثابت ہوتی ہیں۔“

وہ اپنی کرسی پر ذرا سا ترچھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کا انداز میں بے حد دوستانہ تھا۔ عشاء کو اپنی تعریف سننا ہمیشہ اچھا لگتا تھا سو وہ چند لمحوں بعد ہی بے تکلفی سے اسفند رحیم سے باتیں کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

”صحیح مسلم میں حضرات جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حجتہ الوداع کے موقع پر اپنے خطبہ میں فرمایا کہ اے لوگو! عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ تم نے اللہ کی امانت سے انہیں لیا ہے۔ اور اللہ کے کلمہ سے انہیں اپنے لیے حلال کیا ہے۔ عورتوں پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے فرش پر کسی ایسے کو نہ آنے دیں جس سے تم ناراض ہو اگر وہ ایسا کرے تو انہیں مارو لیکن مارا ایسی نہ ہو کہ ظاہر ہو۔ ان کا تم پر یہ حق ہے کہ انہیں اپنی بساط کے مطابق کھلاؤ، پلاؤ، اڑھاؤ۔“

آپاجی نے مخصوص دھیمے لہجے میں درس دیتے ہوئے ایک اہم حدیث مبارکہ بیان کی تھی اور آنکھوں

ہی آنکھوں میں سامنے بیٹھی عورتوں کو سرزنش کی تھی۔ وہ عورتیں درس کو سننے کی بجائے وقتاً فوقتاً گفتگو میں مصروف ہو جاتی تھیں جس کی بنا پر درس میں خلل پڑ رہا تھا۔

”میری بہنو! یہ جو حدیث میں نے بیان کی ہے اس کی وضاحت کرنے سے پہلے میں ایک اہم نکتہ واضح کر دینا چاہتی ہوں۔ دین اسلام نے عورتوں کو حقوق کے معاملے میں بہت نوازا ہے۔ مرد و عورت سے برتر بنایا گیا ہے جب کہ عورت پھر بھی زیادہ معتبر ہے۔ کیا عورت کے قدموں کے نیچے جنت کا ہونا اس بات کا ثبوت نہیں؟“

آپاجی نے استفہامیہ انداز میں کچھ عورتوں کی جانب دیکھا جن کو بات سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ سبحان اللہ سبحان اللہ کا ورد کرنے لگی تھیں اور جن کو سمجھ میں نہیں آئی تھی وہ تھلید میں سر ہلانے میں مصروف تھیں۔

چودھری کا بڑا کمرہ مزارعین کی عورتوں سے کچھ کچھ بھرا ہوا تھا چودھرائن کی طرف سے مزارعین کی عورتوں کے لیے سالانہ میلاد کا اہتمام واہ واہ سینے کے لیے کیا جاتا تھا۔ درس کے بعد مرغ پلاؤ سے توضیح کی جاتی تھی جس کی خوشبو سب عورتوں کو یہاں کھینچ لاتی تھی۔

اسی مرغ پلاؤ کا کرشمہ تھا کہ عورتیں گود کے بچوں کو گھٹنوں میں دیے جلد از جلد درس ختم ہونے جانے کا انتظار کر رہی تھیں۔

”جب پیارے نبی ﷺ صحابہ کرام میں آ کر بیٹھے اور صحابہ کرام ان کے احترام میں اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہوتے تو نبی پاک ان کی اس عادت کو ناپسند فرماتے تھے۔ ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ حضرت فاطمہؓ کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر انہیں تکریم دیتے اور ان کے لیے محبت کا اظہار فرماتے تھے۔ کیا نبی ﷺ کے اس اقدام سے بھی عورت کی وہ عظمت ثابت نہیں ہوتی جو اللہ اور رسول ﷺ نے اسے دی؟ کیا عورت کی حیثیت کو ثابت کرنے کے لیے اس سے بڑی کسی مثال کی ضرورت ہے؟“

آپاجی نے رک کر ہونٹوں پر زبان پھیری۔ چودھرائن ان ہی کی جانب متوجہ تھیں۔ اس نے فوراً ملازمہ کو اشارہ کیا۔ ملازمہ جو بہت انہماک سے آپاجی کا درس سن رہی تھی چودھرائن کا اشارہ سمجھ کر عقبی صحن کی طرف بھاگی جہاں ملازم بڑے بڑے ٹب میں روح افزا گھولنے میں مصروف تھے۔ آپاجی نے درس شروع کرنا چاہا تو چودھرائن نے ٹوک دیا۔

”آپاجی! مصغری پانی لاری ہے..... پہلے تسی پانی پی لو۔“ آپاجی نے مسکرا کر سر ہلادیا۔

آپاجی کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر عورتیں فحاش ایک دوسرے کا حال پوچھنے لگیں اور ایک دوسرے کی تیاری سے اپنی تیاری کا مقابلہ کرنے لگیں۔ نذیراں سامنے کی طرف بیٹھی تھی۔ اس نے کونے میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی زینب کو دیکھ کر سر کے اشارے سے سلام کیا اور آنکھ کے اشارے سے احوال بھی دریافت کیا۔

اتنی دیر میں مصغری اسٹیل کی ٹرے میں شیشے کے جگ گلاس رکھ کر لے آئی۔ سرخ مشروب دیکھ کر سب عورتیں دل ہی دل میں مسکرا دیں۔ گزشتہ سال میلاد پر کچی لسی پلائی گئی تھی۔

”اے مصغری!..... تھوڑا سا میرے احمد کو تسی دے دے..... پیاس سے برا حال ہے۔“ زینب نے جیسی آواز میں مصغری سے فرمائش کی تھی۔

مصغری کو زینب نے دو چینی پہلے ایک سو تین کڑھ کر دی تھیں اور ایک روپیہ بھی نہیں لیا تھا۔ سو اس کی بے ضرر فرمائش اس کا حق تھی۔ مصغری نے آنکھوں آنکھوں میں زینب کو صبر و برداشت کا مظاہرہ کرنے کی درخواست کی۔

”پیاری بہنو! آدمی پر عورت سے زیادہ ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ کیا آپ نے کبھی عورت کو ایسی باتوں کے لیے پریشان دیکھا ہے کہ اسے باپ بھائی شوہر یا بیٹے کو اپنی جائیداد میں سے حصہ دینا ہے جب کہ آدمی ایسی باتوں کے لیے پریشان ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ یاد رہے میں ان لوگوں کی بات کر رہی ہوں جو حقیقتاً اسلامی شعار پر چلتے ہیں۔“

قرآن یا حدیث میں بھی عورت کے لیے یہ حکم یا تاکید نظر نہیں آتی کہ وہ مرد کے نان نفقے کی ذمہ دار ہے۔ میری بہنو! گھر سے باہر نکل کر کمانا بہت مشکل ہے۔ ان مشکلات کے متعلق آپ عورت سے پوچھو جو گھر کی ذمہ داری بھی اٹھاتی ہے اور گھر سے باہر نکل کر فکر معاش میں بھی مبتلا ہوتی ہے۔“

بی بی جان نے آپاجی کا ہاتھ دبا کر انہیں خاموش رہنے کی تاکید کی۔ یہ درس یہاں دینے کے لیے انہیں مناسب نہیں لگا تھا۔ کیونکہ یہ تو خالصتاً شہری خواتین کے لیے تیار کیا گیا تھا جب کہ گاؤں کی عورتیں تو مردوں سے زیادہ جھاکش ہوتی ہیں۔ آپاجی بی بی جان کا اشارہ سمجھ کر ذرا خاموش ہوئیں پھر بولیں۔

”چند لمحے قبل جو حدیث میں نے بیان کی تھی وہ یقیناً آپ کو سمجھ میں آگئی ہوگی۔ مرد کے اوپر عورت کو کھلانے پلانے اور حانہ کی ذمہ داری ڈال کر اسلام عورت سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ عورت اپنے مرد کی وفادار رہے۔“

وہ اس کے گھر اور اس کی نسل کی پرورش میں کوئی کسر نہ چھوڑے۔ اگر آپ غور کریں تو آپ کو احساس ہوگا کہ مرد کی ذمہ داری زیادہ مشکل ہے جبکہ عورت کو جو ذمہ داری سونپی گئی وہ عبادت ہے۔ اسی لیے اس حدیث میں نبی پاک ﷺ نے عورت کو اپنے گھر اور گھروالوں سے وفادار رہنے کی تلقین کی اور اگر عورت اپنی راہ سے ہٹک جائے تو اسے راہ راست پر لانے کے لیے مرد اس پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے۔“

”آپاجی مزید کچھ کہنے میں مگن تھیں مگر مصغری کا اشارہ پا کر زینب احمد کو گود میں لیے عقبی حصے کی طرف چل دی جہاں سرخ مشروب اس کا انتظار کر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

”مجھے لگتا ہے میں پھر سے زندہ ہوگئی ہوں۔“ عشاء نجائے فون پر کس سے کہہ کر رہی تھی۔ عادل ٹی وی لاؤنج کے درمیان میں پڑے صوفے پر بیٹھائی دی دیکھنے میں مگن تھا۔ صوفے پر ہی پڑے کرشل باؤل میں تازہ جامن پڑے تھے۔ جامن عادل کا پسندیدہ پھل تھا۔ اب بھی وہ رغبت سے ایک کے بعد ایک جامن کھاتا چلا جا رہا تھا۔ مگر اس کا دھیان عشاء کی طرف ہی تھا۔

ویک اینڈ کی وجہ سے وہ جلدی آ گیا تھا اور اب انتظار کر رہا تھا کہ عشاء فون سے فارغ ہو تو وہ شاپنگ کے لیے جا سکیں۔ عشاء کو پہلی تنخواہ ملی تھی اور وہ اس رقم کو جلد از جلد خرچ کرنے کے لیے بے چین تھی۔

”یار! ابھی تو پہلی پے ملی ہے..... مطلب صرف ایک ماہ ہوا ہے مجھے ”فلاج“ کے لیے ہم کرتے ہوئے مگر میں بہت انجوائے کر رہی ہوں۔ یہ NGO کیٹر المقاصد ایجنڈے کے تحت کام کر رہی ہے۔ خواتین اور ان کے بنیادی حقوق کی جدوجہد ہمارا اولین مقصد ہے۔

ہم فنڈ ریزنگ اور جلسے جلسوں میں ٹائم برباد نہیں کرتے۔ بلکہ لوگوں کے لیے بالعموم اور خواتین کے لیے بالخصوص کام کرنا ”فلاج“ کے منشور کا حصہ ہے۔ ہمارے چیئرمین اسفند رحیم بہت اچھے انسان ہیں۔“

وہ بات کرتے ہوئے ہنسی تھی جیسے دوسری طرف سے فون پر کسی نے لطیفہ سنا یا ہو۔ عادل صوفہ پر اس کی ٹوہ لینے کے لیے نہیں بٹھا تھا۔ مگر نجانے کیسے ”اسفند رحیم“ کے ذکر پر اس کی ساری حیات عشاء کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ عشاء کی باتوں میں اس شخص کا تذکرہ دن بدن بڑھنے لگا تھا۔

”اس شخص کے دل میں انسانیت کا بڑا درد ہے یار! میں اس کے اس جذبے سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔ وہ صرف باتیں نہیں کرتا بلکہ کام کرتا بھی جانتا ہے۔ سمنا میں اس کے ریسیرچ پیپر کو بہت پسند کیا گیا۔ تم خود بتاؤ کیا عورت ڈبے میں بند کر کے رکھی جانے والی چیز ہے۔ کیا اسے اسی لیے پیدا کیا گیا کہ وہ چار دیواری کی قید میں زندگی گزار دے۔ ہانڈی روٹی بچے شوہر صرف یہی ہم سب کی زندگیوں کا مقصد نہیں ہے۔ ہمیں اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنا چاہیے۔

اسفند رحیم بس ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔ اس کے پاس کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاؤ تو آپ جان جاتے ہیں کہ آپ کیا چیز ہیں۔ مجھے اس شخص نے ایک نظر میں پہچان لیا تھا کہ آپ بہت آگے جائیں گی سسر عادل۔“

وہ اپنی تعریف میں بلا ٹکان بول سکتی تھی۔ اور بول رہی تھی۔

وہ کرٹل باؤل جس میں جا من بھرے تھے پہلے جس تیزی سے خالی ہو رہا تھا یکدم اس کی رفتار میں کمی آگئی اور ٹی وی کا ویلیوم بھی اونچا ہو گیا بے ہنگم سامیوڈک لاؤج میں گونجنے لگا تھا۔ عشاء نے مڑ کر ٹی وی کی سمت دیکھا پھر اشارے سے عادل کو ویلیوم کم کرنے کے لیے کہا۔

لیکن اس نے گویا اس کا اشارہ دیکھا ہی نہیں۔ بہر حال اس کا دھیان عشاء کی طرف ہی تھا۔

”اس معاشرے میں جو مخلوق سب سے زیادہ تباہی کا شکار ہے اس کا نام عورت ہے اور یہ تو تم جانتی ہو کہ مرد سے بڑا استحصال کرنے والا کوئی نہیں۔ یہ مرد بہت بے حس اور غرض چیز ہوتے ہیں یار..... ان کی زندگیوں کا ایک مقصد ہے کہ کسی نہ کسی طرح عورت کو دبا کر رکھا جائے تاکہ اس کی قدرتی صلاحیتیں بدرجہ ختم ہو کر رہ جائیں اور اس کوشش میں حکومت براہر کی شریک ہے ظاہر ہے مردوں کی حکومت ہے۔

”یار! معاشرہ مردوں کا ہے۔“

وہ اس قدر تلخ لہجے میں بات کر رہی تھی کہ عادل حیران پریشان ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

اس کا یہ روپ عادل کے لیے بہت انوکھا تھا۔ اسے جاب کرتے ایک مہینہ ہوا تھا اور اس ایک ماہ نے اس کی شخصیت میں بہت تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ وہ کچھ لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر اس خیال سے پیچھا پھڑکتے لگا۔

آزادی نسواں و حقوق نسواں کے متعلق اس کے یہ خیالات عادل کے لیے نئے نہیں تھے مگر اس کا لہجہ و انداز یقیناً نیا تھا۔

”یار! جلدی کرو..... کیا بوریت پھیلا رکھی ہے۔“ وہ اکتا کر اسے ٹوک بیٹھا۔

عشاء نے اسے گھور کر دیکھا پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔ عادل منہ پھللا کر دوبارہ ٹی وی دیکھنے لگا۔ عشاء نے شاید اس کی خنکی کو محسوس کر لیا تھا۔ تب ہی پانچ منٹ بعد فون بند کر کے وہ اس کے قریب صوفے پر آ بیٹھی اور پھل والا باؤل صوفے سے اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔

”آپ کو سلام کہہ رہی تھی۔“ ایک جا من منہ رکھتے ہوئے اس نے گویا اطلاع دی تھی۔

”وسلام.....“ عادل نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

اس کی پوری توجہ ٹی وی کی جانب تھی۔ اب لڑکیوں کی ریسلنگ شروع ہو گئی تھی۔ کاسٹیو مز میں ملبوس اپنے جسموں کی نمائش کرتی ہوئی وہ عورتیں فی الحال عادل کی توجہ کا مرکز لگ رہی تھیں۔

”یہ نہیں پوچھا کہ کون سلام کہہ رہی تھی اور جواب دے دیا..... یعنی کہ حد ہو گئی ان بے ڈھنگیوں کو دیکھنے سے فرصت ملے تو میری بات سنی جائے۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی۔

پھر عادل کی گود میں پڑا ریوٹ اٹھا کر چینل تبدیل کر دیا عادل نے اس کی اس حرکت پر ناک چڑھا کر اسے دیکھا اور پھر اس کے ہاتھ سے ریوٹ چھین کر دوبارہ Sports ten لگا دیا۔

عشاء نے اس کے درشت انداز کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔ اکثر اوقات چینل ٹیوننگ پر ان کی بحث ہو جاتی تھی مگر بات مذاق کی حد تک رہتی تھی۔ لیکن آج عادل کا انداز جارحانہ تھا

”اتنی دلگزرگ رہی ہیں یہ سب..... بھلا عورتیں بھی یہ سب کام کرتی اچھی لگتی ہیں۔ کیا۔“

وہ ہمیشگی خود پر قابو پا کر نسبتاً نرم لہجے میں بولی۔

”اس میں کوئی حیرانی والی بات تو نہیں..... اکیسویں صدی کی عورت ہر کام کر سکتی ہے تو پھر ریسلنگ میں کیا برائی ہے۔“ عادل ہنوز ٹی وی اسکرین کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہر کام میں کپڑے اتار کر ریسلنگ کرنا شامل نہیں ہے..... اور پھر.....“ ابھی عشاء نے یہی کہا تھا کہ عادل نے چڑ کر اس کی بات کاٹ دی۔

”کم آن عشاء! اگر دوپٹے اتار کر سڑکوں پر جلسے جلوس کرنا ٹھیک ہے تو پھر ریسلنگ میں کیا برائی ہے۔ تم خود ہی تو کہتی ہو آج کی عورت ہر کام کر سکتی ہے۔ جو مرد کر سکتا ہے۔ تو پھر جب مرد اس طرح رنگ میں آ کر اپنی مردانگی کا مظاہرہ کر سکتا ہے تو پھر عورت کیوں ایسا نہیں کر سکتی۔“ استہزائیہ سی ہنسی کے ساتھ عادل نے اپنی بات مکمل کی تھی۔

عشاء چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی۔ وہ درپردہ اسے کیسا سنا چاہ رہا تھا یہ تو بخوبی سمجھ میں آ رہا تھا۔ عادل کے ساتھ جب کبھی کسی بات پر بحث ہوتی تھی تو عادل ہی خاموش ہو کر بحث ختم کر دیا کرتا مگر آج عشاء صبا لمحہ آمیز اشارہ میں بولی۔

”اوکے..... آپ دیکھیں یہ ریلنگ..... میں پہنچ کر کے آتی ہوں۔“ عادل کچھ کہنے کے بجائے ٹی وی کی طرف دیکھتا رہا۔ دس پندرہ منٹ بعد ہی وہ آ بھی گئی تھی۔

”آج کسی نئے رینٹرنٹ میں کھانا کھائیں گے..... میں ”طبا“ کا کھانا کھا کر تھک گئی ہوں۔“

وہ صوفے پر بیٹھ کر جوتے کا اسٹمپر پب بند کرتے ہوئے بولی۔

اس پوزیشن میں بیٹھنے سے اس کا باریک دوپٹہ جھولی میں آ گرا تھا۔ عادل جو اپنی جگہ سے اٹھ رہا تھا یکدم مکمل توجہ سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ پنک کمر کے لان کے سوٹ میں کھلی کھلی سی عشاء بلاشبہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ مگر عادل کی توجہ اس کے بازوؤں کی طرف تھی۔

کوارٹر سیلو شرٹ میں اس کے دودھیا بازو چاندنی کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کا سوٹ بہت اسٹائلش انداز میں سلا تھا۔ ڈنگ والی شرٹ میں اس کا وجود بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مگر یہ حلیہ باہر جانے کے لیے قطعاً نامناسب تھا۔

”سیلو ز کچھ زیادہ ہی شارٹ نہیں ہو گئیں۔ اپنی جینز کی جیب میں ہاتھ پھنساتے ہوئے وہ اس کا بھر پور تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

”آج کل شارٹ سلویز کا ہی تو فیشن ہے۔ اچھی لگ رہی ہیں نا۔“ عشاء مسکراتے ہوئے بولی۔

اس میں تو کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ اچھی لگ رہی تھی۔

”ہاں..... ٹھیک ہے۔ مگر دوپٹہ بدل لو..... ایک تو ماشاء اللہ تمہاری شرٹ کی سلویز اتنی شارٹ ہیں اور پھر تم نے دوپٹہ بھی باریک لیا ہے..... ایسا کرو کسی ڈارک کالر کا دوپٹہ لے لو..... پبلک پلیسز پر اس طرح کا حلیہ اوڈ لگتا ہے۔“

گھر سے نکلے ہوئے عادل اس کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے نرم لہجے میں بولا۔

”تو بے عادل! اس میں کیا اوڈ ہے..... سارا زمانہ اس قسم کی ڈریسنگ کرتا ہے۔ آپ تو چھوٹی چھوٹی باتیں پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مائنڈ مت کیجئے مگر آپ کچھ زیادہ ہی کنزرویٹو ہوتے جا رہے ہیں۔“ عشاء منہ بنا کر بولی۔

اس کا خیال تھا کہ وہ اتنی اچھی لگ رہی ہے تو عادل اسے دل کھول کر سراہے گا مگر وہ تو اسے ٹوک رہا تھا۔

”اس میں مائنڈ کرنے والی کیا بات ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں بہت کنزرویٹو ہوں۔ اب جاؤ اور بڑا دوپٹہ لے آؤ۔“

عادل نے ٹھنڈے لہجے میں قطعیت سے کہا۔

عشاء چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی پھر کندھے سے لٹکا بیگ اتار کر صوفے پر پھینکتے ہوئے

بولی۔

”مجھے نہیں جانا کہیں بھی۔“ وہ کہہ کر رکی نہیں بلکہ پیر پختی بیڈروم کی طرف بڑھ گئی۔

”اوکے..... ایڑیووش.....“ عادل نے گویا پھنکارتے ہوئے کہا اور دوبارہ سے اپنی جگہ پر بیٹھ کر ٹی

وی دیکھنے لگا اب کی بار ٹی وی کا دایروم بہت زیادہ اونچا تھا۔

☆ ☆ ☆

”ارے میرا بچہ..... روتا کیوں ہے..... یہ دیکھ دو دھ میں شکر ڈال دی ہے اور یہ دیکھ اب چاول ڈال

رہی ہوں..... تیرے لیے ہی تو تیار رہی ہوں کھیر..... فیروزی تو روتا چلا جا رہا ہے..... بیچ منٹ کی بات ہے ابھی کھیر بن جائے گی۔“

وہ مٹی کی ہانڈی میں لکڑی کا چمچہ زور زور سے چلا رہی تھی۔ اور ساتھ چار پائی پر لیٹے احمد کو بہلانے میں مصروف تھی۔

وہ کچھ دیر قبل سوکراٹھا تھا اور اب کسلندی سے منہ بسور رہا تھا۔ وہ دانت نکال رہا تھا جس کی وجہ سے وہ بے حدست ہو چکا تھا۔ پیٹ بھی خراب تھا اور صبح سے بخار بھی تھا۔ ساجد علی کام پر جانے سے پہلے خصوصی تاکید کر کے گیا تھا۔

”اس کے جڑے کو کھور کی ضرورت ہے۔ اسے کھیر بنا کر دینا..... سکون ملے گا..... میری ماں کہا کرتی ہے کہ شکر اور دودھ تے تموڑا سا شہد مرض میں شفا دیتا ہے۔ تو جانتی ہے نانہنہ..... میری ماں کتنی سیانی عورت تھی۔ سو آنے کی بات ایک سانس میں کہہ جاتی تھی۔“ نزنہ اس کی بات پر مسکراتی رہی۔

ساجد کو دن میں کئی مرتبہ اپنی ماں کا قصیدہ کہنے کی عادت تھی۔ ساجد کے جانے کے بعد اس نے برتن دھو کر احاطے میں جما ڈویا۔ کمرے میں بیچھے واحد پنگ کی چادر جما ڈ کر ٹکیہ وغیرہ درست کر کے رکھا سب سے آخر میں اس نے احاطے میں چار پائی بچھا کر پیڈل فین آن کر دیا تھا۔

احمد کو اس چار پائی پر لٹا کر ککڑیوں کی مدد سے آگ جلا کر اس نے دودھ کی پتیلی چڑھا دی۔ پھر جب احمد سوکراٹھا نزنہ تقریباً کھیر تیار کر چکی تھی۔

”یہ لے..... تیری ماں نے کھیر تیار کر لی ہے..... تیری ماں تیری دادی جتنی سیانی نہیں..... وہ سو آنے کی بات ایک سانس میں نہیں کر سکتی..... مگر وہ تجھ سے بہت پیار کرتی ہے..... اور اسے بہت مزیدار کھیر پکانی آتی ہے۔“

وہ اسٹیل کی تھالی میں کھیر نکال کر احمد کے پاس چار پائی پر آ بیٹھی۔ احمد ابھی امی اماں اور بھوری کے ناموں سے واقف تھا۔ سوائے باتیں سکھانے کی خاطر نزنہ سارا دن اس سے باتیں کرتی رہتی تھی۔

اسٹیل کی تھالی میں موجود وہ ملغوبہ احمد کو پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے ماں کے ہاتھ سے ایک لقمہ لینے

کے بعد منہ پھر لیا۔ نذیب اسے لاڈ پیار سے پہلا کروہ زرد ملغوبہ کھلانے کی کوشش کرتی رہی مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

پائٹ چار پائی کے نیچے رکھ کر وہ دہیں احمد کے ساتھ لیٹ گئی اور اسے تپتہ تپتہ کر سنانے کی کوشش کرنے لگی۔ احمد کچھ دیر بعد سو گیا۔ نذیب کو آج فراغت ہی فراغت تھی۔ ساجی کی واپسی پر وہ روٹی پکاتی تھی اور سالن کے نام پر شکر اور چاولوں کا ملغوبہ موجود تھا۔

وہ چار پائی پر لیٹ کر عجیب و غریب سوچوں میں الجھتی رہی۔ اس نے نذیراں کی بیٹی کو سرخ رنگ کا بڑا خوبصورت جوڑا پہنے دیکھا تھا۔ اس کا دل بہت شدت سے چاہ رہا تھا کہ وہ بھی ایسا ہی جوڑا لے مگر فی الحال پیسے نہیں تھے۔ اس نے نذیراں سے میل جول بہت کم کر دیا تھا۔

اسے خدشہ تھا کہ جس روز نذیراں اس کے پاس فرصت سے بیٹھ گئی اس روز ساجد کی اور اس کی جھڑپ کے متعلق ضرور سوال کرے گی۔ حالانکہ اس جھڑپ کے بعد ان کی ملاقات ہوئی تھی مگر یہ ملاقات اس قدر سرسری تھی کہ تعصیلی باتیں ناممکن تھیں۔ نذیب خود ہی کافی محتاط ہو چکی تھی۔ اس نے ذریعے کی طرف جانا چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ وہ کپڑے دھونے بھی سب کے ساتھ نہیں جاتی تھی۔

یوں ہی لیٹے لیٹے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی اور جب اس کی آنکھ کھلی تو اچاٹے کا پچھلا دروازہ ایک مخصوص انداز میں بج رہا تھا۔ اس کی آنکھ دروازہ بجنے کی آواز سے ہی کھلی تھی۔ وہ یکدم اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس کا دل ایک عجیب لے پر دھڑکا تھا۔ اس نے بہت آہستہ سے زمین پر قدم رکھا اور دبے پاؤں چلتے ہوئے دروازے کے قریب آ گئی۔ احمد کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ منہ بسورنے لگا تھا۔
”کون.....!“ اس کی آواز اس کے قدموں کی چاپ سے بھی زیادہ مدہم تھی۔
”ارے ہاں..... اب تو کیوں پچھانے؟ ہم تیرے لگتے کیا ہیں؟“ کسی نے شریہ لہجے میں کہا۔ احمد کے رونے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

”ہائے رہا.....“ نذیب نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ اس کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔

☆ ☆ ☆

”کیا ساری زندگی ناراض رہیں گے..... کبھی بات نہیں کریں گے مجھ سے۔“ موبائل پر پیغام ٹائپ کرنے کے لیے وہ کچھ دیر تک Send کے بٹن کی جانب دیکھتی رہی تذبذب کے عالم میں سوچتی رہی۔
اس نے کبھی بھی جھگڑے کے بعد صلح میں پہل نہیں کی تھی ہمیشہ عادل ہی اسے منایا کرتا تھا بلکہ ان کے جھگڑے کبھی اتنے طویل ہی نہیں ہوئے تھے کہ یہ سوچنے کی نوبت آئی ہو کہ کون منائے گا۔ پھر یہ بھی پہلی بار ہی ہوا تھا کہ ان کی بول چال چار دن سے بند تھی۔

عادل ناشتہ کیے بغیر گھر سے نکلتا اور رات گئے آتا۔ آفس میں عشاء کی ذمہ داری بھی کسی قدر بڑھ گئی تھیں اور کچھ وہ اپنی خفگی بھی ظاہر کرنا چاہتی تھی اسی لیے گزشتہ چار دن سے عادل کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگا رہی

تھی۔ اب بھی نجانے کیا سوچ کر اس نے بھیج کیا تھا۔

لنچ آؤر میں سب لوگ لنچ کے لیے اسفند صاحب کے آفس میں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ سب لوگ وہاں ہی تھے اسی لیے عشاء ایڈمن آفس کے باہر بنے ہوئے لاؤنج کمرے میں صوفے پر بیٹھی اطمینان سے عادل کو میسج کر رہی تھی۔

اس آفس کا ماحول کافی دوستانہ تھا لوگ ایک دوسرے کے ذاتی معاملات پر ڈسکس کرنا بہت پسند کرتے تھے۔ کیونکہ اس NGO کا موٹو ہی یہ تھا۔

”فلاح سے نہیں کہیں گے تو کس سے کہیں گے اسی لیے اسفند صاحب کی طرف سے خصوصی ہدایات تھیں کو لیگز کے درمیان تعلقات بہت دوستانہ ہونا چاہیے۔

عشاء کافی دیر اسی طرح موبائل ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی۔ اسے امید تھی کہ اس پیغام کے بعد عادل اسے فون کرے گا مگر اس نے SMS کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔

کافی دیر سوچنے کے بعد عشاء نے اپنے موبائل سے عادل کا نمبر ملایا مگر اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ عشاء کا موڈ آف ہونے لگا۔

”ادنبہ..... نہیں تو نا سہی..... میں بھی بات نہیں کروں گی۔“ اس نے نخوت بھرے انداز میں خود کلامی کی مگر اس سے پانچ منٹ بھی صبر نہ ہو سکا۔ وہ پھر سے اسے کال کر رہی تھی۔ مگر اس بار عادل نے شاید موبائل آف کر دیا تھا۔

کوئی رسپانس نہ پا کر وہ اپنے کیمین کی طرف آ گئی مگر اس کا دل کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ اپنی ٹیبل پر آ کر بھی وہ کپیوٹر اسکرین کو گھورنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکی۔ اگر اس نے عادل کو SMS نہ کیا ہوتا یا Miss call نہ دی ہوتی تو شاید اس قدر بے چینی بھی نہ ہوتی۔ اب تو یہ سوچ کر زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ کہ عادل نے اس کو صلح میں پہل کو بھی اہمیت نہیں دی۔

”کس قدر غرے ہو گئے ہیں عادل آپ کے۔“ اس نے کھس کر سوچا۔

”تم نے مجھ سے کچھ کہا عشاء.....“ رحمہ نے چونک کر پوچھا۔ اس کا اور رحمہ کا کیمین ایک ہی تھا۔

عشاء نے بمشکل سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔

”تم نے لنچ بھی نہیں کیا۔ اسفند صاحب پوچھ رہے تھے تمہارا ان فیکٹ دیہی علاقوں کے وزٹ والا

پلان فائل ہو گیا ہے۔ اسی سلسلے میں وہ تم سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ تم ان کے آفس میں چلی جاؤ۔“ رحمہ اسے مشورہ دیا پھر بیک سے آئینہ نکال کر لپ اسٹک درست کرنے لگی۔

عشاء کچھ دیر سوچتی رہی پھر بیک اٹھا کر اسفند صاحب کے آفس کی طرف آ گئی۔ کھڑکی کے بلائینڈ سے جھپٹ جھاڑ کرتے ہوئے وہ موبائل پر کسی سے بات کر رہے تھے چونکہ عشاء بے دھیانی میں دستک دیے بغیر ہی اندر آ گئی تھی۔ اس لیے شرمندگی سے اب کوئی بات ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ کمرے سے باہر جاتی۔ اسفند رحیم نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔

”او کے ڈیر..... میں تفصیل سے ساری بات بتاؤں گا جب ہم ایک ساتھ ڈنر کریں گے۔ ابھی میں بڑی ہوں۔ ٹیک کئیر..... سی یو۔“ ایک جملے میں ہی وہ بات مکمل کر کے عشاء کی جانب متوجہ ہوا۔

”جی سبز عادل..... زہے نصیب..... ہمارے آفس کوروشن ہنسنے کا بہت شکر یہ۔“ وہ ایک طرف لگے صوفے کی جانب اشارہ کر کے مودبانہ انداز میں بولا۔

”مجھے امید ہے کہ آپ ہمارے ساتھ ضرور چلیں گی۔“

ابتدائی رسمی گفتگو کے بعد وہ یکدم بولا تھا شاید رحمہ نے اسے عشاء کے بارے میں بتا دیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ نہیں جا رہی۔

وہ لوگ ادا کاڑھ کے قریب ایک دو گاؤں کا وزٹ کر رہے تھے تاکہ غریب اور ان پڑھ عورتوں کو ان کے حقوق کے بارے میں آگاہ کیا جاسکے۔ عشاء کا ارادہ تھا کہ وہ ان کے ساتھ نہیں جائے گی۔ اگرچہ اسے یہ سب بہت دلچسپ لگ رہا تھا مگر عادل کی خفگی دور کرنے کے لیے وہ اس سارے پروگرام کے لیے دلچسپی ظاہر نہیں کر رہی تھی۔

”ایکسپوزی سبز عادل.....! کہاں گم ہیں آپ..... بس میں نے کہہ دیا ہے آپ ہمارے ساتھ ضرور چلیں گی..... آپ ان خواتین سے ملیں گی تو احساس ہوگا کہ کیسے کیسے لوگ ہماری توجہ و ہمدردی کے مستحق ہیں۔ آپ اس جاب کو ذمہ داری نہ سمجھیں بلکہ عبادت سمجھیں۔“

اس کی خاموشی میں چھپی ہوئی نیم رضا مندی کو محسوس کر کے وہ استحقاق بھرے انداز میں بولا۔

”ان فیکٹ..... میرے مسیونڈ شاید مجھے اس بات کی اجازت نہ دیں۔“ عشاء نے یہ کہہ کر گویا بات ختم کرنے کی کوشش کی۔

اس کا خیال تھا اسفند رحیم مزید اصرار نہیں کرے گا مگر وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔

”واٹ..... واٹ رٹش..... آپ دودھ جیتی پیتی نہیں ہیں۔ کہ آپ کو اجازت کی ضرورت پڑے..... بائی داوے کیا آپ کے مسیونڈ اس قدر نیرومانڈ ڈ ہیں کہ آپ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے ان کی اجازت لینا پڑتی ہے۔ اور پھر اجازت.....؟ واٹ رٹش..... مجھے تو آپ کے منہ سے یہ لفظ سن کر حیرت ہوئی ہے۔ اس قدر براڈمانڈ ڈ خاتون اور اس قدر کنزرویٹو مسیونڈ۔“

وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔

عشاء کو چاہیے تھا کہ وہ اپنے شوہر کی صفائی میں کچھ کہتی، کچھ تو کہتی مگر وہ خاموش رہی..... قدامت پسندی کی شکایت تو اسے بھی عادل سے ہونے لگی تھی۔

”زمانہ مرغ پر پرائش اختیار کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے اور میرے مسیونڈ کو سلیو لیس پہننا چاہیے یا نہیں چاہیے جیسی باتوں پر کڑھنے سے فرصت نہیں۔“ اس نے گزشتہ چار دنوں میں کئی بار سوچا تھا۔

عشاء کا ذاتی خیال تھا کہ وہ پختہ سوچ کی حامل بہت ذہین لڑکی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ سارے زمانے کو اس کی فہم و فراست کا قائل ہونا چاہیے۔

”مجھے بہت دکھ ہوتا ہے یہ دیکھ کر ایک مرد عورت کے لیے جینے کے اسباب بھی ختم کر دینا چاہتا ہے..... ہمارے یہاں ستر فیصد مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔

ارے بچی کچھ تو Space تو عورت ہے کوئی سنڈی تو نہیں کہ بند بوتل میں بھی جینے کا جواز تلاش کر لے..... سبز عادل آپ کیسے ایک کنزرویٹو مرد کے ساتھ گزارا کر رہی ہیں۔ آپ یہ سب پابندیاں برداشت کیسے کرتی ہیں؟“

اس کے اس قدر جارحانہ انداز کو دیکھ کر عشاء بوکھلا سی گئی۔

عادل نے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی جتنی کہ اسفند رحیم بیان کر رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا مگر اسفند رحیم اسے بات کرنے کا موقع بھی نہیں دینا چاہ رہا تھا۔

”ہم ”فلاح“ کی طرف سے آپ کے بی ہاف پر ان سے باقاعدہ پرمیشن حاصل کریں؟“ اس نے استفسار کیا۔ عشاء نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا۔

”نہیں نہیں سر.....! میں نے ان فیکٹ عادل سے ابھی بات ہی نہیں کہ آپ لوگوں کا سنڈے کا پروگرام ہے اور اس دن ظاہر ہے عادل کا بھی آف ہے۔ ایک ہی دن تو ہوتا ہے ہمارے پاس..... ان کا شیڈول سارے ہفتے بہت لفٹ رہتا ہے..... بس اسی لیے۔“

عشاء کا انداز پر اعتماد تھا مگر الفاظ نہیں۔ اسفند کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”ویل..... فائن..... ہم منڈے کا پلان کر لیتے ہیں۔ آپ ابھی اپنے مسیونڈ کو فون کیجئے اور انہیں انفارم کر دیجئے۔“ وہ ریو الونگ چیمبر کی پشت سے ٹیک لگا کر دونوں ہاتھ ہونٹوں پر رکھتے ہوئے بولا۔

نہ جانے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق عشاء نے پرس میں اپنا موبائل نکال کر ایک بار پھر عادل کا نمبر ملا شروع کیا اسے یقین تھا کہ عادل اب بھی کال ریسیور نہیں کرے گا مگر دوسری جانب سے ”ہیلو“ کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔

مگر یہ ”ہیلو“ عادل کی نہیں تھی۔ کسی عورت کی بھدی سی آواز کے ساتھ پس منظر میں گھنکر وؤں کی صدا صاف سنائی دے رہی تھی۔

”اری کون ہے..... نہیں بولتی تو فون بند کر دے نا..... کہہ دے تیرا آدمی یہ موبائل تجھے تو فہ (تخفہ) دے کر گیا ہے۔“

کسی اور عورت کی چنگھاڑتی ہوئی آواز نے عشاء کے رہے سہے حواس بھی معطل کر دیے۔ اس نے گھبرا کر فون بند کر دیا۔

”عادل کا سیل آف ہے..... میں گھر جا کر ڈسکس کر لوں گی۔“ وہ اتنا کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی اور پھر اسفند کے اصرار کے باوجود کی نہیں اپنے کیمین کی طرف آ گئی۔

اس کی روح کو کوئی چٹکیوں میں مسل رہا تھا اس نے ڈائلڈ نمبر کو دوبارہ چیک کیا کہ کہیں کوئی غلط نمبر نہ لائی ہو مگر نمبر بالکل ٹھیک تھا۔

عادل کا تعلق مردوں کی اس قسم سے نہیں تھا جو غلط قسم کے شوق رکھتے ہیں یا شاید عشاء اسے پہچان نہیں پاتی تھی۔ وہ جتنی دیر تک آفس میں رہی گویا کنکلوں پر رقص کرتی رہی۔ اس نے دوبارہ عادل کا نمبر ملا کر چیک کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مگر آ کر اس نے ٹکسڈ لائٹس سے عادل کا نمبر ملایا اور اس بار جس آواز نے کال ریسیور کی وہ پہلے والی آواز سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔

”کون بات کر رہا ہے؟“ ایک مردانہ کرخت آواز عشاء کی سماعت سے ٹکرائی۔

”میں مزہ عادل سے بات کر سکتی ہوں؟“ عشاء نے ہمت کر کے کہا۔

”آپ کون بات کر رہی ہو؟“

”میں ان کی مزہ ہوں..... آپ..... آپ..... کون؟“ اس نے دوسرا سوال کیا۔

”ادبی..... کیسی مزہ ہو آپ..... شوہر نہیں قابو ہوتا آپ سے..... کوٹھے سے پکڑ کر لائے ہیں.....

اب حوالات میں ہیں..... آپ کے شوہر..... ٹن ہو رہے ہیں..... نام بھی نہیں بتا رہے..... کیا نام بتایا آپ نے.....؟“ عشاء نے گھبرا کر ریسیور کرڈیل پر رکھ دیا۔

یہ تسلی بھی نہیں کی کہ جو شخص اس سے فون پر بات کر رہا تھا وہ پولیس آفسر ہے بھی ہے یا نہیں۔ پریشانی سے اس کا برا حال تھا۔ اس شہر میں ایسا کون جانے والا تھا کہ جس کو وہ فون کر کے مدد کے لیے کہہ سکتی۔ لاؤنج سے باہر گیٹ تک وہ چکر لگا لگا کر تھک گئی۔ مگر عادل آیا نہ کوئی راہ بھائی دی۔

آفس فون کیا تو پتا چلا کہ وہ تو آج صبح سے ہی کسی ضروری کام کے لیے نکلا ہوا ہے۔ وہ اس کے ایک ہی دوست کو جانتی تھی اسے بھی فون کر کے دیکھ لیا۔

”بھابھی! عادل تو عید کا چاند ہو چکا میرے لیے..... کبھی ملتا ہی نہیں ویسے آپ فکر مت کریں..... آجائے گا.....“ نیل کی تسلی بھی اسے مطمئن نہ کر سکی۔

وہ اسے یہ تو نہیں بتا سکتی تھی کہ عادل پولیس اسٹیشن میں ہے۔ آٹھ بجے تک وہ پریشانی سے اس کا انتظار کرتی رہی پھر تھک ہار کر اس نے دوبارہ نیل کو فون کر کے گھر بلوایا اور روتے ہوئے ساری صورت حال اسے بتادی۔ وہ بھی بے حد پریشان ہو گیا۔

اس نے عادل کا سیل نمبر ملانے کی کوشش کی مگر موبائل آف ہو چکا تھا۔ نیل کے ساتھ فاطمہ بھابھی بھی تھیں۔ ان دونوں کی تسلیاں بھی عشاء کو مطمئن نہیں کر پا رہی تھیں۔ دس بجے کے قریب عادل کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور چند لمحوں بعد وہ ڈپٹی کیٹ چابی کی مدد سے گیٹ کھول کر اندر داخل ہو چکا تھا۔ عشاء دوڑتی ہوئی لاؤنج سے گیراج تک چلی آئی۔

”آئی ایم سوری یار.....! دراصل! اس نے عادل کی بات پوری بھی نہیں سنی اور کھینچ کر ایک تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا تھا۔ نیل بھائی اور فاطمہ بھابھی لاؤنج کے دروازے میں کھڑے ان ہی کی جانب دیکھ رہے تھے۔

”جو لوگ کہتے ہیں گوانتا موبے سے بڑا کوئی ٹارچر سیل ہو ہی نہیں سکتا۔ میں ان لوگوں کو دعوت دیتی ہوں کہ وہ ایک بار ان پاکستانی ایریاز کا ضرور وزٹ کریں انہیں خود پتا چل جائے گا کہ دنیا میں ایک موبے ہے جبکہ پاکستان میں کئی ایک گوانتا موبے ہیں۔“

مس شیریں نے نخوت سے ناک چڑھا کر بات مکمل کی پھر اپنے پرس سے بینسن اینڈ میجز کا پیکٹ نکال کر سرگرمی سے سلگنے لگی تھی۔ چھیلیس سیٹ والی اس اے سی کوچ میں رحمہ اور عشاء کو نکال کر باقی سب معزز خواتین چین اسموکریں۔

مس شیریں کی بات سن کر رحمہ کے چہرے پر استہزائی سی مسکراہٹ بکھر گئی جس کا عشاء نے بغور نوٹس لیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

”مس شیریں کا وسیع و عریض بنگلہ کسی ٹارچر سیل سے کم نہیں ہے۔ موصوفہ اپنے باپ اور بھائیوں کو بھٹی کا ناچ نچائے رکھتی ہے۔“ رحمہ نے عشاء کے کان میں سرگوشی کی۔

عشاء گہری سانس بھر کر بدقت مسکرائی اسے فی الحال اتنی تھکن محسوس ہو رہی تھی کہ اس کا مسکرانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ آ تو گئی تھی مگر اس کا ذہن اپنے گھریلو مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ عادل نے بلاچوں و چرا اس کی بات مان کر گویا اسے مزید دو کوڑی کا کروا دیا تھا۔

”میری ایک فرینڈ کا مس شیریں کے چھوٹے بھائی کے ساتھ ٹھیک ٹھاک انصر ہے۔ مجھے تو اس بندے کی باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ اکثر اوقات میری فرینڈ کو اپنے گھریلو مسائل کے بارے میں بتاتا رہتا ہے اور وہ مجھ سے ذکر کرتی رہتی ہے۔“ رحمہ نے پھر جھک کر عشاء کے کان میں سرگوشی کی۔

عشاء کو ایک بار پھر دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے چہرے پر ”اچھا..... آ آ آ“ والی کیفیت پیدا کرنا پڑی۔ رحمہ کو اپنی باتوں سے لوگوں کو حیران کرنے کا شوق بھی بہت تھا۔ گاڑی میں بیٹیس کے لگ بھگ لوگ تھے جن میں سات آٹھ مرد جبکہ باقی تعداد عورتوں پر مشتمل تھی۔ سب لوگ آتے وقت جس قدر پر جوش تھے اب تھکن اور گاؤں کی دھول مٹی نے اتنا ہی بے حال کر رکھا تھا۔ سات بج چکے تھے مگر گرمیوں کی وجہ سے آسمان پر نیلگوں روشنی موجود تھی۔

عشاء پہلے کبھی اس طرف نہیں آئی تھی۔ جن علاقوں کا وزٹ انہیں کروایا گیا تھا وہاں کا معیار زندگی دیکھ کر کم از کم عشاء کافی حیران ہوئی تھی۔

وہ گاؤں کسی بھی چھوٹے شہر کے برابر تھے۔ گلیاں بھی صاف ستھری تھیں اور لوگ بھی اسے کم از کم دیہاتی تو نہیں لگے تھے۔ دراصل انہیں گاؤں کی گلیوں میں پیدل نہیں گھمایا گیا تھا کیونکہ سب ہی نازک مزاج خواتین اس قدر گرمی میں پیدل چلنے کے حق میں نہیں تھیں۔

ان کا پہلا بڑا ذخیرہ آخر آبادی میں تھا جہاں ایک معزز شخص اکرم علی کے اسفند صاحب کے ساتھ گھرے مراسم تھے۔ ان کے بڑے سے ڈرائنگ روم میں اسے سی کی ٹھنڈک میں کھانا کھایا گیا۔

بیگم اکرم علی کافی سلیجی ہوئی خاتون تھیں۔ انہوں نے ”فلاح“ کے اسٹاف کو بہت سی مجبوروں کے

خواتین سے ملوانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔

کسان زینالہ خود حبیب آباد کو کیرہ نامی چھوٹے قصبوں میں دس دس پندرہ منٹ کے لیے جانے کا اتفاق ہوا مگر نجانے کیوں یہ سب ایک تفریحی ٹور سے زیادہ نہیں لگ رہا تھا۔ گرمی اور دھول کے باعث بہت سی خواتین نے اسے سی کوچ سے اتر کر کسی سے ملنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ خود عشاء جو آتے وقت بہت پر جوش تھی۔ گرمی کی شدت سے سارا وقت اکتائی بیٹھی رہی۔ واحد ایک شخص جو گرمی غلاظت اور دھول کی پروا کیے بغیر ہر جگہ تصویریں لینے اور خواتین کے دیوڑا کٹھنے کرنے میں مصروف رہا تھا وہ وجاہت علی تھا۔ وہ اس گروپ کا عمر کے لحاظ میں سب سے چھوٹا تھا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی سے سوشل ورک میں ماسٹرز کر رہا تھا اور ”فلاح“ میں پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا۔

دیپال پور میں انہوں نے کسی ٹیوب ویل میں سی سائیڈ کا محاذ لیا۔ تصاویر بنوائیں اور آم کھائے۔ اس کے باوجود مس شیریں کو نجانے ایسے کون سے مارچر سیل نظر آئے تھے جو وہ ان علاقوں کو گوانتا ناموبے سے ملا رہی تھیں۔

”مس شیریں کو شاید پتا بھی نہ ہو کہ گوانتا ناموبے کیا ہے..... کس چیز کا نام ہے۔ مگر اپنی تھلندی ثابت کرنے کے لیے ایسی فضول باتیں کرنا جیسے لازم ہے ان پر۔“ وجاہت نے اپنے ہنڈی کیم کی جانب دیکھتے ہوئے خود کھائی کی تھی۔ وہ عشاء اور رحمہ کے بالکل پیچھے بیٹھا تھا۔

”اور رینلی..... ہا ہا ہا..... کتنا شارپ سینس آف ہیومر ہے تمہارا وجاہت..... اچھا ویسے گوانتا ناموبے کیا ہے.....؟ ان فیکٹ میری اردو بہت ویک ہے..... انگلش میں گوانتا ناموبے کو کیا کہتے ہیں۔“ رحمہ نے اپنی میتھی کی نمائش کرتے ہوئے پیچھے مڑ کر سوال کیا۔

وجاہت کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھری مگر اس مسکراہٹ کا دورانیہ بہت مختصر تھا۔ عشاء اگر عادل کی وجہ سے اپ سیٹ نہ ہوتی تو یقیناً رحمہ کے سر پر چیت لگا کر اس سوال کا جواب دیتی اس نے فقط ایک نظر رحمہ پر ڈالی اور دو بارہ سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”میں پہلی ملاقات میں ہی آپ کے اعلیٰ لیول سے بہت متاثر ہوا تھا مگر افسوس مجھے خود بھی نہیں پتا تھا کہ گوانتا ناموبے کو انگلش میں کیا کہتے ہیں۔ آپ ڈکشنری میں دیکھ لیجئے گا۔“ اس نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

عشاء کو اس کے اس سادہ سے طہنرے ایک بار پھر عادل کی یاد دلادی۔ عادل یہاں موجود ہوتا تو رحمہ کو اس سے بھی زیادہ کرار جواب دیتا۔

اس کی ذہنی رو پھر بھٹکنے لگی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا جلد از جلد اڑ کر گھر پہنچ جائے۔ ”عادل! آپ بہت بدل گئے ہیں۔“ اس نے دل ہی دل میں اسے مخاطب کر کے کہا۔ سب کا ہی تھکن کے مارے برا حال تھا اسی لیے کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ عشاء کی طرف دھیان دیتا۔ صبح رحمہ کے علاوہ دو تین اور لوگوں نے بھی اس کا چہرہ اترا ہوا دیکھ کر تشویش سے اس کی طبیعت کا

پوچھا مگر اس نے سب کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کر دیا۔ فقط خود کو ہی مطمئن نہیں کر پارہی تھی۔ اسے اب خود پر غصہ بھی آنے لگا تھا کہ وہ آئی کیوں۔ اسے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ وہ جس ٹرپ کو بہت سنجیدہ سمجھ رہی تھی وہ اس قسم کا ایک تفریحی ٹور ہے۔

اگر اس کا حراج عادل کے رویے کی وجہ سے خراب نہ ہوتا تو شاید وہ بھی اس ایڈ ونچرس ٹور کا لطف لیتی کیوں کہ بہر حال وہ گھومنے پھرنے کی بہت شوقین تھی۔

”ہم ادھر چوکی میں تھوڑی دیر کو رک کر نماز ادا کرے گا..... آپ میں سے کسی نے نماز پڑھنی ہے تو آ جاؤ۔“

ان کے بزرگ پنهان ڈرائیور نے بلند آواز میں کہا۔

”نہیں پلیز..... اوہ نہیں..... خان بھائی! سفر میں کوئی نماز نہیں ہوتی..... گھر جا کر پڑھ لینا..... معاف کرو خان بھائی..... آل ریڈی کیٹنگ لیٹ..... پینٹائی (قضا) بھی تو ہوتی ہے۔ نماز کی۔“ خان صاحب کو جواب میں مختلف قسم کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

”خان بھائی تمہارا ہمارا آٹھ بجے تک کا ٹائم تھا اگر یہاں رک گئے تو لاہور پہنچنے تک آٹھ سے اوپر کا ٹائم ہو جائے گا۔ پھر تمہارا مالک ہم سے زیادہ پیسے مانگے گا۔ اگر تم وعدہ کرو کہ آٹھ بجے سے پہلے ہمیں لاہور پہنچا دو گے تو ہمیں تمہارے یہاں رکنے پر اعتراض نہیں۔“ اسفند رحمہ نے گویا آخری فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

”امار بات سنو صاحب! ام تم کو دس منٹ میں لاہور لے جائے گا مگر اس بات کا وعدہ ام نہیں کرتا کہ تم کو زندہ لاہور لے جائے گا۔ شیر خان کو اپنی جان کا فکر نہیں۔ آپ لوگوں کا واسطے ام گاڑی کو اتنا ڈھیلارکھا ہے کہ آپ کے ساتھ آپ کا عورتیں ہیں اور آپ کی عورتیں تو ہوا کو دیکھ کر ہائے کرنے لگتی ہیں۔ فرض نماز پڑھنے میں کتا (کتنا) ٹیم لگ جائے گا اور دیر امارا وجہ سے نہیں ہوا۔ آپ لوگوں نے کھود (خود) لیٹ کیا۔“ خان صاحب ٹرپ کر بولتے چلے گئے تھے۔ اسفند رحمہ خاموش ہو گیا مگر معزز خواتین غصے سے آگ بگولا ہو گئیں۔

”ارے اس میں اتنی بدتمیزی کرنے کی ضرورت نہیں ہے پڑھ لو تم نماز۔ ادا کر دیں گے تمہارے مالک کو زیادہ پیسے بس اب دماغ مت کھاؤ۔“ ضویا درانی ٹرپ کر بولی۔

خان روایات کا لحاظ کرنے والا آدمی تھا اس لیے ضویا کے سخت لہجے کو برداشت کر گیا مگر پھر بھی حق بات کہنے پر باز نہیں آیا۔

”میری بات سنو بی بی! جب تم لوگوں نے گاڑی کا بلیک کر لیا تو بولا کہ تم حقوق کی بات کرتے ہو اور گاؤں میں جا کر عورت کو اس کے حقوق کی بات سکھائے گا مگر تم لوگوں کو اللہ کے حقوق کی کوئی خبر نہیں ہے۔ تم انسان کے بچے کو کیا حقوق کی تعلیم دے گا۔“ اس نے گاڑی ایک ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی کرتے ہوئے سب لوگوں کو غیرت دلانے کی کوشش کی۔

”ادبہ..... مولوی نہ ہوتو۔“ ضویا درانی نے اپنے جیک سے منزل وائر کی بوتل نکال کر منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

خان صاحب نماز کے لیے اتر گئے جبکہ باقی لوگ ہوا کھانے یا چائے پانی وغیرہ کے لیے ایک کے بعد ایک اترتے چکے تھے۔ دس پندرہ منٹ بعد خان صاحب نماز پڑھ کر واپس آ بھی گئے مگر وہ تمام جوان بچے بیچے جو اخاری کے لیے اترے تھے۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔

وہ لوگ جو دس منٹ کے قیام کے لئے تیار نہیں تھے وہی لوگ آدھ کھنے کی تاخیر سے دوبارہ گاڑی میں اپنی نشست پر آ کر بیٹھے۔ خدا خدا کر کے گاڑی پھر چلی مگر بیس پچیس منٹ کے بعد ایک جھکا کھا کر رک گئی۔ نازک مزاج لوگ تھے اس لیے ذرا سے جھکنے نے ہلا کر رکھ دیا۔

خان صاحب بڑبڑاتے ہوئے گاڑی سے اترے تھے۔ گاڑی میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ دراصل خان صاحب کو شک گزرا تھا کہ کوئی جانور گاڑی سے ٹکرایا ہے۔ خان صاحب کے پیچھے سب سے پہلے دجاہت اترتا ہوا ایک ایک کر کے باقی مرد بھی اتر گئے۔

”اب اسنو پڑ خان کو کیا مصیبت ہے؟“ یہ رحمہ کی آواز تھی۔

”ایک عورت گاڑی سے ٹکرائی تھی شاید مر گئی ہے۔“ دجاہت نے دروازے سے منہ نکال کر دھماکا

کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”نہیں عشاء ایسی کوئی بات نہیں۔“ عادل نے ایک عیا جیلے میں اس کی بات کو رد کر دیا۔ ہمیشہ کی طرح عشاء اس کے لہجے سے اس کے مزاج کا اندازہ نہیں لگا پاتی تھی۔ عادل کی توجہ یموں کے پیڑ کی جانب تھی جس پر بہت سے کچے کچے پکے یموں لگے ہوئے تھے۔

عشاء کو یکسر نظر انداز کر کے وہ کچے ہوئے یموں شاخوں سے علیحدہ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ ان کی لینڈ لیڈی نے گھر کا پیچھے والا سارا حصہ ان کے تصرف میں دے رکھا تھا۔ سامنے کے حصے کے مقابلے میں عقبی حصے میں لان کا فقط ایک چھوٹا سا قطعہ تھا مگر یہ نہایت قطعہ سامنے والے قطعے سے زیادہ شاندار لگتا تھا اور اس کا سارا کریڈٹ عادل کو جاتا تھا۔ گارڈننگ اس کا شوق تھا۔ اس نے اس حصے کو کچن گارڈن کی شکل دے رکھی تھی۔

وہ آج صبح کی آخری تاریخ کی وجہ سے جلدی گھر آ گیا تھا اسی وجہ سے اب فراغت میں وہ لان میں نظر آ رہا تھا۔ عشاء نے ٹور کی تھکاوٹ کی وجہ سے جھٹی کی تھی اور عادل کو بیڈروم میں خواہ ستراحت دیکھ کر اس نے سوچا تھا کہ موقع اچھا ہے آج کل کر عادل کو اس کے بد صورت رویے کا احساس دلایا جائے مگر ابھی وہ بات کرنے کا سوچ رہی تھی کہ عادل خود باہر آ گیا۔

مجبوراً عشاء کو اس کے پیچھے آنا پڑا تھا مگر عادل کا سرد رویہ اس کی حوصلہ شکنی کرنے کو کافی تھا۔

”میرا خیال ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے ورنہ اگر مجھ میں یا میرے رویے میں کوئی تبدیلی آئی ہوتی تو کم از کم کوئی اور بھی ایسی شکایت کرتا۔“ اسے اپنی جانب مسلسل دیکھتا پا کر عادل نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

عشاء کچھ لمبے خاموشی سے اس کی جانب دیکھتی رہی۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن اور خاندان بھر کی

پہلی پوتی ونو اسی ہونے کی بنا پر اس کو ہمیشہ توقعات سے بڑھ کر پیار اور توجہ ملی تھی اسی لیے اس کی طبیعت میں ہٹ دھرمی تھی جو اسے ہمیشہ اپنے دل کی مرضی ماننے پر اکساتی تھی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ عادل سے اس معاملے پر کھل کر بات کرے تاکہ کم از کم دلوں میں موجود کشمکش دور ہو جائے مگر نجانے کیا چیز تھی جو اسے روک رہی تھی دوسری طرف عادل سوچ رہا تھا کہ ایک دفعہ عشاء اپنے رویے کی معافی مانگ لے تو وہ سب کچھ بھول بھال کر اپنا مزاج ٹھیک کر لے گا۔

”میں جھوٹ بول رہی ہوں کیا؟.....؟ اتنے دن سے آپ مجھ سے ٹھیک سے بات نہیں کر رہے ہیں، بات کرنا چاہتی ہوں تو میری بات کا جواب نہیں دیتے اور پھر آپ نے مجھ سے ایکسکسوز بھی نہیں کیا.....“ وہ ابھی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ عادل نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اوہ یس..... آئی ایم سوری..... میں بھول گیا تھا کہ مجھے آپ سے ایکسکسوز ذکرنا تھا میں نے مس بی ہو کیا تھا آپ کے ساتھ۔ پلیز مجھے معاف کر دیجئے۔“ مجھ سے آپ کی شان میں گستاخی ہوئی۔“

اس کی ساری توجہ یموں کے پیڑ کی جانب ہی تھی مگر زبان سے نکلنے شعلوں کا رخ عشاء کی جانب تھا۔

”عادل! پلیز اب بس کیجئے۔ ایسا کیا کر دیا ہے میں نے کہ آپ کا غصہ ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ آپ خود بھی تو اپنی غلطی مانجئے۔“ وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔

آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے تھے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ عادل ان آنسوؤں کو دیکھے۔ عادل کن اکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں در آنے والی نمی سے واقف تھا مگر ابھی اسے معاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

وہ اس کی وجہ سے کتنے ہی دن اپ سیٹ رہا تھا اور پھر دو دن قبل نیل اور فاطمہ بھابی کے سامنے جوڈرامہ ہوا تھا اس کے بعد تو وہ عشاء کو اتنی جلدی معاف کر ہی نہیں سکتا تھا۔

”بی بی عشاء میں نے آپ کو کب کہا کہ میری غلطی نہیں۔ میری ہی غلطی ہے سب میری غلطی ہے۔“ وہ اس انداز میں بات کر رہا تھا جیسے اپنے نہیں کسی اور کے بارے میں بات کر رہا ہو۔

”پلیز عادل! فارگاز ڈیک۔ میں کہہ تو رہی ہوں کہ میری غلطی ہے۔ آئی ایم سوری مگر آپ ایک بار خود کو میری جگہ رکھ کر سوچیئے۔ جو واقعات اس دن میرے ساتھ پیش آئے اگر آپ کے ساتھ پیش آتے تو آپ بھی غلط فہمی کا شکار ہو جاتے آپ خود بتائیے کہ اگر آپ مجھے فون کریں اور میرا فون کوئی اور ریسیو کر لے اور آپ کے ساتھ اٹنی سیدھی باتیں کرے تو آپ غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں گے کیا۔ اس عورت کی آواز اتنی گندی تھی۔“ عشاء بولتے بولتے رونے لگی۔

”اور..... اور پھر تھکھکھ روؤں کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ اس عورت نے اتنی گندی باتیں کیں پھر..... دوسری بار ایک آدمی نے کال ریسیو کی اور بولا میں پولیس آفیسر ہوں۔ اس نے کہا اس نے موبائل فون والے کو کوٹھے سے پکڑا ہے۔ آپ خود بتائیے مجھے غلط فہمی نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ مجھے الہام تو ہونے سے رہا کہ آپ

کاسیل چوری ہو گیا ہے۔ کیا آپ نے مجھے انفارم کیا تھا کہ میرا موبائل چوری ہو گیا ہے۔ حالانکہ یہ اتنی صبح کی بات تھی اور سیل چوری ہونے کے بعد تقریباً میں نے سات آٹھ گھنٹے بعد فون کیا تھا۔“

اس کی آواز قدرے اونچی ہو گئی تھی۔ عادل نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر کی جانب چلا آیا۔ لاؤنج میں بیٹھنے کی بجائے وہ اسے بیدروم میں ہی لے آیا پھر اسے صوفے پر بٹھا کر خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا عشاء! کہ میرا کردار ہی بدل گیا۔ ارے سیل چوری ہوا تھا میں تو نہیں کہ تم نے آتے ہی مجھ پر یلغار کر دی۔ تو بے نیل اور بھابھی کے سامنے تم نے مجھے تھپڑ دے مارا۔ مجھے اتنا برا محسوس ہوا کہ بس..... یقین کر دوں گا چارمین میں سا جاؤں..... گاؤں..... سامنے میرا انگوٹیا یا رکڑا تھا جو مجھے آج تک اس بات کے طعنے دیتا ہے کہ مجھے یونیورسٹی میں ہر لڑکی ”نودیکسی“ کا بورڈ دکھا دیتی تھی۔ اب تو ساری زندگی کے لیے اس کو جواز مل گیا مجھے طعنے دینے کا کہ میری بیوی مجھے مارتی ہے۔“

عادل نے سنجیدگی سے بات شروع کی مگر زیادہ دیر سنجیدہ رہنا اسے آتا ہی نہیں تھا۔ نجانے کیسے وہ اتنے دن تک اپنے آپ کو سنجیدہ رکھے ہوئے تھا اور پھر عشاء کے ایک چھوٹے سے الیکسکیز نے اس کے مزاج کی کھٹکتی بحال کر دی تھی۔

”میں آپ کو مارتی نہیں ہوں..... سمجھے آپ..... بس اس روز نجانے کیسے..... آئی ایم سوری عادل..... دراصل میں اتنی ڈپریشن ہو گئی تھی اس روز..... میں اپنے آپ کو کمپوز کرنا چاہتی تھی۔ مگر.....“ عشاء نے رخساروں پر آنی نمی کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے جیسے لہجے میں کہا۔

اس کا لہجہ وانداز اس کی شرمندگی کا احساس دلا رہے تھے۔ عادل کو اس سے زیادہ نہیں چاہیے تھا۔ وہ بہت صابر و شاکر قسم کا بندہ تھا۔ بیوی نے غلطی کی پھر معافی مانگ لی تو اس کا مطلب شوہر کو کھلے دل سے معاف کر دینا چاہیے۔

”اٹس اوکے..... کچھ قصور میرا بھی ہے..... مجھے تمہیں انفارم کرنا چاہیے تھا کہ میرا سیل چوری ہو گیا ہے۔ ان فیکٹ اس روز گاڑی کچھ پرابلم کر رہی تھی۔ میں ورکشاپ پر لے گیا تھا۔ وہاں شاید کہیں گر گیا یا کوئی اٹھا کر لے گیا مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں نے غلطی سے کہیں گرا دیا۔ بہر حال رات گئی بات گئی اب جھگڑے ختم کرو اور پیار کی باتیں کرو۔“ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”ہاں ٹھیک ہے میں چائے بنا کر لاتا ہوں پھر ساری باتیں کریں گے اور میں آپ کو کل والے ٹرپ کی ساری باتیں بتاؤں گی۔ آپ خود سے تو کچھ پوچھتے ہی نہیں ہیں۔ پتا ہے کتنی عجیب بات ہوئی ایک عورت ٹکرا گئی تھی ہماری گاڑی سے۔ ابھی آکر تفصیل بتاتی ہوں۔ پہلے چائے اولسٹک وکٹ لے آؤں بہت بھوک لگی ہے۔ تو بے صبر ہے کچھ نہیں کھایا میں نے۔“ وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولی۔

عادل نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا لیا۔

☆ ☆ ☆

”میرا نام نرنب ہے جی!“ اس نے اپنے ہاتھوں کو تکتے ہوئے بمشکل یہ فقرہ ادا کیا۔

اس کی پیشانی اور ہاتھوں پر پٹی بندھی تھی مگر اس کے علاوہ بظاہر اسے کوئی بڑی چوٹ نہیں آئی تھی۔ لاہور پہنچتے ہی سب سے پہلے اس کا تفصیلی میڈیکل چیک اپ کروایا گیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد یہ پہلا مکمل فقرہ تھا جو اس نے ادا کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ مسلسل سوال پوچھنے پر بھی کچھ نہیں بول رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی سے بہت بہت زیادہ خوف زدہ ہے۔

”بی بی! نام سے فرق نہیں پڑتا۔ ہمیں حقیقت بتاؤ کس سے ڈر کر بھاگ رہی تھیں تم..... قتل کیا ہے.....؟ عشق و عاشقی کا چکر ہے یا جانیداد کے تازے ہیں۔“

اطہر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ نہایت تلخ تھا۔ وہ واحد شخص تھا جو اس عورت کو اس روز سڑک سے اٹھا کر اپنے ساتھ لانے کو تیار نہیں تھا وہ اطہر بخاری تھا۔ وہ اب بھی اس عورت کو گھورنے میں مصروف تھا۔ اطہر کی بات پر اس نے مزید سر جھکا لیا۔

”سیدھا سادا پولیس کیس ہے اسفند! یہ عورت شکل سے ہی ڈرامہ باز لگتی ہے۔“ اطہر اسفند کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

اسفند نے اسے گھور کر دیکھا اور خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ کمرے میں ان دونوں مرد حضرات کے علاوہ ضویا اور شیریں بھی موجود تھیں۔

”آپ کو گھبرانے یا کسی سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں مگر یہ تب ہی ممکن ہے جب آپ ہمیں اپنے متعلق سب کچھ سچ بتائیں گی۔“ اسفند نے لہجے میں حتی الامکان مٹھاس سموتے ہوئے کہا تھا۔

اطہر..... اسفند کے پر حلاوت لہجے پر ناک بھوں چڑھاتا باہر نکل گیا۔ اس کے کمرے سے نکلنے ہی اسفند صوفے پر مزید مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔ اطہر زبان کا کچھ زیادہ ہی تلخ تھا۔ وہ عورت اب بھی کچھ نہیں بولی۔ اس کی نظروں کا ارتکاز اس کے ہاتھوں کی جانب ہی رہا تھا۔ شیریں اسفند کا اشارہ پا کر اس عورت کے پاس جا کر بیٹھ گئی پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حالانکہ ایسا کرنے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

اس عورت کو ضویا نے اپنا ایک پرانا جوڑا دے دیا تھا۔ وہ اس وقت اسی لباس میں تھی مگر ایسا لگ رہا تھا کہ لباس کی اہمیت بھی کم ہو گئی ہے۔ سالونی سلونی سی وہ عورت گلابی رنگ کے شلوار قمیص میں مزید سالونی لگ رہی تھی۔

مس شیریں کے ہاتھ پکڑنے پر اس عورت نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا پھر منت بھرے انداز میں بولی۔

”باجی! مجھے پنڈ (گاؤں) جانے والی لاری میں بٹھادیں۔ مجھے واپس جانا ہے۔“

”باجی.....؟ واٹ ریش..... میں تمہاری باجی نہیں ہوں..... یہاں کوئی تمہاری باجی نہیں ہے..... اسٹوپ عورت.....“ انہبہ.....“ مس شیریں نے یکدم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ناک چڑھا کر بولی۔

”کون سے پنڈ (گاؤں) جانا ہے تمہیں.....؟ ہم تمہیں بس میں بٹھادیں گے۔ مگر جب سے آئی ہو

تم نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ آنکھیں اور ڈرپ پر گزرا کر رہی ہو۔ کھانا کھا لو پھر چلی جانا“ اسفند نے بغور اسے دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

وہ عورت کچھ نہیں بولی۔ یقیناً وہ کچھ کھانا چاہ رہی تھی۔ اسفند کے اشارے پر ملازم بہترین ریسٹورنٹ سے کھانا لے آیا تھا۔ چند منٹوں بعد اس عورت کے سامنے انواع و اقسام کے کھانے جگ گئے تھے اور اس عورت نے بھی کسی کو مایوس نہیں کیا تھا وہ کھانے پر ٹوٹ پڑی تھی۔

وہ سب لوگ اس عورت کو اس قدر رغبت سے کھانا دیکھ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

”وہ اپنا نام نذیب بتاتی ہے اور بہت مظلوم عورت ہے۔ اس کا شوہر اسے قتل کرنے والا تھا مگر وہ بھاگ کر بس اسٹینڈنک آگنی مکر اس کے پاس کرائے کی تم نہیں تھی اس لیے اس کو بس سے چوکی کے قریب اتا دیا گیا تھا۔ وہ بھاگ رہی تھی مگر انجانے میں ہماری کوچ سے ٹکرائی۔“

رحمہ نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے عشاء کو تفصیل بتائی کیونکہ عشاء ایک دن کی چھٹی کے بعد آئی تھی۔

”کاروکاری کا معاملہ ہے۔ قسمت کی بات ہے نا اس عورت کو بھاگنے سے پہلے پتا ہی نہیں ہو گا کہ وہ اسفند صاحب جیسے ہمدرد انسان تک پہنچ جائے گی۔ اسفند صاحب کل یا پرسوں ایک پریس کانفرنس کرنے والے ہیں۔ وہ اس عورت کو اس کے حقوق دلا کر ہی دم لیں گے۔“

سارے اسٹاف کی طرح رحمہ بھی اسفند صاحب کی انسان دوستی کی دل سے معترف تھی۔

”اس عورت کا شوہر اسے قتل کیوں کرنا چاہ رہا تھا؟“

عشاء نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

اخبار میں اس قسم کی خبریں پڑھنا اور بات چینی اور اپنی آنکھوں کے سامنے کسی کو اس طرح ظلم کا نشانہ بننے دیکھنا بالکل الگ کیفیت تھی۔

”یار! کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کیوں اس بے چاری کو قتل کرنا چاہتا تھا جو بات اہم ہے وہ یہ کہ اس کا شوہر اسے قتل کرنا چاہتا تھا۔ یار! پاکستان میں ایسے ہی مرد ہوتے ہیں ظالم خونخوار اور ہوس پرست۔۔۔۔۔“

وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ جائیداد یا پھر وہی اسٹوڈنٹ کاروکاری۔۔۔۔۔ یونو گاؤں میں مرد اپنی عورتوں کو اس لیے بھی مار چکے ہیں کہ وہ ان کی مرضی کے کام کرنے پر تیار نہیں ہوتیں۔ خیر یہ تو شہروں میں بھی ہوتا ہے۔ مرد عورت کو خوش دیکھ ہی نہیں سکتا۔ رحمہ نفرت و حقارت سے کہہ رہی تھی۔

عشاء اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ ابھی وہ باتیں کر رہی تھیں کہ انہیں اسفند صاحب کے روم میں مینٹنگ کے لیے کال کر لیا گیا۔

روم میں داخل ہوتے ہی عشاء کی نظر اس معصوم و مظلوم عورت پر پڑی۔ وہ شکل سے ہی اس قدر لاچار و مفلس لگ رہی تھی کہ ان سب کا دل اس کے لیے رحم سے بھر گیا۔

”یہ نذیب ہیں یہ بھی ان مظلوم خواتین میں سے ایک ہے جو مرد کے ظلم کا شکار ہوئیں۔ اس عورت کی غلطی اتنی بڑی نہیں جتنی بڑی اس کو سزا دی گئی۔ اس کے شوہر نے اس پر بدکرداری کا الزام لگا کر اس پر مار چڑ کیا اسے محلے کی گلیوں میں گھسیٹا گیا اس کے کپڑے بھاڑ دیے گئے اور اسے مارا جینا گیا پھر وہ وہاں سے اپنی جان بچا کر بھاگی اور ”فلاح“ پہنچ کر دم لیا۔“ شیریں ان سب کے چہروں کو بغور دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میڈیا اور پریس کے سامنے کوئی یہ نہیں کہے گا کہ یہ ہمیں چوکی میں ملی تھی بلکہ ہم یہی کہیں گے کہ یہ خود ہمارے پاس مدد کے لیے آئی تھی۔ ٹھیک ہے نذیب۔“ اسفند نے اس عورت کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس عورت نے سر اٹھایا نہیں تھا مگر اثبات میں ہلا ضرور دیا تھا۔

”رونا مت۔۔۔۔۔ تم کمزور نہیں ہو۔۔۔۔۔ کوئی عورت کمزور نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔۔۔۔۔ تم فکر نہیں کرو۔۔۔۔۔ تمہارے شوہر کو ایک نہ ایک دن تم سے معافی مانگی پڑے گی۔۔۔۔۔ شاباش رونا نہیں۔“ ضویا جو اس عورت کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”باجی۔۔۔۔۔ وہ مجھے مار دے گا۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔“ سہارا ملتے ہی وہ سسک کر بولی۔

”اف۔۔۔۔۔ پھر وہی باجی۔۔۔۔۔“ ضویا اس کی حرکت سے چڑ کر بولی۔

مس ضویا کی اکتا ہٹ دیکھ کر اس سنجیدہ صورت حال میں بھی اکثر لوگوں کو ہنسی آ گئی۔

”میڈیا کے سامنے اتنا سا جھوٹ بولنا مبالغہ آرائی نہیں مصلحت ہے اور پھر اگر اس عورت کو اس کا حق دلوانا ہے تو ہمیں اتنا کرنا ہی پڑے گا۔ خیر رحمہ اور عشاء! آپ پلیز نذیب کو تھوڑی شاپنگ وغیرہ کروادیں اور تھوڑا گاڑ کر دیں کہ میڈیا کے سامنے خود کو کس طرح پیش کرنا ہے۔ ضویا! آپ اس کے بیان کی فوٹو اسٹیٹ کروا کے ایک ایک سارے اسٹاف کو دے دیں تاکہ سب کو اس بے چاری پر ہونے والے ظلم کی خبر ہو سکے۔“

اسفند نے ہدایات دیں۔

☆ ☆ ☆

”میں یہ ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ آج کی عورت کمزور نہیں ہے۔ فردوس نے دوپہر کو نکلنے والے ایک نچلے درجے کے اخبار کی سرخی با آواز بلند پڑھتے ہوئے سٹائش بھری نظروں سے اسفند رحیم اور اس کی جانب دیکھا۔

”آج سے پانچ سال قبل ”فلاح“ نامی اس NGO کو بنانے کا خیال فردوس کریم کے زرخیز ذہن کی پیداوار تھا۔ وہ گزشتہ کئی سالوں سے امریکہ میں رہائش پزیر تھی اسی حساب سے اس کی شناسائی امریکن پارلیمنٹ تک تھی جبکہ پاکستان میں اس نے اسفند رحیم جیسے دانا اور زیرک شخص کو اپنا دست راست بنایا تھا۔

اسفند رحیم کی بی بی آر بھی فردوس کریم سے کم نہیں تھی۔ فردوس کی دلچسپی دیکھ کر اسفند نے مزید اخبارات اس کے سامنے رکھے۔ یہ سب دوپہر اور شام کے وقت نکلنے والے اخبارات تھے جن کا بنیادی مقصد سنی پھیلاؤ تھا۔ اس قسم کے تقریباً سب اخبارات نے ”نذیب علی“ کی پریس کانفرنس کو بہت مناسب قسم کی کوریج دی تھی۔

”انگلش نیوز پیپر میں خبر لگ جانی تو زیادہ اچھا تھا۔ تم جانتے ہی ہو غریب اور مظلوم کو تب تک مدد نہیں ملتی جب تک ”بڑے“ اس کا ساتھ نہ دیں اور ”بڑوں“ کی مدد حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ تمام اچھے انگلش اخبارات بھی اس ”خبر“ کو اچھی کورت دیں۔“ فردوس نے اخبارات کو میز پر رکھ کر چائے کا گامگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”آپ کہہ تو ٹھیک رہے ہیں مگر آپ کو نہیں پتا کہ اس عورت کو دو پر اپرا ردو کے فخرے بھی کتنی مشکل سے ازبر کروائے ہیں۔ وہ بہت انوسینٹ اور سادہ ہے۔ ہمارا پلان دراصل یہ تھا کہ اس کی شخصیت کو تھوڑا پالش کر دیں پھر انٹرنیشنل میڈیا کے سامنے لائیں تاکہ مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ ابھی تو وہ اعتماد سے اپنی بات بھی دوسرے تک نہیں پہنچا سکتی۔ بہت جلدی کثیف ہو جاتی ہے۔

ایسا نہ ہو کہ بے چاری بات کرتے وقت پزل ہو اور میڈیا اسے جھوٹی قرار دے دے۔ یہ امریکہ نہیں ہے۔ جناب! یہاں جو جتنا سچا ہے اتنا ہی ڈر پوک ہے۔“

اسفند رحیم نے اسٹیکس کی پلیٹ اس کے سامنے کرتے ہوئے مودبانہ انداز میں کہا تھا۔ فردوس سر ہلانے لگا گویا وہ اس کی بات سے متفق تھا۔

”ایک بات بتاؤ اسفند! تمہیں وہ کتنی سچی اور کتنی جھوٹی لگتی ہے۔“

بسکٹ کو دانٹوں سے کترتے ہوئے فردوس کریم نے اسفند کی آنکھوں میں بخور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اسفند رحیم نے اپنے ساتھ بیٹھے وجاہت کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ ایک پریسٹ بھی جھوٹی نہیں ہے۔ یہ بات میں دو شک سے کہہ سکتا ہوں۔ جھوٹ کی آمیزش ہم نے کی ہے اور وہ بھی اس لیے کہ اپنی NGO کو پروموٹ کرنے کے لیے ہمیں اس قسم کے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ اس عورت کی کہانی میں آپ کو سنا تا ہوں آپ خود فیصلہ کر لیجے گا۔“ وہ بہت مضبوط لہجے میں بولا۔

”یہ عورت کو ہلانا نامی ایک چھوٹے سے گاؤں کی رہنے والی ہے۔ دوسری تمام عورتوں کی طرح اسے بھی کپڑے اور زیورات وغیرہ جیسی چیزوں سے عشق ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ان چیزوں کے حصول کے لیے کوئی غلط کام کرتی ہے یا وہ کوئی بد کردار عورت ہے۔ اس نے ہمیشہ صاف ستھری زندگی گزاری ہے۔ دراصل اس کا تعلق خانہ بدوشوں سے ہے۔ اس کا باپ پیدائشی نشی تھی۔ یعنی جھوٹی عمر سے سنے قسم کے گھٹائیے وغیرہ کرتا تھا اور اس کی ماں بھیک مانگ کر گزارا کرتی تھی کیونکہ وہ کچھ اور نہیں کر سکتی تھی جبکہ اس کی دو بڑی بہنیں اپنا آپ بچ کر زندگی گزار رہی تھیں۔

چودہ سال کی عمر میں اس کے باپ نے ایک شخص کے ہاتھ اس کو پانچ ہزار میں بیچ ڈالا اور خریدنے والا شخص اس کے شوہر کا چچا زاد بھائی تھا۔ ساجد علی نے اپنے چچا زاد بھائی سے اس کو خرید کر اس سے شادی کی تھی۔

ابتداء میں ساجد علی کے خاندان نے زینب کو قبول نہیں کیا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ صورت حال بہتر ہوتی چلی گئی۔ ساجد علی نے زینب سے شادی تو کر لی مگر اس کے دل میں شکوک و شبہات جنم لیتے رہتے تھے۔

وہ زینب پر شک کرتا تھا اور مار پیٹ بھی کرتا تھا۔ زینب پھر بھی اس کی مٹھوڑی کی ساجد علی نے اسے

بیوی کا درجہ دیا اور بقول اس کے زندگی کی ہر سہولت دی مگر اس کے بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ساجد علی ہمیشہ زینب کے متعلق شکوک کا شکار رہا۔ سونے پر سہاگہ گاؤں کے امام مسجد نے کیا۔ وہ زینب کے شوہر کے کان بھرتا رہتا تھا۔ زینب کا کہنا ہے کہ وہ زینب کو بری نظر سے دیکھتا تھا۔

ان ہی دنوں کو کئی پیر صاحب کو ہلا میں وارد ہوا۔ وہ ہر مسئلے کے حل کے لیے تعویذ دیتا تھا۔ زینب چاہتی تھی کہ ساجد علی مولوی باقر کے تسلط سے آزادی حاصل کر لے سو وہ بھی پیر صاحب سے تعویذ لے آئی۔ پیر صاحب نے سختی سے منع کیا کہ اس بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہنا ورنہ عمل بیکار ہو جائے گا۔ مولوی باقر نے زینب کو پیر صاحب کے ڈیرے پر جاتے دیکھا تو اس کے شوہر سے شکایت کر دی۔ وہ شقی القلب بیوی سے اس بات کو بنیاد بنا کر خود ڈرا اور اس پر ہاتھ بھی اٹھایا۔

اس کے کچھ دن بعد ساجد علی کا چچا زاد بھائی ان کے گھر کے قریب سے گذرنا تو احمد یعنی زینب اور ساجد کے بیٹے کے رونے کی آواز سن کر گھر کے اندر آ گیا۔ وہ ابھی احمد کے متعلق استفسار کر رہا تھا کہ ساجد علی گھر آ گیا۔ اس نے زینب کو صفائی کا موقع دے بغیر اسے مارنا شروع کر دیا۔ اس کے کپڑے پھاڑ دیے اور پھر محلے والوں کے سامنے اس پر کلبھاری کے وار کر کے قتل کرنے لگا تھا مگر یہ وہاں سے بھاگ نکلی اور پھر یہ ہم تک پہنچ گئی۔

یہ باتیں ہم نے اپنے ذرائع سے معلوم کی ہیں۔ یعنی صرف زینب کے کہنے کا بھروسہ نہیں کیا۔ باقی سب تو آپ کے سامنے ہے سر! زینب کا کہنا کہ احمد کمر میں چوٹ لگ گئی تھی سوائے ساجد علی کے کزن کو گھر بلانا پڑا۔ آپ خود بتائیے سر! کیا اس زمانے میں عورت کو یہ حق بھی نہیں کہ وہ مصیبت میں کسی سے مدد لے سکے۔“

وجاہت نے وہ تمام تفصیلات ان کے گوش گزار کر دیں جو اتنے دنوں میں اس نے جمع کی تھیں۔ اس نے ان عورتوں کے ویوز بھی اکٹھے کیے تھے جو اس واقعہ کے روز وہاں موجود تھیں۔

”یہ سب سن کر کس قدر افسوس ناک لگتا ہے۔“ فردوس صاحب تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔ کمرے میں کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر مس شیریں نے اس خاموشی کو توڑا۔

”سر! آپ ذرا فنڈز کی سالانہ رپورٹ بھی چیک کر لیں پھر آپ کو خوشخبرہ جیلانی صاحبہ کو فون کرنا ہے۔ ہم چاہتے ہیں زینب کے خلع کے سلسلے میں ان ہی کی خدمات حاصل کی جائیں۔“

اوہ یس..... شیویر..... مسز خوشخبرہ جیلانی بہت ناگس ہیں۔ وہ ضرور زینب کی مدد کریں گی۔ ویسے کیا زینب خلع لینا بھی چاہتی ہے یا دباؤ میں آ کر ایسا کر رہی ہے۔ فردوس کریم نے ایک اور سوال اٹھایا۔

”دباؤ کیسا.....! وہ دل و جان سے تیار ہے۔ ایسے شقی القلب ظالم انسان کے ساتھ کون گزارا کر سکتا ہے۔“ اسفند رحیم نے ذرا کی ذرا چڑ کر کہا۔

فردوس کریم چند لمبے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد مس شیریں کے ساتھ اکاؤنٹس سیکشن کی طرف چلا گیا۔

”ضمویا! تم ذرا اس عورت پر زیادہ محنت کرو اس کا بولنے کا اسٹائل تھوڑا امپروو کرو اور سب سے پہلے

اس کو بہتر قسم کے کپڑے اور جوتے دلاؤ۔ اس کی ظاہری شخصیت کو نکھارنا بے حد ضروری ہے تاکہ انگلش اخبارات میں جب اس کی رنگین تصاویر شائع ہوں تو وہ ایک شاندار خاتون دکھائی دے۔“ اسفند نے صوفے پر نیم دروازہ ہوتے ہوئے اسے ہدایت کی۔

اس کے بعد بہت سی ایسی NGOs جن کا لحاق یورپین یا امریکن NGOs سے تھا نے وقتاً فوقتاً ان لوگوں سے رابطے کیے تھے۔

ملک کے کئی سماجی رہنماؤں نے بھی فون یا ملاقات کے ذریعے نذیب کو مدد کا یقین دلایا تھا۔ وہ ہی عام سی عورت جو شوہر کے ظلم سے عاجز ہو کر گھر سے بھاگی تھی۔ یکدم اس طرح لائٹ میں آئی تھی کہ خود اس کو اپنا آپ پہچاننا مشکل لگنے لگا تھا۔ اس کے پاؤں کے ناخن سے لے کر اس کے بالوں کے رنگ تک ہر چیز تبدیل کر دی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

”نذیب ظلم کے خلاف آواز اٹھائے گی۔“ ظہور بھائی نے عشاء کی طرف دیکھتے ہوئے شرارتی انداز میں کسی میگزین میں چھپنے والے آرٹیکل کی سرخی کا حوالہ دیا۔

نذیب نامی ایک مظلوم عورت کا قصہ اکثر میگزین میں کورا سٹوری کے طور پر لگنے بہت سے اخبارات میں کثرت سے چھپنے کے باعث ہر خاص و عام کے لیے موضوع بحث بن چکا تھا۔

بہت عرصہ بعد وہ سب لوگ اس طرح سے اکٹھے ہوئے تھے۔ عشاء کی سب سے چھوٹی نند کی معنی تھی۔ باقی سب لوگ راولپنڈی اور اسلام آباد میں ہی رہائش پذیر تھے اور ہر ایک اینڈ پر ملنا ملنا ہو جاتا تھا۔ جبکہ عشاء اور عادل مہینوں بعد ہی آپاتے تھے اسی لیے ان کو پروڈیوکل بھی زیادہ ملتا تھا۔ معنی کی رسم سے فراغت پا کر اب سب لاؤنج میں چائے کافی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے باتوں میں مصروف تھے۔

”نذیب علی سے تمہاری ملاقات بھی ہوگی ڈالائیو دیکھنے میں کسی گنتی ہیں؟“ صبا آپنی نے عشاء سے استفسار کیا وہ اس کی بڑی نند تھی۔

”ملاقات.....؟ محترمہ لہجہ اور ڈنر بھی نذیب علی صاحبہ کے ساتھ کرتی ہیں۔“ عادل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

عشاء کو اس کے انداز میں عجب سا طر محسوس ہوا۔ سسرال میں اس کی ہمیشہ ہی خوب عزت ہوتی تھی۔ معنی سے پہلے بھی ایک اچھی اسٹوڈنٹ ہونے کی وجہ سے اس کے ماموں جو اس کے سر بھی تھے اس کو خوب سراہا کرتے تھے۔ عادل کی بات پر اس نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔

”بتاؤ نذیب کیسی ہے؟“ میرا مطلب اخبارات میں جتنی کیوٹ اور معصوم لگتی ہے۔ حقیقت میں بھی ایسی ہی ہے؟“ صبا آپنی کو اس ذکر سے بہت دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

”جی بالکل..... بہت معصوم سی ہے..... باتیں بھی بہت سادہ انداز میں کرتی ہے۔ جب گاؤں سے آئی تھی تب تو بہت بے وقوف سی لگتی تھی۔ کسی بھی چیز کے بارے میں کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ گھڑی سے ٹائم

دیکھنا بھی نہیں آتا تھا اور اب تو اس قدر پاش ہو گئی ہے کہ سب سیکھ گئی ہے۔“ عشاء کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ عادل ہنسنے لگا۔ ظہور بھائی بھی مسکرا رہے تھے۔ ظہور بھائی صبا آپنی کے شوہر اور ان کی خالہ کے بیٹے تھے۔

”یعنی اب اسے گھڑی پر ٹائم دیکھنا آ گیا ہے۔ بہت خوب یہ سب سیکھتا تو بہت ضروری تھا۔ انسان کو گھڑی پر ٹائم دیکھنے کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے۔“ عادل نے ایک اور ٹکڑا لگایا اور ساتھ ہی چائے کا کپ لیوں سے لگا لیا۔

عشاء اس کے طنز پر جل بھن گئی۔

”اس قدر فضول بات آپ ہی کر سکتے تھے عادل! ساری دنیا ایک عورت کی ہمدردی میں پاگل ہوئی جا رہی ہے اور آپ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ درست فرما رہے ہیں، آپ، عورت کو کپڑے دھونے برتن اٹھانے لگانے اور بالآخر ایک دن گل سڑ کر مرجانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔“ وہ اتنے تلخ لہجے میں بولی کہ سب خاموش ہو کر جیرانی سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔

اگر یہی بات وہ مذاق میں کہتی تو شاید کسی کو محسوس بھی نہ ہوتا مگر اب سب کسی قدر محتاط ہو گئے تھے۔ عادل کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

”تکلیف کو کمرے سے باہر نکالو بھئی! اس سے کبوتر مانا اور مانا کل پر موقوف کرے اور اب یہاں سب کے درمیان آ کر بیٹھے۔ ہم نے تو کل چلے جانا ہے پھر فون پر کہے گی ظہور بھائی! میرے پاس تو بیٹھے ہی نہیں آپ۔“ ظہور بھائی نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے فوراً بات پلٹ دی جبکہ صبا آپنی بھی ان کی بات پر عمل کرنے کے لیے فوراً اٹھیں۔

”ہاں ٹھیک ہے میں اسے لے کر آتی ہوں۔ اس کی ساس نے پانچ ہزار روپے تحفہ دے دیے ہیں۔ ہم سب کو آٹس کریم کھلوانا اس کا فرض ہے۔“ صبا آپنی کے اٹھتے ہی عشاء بھی ”ایلیسکیو زی“ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

”عشاء بھابھی بہت بدل گئی ہے نا؟“ عادل سے کچھ فاصلے پر بیٹھے طلحہ نے نہایت دھیمی آواز میں اپنے ساتھ بیٹھے ارحم سے کہا۔

عادل جو پہلے ہی اندر سے سنگ رہا تھا اس کی بات پر مگہری سانس بھر کر رہ گیا۔ طلحہ نے عشاء کے رویے کے متعلق جو شکایت کی تھی وہی شکایت تو عادل کو بھی اس سے تھی مگر وہ کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا جبکہ عشاء لگنے لگا کہ عادل میل شاؤنزم کا شکار ہے اور اس کی کامیابیوں سے جلیس ہے۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہونے لگے تھے۔ وہی پہلے ہی اتن انڈر سٹینڈنگ کی وجہ سے آئیڈیل پہل کہلاتا تھا۔ یکا یک نجبانے اس پہل کو کس کی نظر لگتی جا رہی تھی۔ اس روز تو وہ ہو گئی۔ نیل اور فاطمہ بھابھی کی ویڈیو کی اپنی دوسری تھی۔ عادل پہلے ان لوگوں کی اپنی دوسری پر ریسٹورنٹ میں ڈیر دیا کرتا تھا جبکہ اس بار عشاء لاہور میں تھی سو اس نے ان دونوں کو گھر پر انوائٹ کر لیا کیونکہ فاطمہ بھابھی عوامی

مقامات پر زیادہ شوق سے نہیں جاتی تھیں۔

”عادل! آج کل کوئی کسی کو گھر پر ذریعہ پر انوائسٹ نہیں کرتا۔ اب وہ پچھلا زمانہ نہیں رہا۔ آپ تو نچانے کیڈن! اس قدر کنٹرولڈ ہوتے جا رہے ہیں۔ کتنا برا لگے گا جب میں ملازمہ کی طرح ان کے آگے برتن رکھوں گی۔“ عشاء نے سنتے ہی سب سے پہلا اعتراض کیا تھا۔ عادل کا موڈ یکدم ہی بگڑ گیا۔

”عشاء تمہارے اتنے نخرے کیوں ہو گئے ہیں۔ تم نے گھر کے کام کاج کو ملازمین کا کام کب سے سمجھنا شروع کر دیا اور ملازمین کیا انسان نہیں ہوتے۔ تم جو ہر وقت مجھے کنٹرولڈ ہونے کا طعنہ دیتی ہو میں تمہیں کیا طعنہ دوں؟ تمہیں نہیں لگتا کہ تمہارا داغ آج کل ساتویں آسمان پر رہنے لگا تھا۔ تمہاری اور میری امی تمہاری اور میری بہنیں یہی کام کرتی آئی ہیں۔ کھانا پکانا سرو کرنا اتنا برا کام نہیں جتنا تم سمجھتی ہو۔ ہماری کلاس کی عورتیں اس کام کو برا نہیں سمجھتیں۔“ وہ غلگی سے بولا۔

”آپ کی کلاس کی عورتیں کچھ بھی نہیں سمجھتیں۔ کیونکہ آپ جیسے مرد انہیں سیل بند پیکٹ میں رکھ کر ان کی ساری عقل چھین لیتے ہیں۔ اور جب عقل ہی نہیں ہوگی تو کوئی سوچے سمجھے گا کیا میں ایسی نہیں ہوں۔ کم از کم میں ایسی کبھی نہیں ہو سکتی۔ مجھے اللہ نے عقل دی ہے اور اچھے برے کی تیز بھی۔ مجھے پتا ہے کہ میرے کیا حقوق ہیں اور.....“ عشاء اس سے زیادہ تلخ لہجے میں بول رہی تھی۔

”اسی چیز نے تو تمہارا داغ خراب کیا ہے۔ یہ جس اسٹوڈنٹ جگہ پر تم جاب کر رہی ہو یہ سارے احمقانہ خیالات اسی جاب کا نتیجہ ہیں۔ حد ہوگئی یعنی کہ سب حقوق تو بخوبی ازبر ہیں مگر جو فرائض ہیں وہ بھول گئے ہیں۔ یہ جس ”فلاح“ کا نعرہ تم ہر وقت لگاتی ہوتی تھیں تمہاری ”فلاح“ سے دور کر دے گا۔

یار! صرف اوچی آواز میں چلانے سے حقوق ملا کرتے تو ہمارے اس معاشرے میں سب سے زیادہ حقوق کدھے کو ملتے مگر افسوس..... چہ..... چہ..... ایسا ہوتا نہیں ہے ایسا ہو ہی نہیں سکتا میری ذہین و فطین زوجہ۔“

عادل کے چہرے پر ابھی بھی استہزاء سیہ مسکراہٹ تھی مگر لہجہ کی تلخی کو اس نے جان بوجھ کر کم کر لیا کہ بہر حال آج کا ڈزینسل نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”تم کچھ بھی مت کرنا فقط ایک اچھا سا ڈریس پہن کر ڈرائنگ روم میں ان کے ساتھ بیٹھ جانا۔ میں ”وینچ“ سے کھانا لاؤں گا نیل لگاؤں گا تم ان کو ڈرائنگ روم سے ڈرائنگ روم میں لے آنا۔ بالوں کو رات تک روک لیٹا وہ کچن صاف کر دے گی۔ اتنا تو کر سکتی ہوتا۔ انٹرنیٹ ایجنسی کی ایک لکھی باشعور خاتون یہ کام تو کر سکتی ہے نا! جھینک یو سوچ اب آؤ میو ڈسکس کر لیں۔“

عشاء کو خاموش دیکھ کر اس نے مصلحت سے کام لے کر بات ختم کر دی۔ اس وقت تو دونوں خاموش ہو گئے۔ کھانا باہر سے آیا اور عشاء ڈریس اپ ہو کر مہمانوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی۔ شارٹ شرٹ اور ٹراؤزر کے ساتھ عشاء عادل کاٹن کے سادہ انداز میں سلے کڑھائی والے شلواریں اور سلیپے سے اوڑھے گئے دوپٹے میں فاطمہ اور نیل کے سامنے بیٹھی ماڈرن ایجنسی کی کوئی ماڈل لگ رہی تھی۔

عادل کی خواہش تھی کہ عشاء آج ذرا سادہ ڈریسنگ کر لیتی مگر اس نے اسے ٹوکا نہیں تھا مبادا مزید بحث ہونے لگتی۔ نیل اور عادل بہت گہرے دوست تھے۔ نیل کی فیملی بہت روایتی واقع ہوئی تھی۔ اور فاطمہ بھابی کے اوپر بھی مذہب کی گہری چھاپ تھی۔ حالانکہ وہ نو مسلم تھیں اور نیل سے شادی سے پہلے انہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔

”مرد اور عورت برابر ہیں وہ خواہواہ اپنے آپ کو برتر سمجھتے ہیں۔“ کھانا کھانے کے دوران نیل کی کسی بات پر عشاء نے کہا تھا۔

”میں نے قرآن میں پڑھا ہے کہ مرد کو عورت پر برتری حاصل ہے اور ان پر نان نفقے کی ذمہ داری ہے۔“ فاطمہ بھابی نے فرائیزڈ راکس سے بھرا پیچ منہ میں رکھتے ہوئے اپنے برٹش لیجے کے ساتھ مگر اردو زبان میں بولی تھی۔

”مرد اگر عورت کو فائدہ نفعی سپورٹ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ برتر اور عورت کمتر ہے۔“ عشاء نخوت سے ناک چڑھا کر بولی۔

اس کی اوچی آواز پر فاطمہ بھابی نے اس کی جانب دیکھا پھر اپنی پلیٹ پر جھک کر بولیں۔

”ہاں..... پتا نہیں..... آپ ٹھیک کہہ رہی ہوں گی..... ان فیکٹ میں نے قرآن پاک کا ترجمہ پڑھا تھا۔“

”فاطمہ بھابی! یہ ساگ لیجئے نا۔ نیل بتا رہا تھا آپ کو ساگ پسند ہے۔“ عادل نے فوراً ساگ کا باؤل ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔

”اوہ شیور..... آئی لوڈس گرین ڈش۔“ انہوں نے فوراً باؤل لے کر ساگ فرائیزڈ راکس کے اوپر اٹھایا۔

”میری بیوی بہت سویت ہے۔ ایک بار میں نے کہا تھا کہ مجھے سبز رنگ کی ساری سبزیاں پسند ہیں۔ تب سے پاک ساگ بہت شوق سے کھاتی ہے۔ کہتی ہے اسلام یہی سکھاتا ہے کہ شوہر کے ساتھ تابعداری کی حد تک وفادار رہو۔ یہ وفاداری اور محبت کو ایک ہی معنی پہناتی ہے۔“

عمیل میز پر جھک کر عادل کی طرف دیکھ کر بچانی میں بولا۔ عادل مسکرا کر رہ گیا۔ نیل نے مشی مکن یونیورسٹی سے MS کیا تھا۔ تب ہی اس کی کلاس فیلو کو اس سے محبت ہوگئی تھی۔ اور یہ محبت شادی کے بعد مزید بڑھ گئی تھی۔

فاطمہ بھابی نے نیل کے لیے اپنا کیرئیر بھی پس پشت ڈال دیا تھا۔ پاکستان آ کر وہ بہت گھریلو قسم کی زندگی گزار رہی تھیں اور اسی میں خوش تھیں۔

”عشاء! آپ کیا کہہ رہی تھیں؟“ فاطمہ بھابی ابھی تک وہیں انکی ہوئی تھیں۔ سوانہوں نے وہی موضوع چھیڑ دیا۔ حالانکہ عادل اسی موضوع سے فرار حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔

”مجھے کیا کہنا ہے فقط یہی کہہ رہی تھی کہ اب زمانہ تبدیل ہو چکا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ آدی کو

خدا بنا کر پوجا جائے۔ یہ مخلوق اس قابل نہیں ہے۔ یہ آدمی عورت کو جانور سمجھتے ہیں جبکہ جانور یہ خود ہیں۔ انہیں برتر کہہ کہہ کر ہم نے ان لوگوں کے دماغ خراب کیے ہیں۔ میرا خیال ہے اب اس اولڈ فیشن تھیوری کو ختم کر دیا جاتا ہے۔“

چکن پیس کو کانٹے کی مدد سے کاٹ کر کھاتے ہوئے عشاء کے منہ سے لفظ نہیں گویا شعلے نکل رہے تھے۔ عادل نے اسے گھور کر دیکھا۔ یہ وہ عشاء نہیں تھی صرف چاہہ ایک جگہ جاب کرنے سے وہ عشاء نہیں رہی تھی۔ کچھ اور بن چکی تھی۔ اس کی بات پر فاطمہ بھابھی نے چچہ پلیٹ میں رکھ کر اس کی جانب دیکھنا شروع کر دیا۔

”آئی ایم سوری عیشہ!“ وہ ”عشاء“ کو عیشہ کہا کرتی تھیں۔ ”میں زیادہ تو نہیں جانتی بٹ جتنا بھی میں نے پڑھا ہے..... قرآن اور حدیث سے جو سیکھا ہے وہ یہ سب نہیں ہے۔ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ عورت کا بہت رتبہ ہے جیسے مرد کی ریسپیکٹ لازم ہے ویسے ہی عورت کی ریسپیکٹ کرنا مرد پر لازم ہے۔ معاشرہ اسی طرح متوازن ہوتا ہے مگر اسلام یہ نہیں کہتا ہے کہ عورت کی ذمہ داریاں مرد کی ذمہ داریوں سے مختلف ہیں۔“

عادل اور نیل بھی ان دونوں خواتین کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

”ساری دنیا میں یہی ہوتا ہے جو زیادہ ذمہ داری بھجاتا ہے اس کو زیادہ Regard ملتا ہے۔ مرد کی ذمہ داریاں عورت سے تھوڑی سی زیادہ ہیں۔ اسی لیے مرد کو عورت سے برتر کہا گیا ہے کہ وہ زیادہ ذمہ داری بھجاتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ مرد عورتوں پر قوام ہیں مگر یہ برتری فخر کے زمرے میں نہیں آتی اور میں نے اپنے گھر میں اور اوراد گرایا دیکھا بھی نہیں ہے۔“

نیل میری ریسپیکٹ کرتے ہیں۔ اپنے ہر فیصلے میں مجھے شریک کرتے ہیں۔ میری مرضی کو اپنی مرضی پر مقدم خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح انکل اور شرنیل بھی مجھے بہت اہمیت دیتے ہیں۔ مجھے تو کبھی یہ نیل (محسوس) نہیں ہوا کہ ہمارے معاشرے میں مرد عورت کو دبا کر رکھتے ہیں۔ میری دوست سسٹران (لانا) ہیں۔ ان کے گھروں میں بھی سب مرد بہت سنبھے ہوئے ہیں۔ اسلامی ویلیوز (انڈر) نے ان کو سکھایا ہے کہ عورت کے ساتھ کس طرح ڈیل کرتے ہیں سو وہ ہم سب خواتین کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں۔“

ان کے اس لمبے چوڑے اظہار خیال نے عشاء کو اچھا خاصا تمللانے پر مجبور کر دیا تھا۔ بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”آپ نے بات کا رخ کسی اور طرف موڑ دیا ہے میں ایک عام بات کر رہی تھی۔ ہمارے معاشرے میں اسی طرح ہوتا ہے۔“ وہ اس سے زیادہ کہہ نہیں پائی

”فلاح“ کے آفس میں بیٹھ کر اظہار خیال کرنا ایک الگ بات تھی کیونکہ وہاں کوئی اس قسم کی باتوں سے اختلاف نہیں کرتا تھا۔ وہاں تقریباً سب لوگ ایک ہی سوچ کے مالک تھے۔

”عیشہ بھابھی! آپ..... نارمل نہیں ہیں۔ آئی ایم سوری۔ میرا مطلب ہے ایسی باتیں کوئی نارمل دماغ نہیں سوچتا۔ یہ تو بنارمل خیالات ہیں۔ میں تو ایسے نہیں سوچتی۔“ فاطمہ نے بہت جھجکتے ہوئے کہا۔

”بہت خوب یعنی آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ یہ جواستے سارے لوگ اس قسم کے آئیڈیاز رکھتے ہیں کیا وہ سب بنارمل ہیں؟ کیا وہ نارمل نہیں ہیں؟“ عشاء استہزائیہ مسکراہٹ لیوں پر سجاتے ہوئے بولی۔

”جی ہاں۔“ فاطمہ نے وہ ٹوک جواب دیا تھا۔

”حقوق تو حقوق ہوتے ہیں ان میں مرد عورت کی تخصیص کہاں سے آگئی۔ جب ہم بچوں کے حقوق کی بات کرتے ہیں تب تو ہم یہ نہیں کہتے کہ بچے کے الگ حقوق ہیں اور بچی کے الگ حقوق ہیں۔ یا جب ہم بوڑھے لوگوں کے حقوق کو الگ الگ خانے میں نہیں رکھتے عیشہ! میں نے زندگی کا بڑا حصہ امریکہ میں گزارا ہے۔ ظاہر ہے میری پرورش اسی ماحول میں ہوئی۔ میں نے اپنی زندگی کے پچیس سالوں میں کبھی وہاں کسی کو ایسی باتیں کرتے نہیں سنا۔ یہ تو یہاں پاکستان میں ہی ہوتا ہے۔“

ایسا لگتا ہے ایک بنارمل سوچ یہاں کی خواتین میں پیدا کی جا رہی ہے اور معاف کیجئے گا صرف کم عقل خواتین ان باتوں میں آ رہی ہیں۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں یورپ میں ”حقوق نسواں“ کی بے شمار تحریکیں اٹھیں۔

نتیجتاً آج کا یورپ معرض وجود میں آیا۔ امریکہ پر بھی اس کے اثرات ہیں۔ یہ انتہائی غیر فطری ہے۔ اسی قسم کی غیر فطری معاشرہ ہمارے یہاں تشکیل دینے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ یہ مسائل نہیں ہیں کہ کسی بہن کا بھائی اسے اس کی مرضی کے کپڑے نہیں پہننے دیتا یا کسی بچی کا باپ اسے گھر سے نکلنے سے پہلے دوپٹہ اوڑھنے کی تلقین کرتا ہے اور کسی بیوی کا شوہر اسے کچھ لوگوں سے ملنے سے روکتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بہت مختلف قسم مسائل ہیں جن کا ہمیں سامنا ہے۔ ہمارے اہم مسائل کو ثانوی قرار دے کر ہمیں غیر ضروری اور غیر صحت مندانہ سوچ میں الجھایا جا رہا ہے۔

میں یہ نہیں کہتی کہ عورت کو مسائل کا سامنا نہیں یقیناً ہے مگر یہ مسائل نہیں ہیں صرف اچھی سوچ کے فقدان کے باعث پیدا ہونے والی کیا صورت حال ہیں۔ رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ ایک ماں یعنی ایک عورت اپنے بیٹے کی پرورش اسلامی اصولوں کے مطابق کرنا شروع کر دے تو ایسی صورت حال سے بچا جاسکتا ہے۔ مگر آج کی عورت کم فہمی و کم عقلی کی بنا پر ایسے مشاغل میں خود کو الجھانا زیادہ پسند کرتی ہے جو آؤٹ ڈور ہوتے ہیں جبکہ بچے کی پرورش جیسی مقدس ذمہ داری ان ڈور ہے۔

معاشرہ خراب ہو گا تو اس کا الزام معاشرے کے افراد کی تربیت کرنے والی ہستیوں پر ہی ہو گا۔ اب آپ خود سمجھ دار ہیں سمجھ سکتی ہیں کہ معاشرہ اس قدر میگز کیوں رہا ہے۔ پورے معاشرے کی بات کیا کرنا آپ ایک گھر کی مثال لے لیجئے۔ باپ کما کر نہیں لائے گا تو گھر میں معاشی مسائل جنم لیں گے۔ جب کہ اگر عورت اپنی ذمہ داریاں نبھانے سے انکار کر دے تو ذہنی جسمانی نفسیاتی روحانی مسائل جنم لیں گے۔ کیا چیز زیادہ نقصان کا باعث بنے گی یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں۔“ فاطمہ بھابھی چند لمحے کو رکیں۔

عادل تو عادل خود نیل بھی حیران ہو کر فاطمہ کی شکل دیکھنے لگا۔ مجھ سے زیادہ ”لبرل“ کوئی نہیں۔ ”لبرل“ ہوتا کیا ہے؟ براڈ مائنڈ ہوتا کیا ہے۔ ہم ان لفظوں کا بہت غلط استعمال کرتے ہیں۔ ان لفظوں میں

بہت وسعت ہے۔ جس انسان کا ذہن وسیع ہے وہی لبرل ہے وہی براڈ مائنڈ ڈ ہے۔ جانتی ہیں آپ کا پرابلم کیا ہے؟ فطرت سے بغاوت کر رہی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ مرد کو اللہ نے برتر بنا دیا تو آپ اسے کمتر قرار دیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس فضول بحث سے نکل کر کام کیا جائے۔ فرائض کو چھوڑ لیا جائے تو حقوق کے لیے کبھی جنگ نہیں لڑنا پڑتی۔

روٹی، تعلیم، روزگار رہائش اس قسم کے مسائل کے حل تلاش کرنے کے لیے بحث کی جائے تو کوئی فائدہ بھی ہو۔ افریقہ کے ممالک میں ہڈل ایسٹ میں، آسٹریلیا میں، یو ایس اے اور یو کے میں..... ایسی باتیں زیر بحث نہیں لائی جاتیں کیونکہ وہ لوگ پراپر مسائل کو ٹارگٹ بناتے ہیں جبکہ ہم مرد عورت کی لڑائی میں اپنی توانائی برباد کر دیتے ہیں۔ ہم ایسی باتیں سوچنے کے بجائے صرف یہ سوچ لیں کہ جو خدا نے کہا وہ بہتر ہے تو یقین کیجئے ہمیں ایسے اسٹوڈ مسائل میں الجھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

فاطمہ بھابھی اب پانی پی رہی تھیں۔ عشاء کے چہرے کا رنگ سرخ ہو چلا تھا۔ نبیل نے فاطمہ کو روکنے کے لیے آنکھوں سے اشارہ کرنا چاہا تو عادل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ باتیں وہ خود عشاء سے کرنا چاہتا تھا۔ مگر اب ایک عورت کے منہ سے یہ سب سن کر اسے زیادہ اچھا لگا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عشاء کے ذہن سے یہ خناس نکل جائے۔

”میں نے اخبار میں اس عورت کے متعلق پڑھا۔ زینب..... یہی نام تھا نا اس کا۔ مجھے بہت دکھ ہوا اس کے بارے میں پڑھ کر۔ مجھے بھی اس کے ساتھ ہمدردی ہے لیکن میرے ذہن میں ایک سوال اٹھتا ہے کہ اس عورت نے شوہر کی مرضی کے خلاف ایک نامحرم کو اپنی خلوت میں آنے کی اجازت کیوں دی جبکہ اللہ تعالیٰ ایسی باتوں کو سخت ناپسند فرماتا ہے۔“

ایک حدیث شریف میں بھی میں نے یہ پڑھا تھا جس کا مفہوم یہی تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود کسی نے بھی اس عورت کو یہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی بی بی غلطی میں پہل تم نے کی ہے۔ اس کے شوہر نے بھی اگر اس کو قتل کرنے کی کوشش کی تو غلطی کی مگر آپ کی NGO نے اس ایڈووکیٹ کو اس قدر میڈیا کوریج دلوائی کہ اب چاہتے ہوئے بھی اس عورت کو سمجھایا نہیں جاسکتا۔ وہ کبھی اپنے شوہر کے ساتھ مصالحت پر راضی نہیں ہوگی۔ حالانکہ سب سے پہلے ان کے درمیان مصالحت کی کوشش ہی کی جانی چاہیے تھی۔

اب کیا ہوگا اس عورت کو کیا کریں گے آپ؟ ہر ایک کو تو امریکین اور کینیڈین ایمپیس ویزا دینے سے رہی۔ آپ لوگوں نے اس عورت کو ایک ایسی دنیا میں لاکھڑا کیا ہے۔ جہاں بہت چکا چوند ہے۔ یہ عورت اب اپنی دنیا میں واپس چلی بھی گئی تو کیا یہ ان حالات میں جی پائے گی جن میں پہلے جیتی آئی تھی۔

آپ کی NGO نے اس عورت کا فہم استعمال کیا ہے تاکہ آپ بھی اپنی NGO کے لیے حکومت سے زیادہ سے زیادہ گرانٹ حاصل کر سکیں۔ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ حکومت جب کسی ایک ضرورت مند کی دادرسی کرتی ہے تو ایسے جھوٹے پتے مزید کمیز سامنے آ جاتے ہیں۔ میں نے پبلک ایڈمنسٹریشن میں ڈگری لی ہے۔ میں نے اس فیلڈ میں ریسرچ ورک کی حد تک کام کیا ہے مگر وہاں امریکہ میں ایسا تو کبھی نہیں ہوتا۔ وہاں

ضرورت مند کی مدد اس طرح سے نہیں کی جاتی کہ پہلے اس کا تماشا بنا دیا جائے اور پھر اس کو مدد دی جائے لیکن اس کے باوجود وہ معاشرہ بھی صحت مند معاشرہ نہیں کہلا سکتا۔

وہاں جس قسم کی آلائش پائی جاتی ہیں یہاں کی عورتیں سن لیں تو پھر ایسی باتوں پر کبھی احتجاج نہ کریں کہ ان کے مردان کی مرغی کی طرح حفاظت کرتے ہیں اور ان کی صلاحیتوں کو دباتے ہیں۔“ فاطمہ بھابھی نے بات ختم کرتے ہوئے دائیں ہاتھ کی طرف پڑے لبالب بھرے پانی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

چند لمحے سب خاموشی سے اپنی اپنی پلیٹ کی جانب تکتے رہے پھر عشاء نے خاموشی توڑ دی تھی۔ ”آپ تو بہت اچھی تقریر کر سکتی ہیں۔ کسی فورم میں اظہار خیال کرتیں تو یقیناً بہت سٹائش ملتی اب تو خیر صرف یہ دونوں مرد حضرات ہی سراہ سکتے ہیں کیونکہ آپ ان کی حمایت میں ہی بولی ہیں۔ مجھے تو آپ کی باتوں میں کوئی صداقت نظر نہیں آتی میں سب گلیم کر سکتی ہوں مگر..... کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ اس کا لہجہ سخت نہیں تھا مگر پھر بھی اس کے چہرے سے اس کی غصگی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

فاطمہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”مائی گاڈ..... میں بہت احمق ہوں..... آپ کو شاید برا لگا..... میں اپنی دھن میں بولتی چلی گئی۔ مجھے خیال کرنا چاہیے تھا..... ان فیکٹ میں نے پڑھا تھا کہ ایک مسلمان اگر کوئی اچھی بات سیکھے تو اسے دوسرے مسلمان سے شیئر کرنا چاہیے اور حق بات کہنے سے ڈر نہ نہیں چاہیے۔“

”ارے نہیں..... نو پرابلم..... ہم سب کا اپنا اپنا پوائنٹ آف ویو ہوتا ہے۔ میں نے مائنڈ نہیں کیا..... آپ پلیز یہ کس سبزی لیجئے..... بہت اچھی ہے۔“ عشاء نے چہرے کے تاثرات بحال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

کھانا بہر حال کھالیا گیا۔ کھانے کے بعد آئس کریم بھی تھی۔ فاطمہ کے عشاء کی نماز پڑھنے پر بھی عشاء نے ذرا کی ذرا ناک چڑھائی۔

”مجھے ایسے نئے نئے مسلمانوں سے سخت نفرت ہے۔ ہم تو بچپن سے مسلمان ہیں۔ انہوں نے ابھی اسلام قبول کیا ہے تب ہی اس قسم کی باتیں کرتی ہیں۔ ہر بات میں ٹوکنا تو جیسے ان کی عادت ہے۔ جب بھی فراغت ملتی ہے دو پڑاؤ ڈھ کر خطبہ دینے لگتی ہیں۔ اونہہ..... یہ وہی فاطمہ صاحبہ ہیں جو ہاف شرٹ اور ٹائٹس میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھی رہتی تھیں اور ان کی ساس دیکھ دیکھ کر کڑھا کرتی تھیں کہ ان کے ہونہار بیٹے کو چڑیل نے پھنسا لیا۔“

رات کو بیڈ روم میں ہاتھوں پر کریم کا مساج کرتے ہوئے اس نے کھولتے ہوئے عادل سے کہا۔ بظاہر عادل ٹی وی دیکھنے میں مگن تھا مگر اس کے اندر بھی ایک عجب کشش چل رہی تھی۔ فاطمہ بھابھی کی لمبی چوڑی تقریر نے سوچ کے کتے دروا کر دیے تھے۔

”اور مزے کی بات سنئے۔“ عشاء نے اٹھتے ہوئے کہا۔ عادل نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سادہ سے حلیے میں کتنی اچھی لگ رہی تھی یہ کوئی اس سے پوچھتا۔ اس نے عشاء سے پہلے محبت کی

تھی اور بعد میں شادی..... شادی کے بعد بھی اس کی محبت میں کمی نہیں آئی تھی۔ مگر گزشتہ کچھ دنوں سے عشاء جس طرح بدلتی جا رہی تھی عادل کو اس کے رویے سے الجھن ہونے لگی تھی۔

”یہ فاطمہ بھابھی پاگل ہیں۔ چائے کپ میں اٹھ بیٹے ہوئے تھوڑی سی چائے چمک گئی۔ میں نے عادت کے مطابق کہا۔ فٹے منہ تمہارا عشاء! تو کہنے لگیں ایسے مت کہا کریں عیشہ! گناہ ہوتا ہے۔ آپ کا نام نماز کے نام پر ہے۔ آپ کو چاہیے ”عشاء“ کی بجائے خود کو ”عیشہ“ کہا کریں تاکہ اگر کبھی غلطی ہو جائے تو گناہ نہ ہو۔“

عشاء ہنسنے ہوئے کہہ رہی تھی۔ جبکہ عادل خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کہہ نہیں پایا کہ۔
”عشاء! پاگل تم ہو فاطمہ بھابھی نہیں۔“

☆ ☆ ☆

”عادل بھائی! مائنڈ مت کیجئے گا مگر مجھے لگتا ہے عیشہ بھابھی کے ساتھ کوئی نفسیاتی پرابلیم ہے۔ ان کے اندر مثبت سوچ کی سخت کمی ہے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے گھر کے مرد حضرات بہت سخت گیر تھے۔ یعنی ان کے بھائی یا خاں..... ہو سکتا ہے ان کی مدد نے ان کی پرورش میں کوتاہی کی ہو کہ ان کے اندر یہ غلا پیدا ہو گیا ہے۔ برامت مانے گا مگر آپ کا سخت رویہ بھی بن کر، اس قسم کی سوچ کا باعث ہو سکتا ہے۔ وہ کچھ عجیب عجیب باتیں کرتی ہیں۔ ایک نابل سوچ رکھنے والی خاتون ایسی گفتگو نہیں کر سکتی۔ میں نے اسی لیے آپ کو فون کیا تھا کہ آپ انہیں اس جھڑپ کو ہمارے گھر لائیے۔ آنٹی (نیل کی امی) ہر اسلامی مہینے کی پہلی پہلی جمعرات کو درس دیتی ہیں۔ عیشہ! بھابھی کی سوچ میں اگر ان کے درس سے کوئی تبدیلی آ سکے تو یقین کیجئے مجھے دلی خوشی ہوگی۔“ فاطمہ بھابھی کی بات اسے مزید پریشان کر گئی۔

”میں آپ کو کیسے بتاؤں فاطمہ بھابھی! کہ عشاء صاحبہ کے فادر اور بھائی کتنے اچھے انسان ہیں۔ اور ان کی امی کی فہم فراست کی تو ان کے دشمن بھی مثال دیتے ہیں۔“ عادل نے یہ بات خود سے کہی تھی۔ ایسی باتیں وہ کسی اور سے کیسے کہہ سکتا تھا۔ ویسے بھی اسے اپنے ذاتی معاملات کسی سے ڈسکس کرنے کی عادت نہیں تھی۔ اس کے سر میں شدید درد ہونے لگا تھا۔ نجانے کیوں آج کل سردرد زیادہ ہی رہنے لگا تھا۔ اس نے آفس سے آدھے دن کی چھٹی لی اور ڈاکٹر سجاد کے آئی کلینک جانے کے لیے آفس سے نکل آیا۔

”آئی سائٹ تو تمہاری بالکل ٹھیک ہے ایک دم پرفیکٹ۔“ ڈاکٹر سجاد نے مکمل چیک اپ کے بعد اس کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ عادل اس کے انداز پر ذرا کی ذرا مسکرایا۔

”تو پھر میرے سر میں اس قدر درد کیوں ہوتا ہے۔ یار!“ اس نے کپٹی کو اٹھایوں سے دباتے ہوئے سوال کیا۔

”بلڈ پریشر تو ہائی نہیں ہے؟“ ڈاکٹر نے اس کے بازو کے گرد پریشر کا فلیپ چڑھاتے ہوئے کہا۔
عادل نے ہونٹ بھیج کر لائیکس کا اظہار کیا۔

”سارا دن ہی سر میں درد رہتا ہے۔ رات کو بچنے پر سر رکھتا ہوں تو لگتا ہے جیسے کسی سخت چیز پر سر رکھ دیا ہو۔ حالانکہ نیند پوری لیتا ہوں۔ مگر نجانے کیوں صبح اٹھتا ہوں تو نالصر صرف سر بھاری ہو رہا ہوتا ہے۔ بلکہ آنکھیں بھی سو جی ہوئی ہوتی ہیں۔ میں نے سوچا شاید آئی سائٹ ویک ہے اسی لیے چیک اپ کے لیے تمہارے پاس آ گیا۔“ عادل دائیں آنکھ کو ملستے ہوئے مزید تفصیل سے بتا رہا تھا۔
سجاد سے اس کے پرانے مراسم تھے۔ سجاد اور عادل پڑھائی کے سلسلے میں کافی عرصہ ایک ہی کمرہ حشر کرتے رہے تھے۔

”آج کل آفس میں زیادہ کام ہے کیا.....؟ یا پھر خدا نخواستہ کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟“ سجاد نے اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”نہیں نہیں یار! شکر ہے اللہ کا، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ بس شاید موسم کی تبدیلی کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔ برسات کے دنوں میں میرا شہر خراب ہو ہی جایا کرتا ہے۔“ عادل فوراً بولا۔ سجاد نے اسے کڑی نگاہوں سے گھورا۔

”یہ برسات کے دن ہیں.....؟ بھائی میرے برسات ختم ہوئے بھی عرصہ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر سے کوئی بات نہیں چھپا سکتے تم..... سچ بتاؤ کوئی مالی پریشانی تو نہیں ہے نا؟“ سجاد نے دوستانہ استحقاق سے پوچھا۔
عادل اس کے انداز پر کھل کر مسکرایا۔

”نہیں یار! کہا نارب کی مہربانی ہے۔ میری جاب بہت شاندار ہے کم از کم تیری ڈاکٹری سے زیادہ روئے کالیتا ہوں۔ تو میری فکر مت کر بس مجھے اچھی سی میڈیسن لکھ دے تاکہ اس سردی سے نجات ملے۔“ عادل بے تکلفی سے بولا۔

”بلڈ پریشر بزرگو! ہائی ہے آپ کا۔ اس کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک ٹیبلٹ لکھ دیتا ہوں۔ اور ساتھ ملٹی وٹامنز دے رہا ہوں۔ ڈائٹ پر اپر اور ہاں چالیس سال کے بعد تم جیسے سب بڑھوں کو مارنگ واک شروع کر دینی چاہیے اور تم تو اکتالیس سال کے ہو چکے ہو سو میرا مشورہ ہے کہ واک کے لیے جایا کرو۔“
سجاد نے رائٹنگ پیڈ پر تیزی سے قلم چلاتے ہوئے مشورہ دیا۔ عادل کا تہقہ بے ساختہ تھا۔
”بائی داوے تم نے واک شروع کر دی۔ تم تو مجھ سے پہلے کی پیداوار ہو۔“ اس نے سجاد کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ مزاج خوشگوار ہو چلا تھا۔

”یہ بات تو تم مجھے پہلے بھی جتانے رہے ہو۔ یاد ہے جب ہم اکٹھے رہا کرتے تھے اور اکٹھے ہی بس اسٹاپ ٹیک جایا کرتے تھے۔ تب بھی تم اس گھٹیا فلیٹ کی میز حیاں چڑھتے ہوئے مجھ سے پہلے تھک جاتے اور بس اسٹاپ ٹیک پیدل چل کر جانے میں تمہارا شہر خراب ہو جاتا تھا۔ تم تب بھی یہ بات تسلیم نہیں کرتے تھے کہ تم مجھ سے عمر میں دس بارہ سال بڑے ہو۔ حالانکہ اس زمانے میں بھی ہر آنٹی ٹائپ خاتون تم پر عاشق ہو جایا کرتی تھی۔“ سجاد نے ماضی کی یاد دلاتے ہوئے اسے چھیڑا۔

”ہاں تو بچپن سے ہی کیوٹ تھا۔ پہلی نظر میں ہی سب کا دل موہ لیا کرتا تھا۔“ عادل کہاں چوکنے

والوں میں سے تھا۔ سجاد کی بات کے جواب میں اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یار! تم نے مجھے ماضی کی یاد دلا کر نوٹسٹیک کر دیا ہے۔ اب یہ لازم ہے کہ ہم ایک ساتھ چاسو یا کھانا وغیرہ کھائیں اور ان پرانے دنوں کی یاد تازہ کریں۔“ سجاد مسکراتے ہوئے بولا۔

”او کے شیور..... اب تو میرا بھی دل کر رہا ہے وہ سب پرانی باتیں یاد کرنے کو..... تم کلینک سے فارغ ہو جاؤ پھر چلتے ہیں کہیں۔“ عادل نے فوراً فیصلہ کیا۔

”چل ٹھیک ہے۔ بس یہ آخری مریض چیک کر لوں پھر چلتے ہیں اور ہاں مجھے ”میڈیم بتول“ والا قصہ بھی سنانا ہے۔ یاد ہے کتنے پاگل رہا کرتے تھے تم میڈیم بتول کے عشق میں۔“ سجاد نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ عادل کو پھر ہنسی آگئی۔

”پاگل میں رہا کرتا تھا مگر لفٹ وہ تمہیں کرواتی تھی۔“ سجاد بقیہ لگا کر ہنس پڑا۔

اسی اثناء میں وہ آخری مریض کے لیے بیل بجا چکا تھا۔ ایک کلکجے سے شلوار قمیص میں ملبوس دیہاتی خدوخال کا آدمی اندر داخل ہوا۔ اس نے گود میں ایک کمزور سا بچہ اٹھا رکھا تھا۔ عادل سجاد کی میز کے قریب پڑی کرسی سے اٹھ کر دوسری سمت میں پڑے صوفے پر جا بیٹھا۔ صوفے کے سامنے ایک چھوٹی سی میز پڑی تھی۔ جس پر کچھ اخبارات اور میگزینز وغیرہ تھے۔ عادل نے ایک اخبار اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیا۔

”تسی اپنے بچے نوں زہر دے کر مار دو۔“ سجاد کی تلخ آواز پر عادل نے اخبار سے نظریں ہٹا کر اس طرف دیکھا۔ چیک اپ اس آدمی کا نہیں بلکہ بچے کا ہو رہا تھا۔

”یعنی حد ہو گئی جہالت کی۔ بچے کی آنکھ تباہ کر کے رکھ دی ہے۔ اتنی بڑی نعمت ہے یہ بیٹائی آپ نے اسے مذاق سمجھا ہے۔ بانی داوے آپ کا ہی بچہ ہے یا کوئی دے گیا تھا۔“ سجاد لہجہ سخت تر ہوتا جا رہا تھا۔

وہ دیہاتی شخص منمننا کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر سجاد اس کی کوئی بات سننے پر تیار نہیں تھا۔

”آپ وہاں جا کر بیٹھ جائیے پلیز“ وہ شخص سجاد کے لہجے سے خائف ہو کر عادل کے قریب پڑی کرسی پر آ بیٹھا۔

عادل نے بچے کی جانب دیکھا۔ انتہائی کمزور گندمی سی رنگت والا بچہ گندے حلیے میں تھا۔ اس کے جسم پر جو کپڑے تھے وہ کبھی سفید رہے ہوں گے مگر اب وہ سرمئی رنگ کے ہو چکے تھے۔ اس کی ایک آنکھ بہت زیادہ سوجی ہوئی تھی بلکہ آنکھ کا حصہ باہر لوٹا ہوا لگ رہا تھا۔ آنکھ کے ارد گرد شاید پیپ رسنے کے باعث کچھ زرد سا مواد چپکا تھا۔

بچے کی آنکھ کی طرف دیکھ کر عجیب کراہیت کا احساس ہو رہا تھا۔ سجاد نے بیل بجا کر میل انٹینڈنٹ کو اندر بلایا اور بچے کی آنکھ کی مینڈیج کرنے لگا۔ عادل نے رسٹ وایج کی جانب دیکھا پھر ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر پاس پڑا میگزین اٹھا لیا۔ چند صفحات دیکھ کر ہی اس نے میگزین دوبارہ میز پر رکھ دیا۔ ”زنہب علی“ کا انٹرویو تصاویر کے ساتھ درمیانی صفحات پر جگمگا رہا تھا۔ عادل نے میگزین میز پر رکھا سامنے وہی صفحات نکل آئے تھے۔ وہ دیہاتی شخص آگے ہو کر میز کی طرف جھکتے ہوئے ان ہی صفحات کو غور سے دیکھنے لگا اور کافی دیر تک دیکھتا چلا گیا۔

عادل کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”یہ عالم شوق کا دیکھنا جائے۔“ اس نے دل ہی دل میں اس شخص کی محویت دیکھ کر سوچا۔ اسی اثناء میں اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔

بے دھیانی میں بھی اس کا دھیان اس شخص کی طرف تھا جبکہ بظاہر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ فون سننے میں مگن ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس شخص نے وہ میگزین ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس کے انداز کچھ عجیب سے تھے۔ عادل اپنی جگہ سے اٹھ کر دور کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا مگر وہ کچھ پھر بھی وہ اس دیہاتی کی طرف ہی رہا تھا۔

اس شخص نے پہلے سجاد کی طرف دیکھا پھر عادل کی طرف۔ عادل فوراً بارہ دیکھنے لگا۔ اس شخص نے وہ میگزین فولڈ کیا اور اپنی قمیص کے نیچے شلوار کے نیچے میں اڑس لیا۔ عادل کسی قدر حیران ہوا مگر اس نے اس شخص کو ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس شخص کو اندازہ بھی نہیں ہوا کہ موبائل فون پر بات کرتا ”صاحب“ اس کو دیکھ رہا ہے۔

”ساجد صاحب! ادھر تشریف لائیے۔“ ڈاکٹر سجاد نے طنزیہ انداز میں اس شخص کو مخاطب کیا۔ وہ کندھے پر پڑے میلے سے رومال سے چہرہ صاف کرتے ہوئے اس کی سمت بڑھ چلا گیا۔ عادل کو فون پر آفس کال کیا گیا تھا۔ وہ سجاد سے معذرت کر کے باہر آ گیا۔

کلینک کے باہر ایک بڑی سی لیبارٹری اور میڈیکل اسٹور تھا۔ اس کے بعد مختصر سا پارکنگ ایریا تھا۔ عادل اسی پارکنگ ایریا میں آ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے پھر ایک فون آ گیا۔ اس نے موبائل کان سے لگایا اور سننے لگا۔ اس دوران وہی شخص اپنے بچے کو گود میں لیے کلینک سے باہر نکلتا نظر آ رہا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ پارکنگ میں کھڑا ایک شخص اس کی جانب دیکھ رہا ہے۔ وہ شخص پارکنگ کی سمت آیا اور ایک کونے میں چلا گیا جہاں ایک گھڑی سی پڑی تھی۔ اس نے وہ گھڑی اٹھائی تو میگزین زمین پر گر پڑا۔

”یہ دیکھ احمد..... تیری ماں کی تصویر چھپی ہے..... دیکھ اس بد ذات عورت کو..... یہ اب تیری ماں نہیں رہی..... کسی کی ماں نہیں ہے۔“

وہ شخص میگزین نکال کر وہی تصاویر اپنے بچے کو دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ عادل ہکا بکا ہو کر اس شخص کو اور کبھی میگزین میں چھپی زنہب علی کی تصاویر کو دیکھ رہا تھا۔ موبائل ابھی بھی اس کے کان سے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ دن اس کی زندگی کا بدترین دن تھا۔ احمد کی طبیعت بہتر نہیں تھی۔ کھیتوں میں پہنچ کر بھی اس کا دھیان احمد کی طرف رہا۔ سورج سوانیزے پر تھا جب اسے مل چلائے سے فرصت لی۔ اس نے احمد کی طبیعت کے پیش نظر زنہب کو گڑھی کھیر پکانے کی خصوصی تاکید کی تھی۔ اس نے سوچا آج جلدی گھر چلا جائے تاکہ احمد کو بھی دیکھ کر تسلی کر لے اور کھانا بھی کھالے سو وہ منشی سے خصوصی اجازت لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔

راستے میں اس نے اپنے چچا زاد بھائی کو کلف گئے شلوار قمیص میں کہیں جاتے دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے تھا اس لیے اس کے کزن کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔ وہ سر جھٹک کر اپنے رستے پر چلا رہا۔ اس نے رفتار جان بوجھ کر کم کر لی تاکہ خالد بٹ سے سامنا ہونے کا امکان ہی نہ رہے۔ اسے خالد بٹ سے سخت نفرت تھی۔

اگرچہ خالد بٹ کی وجہ سے ہی اسے زینب جیسی بیوی ملی تھی مگر پھر بھی خالد بٹ کی بری عادات کے باعث وہ اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔

وہ مخصوص رفتار سے چلتا جب اپنے گھر کی سمت مڑا تو اس نے خالد بٹ کو بھی اسی سمت جانے دیکھا۔ اسے قدرے حیرت ہوئی مگر وہ برداشت کرتے ہوئے ذرا کی ذرا مزید پیچھے ہو گیا تاکہ خالد بٹ کی نظر اس پر نہ پڑ سکے۔ اگلا منظر اس کے لیے زیادہ حیران کن تھا۔ خالد بٹ اس کے گھر کا پچھلا دروازہ بجا رہا تھا۔ ساجد اپنی حیرت پر قابو پا کر مزید پیچھے ہٹ گیا۔ اور جب اس نے خالد کو گھر کے اندر جاتے دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”یہ مکینہ میرے گھر کیوں گیا ہے؟“ اس نے با آواز بلند خود سے کہا تھا۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا سامنے کے حصے کی طرف گیا اور دروازہ بجانا چاہا۔ نجانے وہ کون سی طاقت تھی جس نے اسے دروازہ بجانے سے روک دیا۔ وہ چند لمحے دروازے کے باہر کھڑا صورت حال پر غور کرتا رہا۔

اسے زینب پر یقین تھا اس کے باوجود دروازے کے بجائے دیوار پھاندا کر بہت آہستگی سے اندر کود گیا۔ سامنے کے صحن اور پیچھے کے صحن میں خاصا فاصلہ تھا ساجد بے پاؤں چلتا اس دروازے کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا جہاں سے پچھلا دروازہ صاف نظر آتا تھا اور ایک کونے میں بنے کمرے میں بھی نظر پڑتی تھی۔

زینب کا پریشان چہرہ بھی اسے نظر آ رہا تھا۔ مگر اس پریشانی میں خوف تھا حیرت نہیں تھی۔ یعنی زینب اس شخص کو گھر کے اندر اپنی مرضی سے لائی تھی اور اس کی موجودگی سے متحیر نہیں تھی۔

”تم..... اس وقت..... یہاں کیوں آئے ہو؟“ زینب کی آواز نے ساجد کو حیران کر دیا تھا۔

”اس وقت..... مطلب..... اس کے آنے کا وقت مقرر ہے۔“ ساجد نے حیرت سے سوچا۔ مولوی باقر نے اسے زینب سے متعلق کچھ پریشان کن باتیں بتائی تھیں مگر اسے ان باتوں پر یقین نہیں تھا۔

”بلے بھی بلے..... اتنے غرے..... وہ بھی میرے سامنے۔“ خالد بٹ کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

”تم..... یہاں کیا کرنے آئے ہو؟“ زینب کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

”ارے واہ..... جب تم ہمارے پاس آتی ہو تو ہم تو ایسے سوال نہیں کرتے۔“ خالد بٹ کے اس جملے نے ساجد کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔

”زینب..... اس کے پاس..... کیا کرنے جاتی ہے..... اور کیوں؟“ ساجد نے سن ہوتے ہوئے دماغ کے ساتھ سوچا۔ اس نے خالد بٹ کو زینب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دیکھا پھر وہ اس کی کمر میں بازو ڈال کر اندر والے کمرے کی سمت چل دیا۔

”میرا آدمی بہت غصے والا ہے..... اسے اتنی جلدی غصہ آتا ہے کہ شاید کسی کو اتنی جلدی سانس بھی نہیں آتا ہوگا..... اسے خبر ہوگئی تو وہ میری گردن کاٹ دے گا..... میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔“ اس نے زینب کی آواز سنی۔ اب وہ انہیں دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ مگر ان کی آوازیں بخوبی اس تک پہنچ رہی تھیں۔

”ارے جاؤ جاؤ..... تمہارا آدمی..... اونہہ..... میں اسے جانتا نہیں ہوں کیا؟ مجھے کس سے ڈرانے کی کوشش کر رہی ہے؟ میں نہیں اس سے ڈرتا ورتا۔“ خالد بٹ کی شوخ آواز سنائی دی۔ ساجد کے ماتھے کی رگیں ٹٹنے کے بارے فریادیں مچانے لگی تھیں۔

”تم سمجھتے کیوں نہیں ہو..... ساجد آجائے گا۔“ زینب کی پریشان کن آواز سنائی دی۔ خالد بٹ کھل کر ہنسا تھا۔

”ارے میری شہزادی اتنا ڈرتی ہو اپنے اس سنڈی جتنے ساجی سے۔ ایک پھونک کی مار ہے مت ڈر اس سے یہاں میرے پاس آ کر بیٹھ۔“ ساجد بہت آہستگی سے احاطے میں داخل ہو کر مرغی کے ڈربے کے پیچھے چھپ گیا۔

یہاں سے کمرے کا منظر کافی واضح تھا۔ خالد بٹ کمرے میں بچھی واحد چار پائی پر نیم دراز تھا اسی اثناء میں زینب لپک کر اس کے قریب گئی اور اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”رب کا واسطہ ہے۔ کیوں مجھے تنگ کرتے ہو تمہیں کیا پتا یہاں کیا کیا نہیں ہوا۔ میں نے بڑی مشکل سے بات سنبھالی تھی ورنہ ساجی کو تو اس مولوی نے بھڑکا دیا تھا۔ وہ میرے خون کا پیاسا سو رہا تھا۔ میں ہمت کر کے اسے نہ سنبھالتی تو آج تم مجھے یہاں دیکھنے کے بجائے ڈوے قبرستان میں دیکھتے تو بہ تو بہ..... تم ساجی کی شکل دیکھتے تو ساری مستی بھول جاتے۔ میں بس کہہ رہی ہوں تم سے..... یہاں سے چلے جاؤ۔“

زینب کی منت بھری آواز سنائی دی۔ خالد بٹ کے چہرے کی مسکراہٹ بڑھ رہی تھی۔

”یہ دیکھو میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ چلے جاؤ نا۔“ ساجد نے اپنی بیوی کو اپنے دشمن کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے دیکھا پھر خالد بٹ نے اس کے ہاتھوں کو پکڑ لیا تھا۔

”ہاں ہاں چلا جاتا ہوں میں واپس جانے کے ارادے سے ہی یہاں آتا ہوں۔ یہ تو تیرے ”ساجی“ کا گھر ہے بھئی! میں یہاں کیسے رہ سکتا ہوں تو مجھے رہنے کب دے گی یہاں کبھی میرے گھر آنا تجھے کبھی ایسے بے عزت کر کے نہیں نکالوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تجھ سے۔“

وہ کسی فلمی ہیرو کی طرح بول رہا تھا اس کے بعد کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

”میں جا رہا ہوں مگر میں پھر ضرور آؤں گا..... تو مجھے آنے سے روک نہیں سکتی..... بتا روک سکتی ہے.....؟ بتا.....؟ بول.....؟ وہ چار پائی سے اٹھ کر اس کے مقابل آ کر بولا۔

”ذلیل عورت! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ غصے سے پھر کر کمرے کے اندر داخل ہوا تھا۔

زینب اور خالد بٹ اس ناگہانی آفت سے گھبرا کر یکدم چونکے تھے۔ ساجد نے اندر آتے ہی زینب کے بازو کھینچ کر اسے پیچھے کی طرف دھکیلا تھا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ اس نے خالد بٹ کا گریبان پکڑنا چاہا مگر وہ جھک کر صاف بچ نکلا اور زینب کو دھکا دے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ساجد اس کے پیچھے تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ اس پر قابو پاتا خالد نے چار پائی پر لیٹے احمد کو گود میں اٹھالیا۔

”اگر تو نے ایک قدم آگے بڑھایا تو..... میں اس جھپٹے کو جلتے ہوئے تندور میں پھینک دوں گا۔“

وہ پھنکار کر دھمکی دینے والے انداز میں بولا۔ ساجد کے قدم وہیں رک گئے۔

”میرے بیٹے کو چھوڑ دے میں.....“ وہ چلا گیا مگر خالد نے اس کی بات کاٹ دی۔

”چھوڑ دوں گا تیرے بیٹے کو..... پہلے سکون میں آ..... اندر بیٹھ کر میری بات سن۔“ خالد پھلکار

بولا۔

ساجد غصے میں آگ بگولا ہوا جا رہا تھا مگر احمد کی وجہ سے اسے خود پر قابو پانا پڑا تھا۔

”اے زینب!..... میری بات غور سے سن۔“ خالد نے زینب کو پکارا۔ اپنی جزی اتار کر پھینک اور زور زور سے چلا۔ جیسے تیرا ساجی تجھ پہ ہاتھ اٹھا رہا ہے۔“ اس نے حکمیر انداز میں کہا۔

ساجد کی حیرانی کی انتہا نہ رہی جب اس نے زینب کو یہ حکم مانتے ہوئے دیکھا تو وہ آگے بڑھا اور اس نے زینب کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ دے مارا۔

”تجھے حیائہ آئی ذلیل عورت!“ وہ غرا کر بولا۔ اسے لگ رہا تھا جو زینب اس کے سامنے کھڑی ہے وہ اس زینب سے بہت مختلف ہے جسے وہ جانتا تھا جو اس کے گھر میں اس کے ساتھ رہتی تھی۔ جو اس کے احمد کی ماں تھی۔

”شاباش..... ایک ایسا ہی قہقہہ دوسرے گال پر بھی مار۔ کس لیے خوف زدہ ہے..... مارتا کیوں نہیں۔“ خالد بٹ نے کیمینی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

ساجد کا دل چاہا اس فیض کا منہ فوج لے مگر اس کے بازو کے حلقے میں پھنسا بلکتا ہوا احمد اسے کوئی بھی رد عمل ظاہر کرنے سے روک رہا تھا۔

”میری بات سن زینب! باہر نکل اور لوگوں کو بتا دے کہ یہ تجھے قتل کرنے والا ہے..... جلدی کر زینب..... مرنا نہیں چاہتی تو باہر نکل کر لوگوں کو بتا دے تو صرف اتنا کام کر..... باقی میں سنجال لوں گا۔“ خالد بٹ نے چلا کر زینب کو مزید ہدایات دیں۔ زینب نے سوچنے میں لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔ وہ باہر محن میں نکل گئی۔

”ہائے مجھے مت مارو..... مجھے مت مار ساجی.....! میں نے کچھ نہیں کیا..... قسم اللہ پاک کی میں بے قصور ہوں۔“ وہ تا صرف چلا رہی تھی بلکہ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

اس کے محن میں نکلنے ہی خالد بٹ پچھلے دروازے سے گلی میں نکلا اور سر پٹ بھاگنے لگا۔ احمد اب بھی اس کے بازو میں دبکا تھا۔ ساجد نے واویلا مچائی زینب کو دیکھا اور پھر پچھلے دروازے سے باہر نکلتا کہ خالد بٹ کے ٹکجنے سے احمد کو چھڑا سکے۔

خالد اس سے کافی فاصلے پر تھا جبکہ احمد کے رونے کی آوازیں ساجد تک پہنچ کر اسے مزید تیز بھاگنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ انتی ساری افتاد ایک ساتھ اس پر آگئی تھیں کہ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

خالد بٹ پھر تیرا تھا اور اس سے کہیں تیز بھاگ رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے خالد بٹ نے احمد کو اچھال کر دور کھیتوں میں پھینک دیا۔

”کتے..... تجھے موت آئے..... ہائے میرا بچہ.....“ ساجد چلا کر بولا۔ خالد کہیں آگے نکل گیا تھا

جبکہ ساجد کے قدم اس مقام پر آ کر رک گئے جہاں اس کا بیٹا مٹی میں لتھڑ چکا تھا۔

ساجد نے اس کی حالت پر تڑپتے ہوئے اسے سیدھا کیا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ اس کی آنکھ میں شاید کوئی کاغذ چھپا تھا کیونکہ ہاں سے خون کی دھار نکل رہی تھی۔

اس نے احمد کو بانہوں میں تھام لیا۔ کافی دیر وہ اس کی آنکھ سے ٹپکنے والے خون کو اپنی قمیص کے کونے سے صاف کرنے میں لگا رہا تھا بلکہ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

ساجد کی اپنی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا تھا۔ اس نے احمد کو اٹھایا اور اسی سمت میں تیز تیز چلنا شروع کر دیا جس سمت میں خالد بٹ گیا تھا۔ مگر اب اس کا مقصد اس کو پکڑنا نہیں تھا بلکہ وہ احمد کو حکیم صاحب کے پاس لے جا رہا تھا۔

علاقے کے نزدیک تو کسی ڈاکٹر کا کلینک بھی نہیں تھا۔ حکیم صاحب کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ انہوں نے کھانا ختم کرنے میں کافی وقت لیا تب تک ساجد جلے پیر کی بلی کی طرح ان لے دو خانے میں چکر لگاتا رہا۔

”ساجد..... یہ تو نے کا کے کی آنکھ کو کیا کر دیا..... میں اس پر پٹی کر دیتا ہوں مگر تو اسے ڈاکٹر کو دکھلا..... آنکھ رہ گئی اس کی..... ہائے ہائے کیوں دھیان نہیں رکھتے اپنے بچوں کا۔“ حکیم نے اسے مزید پریشان کر دیا۔

وہ حکیم صاحب سے عارضی پٹی کروا کر گھر کی طرف بھاگا تھا۔ گھر پہنچا تو مولوی باقر اس کے گھر کے محن میں چار پائی پر بیٹھا تھا۔

”ساجد..... میرے بھائی..... یہ کیا ہو گیا.....؟“ وہ احمد کی حالت دیکھ کر تڑپ کر بولا تھا۔ زینب اسے کہیں نظر نہیں آئی نہ جانے وہ کہاں چلی گئی تھی۔ فی الحال ساجد اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ مولوی باقر نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ ساجد نے گھر میں موجود برے وقت کے لیے بچا کر رکھی ہوئی چند ہزار کی رقم نکالنی چاہی تو اسے وہاں بھی مایوسی ہوئی۔

رقم وہاں موجود نہیں تھی۔ اس نے مولوی باقر سے نو سو پچھتر روپے ادھار پکڑے اور اوکاڑہ کی طرف جانے کے لیے بس میں سوار ہو گیا۔ یہ شہر اس کے گاؤں کے قریب تھا۔ گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ حالانکہ اس نے اپنے گھر کے قریب رہنے والوں میں سے کچھ لوگوں کو متنبس اور کھوجتی ہوئی نظروں سے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ زینب کے شور و غل نے انہیں یہ موقع دیا اور وہ خود نجانے کہاں غائب ہو چکی تھی۔

”بھائی باقر! میرے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔“ اس نے مولوی باقر سے صرف اتنا کہا اور اس کے بعد وہ بس میں سوار ہو گیا تھا۔

”اس کو پانی دو یا ر!“ عادل نے بہت بوجھل لہجے میں ساجد کو اشارہ کیا تھا۔ وہ خود ہکا بکا یہاں داسٹان ہضم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ساحر علی نامی یہ دیہاتی بہت دن سے اس کے پاس اپنے بیٹے کے علاج کے لیے آرہا تھا۔ مالی مشکلات کا شکار یہ شخص اسے کبھی بھی قابل ذکر نہیں لگا تھا اور اب اپنے کلینک کے ریٹائرنگ روم میں بیٹھے اس شخص کے دو تین سون کر اس کی کچس ایک دم بڑھ گئی تھی۔

اخبارات میں جس طرح اس شخص کے ظلم و ستم کی داستان کو پیش کیا جا رہا تھا وہ شخص اس سے بالکل مختلف کہانی سن رہا تھا۔ سجاد نے میز پر پڑا پانی کا گلاس اس کی طرف سرکا دیا۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ اس کا بیمار بچہ اس کی گود میں گہری نیند سوچا تھا۔

”میرے بھائی! مجھے تو تمہیں تسلی دینے کے لیے الفاظ بھی نہیں مل رہے۔ جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے اگر یہی حقیقت ہے تو یقین کرو میرے کانوں نے اس سے پہلے اس قدر خوفناک حقیقت نہیں سنی۔“ عادل اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی آمیز انداز میں بولا۔

”قسم لے لو صاحب جی! ایک ایک لفظ سچا ہے۔ میں نے آپ کو جو بھی کہا ہے سچ کہا ہے آپ کو یقین نہیں تو میں اپنے احمد کے سر کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔“ وہ تڑپ کر بولا۔

”میں جب احمد کو اکڑا لیا تو مجھے بڑی امید تھی کہ وڈے ہسپتال کا ڈاکٹر میرے بیٹے کو ٹھیک کر دے گا مگر انہوں نے کہا۔ پہلے ثابت کر دیتا ہمارا بچہ ہے تم کہیں سے اٹھا کر تو نہیں لائے کہ بھیک منگوانے کو بٹھا دو۔ فیروہاں میرا ماں ہسپتال کے باغ کا مالی ہے اس نے کہہ کر احمد کو داخل کروایا۔ اگلے دن سے علاج شروع ہوا تو یہاں کوہلے کی پولیس چوکی نے پرچہ کاٹ کر مجھے مفروضہ قرار دے دیا۔ اس کے بعد اخبار میں خبر لگ گئی کہ میں اپنی بیوی کو قتل کرنے کا تھا اور میں بڑی کوئی کمیہ آدمی ہوں۔“

وہ ان دونوں کے مزید کسی سوال سے بچنے کے لیے خود ہی مزید تفصیلات بتانے لگا۔

”میں نہ ب کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں کہ میں ایک بلی کا بچہ مار سکوں تو بھلا میں ایک جیتی جاگتی زانیہ کو کیسے مار سکوں مگر پولیس نے میرے خلاف جو پرجہ کاٹا ہے وہ قتل کا ہے جی..... میرے دو دس میں آج تک کسی نے تمہارے کچھری کی شکل نہیں دیکھی۔

ہم شریف لوگ ہیں جی مگر ایک ذرا سی غلطی نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا..... مجھے ہتھی نہ چل سکا کہ نہ بیاہی عورت تھیں جب خالد نے اس کو اس کے کچھی واس ماں پو (خانہ بدوش ماں باپ) سے خریدا تو اس نے خود میرے پاؤں میں بیٹھ کر کہا تھا کہ مجھ سے شادی کر لو۔ خالد اس کو ورنہ بوت ذلیل کرتا وہ بوت برا آدمی ہے۔ اور فیروزی نے بیاہنے سے اس سے باری لگائی۔

میں اس دن سے پچھتا رہا ہوں۔ اوکاڑے میں ڈاکٹر نے جواب دے دیا تو میں یہاں (لاہور) اپنے احمد کو ہسپتال لایا مگر میرے مامانے کہا۔ ڈاکٹر کو گھر پر دکھاؤ ورنہ ہسپتال میں تو پولیس کا وی ڈر رہتا ہے۔ میں توجی بس ایک اسٹوری (قصہ) بن کر رہ گیا ہوں۔ بھلا ایسا بھی سنا کبھی کسی نے کہ ایک زانیہ جو بد کردار ہواور فیئر دی سب اس کا ساتھ دیں۔

مجھے میرے ماے نے بتایا تھا کہ اخبارات میں زینبہ کے متعلق بہت ساری باتیں آئی ہیں۔ مگر آپ یقین کریں صاحب جی! وہ جو کچھ کہتی ہے جھوٹ کہتی ہے بکواس کرتی ہے۔ ہاں میں مانتا ہوں میں نے اسے ٹھہر مارا تھا مگر آپ یہ بھی تو دیکھیں وہ قلعہ عورت ہے۔ مجھے اس کو خانہ بدلت کے ساتھ دیکھ کر غصہ آ گیا تھا۔ آپ خود بتائیے صاحب جی! آپ اپنی زانی کو کسی غیر مرد کے ساتھ.....“

”لا حول ولا قوۃ..... تم اپنی بات کرو بھائی.....“ سجاد اس کی بات کاٹ کر فوراً بولا۔

”میں اپنے پنڈ واپس نہیں جاسکتا کیونکہ وہاں سب میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ حالانکہ سب کو پتا ہے کہ میرا کوئی قصور نہیں مگر فیروزی سب کو لگتا ہے جیسے میں کوئی لطیفہ ہوں اور فیر پولیس میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہے۔“

میری بھی غلطی ہے تاکہ میں نے ایک بدکردار عورت کے ساتھ شادی کی اور اس شادی کو نبھایا بھی۔ اب وہی میرا منہ کالا کرگئی تو میں کیا کروں صاب جی! میں نے آج تک اسے سکھ ہی دیا میرا کیا قصور جی..... اس کا پلہ اس لیے بھاری ہے کہ شہر کی زنانیوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔ وہ سب بھی ایسی ہی بد ذات ہوں گی نا۔“

ساجد علی کی بات پر عادل تڑپ کر رہ گیا۔ وہ سادہ لوحی میں اس کی شاہ رگ پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”میں نے نذیب کی تقریریں اخبار میں دیکھی ہیں۔ وہ تو جی وڈی میم بن گئی ہے اور یہاں اس کا پتر اس کی وجہ سے اپنی آگہ گناہیں بھرا کر اس عورت کو کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ تو مزے میں ہے۔“ وہ اپنے بیٹے کو بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

”اللہ وڈے لوگوں کا ہی تو نہیں..... ہمارا بھی ہے..... میں پیدا ہوا تو میرے ابا نے دی میرے کان میں ویسی ہی اذان دی تھی جیسی خالد ہٹ کے کان میں اس کے باپ نے دی ہوگی۔ فیرایا تو نہیں ہو سکتا نا کہ وہ گناہ کر کے سزا سے ہمارے اور میں مظلوم ہو کر وی مصیبت میں پھنسا ہوں۔“

وہ دھچکے اور دکھ کی اس کیفیت سے گزر رہا تھا جہاں انسان کو باتیں کرنے کے لیے کسی دوسرے انسان کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔

”تم یہ پھل کھاؤ..... پانی شانی پو..... ہم ابھی آتے ہیں۔“ سجاد نے عادل کو اشارہ کیا اور خود بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔ عادل دھیر دھیرے قدم اٹھاتا ہوا اس کے پیچھے باہر نکل گیا۔

”یہ گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے اپنے بچے کے سلسلے میں میرے پاس آرہا ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کا تعلق اس اخبار میں مسلسل چھپنے والی عورت کے ساتھ نہ ہوتا تو اتنی دیر اس کے پاس بیٹھ کر اس کی باتیں کبھی نہ سنتا۔ اس کی باتوں میں کسی قدر صداقت ہے یہ حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا۔ مان بھی لیا جائے تو پھر اس عورت کے اس مقام پر ہونے کا کیا جواز پیش جائے گا۔ وہ عورت نیشنل انٹرنیشنل میڈیا کو اتنے اطمینان کے ساتھ فیس کر رہی ہے وہ حکومتی اہلکاروں سے بات چیت کرنا چاہ رہی ہے۔ ہم اتنے اطمینان سے اسے جھوٹا قرار نہیں دے سکتے اور پھر یہ بات تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں عورت کو

تشد اور استحصال کا سامنا ہے۔“ سجاد اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہا تھا۔

عادل چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر ایک طرف صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

”جیسے یہ شخص جھوٹا نہیں لگتا..... میں خود بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے مگر پھر بھی اس شخص نے اس عورت سے نکاح کر کے اسے تحفظ فراہم کیا۔ اس کے ساتھ بناہ کیا جبکہ وہ عورت کیا کرتی رہی اور پھر بھی تم کہتے ہو کہ ہمارے یہاں عورت استحصال کا شکار ہے کیا استحصال۔“

میں تو اس فقرے سے عاجز آ گیا ہوں۔ خواہ مرد ہوں یا عورت ہر شخص ہی کہتا ہے کہ ہمارے یہاں مردوں نے عورت کی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے۔ مجھے تو خود اپنے آپ سے شرمندگی ہونے لگتی ہے۔“ عادل کا انداز گفتگو کی قدر جارحانہ تھا۔

سجاد نے اسے پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

”اوکے مولوی..... ایسی کنز باتیں کہاں سے آتی ہیں تیرے ذہن میں..... یہ جو غیر ملکی چیخ رہے ہیں باہر کے اخبارات جو چھاپ رہے ہیں۔ تیرے خیال میں یہ سب جھوٹے ہیں۔“

”تو بہ استغفر اللہ۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ سب جھوٹ ہے۔ مگر ان کی دیکھا دیکھی جو جھوٹی عورت اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے لائٹ لائٹ میں آنے یا روپے کمانے کے لیے ایسے اوجھے جھکھنڈے اپنا رہی ہیں جیسے مذہب علی نے اپنا ہے تو خود تم بتاؤ انہیں کس طرح حسنی فانی کیا جائے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ بہت لوگ انہیں سپورٹ کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ہمارے ہونے کا کیا جواز ہے..... ہم سب برے ہیں..... میں بھی تو مرد ہوں۔“

”میرا بھائی باپ‘ میرے دوست‘ تم‘ تمہارے جاننے والے مرد کیا سب برے ہیں..... نہیں نا..... اور ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ صرف ہم اچھے ہیں یا اللہ نے ہمارے حلقہ احباب میں فرشتے پیدا کر دیے جبکہ باقی سب لوگ شیطان ہیں۔ کم از کم یہ غیر ملکی چینلو اخبارات تو پاکستانی مسلمان مردوں کی ایسی ہی تصویریں پیش کر رہے ہیں جیسے دنیا کے اس خطے میں صرف شیاطین پیدا ہوتے ہیں۔“

عادل کے دل میں نجانے کتنے دنوں کا غبار تھا جو باہر نکل آیا۔

”یار..... تو تو جیج مولوی بن گیا ہے۔“ وہ فقط اتنا ہی کہہ سکا۔

”اوہ شٹ اپ یار! یہ کیا بکواس ہے..... یہی تو ہم لوگوں کا المیہ ہے۔ ہم مسلمان جب اپنی پوزیشن کو واضح کرنے کے لیے کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں تو سب کہہ دیتے ہیں۔ یہ ”مولوی“ ہو گیا ہے۔ یہ ایسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ ہمارے یہاں کے عالم بھی ڈر ڈر کر بولتے ہیں۔“ عادل نے تضحیک سے کہا۔

سجاد خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔

”تجھے اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے۔ میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا یار! بہت دیر خاموش رہنے کے بعد سجاد

بولاً۔

”نہیں یار..... غصہ کب کر رہا ہوں..... بڑھتی ہوئی عمر کا اثر ہے جلدی جذباتی ہو جاتا ہوں۔“ عادل نے ذرا کی ذرا مسکراتے ہوئے بولا۔

اسے ٹوڑ بھی اپنے لیے کا احساس تھا۔ جو باتیں وہ نساء کو سمجھاتا چاہتا تھا وہ جادو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اب مذاق مت کر..... اتنا بوڑھا بھی نہیں ہوا تو اور پھر غلط بھی نہیں کہا تو نے۔ ظلم و زبردستی استحصال تو ہر جگہ ہوتا ہے مگر ہمارے خطے میں جو بات اس قسم کی ہو جاتی ہے۔“ اسے سوسے ضرب دے کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے اور پھر اس طرح سے ہائی لائٹ کیا جاتا ہے کہ ہم اپنے آپ سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔

یہ جو یورپ امریکہ آسٹریلیا میں ہوتا ہے یہ بھی کسی سے ڈھکی چھپی بات تو نہیں مگر وہاں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جسے یہ لوگ فطرت قرار دے کر ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں جبکہ ہم ایسا نہیں کر سکتے اور یہی چیز ان فرنگیوں سے برداشت نہیں ہوتی۔

یہ جو جھگڑے ہیں نا یہ آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ہوتے ہیں یہ ہماری آئیڈیالوجی تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔ تب ہی اس قسم کی باتیں پھیلاتے رہتے ہیں۔“ سجاد نے بھی اپنی بھڑاس نکالی۔

”ہم بھی تو احمق ہیں ان کی باتوں میں آ جاتے ہیں اور پھر یہ NGOs..... تو بہ۔“ عادل نے اپنی کنپٹیاں دباتے ہوئے کہا سجاد مسکرا دیا۔

”خیر اب سب کو ایک ہی صف میں کھڑا مت کرو۔ میں ایسی ڈھیروں NGOs کے نام لے سکتا ہوں جو بہت گرانقدر خدمات سر انجام دے رہی ہیں۔“ وہ فقط سر ہلا کر رہ گیا۔

”اب اس شخص کا کیا کرنا ہے؟“ اس نے سب سے اہم سوال اٹھایا۔

”ہم کیا کر سکتے ہیں..... جو کرنا ہے اللہ نے کرنا ہے۔ باقی جو کچھ اخبارات میں چھپ رہا ہے ہم اس کو کس بنیاد پر جھٹلا سکتے ہیں۔ ہم نہیں جانے حقیقت اصل میں کیا ہے اور پھر وہ عورت خود ایک NGO تک آئی تھی مدد مانگنے کے لیے۔ NGO کو کیا پتا کہ وہ عورت جھوٹی ہے۔“ سجاد کا انداز سوچتا ہوا تھا جب عادل کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

عشاء نے بتایا تھا کہ ان لوگوں کو مذہب کے متعلق کافی انکوائری کی ہے۔ اگر وہ انکوائری ٹھیک تھی اور حقیقت پر مبنی تھی تو پھر اندر کمرے میں بیٹھا وہ شخص جھوٹا تھا۔ وہ عجیب شش و پنج میں پڑ گیا۔

”اس کو کچھ روپے دے کر رخصت کر دیتے ہیں۔“ سجاد نے مشورہ کیا۔

”ہاں..... ٹھیک ہے..... مگر اس کا ایڈریس وغیرہ لینا۔“ عادل والٹ نکالتے ہوئے بولا۔

”کیوں؟“ سجاد نے پوچھا۔

”جنرل نالج کے لیے۔“ عادل نے مسکرا کر جواب دیا مگر دل ہی دل میں وہ بہت سنجیدہ تھا۔

ہجر میں کیوں رلاتے ہو کہاں ہوتے ہو
لوٹ کر کیوں نہیں آتے ہو کہاں ہوتے ہو
مجھ سے بچنے سے ہو تو مجھ کو نظر ہو کس کے
آج کل کس کو مناتے ہو کہاں ہوتے ہو

کسی کو دھسے لہجے میں شعر سنانے کے بعد اس نے بہت زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ گو میں میگزین لے کر بیٹھی عشاء نے چونک کر اسے دیکھا۔ شعر و شاعری سے تو اس کے مجازی خدا کو کبھی بھی شغف نہیں رہا تھا۔ اس کے اندر بہت زور کا الارم بجھا۔

”اب اگر میں نے یہ کہا کہ عادل آپ کے انداز بدلے بدلے سے نظر آتے ہیں تو منہ پھول جائے حالانکہ آج اس سے پہلے تو ایسے رومانٹک شعر کی کوئیں سنائے گئے۔“

”اللہ خیر..... یقیناً کسی لڑکی سے بات کر رہے ہیں۔ جیسی تو اندر ہی نہیں جاری۔“ اس نے بڑبڑا کر خود سے کہا اور ساتھ ہی میگزین کا صفحہ پلٹ دیا۔ وہ عادل پر اپنا تجسس ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”نہیں یار! ایسی بات نہیں..... تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں..... اکثر تمہاری یاد آتی ہے۔ تم میں ہی مروت کی سخت کی ہے کبھی فون ہی نہیں کیا۔“ وہ بہت پیار بھرے لہجے میں شکوہ کر رہا تھا۔

دوسری جانب سے نجانے کیا کہا گیا۔ عادل نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

”نہیں یار..... قسم سے..... شادی کے بعد تو اور بھی زیادہ یاد آتی ہے۔“ عشاء نے اسے گھور کر دیکھا۔

اس کی ساری توجہ فون کی جانب تھی۔

”ارے نہیں بھئی..... وہ بہت لبرل لڑکی ہے۔ اسے اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ میں ایک گرل فرینڈ کے ساتھ گھومتا ہوں یا ایک وقت میں چار چار گرل فرینڈ کے ساتھ.....“ وہ بہت براڈ مائنڈڈ ہے بھئی۔“

اس نے ”بہت“ پر خوب زور دیتے ہوئے کہا تھا۔

عشاء اس کے طنز بخوبی سمجھ رہی تھی مگر منہ سے کچھ نہیں بولی۔ آج کل اسے عادل کے مزاج سے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ بہت جلدی غصہ میں آ جاتا تھا۔ اور طنز یہ گفتگو کرنے سے تو کبھی چوکتا ہی نہیں تھا۔ پہلے بھی اس معاملے میں وہ بہت تیز واقع ہوا تھا مگر وہی باتیں جو پہلے مذاق مذاق میں ختم ہو جایا کرتی تھیں۔ اب وہی سب باتیں ان کے جھگڑوں پر ختم ہونے لگی تھیں۔

بہت دن کے بعد انہیں فرصت ملی تھی۔ عشاء کا دل چاہ رہا تھا کہ اتنے دن سے جو باتیں جمع کر رکھی ہیں وہ سب حیر کر لے بہت سی باتیں عادل کو بتاتا تھیں بہت سے مشورے کرنے تھے مگر وہ تو آج کل اسے مسلسل نظر انداز کرتا رہتا تھا۔

”میں سیدھا سادہ بندہ ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا یار..... تم اخباری بندے ایسے لوگوں کو پہلی

نظر میں پہچان لیتے ہو۔“

اب وہ سنجیدہ نوعیت کی گفتگو کرنے لگا تھا۔

عشاء کے دل کو تسلی ہوئی کہ کم از کم وہ کسی لڑکی۔ باتیں نہیں کر رہا۔ وہ آنکھیں جھکا کر میگزین میں گم ہونے کی ایکٹنگ کرنے لگی۔

”نہیں گھامڑا تم اس سے ایک بار مل لو..... تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا آئی سویر جھوٹ نہیں بول رہا اور پھر اس طرح کا جھوٹ کیوں بولوں گا میں تم سے..... اسٹوڈنٹ ایک بار کوشش کر لے دو بارہ نہیں کہوں گا۔ ہاں بابا! میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں ایک بزدل انسان ہوں اور تو کمینہ دنیا کا بہترین انسان ہے۔ بس خوش۔ اب سن میں کل لٹج بریک میں تیرا انتظار کروں گا..... جرنلسٹ بن کر مت آنا بلکہ ایک ہمدرد انسان بن کر آنا..... مسئلہ سنجیدہ نوعیت کا ہے..... ہاں میرے باپ! اہل میں ہی دوں گا۔“

عشاء کے کانوں میں وقفاً وقفاً آوازیں پڑتی رہیں۔ اس کے بعد اس نے ریسپور کرڈیل پر رکھنے کی آواز سنی۔

”الو کا پٹھا..... بالکل سیاستدانوں کی طرح بات کرتا ہے۔“ عادل نے سائڈ پر پڑے ریموٹ کو نیپل پر رکھ کر صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے خود کلامی کی تھی۔

”کس سے بات ہو رہی تھی؟“ عشاء نے مسکراتے ہوئے پوچھا مگر عادل کے چہرے پر ایسے کوئی تاثرات نہیں تھے۔

”تم نہیں جانتیں..... اچھے وقتوں کا دوست ہے۔“ سنجیدہ سے انداز میں جواب دے کر وہ پھر گویا کچھ سوچنے لگا تھا۔ عشاء کا دل جل کر خاک ہو گیا۔

”یعنی یہ آپ کا برا وقت ہے؟“ دل میں اٹھنے والے سوال کو وہ زیادہ دیر تک زبان پر آنے سے روک نہیں سکی تھی۔

عادل جواب دیے بغیر سابقہ انداز میں بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کچھ سوچتا رہا۔ عشاء کا پارہ ہائی ہونے لگا تھا۔ مگر وہ کنٹرول کر کے بیٹھی رہی۔ وہ خود اب حالات کی اس سنگینی سے ڈرنے لگی تھی۔ ان کے درمیان بہت فاصلے حائل ہوتے جا رہے تھے۔

”جائے بناؤں؟“ عشاء نے پھر پوچھا مگر عادل کی خاموشی نہ ٹوٹی۔

”میں نے پوچھا چائے بنا لاؤں.....؟“ عشاء دل گرفتہ ہو کر بولی۔

”اوں ہوں..... دل نہیں چاہ رہا.....“ وہ ناک چڑھا کر بولا۔ عشاء نے جل کر گود میں پڑا میگزین نیپل پر پٹخ دیا اور ترخ کر بولی۔

”جانتی ہوں..... آپ کا دل تو مجھ سے بات کرنے کو ہی نہیں چاہتا۔“

”اچھا آ..... آ..... زود مجھے یہ آپ فرما رہی ہیں..... آپ کو اس بات سے کوئی فرق نہیں

دار ہاتھ مارا۔

”ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی۔ آپ کنزروٹو نہیں ہیں مگر بہت خود غرض ہیں آپ کو احساس ہوا کہ نبیل یہ رونا رونے لگی تھی کہ میرے پاس دو گھڑی بیٹھ کر میری باتیں سن لیں میں اکیلی ہوتی ہوں مجھے ناگم دیا کریں تب کیسے غم سے کیا کرتے تھے اور اب آپ مجھ سے وہی شکوے کر رہے ہیں جو کبھی میں آپ سے کیا کرتی تھی۔“

وہ اس کی غلطی کا احساس دلانے لگی تھی۔ عادل بہت عرصے بعد دل سے مسکرایا تھا۔

”میں ایکسکیو زکریٹا ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”کان بھی پکڑنے پڑیں گے۔“ عشاء پھلتے ہوئے بولی۔

”اوہ ہاں..... شیور..... کیوں نہیں جی.....“ اس نے کہا پھر جھٹ سے عشاء کے کان پکڑ لیے۔“

عشاء نے اس کے کندھے پر چیت رسید کی۔

”میرے نہیں اپنے کان پکڑیں۔“

”ارے تو یہ کس کے ہیں..... یہ بھی تو میرے ہی ہیں۔“ وہ آنکھ مار کر بولا تھا۔ عشاء کھلکھلا کر ہنس

دی۔

”ایسی باتوں میں کتنا دماغ چلتا ہے آپ کا۔“ وہ اس کے بال بگاڑ کر بولی۔ عادل کو اس کے انداز پر

ہنس آ گئی۔

”اچھا بتاؤ تمہارا آفس کیسا چل رہا ہے اور ہاں وہ محترمہ زینب علی کیسی ہیں؟“ عادل نے ذرا کی ذرا

سنجیدہ ہو کر پوچھا تھا۔

عشاء نے چپل اتار کر دونوں پاؤں صوفے کے اوپر چڑھا لیے۔

”محترمہ زینب علی ٹھیک ہی ہوں گی..... ہم کون سا اس سے روز ملتے ہیں۔ اس کی سکیورٹی بہت

ٹائٹ ہے۔ اس کا شوہر بہت ظالم اور سائیکلک سا انسان ہے جس کی وجہ سے ”فلاح“ والوں نے اس عورت کو

سات پردوں میں چھپا کر رکھا ہے۔“ عادل کی نظروں میں وہ ”ظالم“ اور ”سائیکلک“ شخص گھوم کر رہ گیا جو اپنے

بیٹا بچے کو سینے سے لگائے جگہ جگہ فریاد کرتا پھر رہا تھا۔

”کس قدر گھٹیا اور فضول انسان ہے وہ شخص..... میرے ہاتھ لگ جائے تو قسم سے میں تو اسے فوراً

شوٹ کر دوں۔“

عشاء نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

عادل نے اسے دیکھا پھر لچر بھر میں ہی اسے سب بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

”تم ملو گی اس شخص سے؟“ اس نے بے ساختگی سے کہا۔ عشاء نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا

پھر سر جھٹک کر مسکرائی گویا اس کے مذاق کو محسوس کر لیا ہو۔

نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ عادل آج آکس کریم کھانے چلتے ہیں۔ حالانکہ پہلے تو ہر ہفتے تم مجھ سے ضد کرتی تھیں کہ آکس کریم کھانے جانا ہے۔ کل میں نے فیروز رکھو لا تو اس میں آکس کریم موجود تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ابھی بھی آکس کریم کھانا پسند کرتی ہو مگر میرے ساتھ جا کر کھانا نہیں اور پھر جب کسی جہم شاپنگ کے لیے گئے ساری بے منت تم نے کی جب میں نے پیسے دینے چاہے تو تم نے کہا میرے پاس پیسے ہیں۔“

یقین جانو عشاء! مجھے اتنا برا لگا کہ میں بیان بھی نہیں کر سکتا..... ہاں ٹھیک ہے میں کنزروٹو ہوں۔

مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میری بیوی میری موجودگی میں رقم خرچ کرے جب یہ میری ذمہ داری ہے۔“

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بات کر رہا تھا مگر اس کا ہاتھ ابھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

”اتنی سی بات..... یہ تو بہت چھوٹی سی بات ہے عادل پھر.....“ عشاء صفائی دینے والے انداز میں

بولی مگر عادل نے اس کی بات کاٹ دی۔

”نہیں عشاء! یہ چھوٹی بات نہیں ہے کم از کم میرے لیے یہ چھوٹی بات نہیں ہے۔“

تمہیں یاد ہے جب پنڈی سے لاہور آئی تھیں اور جب صبح تمہاری آنکھ نہیں کھلا کرتی تھی۔ میں خود

ناشہ بنا کر کھالیا کرتا تھا تب تم نے مجھ پر کتنا غصہ کیا تھا اور تم نے کہا تھا کہ تمہیں یہ بات سخت نا پسند ہے تمہاری

موجودگی میں ناشتہ میں بناؤں میں نے کبھی تمہیں یہ باور نہیں کروایا کہ تم کنزروٹو ہو یا شاؤنک ہو۔“ وہ نہایت

سنجیدہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔

عشاء کو اس کی مثال پر حیرت ہوئی۔ اس نے کس کو کس بات سے ملا دیا تھا۔

تم جانتی ہو تمہارے پاس اب میرے لیے وقت نہیں ہوتا۔ میں انتظار ہی کرتا رہ جاتا ہوں کہ تم

میرے پاس بیٹھو گی باتیں کرو گی مگر..... گاؤ عشاء شاید میں حقیقتاً بہت کنزروٹو ہوں۔“

وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھ پیشانی پر رکھ کر بولا۔

عشاء کو اس کے انداز پر از حد بے چینی محسوس ہوئی۔

”نہیں..... عادل! دراصل آئی ایم سوری..... آپ کنزروٹو نہیں ہیں..... آپ بالکل بھی کنزروٹو

نہیں ہیں۔ شاید میں ہی زیادہ ماؤرن ہو گئی ہوں شاید یہ میری غلطی ہے۔“

”شاید نہیں..... یقیناً..... آپ ہی کی غلطی ہے زور جب..... شکر ہے آپ نے خود ہی تسلیم کر لیا۔“

عادل اس کی بات کاٹ کر جلدی سے بولا۔

عشاء نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر جو تاثرات تھے وہ عشاء کے لیے بالکل بھی

نئے نہیں تھے۔

”ارے یہ تو بالکل بھی نہیں بد۔ لے۔ یہ تو بالکل پہلے جیسے عادل ہیں۔“ اس نے دل میں سوچا مگر منہ

سے نہیں کہا۔

ایسی بات کہہ کر وہ اسے سر نہیں چڑھانا چاہتی تھی اس نے اپنے مجازی خدا کے کندھے پر ایک زور

پڑنا چاہیے کہ میرا دل کیا کرنے کو چاہتا ہے اور کیا نہیں۔“ وہ بہت نرم لہجے میں بولا تھا۔

اس کا یہی لہجہ عشاء کو تاؤ دلاتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور عادل کے قریب سے گزر کر باہر جانے لگی تھی۔ مگر عادل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر اسے اپنے قریب بٹھا کر بولا۔

”اچھا..... اب ایسے موڈ کو آف مت کرو..... تم جانتی ہو میری تو عادت ہی ایسی ہے۔“ عشاء خاموش کھڑی رہی۔

اس کی طرف دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی ورنہ آنکھوں میں آنی نمی چھپانا مشکل ہو جاتا۔

”سوری یار..... کہا نا سوری.....“ وہ اس کا ہاتھ دبا کر بولا۔ پھر اسے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھالیا۔

عشاء تامل کیے بغیر اس کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔

”چلو آج میرے پاس فرصت ہی فرصت ہے..... آؤ آج اپنی باتیں کر لیں ورنہ کل تو شاید

تمہارے پاس میری باتیں سننے کا بھی وقت نہ ہو۔“

اس کے انداز دوستانہ تھے مگر چہرے پر عجیب سی سنجیدگی تھی۔

”پلیز عادل..... آپ بس بھی کریں اتنے طنز کے تیر چلاتے ہیں کہ میں برداشت کرتے کرتے بھی

عاجز آ جاتی ہوں۔“

وہ روہانی ہو کر بول ہی پڑی۔

عادل نے اس کی جانب دیکھا اس کا ہاتھ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس کے ہاتھ کو

تھپتھپانے لگا۔

”تم نے کبھی سوچا کہ اس کی وجہ کیا ہے..... ہم پہلے بھی تو جھگڑتے تھے مگر وہ جھگڑے ایسے نہیں

ہوتے تھے..... پہلے.....“

”پہلے میں جاب بھی تو نہیں کرتی تھی۔“ عشاء اس کی بات کاٹ کر بولی۔

عادل جو اس کے ہاتھ کو سہلا رہا تھا یکدم رک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

”آپ کو میرا جاب کرنا پسند نہیں ہے..... ہے نا؟“ وہ ذرا سا ترچھا ہو کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر

استغنامیہ انداز میں بولی۔

”نہیں..... تم غلط سمجھیں..... مجھے تمہارے جاب کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر جس نوعیت کی

جاب تم کر رہی ہو مجھے اس پر اعتراض ہے..... تمہیں اندازہ ہے تم کتنی بدل گئی ہو۔ اب پلیز کوئی آرگيومٹ

دیے بغیر میری بات تسلی سے سن لو تمہیں مجھ سے شکایت رہتی ہے کہ میں بدل گیا ہوں حالانکہ حقیقت یہ ہے عشاء

کہ تم بہت بدل گئی ہو۔ تمہارے آئیڈیاؤں تمہارے انداز تمہارے رویہ تمہاری اپروچ ہر چیز بالکل تبدیل ہو چکی ہے اور

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم خود یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔“

مجھے بتاؤ کتنے دن ہوئے تم نے اپنے ہاتھ سے میرے لیے کوئی ڈش نہیں بنائی کتنے دن ہوئے تم

”عشاء! میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں اس شخص سے ملا ہوں اگر تم ملنا چاہتی ہو تو میں تمہیں اس سے ملوا سکتا ہوں۔“

وہ بہت سنجیدگی سے بولا۔

عشاء تو حیرانی سے اس کی جانب نکلنے لگی۔

”جی نہیں..... مجھے نہیں ملنا ایسے شقی القلب انسان سے..... اور پلیز آپ بھی مت ملیے گا ایسے شخص

سے..... توبہ آپ کیا اخبار نہیں پڑھتے بہت خطرناک شخص ہے وہ۔“ عشاء دہل کر بولی۔

عادل نیم دلی سے مسکرایا۔

”مائی سویٹ وائف! میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ وہ بالکل بھی خطرناک نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ

مظلوم اور مجبور شاید ہی کوئی اور ہو.....“

”ایک ایسا مرد جو اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھاتا ہوا ہے آپ ہی مظلوم و مجبور کہہ سکتے ہیں۔“

”اور اگر بیوی شوہر پر ہاتھ اٹھائے؟“ عادل کے سوال پر عشاء چپ سی ہو گئی۔

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“ بہت دیر بعد اس نے پوچھا تھا۔

”ایک سہیل سا سوال پوچھا ہے کہ اگر شوہر بیوی پر ہاتھ اٹھائے تو یہ انتہائی غلط بات ہے مگر بیوی

شوہر پر ہاتھ اٹھائے تو یہ بری بات نہیں ہے..... کیا یہ بری بات نہیں عشاء.....؟ اور اگر یہ بری بات ہے تو پھر یہ

بری بات نہیں ہے..... تم نے بھی مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا..... ایک بار نہیں دو بار..... اگر زینب علی کو یہ حق ہے کہ وہ

اس ظلم کے خلاف احتجاج کرے تو پھر یہ حق مجھے بھی حاصل ہے۔“

وہ بہت رک رک کر بات کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ عشاء کا چہرہ بھی دیکھ رہا تھا جہاں تاثرات لمحہ لمحہ

بدل رہے تھے۔

”عادل.....! آپ مجھے اس شخص سے کپیئر کر رہے ہیں..... آپ جانتے ہیں مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی

اور..... اور میں نے ایکسکسوز کیا تھا عادل!“ وہ شرمندہ سے لہجے میں بولی۔

اسے عادل سے اس طرح سے جتنا نے کا دکھ بھی ہوا تھا۔ عادل نے اس کا چہرہ دیکھا پھر دوبارہ اس کا

ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

”یہی تو میں سمجھا نا چاہ رہا تھا میری جان کہ اس شخص کو بھی غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ اسے بھی تو معافی کا

موقع ملنا چاہیے۔ کیا پتا اسے ایک موقع دیا جائے تو وہ بھی معافی مانگ لے یا پھر تم لوگ زینب اور اس کے خاوند کو

مصالحت کا موقع ہی نہیں دینا چاہتے۔“

”نہیں عادل! وہ شخص اچھا نہیں ہے بہت برا ہے۔ آپ نے کیا سچ سچ اخبار نہیں پڑھا؟“ وہ تڑپ

کر بولی تھی۔

”میں اس شخص سے ملا ہوں اور جو کہانی وہ سن رہا ہے وہ میں نے بھی اپنے کانوں سے سنی ہے۔ اسے

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کیا تم نے اس عورت کی کہانی اپنے کانوں سے سنی ہے؟“ عادل کے سوال پر وہ پھر لا جواب ہو گئی۔

”تم جانتی ہو اس عورت کا ایک بچہ بھی ہے..... بہت چھوٹا سا اور وہ بیمار ہے۔ اس بچے کو اپنی ماں کی وجہ سے ایک آنکھ کی بینائی سے محروم ہونا پڑا مگر اس عورت نے اپنے کسی بیان میں اپنے کسی بچے کا ذکر نہیں کیا..... اس بات سے اس عورت کا کٹھور پن ثابت نہیں ہوتا؟ پھر..... میں تمہیں اس شخص سے ملواؤں گا۔“ عادل کی بات پر عشاء چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر سر ہلا کر بولی۔

”نہیں..... میں یقین نہیں کر سکتی..... اتنا بڑا جھوٹ اور پھر یہ فراڈ ہے.....“

”ہاں..... میں جانتا ہوں..... یہ فراڈ ہے اور اس فراڈ میں نجانے کتنے لوگ شامل ہیں مگر یہ دیکھو کہ یہ فراڈ دنیا کے سامنے کتنی خوبصورتی سے پیش کیا گیا کہ اب تک کسی کو جھوٹ سچ کا پتا ہی نہیں چل سکا۔“ عادل نے فوراً تسلیم کر لیا تھا۔

عشاء تو عجیب شش و پنج میں پڑ گئی تھی۔

”اچھا میں تمہیں تفصیل سے بتاتا ہوں دراصل میں سجاد کے کلینک پر آئی سائنٹ چیک کروانے گیا تھا اور وہاں.....“

وہ اسے اپنی اور ساجد علی کی ملاقات کے متعلق بتانے لگا۔ عشاء حیرانی سے یہ سب سن رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

”آج کیسی فضول ڈرینک کی ہے تم نے؟“ شہلانے اسے دیکھ کر ناک چڑھاتے ہوئے بے تکلفی سے تنقید کی۔

”کیوں.....؟“ اس ڈریس میں کیا برائی ہے؟“ عشاء نے بھی اسی کے انداز میں ناک چڑھا کر پوچھا۔

فیروز کی رنگ کا اچھا خاصا خوبصورت شلوار قمیص سوٹ تھا ہاں مگر شرٹ کی فٹنگ ڈھیلی تھی اور آستین بھی پوری تھی۔

”برائی نہیں ہے..... مگر.....“ شہلانے لمحہ بھر توقف کر کے اس کا بھرپور جائزہ لیا پھر منہ کے زاویے بگاڑتے ہوئے بولی۔

”ہر جگہ کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور اسی حساب سے انسان کو ڈرینک وغیرہ کا دھیان رکھنا چاہیے اور پھر یا راتنا زبردست فکر ہے تمہارا..... اس قسم کی ڈبہ بند ٹائپ ڈرینک سب بیڑا غرق کر دیتی ہے۔“

عشاء سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

اس سے کچھ بھی کہنا فضول تھا۔ وہ ابھی تک اسی رنگ میں رنگی تھی جس میں کچھ دن پہلے تک عشاء رنگی نظر آ رہی تھی۔ کپٹلی شہلا کی نہیں اتری تھی بلکہ عشاء کی اتری تھی۔ تب ہی اسے کچھ کچھ حقیقت سمجھ میں آنے لگی

تھی۔ دراصل عادل کے ساتھ ایک لمبی چوڑی جھڑ ساجد علی کی کہانی اس کی زبانی سن کر فاطمہ بھابھی کی نصیحت سے بھری گفتگو اور سب سے بڑھ کر اسفند رحیم لے بدلے بدلے انداز سے بہت سی حقیقتیں باور کروا گئے تھے اور ایک ایسی بات تھی جو فی الحال اس نے کسی سے نہیں کہی تھی۔

وہ شخص بے تکلفی کی ہر حد کراس کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ بے جا تعریف کرنا اور فریگیوں کے انداز میں تعریف کرنا تو اس کی عادت تھی ہی مگر اب وہ تعریف کرتے کرتے ہاتھ پکڑنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ ایک آدھ بار عشاء کے ساتھ یہ ”حادثہ“ پیش آیا تو وہ اسے اتفاق دے کر برداشت کر گئی مگر ایک دن جب وہ اس کے روم میں کسی کام سے گئی تو باتوں کے دوران اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا سہلاتے ہوئے بولا۔

”اللہ نے ایک ناشکرے بندے کو آپ جیسا تحفہ دے کر سخت نا انصافی کی۔“

عشاء نے اپنا ہاتھ تو چھڑا لیا تھا مگر اسے ڈانٹ پھینکا نہیں کی تھی حالانکہ وہ کوئی بزدل یا عدم اعتماد کا شکار نازک سی لڑکی نہیں تھی۔ وہ شادی شدہ تھی اور اس میں اتنی ہمت تھی کہ وہ اسفند رحیم کو ایک آدھ جھڑکی تو ضرور دیتی مگر پھر بھی نجانے کیوں اس نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنے آپ کو بہت ”ویل میزڈ“ سمجھتی تھی۔

”تم جانتی ہو تم کس سمت میں جا رہی ہو..... اب پھر مجھے کنزروٹو کہہ دینا مگر میں پھر بھی خود کو یہ کہنے سے نہیں روک سکتا کہ تم خود بھولتی جا رہی ہو کہ اخلاقیات کسے کہتے ہیں اور جو اخلاقیات تم سیکھتی جا رہی ہو وہ آپ کو یہ سکھاتی ہے پورے پکڑے نہ پہنؤ آپ بد صورت لگو گے اور جو یہ سکھاتی ہے کہ جب کوئی مرد آپ کو سراہے تو اس تعریف کو خندہ پیشانی سے برداشت کرو۔ بے شک یہ تعریف اور یہ سراہنا اخلاقیات سے گرا ہوا ہی کیوں نہ ہو..... یہ سو کالڈ ماڈرن سوسائٹی کے میسرز ہیں بھی۔“

عادل نے بہت سلجھے ہوئے لہجے میں سے بہت کچھ سمجھا دینا چاہا تھا اور وہ اندر ہی اندر مل کر رہ گئی تھی۔

”عادل کو اندازہ تو نہیں ہو گیا کہ اسفند اس قماش کا آدمی ہے۔“ اس نے سوچا تھا۔

”کس دنیا میں گم ہو بھی۔“ رحمہ نے کی بورڈ پر انگلیاں چلانے کے ساتھ ساتھ اسے ٹوک کر پوچھا۔ وہ جب سے آئی تھی ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔

”یہ نہ بے تکلفی کے ڈائی ورس پیچہ ز ہیں..... اسفند چاہتا ہے کہ یہ کام جلد سے جلد بٹ جائے۔“

رحمہ اس کی خاموشی سے اکتا کر بولی۔

عشاء نے ”اسفند“ کے ذکر پر اس کی جانب دیکھا۔ نجانے کب سے اس نے اسفند کے ساتھ صاحب کا لاحقہ لگانا چھوڑ دیا تھا۔

”اسفند بہت اچھا انسان ہے یا..... ایک آئیڈیل بندہ ہے..... میں تو کم از کم اس سے بہت امیر پس ہوں۔“

وہ کمپیوٹر اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

عشاء نے اسے روکنا یا نوکنا مناسب نہیں سمجھا۔

”یہ زینب علی طلاق لے کر کیا کرے گی؟“ اس نے رحمہ سے پوچھا۔

”اسفند نے کچھ تو سوچا ہوگا اس کے متعلق..... اور یقیناً کچھ اچھا ہی سوچا ہوگا۔“ وہ کپیر ٹراسکرین پر نظریں ہٹائے بغیر بولی۔

اس کے لہجے میں لفظ اسفند کے لیے بہت مٹھاس تھی۔

”وہ شخص اس عورت کو طلاق دلوا کر کیا کرے گا..... نکاح تو نہیں کرے گا..... حالانکہ اگر اسے اس عورت سے اتنی ہمدردی ہے تو پھر اس سے نکاح کر لے نا۔“

عادل نے کل ہی اس سے یہ بات کہی تھی کل اس نے عشاء سے بہت کچھ کہہ ڈالا تھا۔

”وجاہت کو ٹرمینٹ کر دیا گیا ہے۔“ رحمہ نے ایک اور اطلاع دی۔ اب کی بار عشاء چوکی۔ وہ وجاہت سے آج زینب علی کے متعلق تفصیلی بات چیت کرنا چاہ رہی تھی۔ آخر وہی تو تھا جو انکو انری کرنے والوں میں پیش پیش تھا۔

”وجاہت کا نمبر ہے تمہارے پاس؟“ اس نے رحمہ سے سوال کیا۔

رحمہ نے ناک چڑھا کر اسے نمبر دے دیا۔ وہ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے لوگوں میں سے تھی۔ وجاہت کو نکال دیا گیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ اب اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی عشاء رحمہ کے کیمین سے جانے کا انتظار کرتی رہی پھر اس نے وجاہت کا نمبر ملایا۔

”عشاء بی بی! یہ لوگ سمجھتے ہیں دنیا بے وقوف ہے اور یہ بالکل غلط سمجھتے ہیں۔“ وجاہت نے اس کے استفسار پر کوئی گلی لپٹی رکھے بغیر کہا۔

”یہاں بہت فراڈ ہے..... آہستہ آہستہ سب کچھ سمجھ جائیں گی اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وجاہت کو نکال دیا گیا ہے ان کی خدمت میں میرا دست بستہ سلام عرض کر کے یہ پیغام دے دیجے گا کہ وجاہت خود یہ گھنیا جگہ چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ مجھے انفس اس بات کا ہے کہ میں پہلے ان کی گیم کو کیوں نہیں سمجھ سکا۔ ہم نے جب اس عورت کو مرکز پر سے اٹھا کر کوچ میں ڈالا تھا یہ ہم ہی جانتے ہیں اسفند سمیت کوئی بھی اسے وہاں سے اٹھا کر مدد کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اگر میں اور خان اسے اٹھانے پر اصرار نہ کرتے تو یہ کھڑا ہی پیدا نہ ہوتا۔

آپ کو پتا ہے انہوں نے یہ ساری اسٹوری بند کرے میں بیٹھ کر پلان کی بلکہ مجھے لگتا ہے کسی ڈرامہ رائٹر کو بلا کر سب لکھوایا گیا اور اس کے بعد اسے کوہلہ نامی اس چھوٹی سی جگہ پر چیدہ چیدہ لوگوں میں پسیدے کر پھیلا دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ حقیقت کسی کو یہ ہی نہیں۔ میں جب وہاں پہنچا تو سب سے پہلی ملاقات مجھے وہاں کے ”وڈے چوہدری صاحب“ سے کروائی گئی اور اس نے مجھے جو کچھ بتایا۔ وہ میں نے یہاں آ کر ان سب کو بتا دیا۔

آپ یقین کیجئے عشاء! مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ اسٹوری ایک بوکس ڈرامہ ہے اور ”فلاح“ والوں نے میری ”فلاح“ خراب کرنے کے لیے مجھے اس کام میں پھنسا دیا۔ ایک تو وہاں چوہدری کے ڈر سے کوئی کج بولا ہی نہیں اور جو بولا وہ بھی جھوٹ ہی بولا۔ اس کے بعد جو کچھ اخبارات میں آیا وہ تو نری کیا اس بات میں تھیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ میں کوئی با اختیار بندہ نہیں ہوں۔ میں جو کر سکتا تھا میں نے وہی کیا۔ میں نے اسفند کو بہت سمجھایا کہ اس ڈرامے کو ختم کر دے مگر تب تک وہ اس عورت کو میڈیا میں ٹھیک ٹھاک شہرت دلوا چکا تھا ایسی صورت حال میں مجھے یہی بہتر لگا کہ میں اس سب سے دور ہو جاؤں۔“ وہ تو اسے ایک کے بعد ایک کج بتاتا چلا گیا۔

”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ سب جھوٹ ہے؟“ اس نے بے یقینی سے سوال کیا۔

”سب جھوٹ نہیں ہے..... وہ عورت گھر سے بھاگی تھی اور اس کا شوہر اس پر شک بھی کرتا تھا شاید وہ اسے مارنا بھی چاہتا تھا۔ پر میں اس کے بارے میں پر یقین نہیں ہوں۔ کچھ ایسا ہے جو ابھی بھی پوشیدہ ہے..... خیر کب تک، میں پتا چلاؤں گا۔“

عشاء کو اس کے جواب نے پھر غصے میں ڈال دیا۔ وہ تو خود پر یقین نہیں تھا۔

”آپ کو اسفند صاحب بلار ہے ہیں۔“ وہ ابھی فون پر مصروف تھی۔ کہ چہرہ ای پیغام لے آیا۔ وہ فون بند کر کے اس کے آفس کی طرف آ گئی۔ اسے تسلی تھی کہ رحمہ وہیں موجود ہوگی مگر اسفند اپنے آفس میں اکیلا ہی ریوانگ چیز پر بیٹھا ٹیبل پر پڑے پیپر ویٹ کو گھمانے میں مصروف تھا۔

”آئیے مس..... میرا مطلب مسز عشاء..... آپ تو بہت کم کم نظر آنے لگی ہیں آج کل۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ عشاء نے اس ہنسنے میں دو چھٹیاں کی تھیں۔ وہ اسی وجہ سے اس سے کم کم نظر آنے کا شکوہ کر رہا تھا۔

”کیسی ہیں آپ.....؟ اور آپ کے کنزرویٹو میسینڈ؟“ اس نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ عشاء نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا مگر یہ مسکراہٹ بہت مصنوعی تھی۔

”یقین کیجئے..... مجھے انفس ہوتا ہے یہ دیکھ کر آپ جیسی زبردست شخصیت کا میسینڈ اتنا گیا گزرا ہے..... کاش میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں کہہ رہا تھا۔

عشاء کے اندر ابا ل اٹھنے لگے مگر اس نے خود پر قابو پایا۔ اسے اسفند سے حقیقت اگلو اتھی۔

”آپ میرے لیے کچھ سکتے ہیں اسفند صاحب؟“ اس نے چہرے پر بے چارگی طاری کر کے وہی سوال پوچھ لیا جو اسفند کی دلی خواہش تھی۔

”ارے..... آپ کے لیے تو ہماری جان بھی حاضر ہے۔ آپ کہیں آپ کو کس قسم کی مدد درکار ہے۔“ اس نے نہایت دلچسپی سے پوچھا۔

عشاء کو دل ہی دل میں اس کے انداز پر مزید غصہ آنے لگا۔

”میں..... مجھے کیا پتا..... مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں؟“ وہ مزید بے چارگی لہجے میں

سموکر بولی۔

”آہم..... نو پر اہلم..... ڈائی وورس..... ویری سپل..... اس مسئلے کا یہی حل ہے۔ ارے بھی آپ نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے کہ جس کی سزا کے طور پر آپ کو ایسا شوہر ملا ہے جو آپ کے قابل نہیں ہے۔ آپ بہت زیادہ ڈیزرور کرتی ہیں عشاء اور یہ شخص آپ کو کچھ نہیں دے سکتا۔“ وہ پر جوش لہجے میں بولا۔

”عادل مجھے آسانی سے طلاق نہیں دیں گے۔ کبھی بھی نہیں۔“ وہ سر جھکا کر اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے بولی اور دل ہی دل میں خود کو بے شمار گالیوں سے بھی نوازا۔

”ارے یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں..... میں آپ کو دلوادوں گا طلاق..... آئی مین۔ میں آپ کی مدد کروں گا..... اگر میں زینب علی کی ساجد علی سے طلاق لینے میں ہیلپ کر سکتا ہوں تو پھر آپ تو میری..... آپ تو میری بہت اچھی فرینڈ ہیں۔“ وہ میز کی طرف جھک کر بولا۔

”وہ عورت تو بہت مظلوم ہے اور وہ حقیقتاً یہ ڈیزرور کرتی ہے کہ اسے ساجد علی جیسے شخص سے چھٹکارا دلوایا جائے مگر میں اس قدر انوسینٹ (محموم) نہیں ہوں۔“

اس نے اپنی طرف سے آخری وار کیا۔

اسفند نے ایک بلند بانگ قہقہہ لگایا۔

”زینب علی..... انوسینٹ؟“ اتنا کہہ کر وہ بھرپور ہنس لگا۔

”مائی گاڈ عشاء..... شی از نوٹ انوسینٹ ایٹ آل..... آپ کو کیا پتا اس کو کس قدر پالش کیا گیا ہے۔ ایک نمبر کی کرپٹ عورت تھی۔ اپنے شوہر کو دھوکا دیتی رہی تھی۔ یہ تو اس کی شکل پر ہی لکھا تھا کہ وہ بدکردار ہے۔ اس نے اپنے منہ سے ہمارے سامنے اعتراف کیا تھا اس کے کسی آشنا نے اسے اس کے گاؤں سے بھاگنے کا موقع فراہم کیا تھا یہ اس کی گڈ لک تھی کہ یہ ہماری کوچ سے ٹکرائی۔ اب دیکھا ہم اس کی قسمت کو کس طرح بدل دیں گے۔ امریکہ کا ویزا تو اسے ملا ہی سمجھو۔“

وہ جیسے کوئی بہت دلچسپ کہانی سنارہا تھا۔ عشاء کو اس شاندار شخصیت سے نہایت خوف محسوس ہوا۔

”یعنی..... یہ سب ڈرامہ تھا..... اس میں حقیقت نہیں تھی۔“ عشاء گہری سانس بھر کر بولی تھی۔ اس کے انداز پر اسفند مسکرایا۔

”آف کورس مائی ڈیر..... فیکسپیر کو تو پڑھا ہوگا نا دنیا ایک اسٹج ہے یہاں یہی ہوتا ہے..... اگر یہ ڈرامہ نہ کرتے تو اس عورت کو اس کا حق کیسے دلاتے۔ ہم یہاں بیٹھے کس لیے ہیں۔ ہمیں تو فنڈز ہی مظلوم عورتوں کی وجہ سے ملتے ہیں بھی۔“

وہ کمینٹی ہی ہنسی ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ عشاء کو مزید سننے کی حاجت نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

”مرد محافظ نگراں ہیں عورتوں پر اس لیے کہ اللہ نے ان میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دی اور اس

لیے کہ مردان پر اپنے مال خرچ کرتے ہیں تو نیک عورتیں اطاعت گزار ہوتی ہیں وہ خاوند کے پیچھے وفادار رہتی ہیں جس طرح اللہ نے وفاداری کا حکم دیا اور اگر انہیں عورتوں کی نافرمانی کا اندیشہ ہو تو انہیں سمجھاؤ اور ان سے الگ ہو جاؤ اور انہیں مارو (نسب غیر شدید) پھر اگر وہ حکم میں آجائیں تو ان پر کوئی زیادتی نہ کرو۔ بے شک اللہ بڑا بلند ہے۔“

اس کے منہ سے گہری سانس خارج ہوئی۔ اخبار کے پہلے صفحے کے سب سے اوپر دی گئی اس آیت کا مفہوم وہ شاید کبھی اتنی اچھی طرح سے نہ سمجھ پائی اگر اسی صفحے پر ہیڈ لائن سے اوپر دی گئی اس خبر سے بے خبر ہوتی جس میں زینب علی کا پردہ فاش کیا گیا تھا۔

تمام اخبارات نے ساجد علی کی پریس کانفرنس کو نمایاں کوریج دی تھی۔ گزشتہ چار پانچ ماہ سے وہ عورت جس طرح لائم لائٹ میں تھی اسی حساب سے اب اسے پھنکار کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ حقیقت سامنے آتے ہی ”فلاح“ والوں نے تو معافی مانگ کر اپنی جان بچا لی تھی۔

زینب کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ اب اس کے ساتھ مزید کیا ہونا تھا عشاء کو اس سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی دلچسپی اس عورت میں تب ہی ختم ہو گئی تھی جب اسفند حیم کی زبانی اسے اس کے فراڈ ہونے کے بارے میں پتا چلا تھا۔

”حد ہو گئی..... میں ہارن دے دے کر تھک گیا اور یہاں تمہارے کانوں پر جوں تک نہیں رہتی..... ارے زوجہ اٹھو..... ہم آکس کریم کھانے جا رہے ہیں۔“

وہ نجائے کن خیالوں میں کھوئی تھی جب عادل اس کے قریب آ کر چلایا۔

اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آئی ایم سوری..... میں اخبار دیکھنے میں مگن ہو گئی۔ پتا ہی نہیں چلا۔“

وہ اس کے قدم سے قدم ملا کر باہر کی سمت آتے ہوئے بولی۔

عادل گیٹ لاک کرنے لگا تھا۔ اتنی دیر میں وہ گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ چکی تھی۔

”جو ہوا اچھا ہوا اور جو ہوگا اچھا ہی ہوگا۔ اب اخبار پڑھ پڑھ کر کڑھنے سے بہتر ہے تم ”ٹی وی“

دیکھنا شروع کر دو..... سنا ہے بہت اچھے اچھے ڈرامے آتے ہیں آج کل۔

وہ مین گیٹ سے گاڑی نکالتے ہوئے بولا۔

”دفع دور..... میں نہیں دیکھتی ڈرامے درامے..... اتنا برا وقت نہیں آیا ابھی مجھ پر۔“ عشاء ناک

چڑھا کر بولی۔

عادل مسکرانے لگا۔ عشاء کو ایک ٹھیک ٹھاک کھڑاک سے گزرنے کے بعد احساس ہوا تھا کہ اللہ نے

اسے بہت اچھا شریک سفر دیا ہے۔ عادل نے ایک بار بھی اسے اس کے گزشتہ رویے کی بدصورتی کا احساس

دلانے کے لیے کچھ نہیں بتایا تھا۔ بلکہ وہ اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔

آفس سے جلدی آ جاتا تھا اور پھر سارا وقت اس کے ساتھ گزارتا تھا۔ عشاء نے جاب چھوڑ دی تھی مگر اس نے عادل کو اسفند کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ کس منہ سے کہتی کہ وہی اسفند رحیم جس کی وہ تعریفیں کرتے نہیں تھکتی تھی دراصل نہایت برا انسان ثابت ہوا تھا۔

”اب کن سوچوں میں گم ہو؟“ اس کی طویل خاموشی سے اکتا کر عادل نے پوچھا۔ وہ بے وجہ مسکرا دی اور کوئی جواب دیے بغیر دوبارہ ششے سے باہر دیکھنے نکلے۔ عادل نے مسکراتے ہوئے اپنا بایاں بازو اس کے کندھوں کے گرد پھیلا لیا۔

”سب کچھ بھول جاؤ نا..... میں کبھی یہ نہیں جتاؤں گا کہ تم اس جاب کی وجہ سے مجھے اگنور کرتی رہیں یا مس بی ہو کرتی رہیں یا بے وجہ ایک غلط شخص کی لچھے دار گفتگو سے متاثر رہیں..... سب بھول جاؤ..... جو ہوا سو ہوا..... ارے ہاں اس سے مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک چائیز کیکل کے یہاں جڑواں بچے ہوئے تو انہوں نے بچوں کے نام رکھے ”جوہو“ اور ”سوہو“ یعنی جوہو سوہو ہا ہا ہا..... لوگ کیسے کیسے لطیفہ بنا لیتے ہیں نا۔“

وہ بہت محبت سے اپنے مخصوص انداز میں بات کر رہا تھا۔ جب کہ عشاء حیران ہو گئی اس کے زبردست قیاس پر۔ وہ اپنی بے وقوفی کے متعلق سوچ کر ہی تو پریشان تھی۔ سب سے بڑا ہچکا اسے عادل کے منہ سے اسفند رحیم کا نام سن کر لگا تھا۔ یعنی وہ جانتا تھا کہ عشاء اس وجہ سے پریشان ہے۔

”میں تو آپ کو بہت بے وقوف سمجھتی تھی عادل!“ وہ بے ساختہ کہہ گئی۔

عادل نے بلاوجہ ایک اور تہقید لگا لیا پھر اس کے سر پر محبت سے ایک چیت رسید کر کے بولا۔

”اور میں تمہیں بہت عقل مند سمجھتا تھا۔“ عشاء مسکرا دی۔

”ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکے اور ہم دونوں کے اندازے ایک دوسرے کے بارے

میں غلط ثابت ہوئے۔“

وہ گاڑی آکس کریم پارلر کے باہر روک کر مزید گویا ہوا۔ عشاء نے گہری سانس بھری پھر بولی۔

”نہیں عادل..... آپ کا اندازہ درست تھا۔ میں بے وقوف ہوں مگر آپ سچ سچ ذہین واقع ہوئے

ہیں۔ آپ کو بہت پہلے اندازہ ہو گیا تھا کہ ”نہن علی“ ایک فلاپ ڈرامہ ہے..... ہے نا..... ہے نا۔“ وہ اس کی جانب مڑ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

آکس کریم پارلر کے گلاس ڈور سے ہی اندر موجود ہجوم کا اندازہ ہو رہا تھا۔ جب ہی وہ گاڑی میں بیٹھے

رہے تھے۔

”ارے میری جان! آپ شرمندہ مت ہوں..... یہ صرف آپ کے ساتھ نہیں ہوا۔ بہت سے لوگ

اس عورت کو مظلوم سمجھتے تھے۔ دراصل یہ ہماری قوم کی کمزوری ہے تم مانو یا نہ مانو مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں جب کوئی عورت رورور کر اپنی زندگی کے المیوں پر روشنی ڈالتی ہے تو ایک زمانہ اس کی مدد کو آگے بڑھ آتا ہے۔ جب کہ ایک سومر دل کرمی روئیں تو کوئی انہیں عورت کے مقابلے میں مظلوم نہیں سمجھتا۔“

وہ بہت نرم لہجے میں بات کر رہا تھا۔ تاکہ عشاء کو اپنا موقف سمجھا سکے۔

”حالانکہ ہمارا معاشرہ ایک میل ڈومینڈ معاشرہ ہے۔ یقین کرو عشاء! اس دن فاطمہ بھابھی کی باتیں سن کر میرے ذہن کی بہت سی الجھنیں دور ہو گئیں۔ میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے۔ ہم اندھا دھند ایک غلط راستے پر چلے جا رہے ہیں ہم کیوں اپنے آپ کو بے کار کے مسکوں میں الجھاتے ہیں۔ امریکہ بہادر ہمیں ایک نام نہاد صحت مند سوچ تحفتا دان کر دیتا ہے اور ہم اس کے اوپر اپنا آپ قربان کر دینے کی حد تک سوچنے لگتے ہیں۔“

ہم یہ بھی نہیں سوچتے کہ ان کا معاشرہ ہمارے معاشرے سے مختلف ہے اور ان کے مسائل کو اپنے مسائل مان کر ان پر کڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ فاطمہ بھابھی کی باتیں سن کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہمارے مسائل کا حل تو چودہ سو سال پہلے ہمیں ہماری کتاب میں بتا دیا گیا تھا پھر ہم کیوں اپنے مسائل کے لیے ادھر ادھر لڑکھتے ہیں۔

چپھلے جمعہ کو میں نے مولانا صاحب کے خطبے کو بہت دلجمعی سے سنا اور یقین کرو بہت سی باتیں ہٹا چلیں۔ میرے ذہن کی بہت سی رہیں کھلیں۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے جان بوجھ کر خود کو آگہی سے دور رکھا ہوا ہے۔ میں کسی امام مسجد کو دوست نہیں بنا سکتا اور میں خود میں اور کسی مذہبی اپروچ کے بندے میں بہت فرق محسوس کرتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میں خود کو بہتر سمجھتا تھا مگر جب میں نے اپنا موازنہ ان لوگوں سے کیا تو مجھے وہ بہتر لگے۔

یہ این جی اوز جو ہمارے معاشرے میں ایسی سوچ انجیکٹ کرتے ہیں کہ عورت اور مرد کے درمیاں کھلی جنگ ہے اور فلاں فلاں یہ دراصل ہمارے دشمنوں کے آلہ کار ہیں۔ میں آج کل جس مسجد میں نماز جمعہ ا کرنے جاتا ہوں وہاں کے امام بہت اچھے ہیں۔ میں ان سے اکثر مسئلے مسائل پر گفتگو کرتا رہتا ہوں انہوں نے مجھے ایک بہت گر کی بات بتائی۔

ایک دن باتیں کرتے کرتے کہنے لگے۔ ”جس شخص کو عزت پیاری ہوتی ہے وہ کبھی بھی اس طرح سے دنیا کے سامنے آ کر دوا دیا نہیں چھاتا کیونکہ وہ خوف زدہ ہوتا ہے جب کہ جس شخص کے لیے عزت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی وہی پورے معاشرے کے سامنے اس طرح بلند و بانگ شور کرتا ہے۔“

وہ مزید کہنے لگے کہ عادل صاحب آپ خود سمجھ دار ہیں۔ اس مثال کو آپ ان ”محترمہ“ کے اوپر اٹو کر کے دیکھیں۔ یہ خاتون خوف زدہ نہیں ہیں بلکہ غرور ہو کر ایک ایسے ایٹھو پر بیان دیتی پھر رہی ہیں جس نے اسلامی پوائنٹ آف ویو سے وہ قطعاً ناواقف ہیں۔“

عادل بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا کیونکہ ان کی گاڑی دیکھ کر آکس کریم پارلر کا ویٹر آرڈر نے آ گیا تھا۔

”ونیل اور چاکلیٹ کراچی۔“ عادل نے آرڈر دیا۔

عشاء اب بھی اس کی جانب حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اسے ہمیشہ لگتا تھا کہ عادل کی ذہنی اپروچ ابھی تک کھلنڈرے لڑکوں جیسی ہے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی باتیں عادل نے کی ہیں۔

”چلو اب ایسے مت دیکھو مجھے جیسے میں ہی آئس کریم ہوں۔“ وہ پھر ٹریک بدل کر بولا تھا۔
 ”آپ کو نہیں دیکھوں تو کس کو دیکھوں..... کسی اور کو دیکھوں گی تو گناہ ملے گا نا؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
 اس کے جواب نے عادل کو بہت لطف دیا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

”ارے واہ..... یہ ہوئی نامسز عادل والی بات..... اب تو تمہیں دو کپ آئس کریم کھلانی پڑے گی۔“ وہ اسے چڑا رہا تھا۔

”ہاں پلیز..... مجھے دو ہی کھانی ہیں..... ایک ونیلا دوسری اسٹرابیری..... دو ہی لا کر دیجئے اب.....“ وہ بچوں کی طرح مچل کر بولی۔

”اچھا بابا..... لاتا ہوں مجازی خدا کے منہ سے کوئی عقل کی بات نہ سننا اسے مزدوری پر لگائے رکھنا۔“ وہ مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کرتا گاڑی سے اتر کر باہر کی جانب چل دیا۔

عشاء نے مسکراتے ہوئے سیٹ کی پشت سے سر نکا دیا۔
 اسے خوشی تھی کہ وہ بھٹکنے سے بچ گئی۔ اس کی سوچ میں جو خفی رنگ آتا جا رہا تھا وہ اسے بھٹکانے کو کافی تھا۔ وہ خوش تھی کہ وہ اس خفی رنگ کے اثر سے باہر نکل آئی۔ اسے خوشی تھی کہ اسے اچھا سلجھا ہوا شریک سفر ملا۔ وہ خوش تھی کہ وہ ”فلاح“ سے نکلی تھی۔ مگر حقیقی ”فلاح“ کے راستے پر گامزن تھی۔



عدم کا افسانہ ہے دنیا

دارالامان میں ایک سنگدل عورت نے قرآن پاک شہید کر ڈالا۔

لاہور (نامہ نگار) دارالامان میں ایک سنگدل عورت نے قرآن پاک کے ٹکڑے کر کے اسے شہید کر ڈالا۔ تفصیلات کے مطابق شہر کے نواحی علاقے میں موجود ایک دارالامان میں مسماۃ ”ت“ نے نہ صرف قرآن پاک کی بے حرمتی کی بلکہ اللہ اور رسول ﷺ کی شان میں نازیبا کلمات بھی کہے۔ دارالامان کے حکام نے ”ت“ کو روکنے کی کوشش کی مگر ”ت“ نے حملہ کر کے ایک اہلکار کو زخمی کر ڈالا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ”ت“ اس وقت نشے کی حالت میں تھی اور وہ پہلے بھی اللہ اور رسول کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کرتی رہی ہے۔ شہریوں نے اس واقعے پر احتجاج کرتے ہوئے ”ت“ کے خلاف سخت سزا کی اپیل کی۔ پولیس نے ملزمہ کو گرفتار کر کے واقعہ کی تحقیقات شروع کر دی ہیں۔



”میں آج شام میں فارغ ہوں۔ میں چاہ رہا تھا کہ آپ بھی فارغ ہوں تو ڈنر کے لیے چلتے ہیں۔“
 منائل نے استغجاب آمیز حیرت میں گھر کر ہاتھ میں کپڑے کا رڈلیس کو دیکھا۔ یہ خیال ہی بہت خوش کن تھا کہ جس کی موجودگی کو ہمہ وقت آس پاس محسوس کرتی تھی اس بے حد مصروف شخص کو ایک ڈیڑھ ماہ بعد ہی کبھی مگر بہر حال اس کا خیال آ جاتا تھا۔

”اگر آج مصروف ہیں تو پرسوں کا پلان کر لیتے ہیں کیونکہ کل میں آپریشن تھیر میں مصروف ہوں۔“
 اس کی لمحہ بھر کی خاموشی کو اس کی مصروفیت خیال کرتے ہوئے صفوان نے نئے سرے سے پروگرام

ترتیب دیا۔

”نہیں۔“ اس نے قطعیت سے کہا پھر لمحہ بھر کا توقف کر کے بولی۔

”آج ہی چلتے ہیں۔ آپ سات بجے مجھے یک کر لیجئے گا۔“

دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہوا تو اس نے مسکراتے ہوئے کارڈ لیس کو دور بیڈ پر پھینک دیا۔ وہ خود کاؤچ پر دونوں ٹانگیں سینے لیپ ٹاپ گور میں رکھے بہت دیر سے اسی حالت میں بیٹھی تھی۔ اسے ہر حال میں ایک دارالامان کو چند خیر حضرات کی جانب سے سلائی مشینوں کی فراہمی پر مشتمل یہ دستاویز مسز شہلا قمر کی میز پر پہنچانی تھی اسی لیے وہ کافی دیر سے غیر ترتیب شدہ ڈیٹا کو مرتب کرنے میں مصروف تھی۔ ویسے تو وہ ہر کام میں اتنی ہی جانفشانی سے کرنے کی عادی تھی مگر جو کام ہیڈ آفس کی طرف سے اسے سونپا جاتا تھا وہ اس کام کو مزید محنت سے سرانجام دیتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا کوئی بھی کوئیگ یا مسز شہلا قمر خود یہ سمجھیں کہ وہ اپنے اور ان کے سچ رشتے کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہے اسی لیے وہ جب سے آفس سے واپس آئی تھی آفس ہی کے کام میں مصروف تھی لیکن پانچ منٹ کی ایک فون کال نے اس کی ساری توجہ کہیں اور مبذول کروا دی تھی۔

”آج مصروف ہو تو پرسوں کا پلان کر لیتے ہیں۔“

مسکراتی آنکھوں اور متشتم ہونٹوں کے ساتھ اس نے بیڈ پر پڑے کارڈ لیس کو نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے صفوں کی نقل اتاری۔ وہ کم گوتھا اور منال کو اس کی اس عادت سے سخت چڑھتی۔

”مس منال مرقعی! آپ کے حصے میں ایک نہایت بورنگ شخص آیا ہے۔“

لیپ ٹاپ کو بند کر کے سائنڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے خود کلائی کی۔ اس کا موڈ خوشگوار ہو چکا تھا گھڑی کی سوئیاں چار کے قریب پہنچی تھیں سات بجنے میں بہت وقت باقی تھا مگر وہ سب چھوڑ چھاڑ کر وارڈ روم کھول کر شام کو پہننے کے لیے ڈریس منتخب کرنے لگی بہت غور و خوض کے بعد اس نے نیوی بلیورنگ کا لباس نکالا تھا۔ جب سے اسے پتا چلا تھا کہ صفوں کو یہ رنگ پسند ہے تب سے اس نے اس رنگ کے کافی ڈریس خریدے تھے۔ کپڑوں کے انتخاب سے فارغ ہو کر وہ آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

ایک سال قبل جب صفوں کے نام کی انگوٹھی پہننے کا موقع آیا تھا تو اس نے گھر میں ایک ہنگامہ مچا دیا تھا وہ ابھی یا کبھی بھی شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ سوشیا لوجی میں ماسٹرز کرتے ہی اس کے عزائم بہت بلند ہو چکے تھے۔ وہ خود کو عورتوں کے حقوق کی سب سے بڑی علمبردار سمجھنے لگی تھی۔ اس کے پاپا تو اس کی ہر روش سے محبت کرتے تھے مگر می انکلوی بیٹی کی اس آزادانہ روش کو دیکھ کر ہونے لگتیں پھر ایک دن اکتا کر بہت غصے سے انہوں نے اپنے شوہر صاحب سے شکایت کر ڈالی۔

”آپ کی بیٹی عاصمہ جہانگیر بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔“

”ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ..... اچھی بات ہے۔ بہت اچھی بات ہے۔“

وہ کیمسٹری کے پروفیسر تھے اور ان کی ساری دلچسپی نامیاتی غیر نامیاتی اصولوں اور فارمولوں تک محدود تھی۔ اس وقت تو انہوں نے بیٹی کو سراہ کر اپنی شریک حیات کا موڈ خراب کر دیا مگر اتفاق سے اسی رات انہوں نے ٹی وی کے کسی پروگرام میں متعلقہ خاتون کو دیکھ لیا۔

”میرا خیال ہے ہمیں منال کے لیے آئے ہوئے پروپوزل کو سنجیدگی سے زیر غور لانا چاہیے۔“

صبح ناشتے کے وقت وہ اپنی بیگم سے کہنا نہیں بھولے تھے۔ اس طرح سے بہت جھان پھانک کے بعد منال کی مرضی سے اس کے جملہ حقوق صفوں قمر کے نام منسوب کر دیے گئے۔ ماسٹرز کے دوران تھیسز اور پراجیکٹ کے سلسلے میں منال کا مسز شہلا قمر کی این جی او میں بہت آداب تھا۔ انہیں چاہنے اس کی کون سا راپارہہ آئی کہ اسے اپنے لائق فائق ہونہار بیٹے کے لیے پسند کر لیا۔ منگنی کے بعد وہ ان ہی کی این جی او کے ساتھ کام کرنے لگی تھی۔

منگنی سے پہلے اس کی صفوں قمر کے ساتھ صرف ایک باضابطہ ملاقات ہوئی تھی۔ وہ نیو روسر جن تھا۔ زندگی میں اس کی دلچسپیاں اور ترجیحات منال کی زندگی میں اس کی دلچسپیوں اور ترجیحات سے بہت مختلف تھیں مگر پھر بھی ایک چھوٹی سی انگوٹھی نے منال کو دونوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ اب کام کے علاوہ جو ایک نام اسے یاد رہا تھا وہ صفوں قمر تھا۔ ہمیشہ اپنی مرضی کرنے والی منال اب چھوٹی چھوٹی باتوں میں صفوں کی رائے کو اہمیت دینے لگی تھی۔ ہمیشہ اپنے آپ کو کوئی قسم کی چیز سمجھنے والی منال کو اب عام لڑکیوں کی طرح صفوں کی طرف سے موصول ہونے والے کارڈز گفتش اور پھولوں کا انتظار رہنے لگا تھا۔

وہ صفوں کی طرف سے ملنے والی ہر دعوت پر نہ صرف لیک کہتی تھی۔ بلکہ خاص طور پر تیار ہی بھی کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ڈیڑھ ماہ بعد ملنے والی یہ دعوت اور یہ شام اس کے لیے بہت خاص تھی۔ سات بجنے میں منال منٹ ابھی باقی تھے جب وہ تیار ہو کر پورچ میں آکھڑی ہوئی۔ پھپھو سے اجازت وہ پہلے ہی لے چکی تھی۔ منال کے می پاپا ایک ہفتہ قبل حج کے لیے جدہ روانہ ہوئے تھے۔ پھپھو منال کی تنہائی کے خیال سے ان کے یہاں رہ رہی تھیں۔ پورچ میں کھڑے کھڑے اسے اپنے موبائل فون کا خیال آیا جو چارج کے لیے لگا تھا وہ دوبارہ بیڈ روم میں آگئی۔ موبائل فون اٹھانے سے پہلے اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں ایک بار پھر برش چلایا ابھی وہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر سراپنہ میں مشغول تھی کہ موبائل کی بپ بجی۔ موبائل کی اسکرین پر مسز شہلا قمر کا نمبر آ رہا تھا۔ اس نے کچھ حیران ہوتے ہوئے موبائل کان سے لگا لیا۔ اس کا موڈ فون سننے کے بعد آف ہو گیا۔ وہ کافی دیر تک برے برے منہ بنانے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے موبائل فون اٹھا کر کچھ نمبر پُیش کیے تھے وہ صفوں کو کال کر رہی تھی۔

”ٹوہیل ودیو منال..... ٹوہیل ودیو۔“

سات بج کر دس منٹ پر دوبارہ کار پورچ میں کھڑی وہ خود کو کوس رہی تھی۔ اب اسے مسز شہلا قمر کے ڈرائیور کا انتظار تھا۔

☆ ☆ ☆

”میں کیوں ہوں.....؟ دادو جی! مجھے کیوں پیدا کیا گیا؟“ اس نے ان کی گود میں ہلکتے ہوئے سوال کیا۔ ان کے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے اس قسم کے سوالوں کے آگے خود کو دبے بس محسوس کرتی تھیں..... مسلسل پڑنے والے تھپڑوں کے باعث اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنسوؤں کی نمی کی وجہ سے بال رخساروں پر چپک گئے تھے۔ اسے تھپڑوں، ڈنڈوں، لٹاؤں سے مارا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا

ہاتھ دروازے میں آنے کے باعث بری طرح کچلا گیا تھا۔ اس کی دادو جی یہ حالت دیکھ کر ایک بار پھر آبدیدہ ہو گئیں۔ ایسے تو کوئی جانور بھی انسان کو نہیں رکھتا ہوگا جیسے اس کے باپ نے اسے رکھ ڈالا تھا۔
”ابو کو اگر مجھ سے اتنی نفرت تھی تو انہوں نے مجھے پیدا کیوں کیا..... وہ اگر مجھے..... دنیا میں نہ لاتے..... تو ہم دونوں سکون سے رہ سکتے تھے۔ وہ بھی..... اور میں بھی..... میرے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے دادو جی۔“

وہ ان کی گود میں سرگھسائے مسلسل سسک رہی تھی۔ اس کے لیے یہ مار پیٹ کوئی نئی بات نہیں تھی مگر اس مار پیٹ کے لیے اس کی ماں نے آج جو جواز گھڑا تھا وہ کم از کم اس کے لیے بہت نیا تھا۔
اس کی زندگی کی کہانی وہی تھی جو سنڈریلا کی کہانی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ سنڈریلا کی سوتیلی ماں کے مظالم اس لیے سہتا پڑے کیونکہ اس کی ماں مرگئی تھی جبکہ اسے اس لیے سوتیلی ماں کو برتاؤ پڑا تھا کہ اس کی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی کیونکہ وہ اس کے باپ جیسے تنگ نظر مڈل کلاس عام آدمی کے ساتھ خوش نہیں تھی۔ ماں پاس رہی نہیں باپ پاس تھا مگر اس نے پاس آنا چھوڑ دیا۔ اسے دادو جی نے پالا تھا۔ اس کے ابو نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دینے کے دو ماہ بعد ہی دوسری شادی کر لی تھی۔ ابتدا میں اس کی سوتیلی ماں کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہوئی جب دو سال بعد عمران کی گود میں آئی تو انہوں نے خود بخود اس کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ انہیں اس کا وجود بہت بری طرح کھٹکنے لگا تھا۔

بچپن میں زیادتی کا زیادہ احساس اس لیے نہیں ہوتا کہ بچہ ہر ظلم و ستم پر چیخ چلا کر احتجاج لیتا ہے۔ اور اس کی بھڑاس نکل جاتی ہے۔ وہ بہت بڑی بڑی باتیں بھی بہت آرام سے بھول جاتا ہے مگر شعور آنے کے بعد رو کر چلا کر اپنے غصے کا اظہار کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر اس انسان کے لیے جس کی پروا کرنے والے اس کے ارد گرد موجود نہ ہوں۔ وہ ہر زیادتی کا بدلہ اپنے آپ سے لینے لگی۔ امی کی ڈانٹ چھڑکھا کر دادو جی کی گود میں آ کر رو لینا اور پھر تھوڑی دیر بعد سب کچھ بھلا کر پھر سے اپنی ننھی مٹی دنیا میں گم ہو جانا..... یہی اس کے بچپن کی خوشگوار یادیں تھیں کیونکہ دادو جی ہر بار پٹ کر آنے کے بعد اسے اپنی بانہوں میں بھر لیتیں اس کے بالوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے اس کے بدن کو سہلاتیں اور پھر اسے ننھے ننھے قہقہے کہانیاں سنا کر بہلایا کرتیں۔ وہ اس کے لیے اتنا ہی کر سکتی تھیں۔ جب ذرا بڑی ہوئی تو کموں چھڑوں کے ساتھ جو ایک اور چیز اسے ملنا شروع ہوئی وہ طعنے تھے۔

اسے اکثر ابو کے گھر آنے کے بعد ہوتا چلتا کہ آج اس نے امی کو کتنا ستایا ہے۔ اس نے عمیر کے نئے فراک کو قینچی سے کاٹ ڈالا ہے۔ کیونکہ وہ اس فراک میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس نے چھوٹے خرم کا فیڈر پنی لیا ہے اس کا مقصد صرف اور صرف خرم کو بھوکا رکھنا تھا۔ امی کی ایسی باتیں سن کر وہ خوفزدہ ہو جاتی۔ اس وقت ابو حکمران ہوتے تھے اور امی ظالم فریادی۔ انصاف کا تقاضا پورا کرنے کے لیے اس کو مارنا ضروری ہوتا تھا۔ وہ مار کھانے کے لیے زندہ تھی یا زندہ رہنے کے لیے مار کھا رہی تھی۔ اسے بہت عرصہ تک سمجھ میں نہ آیا مگر وقت اس کی تانجی کی وجہ سے رک نہیں سکتا تھا سو وقت گزرتا رہا اور وہ بڑی ہوتی گئی۔

اس کی اسکولنگ اس کی گھٹیا ڈریسنگ اور اس کا دوسرے درجے کا انداز پرورش یہ سب کچھ اس کی امی کے ایماء منشا کے تحت ہوا۔ ابو نے کبھی یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ ان کے دوسرے بچوں کی نسبت اتنی ڈل اور ذرخیر کیوں ہے۔ اس کی رنگت جو بچپن میں اچھی بھلی صاف ہو کر تھی اب اتنی زردی مائل کیوں ہو گئی ہے۔ اس کے کپڑے اتنے برے رنگوں کے کیوں ہوتے ہیں۔ اس کی مارکس شینس پر اتنے برے گرینڈ کیوں ہوتے ہیں؟ یہ سوالات اس کے والدین کے سوچنے اور کرنے کے تھے مگر انہیں کوئی کام سوچ سمجھ کر کرنے کی عادت ہوتی تو شاید ان کے درمیان طلاق کی نوبت نہ آتی۔

عمیر ہر لحاظ سے اس سے بہتر تھی۔ ہر ایک کی توجہ لمحوں میں اپنی طرف مبذول کروا لینے والی۔ ان دونوں کی شخصیت میں بلا کا تضاد تھا۔ جس کی وجہ سے اکثر لوگ انہیں بہنیں ہی نہیں سمجھتے تھے۔ اس صورت حال میں امی کے چہرے پر عجیب سی استہزائیہ مسکراہٹ پھیل جاتی جو اسے پزل کر دینے کو کافی ہوتی تھی۔
دادو جی کے علاوہ اگر اس گھر میں کسی اور کو اس کا احساس تھا تو وہ اس کا بھائی خرم تھا۔ امی نے عمیر کی طرح خرم کے دل میں بھی سوتیلی پن کے جراثیم انجیکٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ زیادہ کامیاب نہیں ہو پائی تھیں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس نے خرم کو گود میں کھلایا تھا۔ خرم جب پیدا ہوا تو وہ پانچ سال کی تھی۔ دادو جی کو بھی اپنے اکلوتے پوتے سے بہت محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ خرم عمیر کی نسبت اس سے زیادہ قریب تھا۔ وہ اپنے اسکول سے اکثر اس کے لیے چاکلیٹس وغیرہ لے آتا تو اس کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔ کیونکہ اس کے اپنے اسکول کی کینٹین میں اس قسم کی چیزیں نہیں ملتی تھیں۔ دراصل اس کے لیے اسکول کا وہی معیار دیکھا گیا تھا جو امی کے دل میں اس کا اور اس کی محبت کا تھا۔ ان سارے حالات میں اگر ابو پہلی اولاد ہونے کے باعث کچھ تو قناعت لگا رہے تھے تو یہ سراسر ان کی غلطی تھی۔

اس کی زندگی نے چند سال تک یہی چلن اپنائے رکھا۔ اس عمر کو پہنچنے تک وہ ہر چیز برداشت کرنا سیکھ گئی تھی۔ ابتدا میں طعنے برداشت کرنا بہت مشکل لگتا تھا مگر جب طعنوں کے ساتھ الزام بھی لگنے لگے تو احساس ہوا طعنے برداشت کرنا تو بہت عام سی بات ہے۔

بات سچ سچ بہت عام سی تھی۔ محلے میں سے ایک بڑی عمر کی خاتون اس سے اپنے بیٹے کو خط لکھوانے آئی تھیں۔ وہ عرصہ دراز سے کراچی میں مقیم تھا اور اس نے ماں کی خیر خبر نہ لی تھی۔

”میرے پیارے اختر! مجھے تمہاری بہت یاد آتی ہے۔ تم کب مجھ سے ملنے آؤ گے۔“

پہلا فقرہ انہوں نے یہی لکھوایا تھا اور امی نے بھی شاید یہی فقرہ سنا تھا۔ اس کے بعد مزید کچھ سننے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ انہوں نے اس کے ہاتھ سے کاغذ چھین کر دیا اور ایسا مچا کر شروع کر دیا۔ اس کی ہر تردید سے ان کے دل میں یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ وہ بڑھ چکی ہے اور اس نے اتنی سی عمر میں لڑکوں سے خط و کتابت شروع کر دی ہے۔ ان کے اس قدر برا فروخت ہو جانے سے بیٹے کو خط لکھوانے والی اماں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے واپس چلی گئی تھیں۔ دادو جی کی طرح وہ بھی ترس کھانے کے علاوہ اس کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

ابو کے گھر آنے پر امی نے اس کی یہ محبت بھری چشمی ان کے سامنے رکھ دی۔ اس کے بعد اسے طلب

کیا گیا۔

”ابو! میں نے کچھ نہیں کیا..... میری غلطی نہیں ہے۔ ابو!“

ان کے شے سے خائف ہو کر وہ اپنی صفائی دیتے ہوئے بولی۔

”میں جانتا ہوں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے..... غلطی میری ہے..... میرے نصیبوں کی ہے جو میرے گھر تمہارے جیسی اولاد پیدا ہوئی۔“

انہوں نے اپنے پاؤں سے بھاری سلیپر اتارتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد بھی وہ مسلسل بولتے رہے تھے۔ مگر کمرے میں سلیپر کی آواز تھی اس کے بلکنے اور سننے کی آواز تھی۔ ایک گھنٹے کے بعد ہر طرف سکوت چھا گیا۔ دادو جی بہت مشکل سے اسے تھسٹ کر اس کے کمرے تک لاپائی تھیں۔ اس رات وہ بہت روٹی تھی بہت داویلا کیا تھا بہت واسطے دیے تھے مگر اس کی پکار سننے والا کوئی نہیں تھا یا شاید پکار سننے والے تو بہت تھے مگر جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

”نبی! آج تجھے تپتیر رحمان سے ملنا ہے۔“

اس نے اب کی بار ذرا..... غصہ سے اس سمجھنے والے موٹے حوالدار سے کہا اس کی بیٹی اندر جانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بظاہر وہ ہنری مائل رنگ کی فائل میں سرگھسانے کچھ لکھنے پر دست بردار کے چائے پینے میں مصروف تھا مگر ہر سات آٹھ منٹ بعد وہ منابل کو بغور جائزہ لے کر سر جھکا لیتا۔ منابل نے سیاہ چادر بہت اچھی طرح سے لپیٹ رکھی تھی لیکن اس کے باوجود اسے اس ماحول میں عجیب سی الجھن ہو رہی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس جگہ کا ماحول برا ہو گا مگر اتنا برا ماحول وہ توقع نہیں کر رہی تھی۔

”نبی! میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ سیف اللہ صاحب تفتیش کر رہے ہیں۔“

منابل کی بات پر اس حوالدار نے تیس دانتوں کی دوبارہ نمائش کرتے ہوئے کہا۔ اس کا جی چاہا اس بات پر اس شخص کو خوب جلی کٹی سائے مگر اسے خاص طور سے تاکید کی گئی تھی کہ اس جگہ کسی قسم کا تماشا کھڑا نہیں ہونا چاہیے اسی لیے وہ غصہ کرنے سے احتراز برت رہی تھی۔

”کیا آپ مہربانی فرما کر مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کے سیف اللہ صاحب اس تفتیش کا اختتام کب کریں گے۔“

اس نے طنزیہ انداز میں اس خزانہ شکل والے حوالدار کو گھورتے ہوئے کہا۔

”اوہ نبی! وہ سر پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگا پھر ہنس چکا تو بولا۔“

”صاحب! لوگ اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔ جب خواتین سے تفتیش کرتے ہیں تو اس کا

اختتام اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔“

”کیا آ آ.....؟“ وہ ایک دم سے اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایسی ویسی کوئی بات تو اس کے

ذہن میں بھی نہیں آئی تھی۔ اس کے یہاں بچنے کے بعد سبز شہلا قریشی قمر کا دو بار فون آ چکا تھا لیکن تپتیر رحمان

سے اس کی ملاقات ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ حوالدار کی بات سننے کے بعد اسے اپنے غصے پر قابو نہیں رہا تھا۔ وہ لکڑی کے بنے دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہو گئی۔

میز کے دوسری طرف وردی میں ملبوس وہ شخص جو بھی تھا کافی اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔ منابل کو دیکھ کر وہ گڑبوا یا نہیں تھا بلکہ اس نے حیر سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کاشت تھی جس نے منابل کو مزید تاؤ دلایا۔ اس آفسر کے سینے پر اس کے نام کا بیج لگا تھا وہ سیف اللہ صاحب ہی تھے۔

”مجھے تپتیر رحمان سے ملنا ہے بلکہ مجھے اسے اپنے ساتھ لے جانا ہے۔ تیل پیپر (ضمانت کے

کاغذات) میں آپ کے ماتحت کو دے چکی ہوں اور امید ہے کہ آپ کو فون بھی آچکا ہو گا۔“

وہ اسے کہا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔ اس آفسر نے بہت جھل سے اس کی بات

سنی پھر کرسی کی سمت اشارہ کر کے بولا۔

”آپ بیٹھے پلیز!“

”میں پچھلے آدھے گھنٹے سے بیٹھی ہوں اور میں مزید نہیں بیٹھ سکتی اگر میرے بیٹھے کا کوئی فائدہ ہے تو

.....

”نبی! آپ جھیلی پہ سروسوں جمانے والی بات کیوں کر رہی ہیں۔ آخر ہمیں بھی اوپر جواب دینا ہوتا

ہے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر انتہائی سرد انداز میں بولا۔ منابل کو حوالدار کے ”نبی! بی“ کہنے پر اتنا غصہ نہیں آیا تھا

جتنا اس شخص کے ”نبی! بی“ کہنے پر آیا تھا۔

”میں جھیلی پہ سروسوں جمانے کی بات نہیں کر رہی مگر آپ مجھے یہ بتائیے کہ یہ سارا پولیس ڈپارٹمنٹ

آخر کس مرض کی دوا ہے۔ آپ لوگ یہاں بیٹھے سارا دن کرتے کیا ہیں؟ لوگوں کے جان و مال کی حفاظت آپ

سے ہونی سکتی اور عزت کی حفاظت آپ کر نہیں سکتے۔ میں اتنی دیر سے باہر بیٹھی بکواس کر رہی ہوں کہ مجھے اس

عورت سے ملنا ہے۔ وہ..... آپ کا اسٹوڈنٹ حوالدار کہتا ہے کہ صاحب تفتیش کر رہے ہیں اور یہاں صاحب فرما

رہے ہیں کہ ضابطے کی کارروائی بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور..... پھر آپ کہتے ہیں آپ کو اوپر بھی جواب دینا ہوتا

ہے..... کس کو.....؟ اوپر کون ہے.....؟ کس سے ڈرتے ہیں آپ.....؟ میرا تو خیال ہے پولیس ڈپارٹمنٹ اللہ

سے بھی نہیں ڈرتا.....“

”شٹ اپ..... کیا سمجھتی ہیں آپ اپنے کو..... ونی منڈیلا کی کاربن کاپی۔“

وہ شخص اس کی بات کاٹ کر اتنے غصے سے بولا کہ باہر سے سپاہی بھی بھاگ کر اندر آ گیا پھر صاحب

کو ”موڈ“ میں دیکھ کر فوراً واپس چلا گیا۔ سیف اللہ نے اپنے سامنے بڑی فائل اٹھا کر اس کے سامنے میز پر بچھی۔

”یہ کاغذات آپ کی طرف پیش کیے گئے ہیں۔ ان پر آج کی تاریخ میں ساڑھے گیارہ بجے سائن

کیے گئے تھے۔ اب آپ یہ دیکھیے۔“

”اس نے ٹیلی فون سیٹ کا رخ گھما کر اس کی طرف کیا پھر وہ سی ایل آئی کے نمبر پیش کرنے لگا۔“

”یہ دیکھیے..... بارہ..... ساڑھے بارہ..... بارہ چالیس..... سو ایک..... ایک انچاس..... دو.....“

پھر اڑھائی..... پھر ساڑھے تین..... پھر سوا چار..... پھر چار پچاس..... پھر چھ اکیس..... پھر سات..... اور سات سے لے کر اب آٹھ چالیس تک ایک درجن سے زیادہ فون آچکے ہیں کہ اس عورت کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑنا۔“

”اور اب اس پر دیکھیے۔“ اس نے اپنی جیب سے موبائل فون نکال کر اس کے سامنے رکھا۔

”میرے ذاتی موبائل پر بھی کم و بیش اتنے ہی فون آچکے ہیں کہ ضمانت کے کاغذات آ بھی جائیں تب بھی کم از کم آج کی رات اس عورت کو نہیں چھوڑنا۔ آپ کی پارٹی مضبوط ہے تو ان کی پارٹی بھی کسی سے کم نہیں ہے جس دارالامان میں یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ اس دارالامان کو چلانے والی محترمہ ایک ایم این اے کی منظور نظر ہے۔ وہ کسی صورت ملزمہ کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جب آپ لوگوں نے نیل پیپر پر دستخط لیے تو ہم لوگ بھی کورٹ کے باہر موجود تھے۔ آپ لوگوں کو پانچ منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو ہم مزید ریمانڈ لینے میں کامیاب ہو جاتے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ ایسا ہو جاتا تو یقیناً مجھے خوشی ہوتی کیونکہ یہ حدود کا مقدمہ ہے..... غلطی کرنے والے کو ضرور ملتی چاہیے اور کڑی سزا ملنی چاہیے لیکن.....“

اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ ذہنی اضطراب کی نجانے کون سی حد پر تھا کہ اسے سب کچھ بتائے چلا جا رہا تھا۔

”ہمیں کسی سے ذاتی دشمنی نہیں ہے ہمیں کسی کو بے وجہ اپنا مہمان بنائے رکھنے کا بھی شوق نہیں ہے۔ لیکن ہم مجبور ہیں کیونکہ یہ معاملہ جن لوگوں کے درمیان ہے ان کی اپروچ بہت آگے تک ہے۔ ان کی آپس میں دشمنیاں بھی ہیں اور انہیں ایک دوسرے کو مہمان بنائے رکھنے کا بھی شوق ہے۔ آپ کی مسز شہلا قمر اس وقت دارلپناہ کی صفیہ صفدر کے آفس میں موجود معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان کے آفس میں اس وقت دو ایم این اے ایک مشہور سیاسی رکن جو اس وقت حکومت کا حصہ نہیں ہے مگر پھر بھی پاور میں ہے۔ اس کے علاوہ دو مشہور وکیل ہیں۔ وہ سب معاملے کو سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی ہدایت کے بغیر میں کوئی حکم کیسے جاری کر سکتا ہوں۔ جب تک ہمیں وہاں سے آرڈر نہیں مل جاتے ہم کچھ نہیں کر سکتے..... ہم آزاد ہیں..... مگر ہم آزاد نہیں ہیں۔“

وہ خاموش ہوا تو منابل کو ایسا لگا جیسے وہ دوبارہ بہت دیر تک بول نہیں سکے گا۔ اس کے چہرے پر جھج

جھج ایک عجیب سی تھکن اور پڑمردگی نے ڈیرا ڈال لیا تھا۔

”اس ملک کا قانون اندھا ہی نہیں ہے بلکہ مکمل طور پر اپنا جھج ہو چکا ہے۔ ہمارے ٹکٹے میں برائی ہونی چاہیے لیکن ہم خود برائی کے ٹکٹے میں ہیں..... آپ کے کہنے پر میں ظہیر رحمان کو چھوڑ دیتا ہوں..... آپ مجھے میری نوکری کی ضمانت دیجئے۔“

”آئی ایم ساری آفیسر! لیکن میں.....“ منابل کی خود سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ سیف اللہ صاحب اس کوشش و جھج میں دیکھ کر استہزائیہ انداز میں ہنسنے۔

”آپ کو ایکسکیوز کرنے کی ضرورت نہیں ہے..... شرمندہ ہونے کی بھی کوئی ضرورت نہیں.....“

دراصل آپ جیسے لوگ جو یونیورسٹیوں کا لجنوں سے پانچ پانچ چھ ماہ پہلے پاس آؤٹ ہو کر آتے ہیں وہ اسی طرح جذباتی ہوتے ہیں جیسے آپ ہو رہی ہیں۔ آر۔ لائل کو انڈازہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ کس قسم کا گورکھ دھندا ہے۔ یہاں انسان کو کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے؟ کرا کوٹا کیسے ہو جاتا ہے اور کھٹا کرا کیسے کیا جاسکتا ہے۔ یہ سب آپ کو اتنی جلدی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ آپ مزید دو تین سال اس سسٹم کا حصہ رہیں گی تو آپ کو ہر بات سمجھ میں آ جائے گی پھر آپ کسی پولیس آفیسر کے سامنے اس طرح نہیں بھڑکیں گی جس طرح آپ میرے سامنے بھڑک اٹھی تھی۔ اور پھر آپ کو کسی کے سامنے اس طرح ایکسکیوز نہیں کرنا پڑے گا جس طرح آپ میرے سامنے کر رہی ہیں۔“

وہ ابھی بہت کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر فون کی گھنٹی نے گفتگو کا تسلسل توڑ ڈالا۔ اس سے پہلے منابل کا واسطہ کبھی اس قسم کے آفیسر سے نہیں پڑا تھا بلکہ اس کا واسطہ کسی بھی پولیس آفیسر سے نہیں پڑا تھا۔ اس لمحہ وہ اپنے آپ کو جھج جھج محسوس کر رہی تھی۔ وہ فون پر بات کر رہی رہا تھا کہ منابل کے اپنے موبائل کی بپ بجی۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں سے منابل کو اشارہ کیا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ ”دیکھا میں کہہ رہا تھا نا۔“

مسز شہلا قمر فون پر تھیں۔ وہ اسے ضروری ہدایات دے رہی تھیں۔ ان کی ساری باتیں اسے کس قدر الجھا رہی تھیں۔ اس سے پہلے آفس کی طرف سے ایسی ذمہ داریاں اسے نہیں سونپی گئی تھیں۔ فون بند کر کے وہ سیف اللہ..... کی طرف متوجہ ہوئیں۔ وہ اس کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک جلی ہوئی مسکراہٹ کی پرچھائیں تھیں۔ اس نے دوبارہ منابل کو نشست سنبھالنے کے لیے اشارہ کیا۔ وہ چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

”مبارک ہو..... تصفیہ ہو گیا ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ”کیا آپ جانتا چاہتی ہیں کہ تصفیہ کیسے ہوا۔“

منابل خاموش رہی۔ اس کا خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔ سیف اللہ نے اسے خود ہی بتانا شروع کیا۔ معاملہ کتنے میں طے ہوا؟ پولیس ڈپارٹمنٹ کو کتنا ملا۔ اس کی اپنی جیب میں کتنا گیا؟ پھر اس نے سپاہی کو بلا کر مطلوبہ لڑکی کو بلانے کو کہا۔

اس کے بعد اس نے فائل نکال کر اس کا سرسری جائزہ لیا پھر ایک نظر منابل کو دیکھا پھر وہ دوبارہ فائل پر نظر ڈالی۔ اس کے بعد اس نے دیکھتے ہی دیکھتے فائل کے ٹکڑے کر ڈالے تھے۔

”یہ ہے ایک اسلامی ملک اور یہ ہے اس اسلامی ملک کا قانون۔“

وہ ہنسنے ہوئے کہہ رہا تھا لیکن منابل نظر اٹھا کر اسے دیکھنے کے بھی قابل نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

”میرا نام منابل ہے..... منابل مرتضیٰ۔“ کار پورچ سے لاؤنچ میں داخل ہوتے ہوئے وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ مسز شہلا قمر کا ڈرائیور ان دونوں کو یہاں ڈراپ کر کے گیا تھا۔ ان ہی کے کہنے پر ڈرائیور کی موجودگی میں اس نے ظہیر رحمان کو مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے گھر کے گیٹ سے اندر

داخل ہونے کے بعد خود کو متعارف کروایا۔ تطہیر نے اسے مخاطب کرنے یا مسکرانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ سر سے پیر تک بھورے رنگ کی ملکتی سی چادر میں ملفوف تھی۔

”یہ میرا گھر ہے۔ جب تک آپ کی رہائش کا کہیں اور بندوبست نہیں ہو جاتا آپ یہاں میرے ساتھ رہیں گی۔“

لاؤنج میں داخل ہو کر منابل نے اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔ فی الحال وہ اس کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم نہ کر سکی۔ اس کا حلیہ میلا میلا سا تھا۔ شاید اس نے بہت دن سے منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ منابل اسے لے کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

”یہاں آپ اطمینان سے رہیے کوئی آپ کو ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ اس گھر میں میرے اور میری پھپھو کے علاوہ صرف ملازم ہیں اور ملازم آپ کی مرضی کے بغیر آپ کو مخاطب کرنے کی کوشش بھی نہیں کریں گے۔“

وہ اس سے کہتے ہوئے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔

”آپ کو بھوک لگی ہوگی؟ آپ فریش ہو جاؤ میں کھانا لاتی ہوں۔“

اب اس کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا۔ تطہیر کے لیے کپڑے نکال کر بیڈ روم پر رکھے پھر سیڑھیاں اتر کر لاؤنج میں آ گئی۔ کن اکھیوں سے پھپھو کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ چکن میں آ گئی۔ پھپھو کو وہ یہی بتا کر گئی تھی کہ صفوان کے ساتھ ڈنر کے لیے جا رہی ہے اس لیے اس وجہ احتیاط برتنا پڑ رہی تھی۔ ملازمہ سے بھی کھانے کے لیے کہہ نہیں سکتی تھی۔ وہ خود ہی ٹرے میں چیزیں رکھنے لگی۔

”بابی! آپ کھانا کھاؤ گے؟“ پروین نے اس کے پیچھے سے آ کر لمحہ بھر کو ڈرا دیا تھا۔ وہ ان کے چوکیدار کی بیوی تھی اور پھپھو کے سوجانے تک ان کے پاس ہی بیٹھی ہوتی تھی۔

”پھپھو سو گئیں؟“ اس نے پروین کی بات کا جواب دیے بغیر استفسار کیا۔

”ہاں جی!“ اس کا خیر دور نہیں ہوا تھا۔ وہ ”بابی“ کے خاص الخاص ڈنر اور اس کی تمام تیاریوں سے بخوبی واقف تھی۔

”کھانا گرم کر کے گیلری والے کمرے میں لے آؤ۔“ پھپھو کے سوجانے کا سن کر وہ کافی مطمئن ہو گئی تھی۔ انہیں اگر پتا چل جاتا کہ ان کی جیتی پالیس انٹیشن سے ہو کر آئی ہے تو وہ اس سے کچھ نہیں کہتیں مگر جدہ فون کر کے ساری رام کہانی کو دو سے دو مرتبہ ضرب دے کر اس کے والدین کو سنا دیتیں اور اسی چیز سے منابل بچتا چاہتی تھی سو محتاط رہنا لازماً تھا۔

”ہائیں بابی.....! گیلری والے کمرے میں؟“ پروین کی باتیں اس کا موڈ خراب کرنے کے لیے کافی تھیں اور یوں بھی اسے وہ ڈنر یاد آ رہا تھا جو ناگزیر وجوہات کی بنا پر موخر ہو گیا تھا۔ وہ پروین کی بات کا جواب دیے بغیر دوبارہ بیڈ روم چڑھ کر اپنے کمرے تک آ گئی۔ کپڑے اٹھا کر اس نے اس کمرے کا رخ کیا جہاں تطہیر رحمان تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھو چکی تھی۔ اور بستر پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے فوراً ٹانگیں سیٹ

لیں۔

”یہ کپڑے بھی تبدیل کر لو۔“ منابل نے بے تکلفی سے کہتے ہوئے کپڑے بستر پر رکھ دیے۔ وہ کن اکھیوں سے اس کا جائزہ بھی لے رہی تھی اور اس کے لیے مناسب رابطہ سٹائل بھی سوچ رہی تھی۔

”عام..... بہت عام..... عام سے بھی عام لڑکی۔“

اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا تھا۔ چند لمحوں بعد پروین کھانا لے کر آئی تو تطہیر کو دیکھ کر اس کی آنکھیں مزید پھیل گئیں مگر منابل کے چہرے پر پھیل چکی تھی دیکھ کر وہ خاموشی سے باہر چلی گئی۔ منابل نے ٹرے تطہیر کی طرف بڑھادی پھر اسے جھجکا دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ کھانا کھاؤ..... میں چلتی ہوں۔“ وہ دروازے کی سمت آئی پھر کچھ یاد آ جانے پر مڑی۔

”کمرے میں لحاف موجود ہے لیکن اگر اور لحاف چاہیے ہو تو اس کبیٹ میں موجود ہے۔“

اس نے الماری کے نیچے بے کبیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

روم ہیٹر پہلے ہی آن کر چکی تھی جس کی بدولت کمرے کا خنک ماحول کسی حد تک گرم ہو چکا تھا۔ اپنی طرف سے اچھے میزبان کی تمام ذمہ داری نباہ کر وہ جانے لگی جب تطہیر نے اسے پہلی مرتبہ پکارا۔ اس کی آواز بہت خوبصورت تھی..... نرم ملائم احساس لیے ہوئے۔

”مجھے جانے نماز چاہیے۔“

منابل نے آنکھیں سیڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر تطہیر کا جھکا ہوا سر دیکھ کر استہزائی سی مسکراہٹ آ گئی۔

”خاتون کافی سے زیادہ ذہین واقع ہوئی ہیں۔ ایک نہایت مشرکانہ حرکت کے لیے کی جانے والی نہایت مسلمانہ کوشش۔“

☆ ☆ ☆

”اللہ میاں جی! پلیز..... پلیز اللہ میاں جی۔“

مصلے پہ بیٹھی وہ آنکھیں بند کیے دیر سے ایک ہی دعا کرنے میں مصروف تھی۔ منہ سے صرف وہ اللہ کو پکارتی تھی اور باقی دعا دل میں کر رہی تھی۔ آج اس کا رزلٹ اناؤنس ہونے والا تھا۔ اس کی اس رزلٹ سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ اس رزلٹ کو لے کر بہت آگے جانے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کا رزلٹ اچھا ہوتا تو وہ اپنے امی ابو پر عادت کر سکتی تھی کہ وہ اتنی بریکار نہیں ہے جتنا وہ اسے سمجھتے ہیں۔

”میں نے آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگا اور اگر کبھی مانگا تو آپ نے مجھے دیا نہیں لیکن میں کوئی شکوہ نہیں کروں گی..... اللہ میاں جی..... میرے پیارے اللہ جی..... مجھے نمبرز دے دیجئے گا۔ مجھے اے گریڈ چاہیے..... پلیز اللہ میاں جی!“

وہ آگے پیچھے ہلتے ہوئے دعا مانگ رہی تھی۔ خرم اس کا اور بغیر کارزلٹ معلوم کرنے کے لیے قریبی اسٹال تک گیا تھا۔ بغیر اس سے چھوٹی تھی مگر وہ دونوں ہم جماعت تھیں۔ کیونکہ میٹرک میں برا گریڈ لانے کے

باعث اس کی پڑھائی ختم کروادی گئی تھی۔ اس کے امی ابو نے اتنے برے نتیجے کی ساری ذمہ داری اس پر ڈال دی تھی۔ اس کی امی بھول گئی تھیں کہ وہ امتحانات میں روٹین سے دوگنا کام کرواتی تھی۔ اس کے ابو بھول گئے تھے کہ امتحان کے لیے کچھ دن قبل انہوں نے اس پر بے چاشنک کرتے ہوئے اس کو روٹی کی طرح دھنک ڈالا تھا۔ انہیں یاد رہا تھا کہ وہ ان کے کسی گناہ کی سزا ہے اور وہ صرف اس لیے پیدا کی گئی ہے۔ کہ ان کی ٹینشن میں ہر آنے والے دن کے ساتھ اضافہ کر سکے۔ اس نے پڑھائی چھڑوائے جانے پر کوئی شکوہ نہیں کیا تھا کیونکہ وہ خود بھی اتنے برے زلٹ سے دلبرداشتہ ہو گئی تھی۔ اسے لگا تھا کہ وہ زندگی میں کبھی بھی کچھ نہیں کر پائے گی۔

اس کے بعد اس نے دو سال گھر میں فارغ ہی گزار دیے تھے۔ دادو جی اسے دیکھ کر کڑھا کرتی تھیں کیونکہ اس کی زندگی میں کھانے پکانے کپڑے دھونے اور اسی طرح کے دوسرے کاموں کے علاوہ کوئی اور دلچسپی تھی ہی نہیں۔

اس ساری صورت حال سے تنگ آ کر دادو جی نے اپنی کسی جاننے والی کے مشورے پر اسے کچھ کتابیں لادی تھیں۔ وہ کتابیں نصاب کی کتابوں سے مختلف تھیں اور اسی لیے ٹین انج سے نکلتی ہوئی کسی بھی لڑکی کے لیے ان کتابوں میں سیکھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ شروع میں وہ اتنی دلچسپی سے نہیں پڑھ رہی تھی مگر پھر نیم جازبی کی داستانوں اور ڈپٹی نڈیر احمد کے ناولز میں کچھ کچھ دلچسپی ہونے لگی تھی۔

اس کی پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے دادو جی نے محلے میں رہنے والی ایک پڑھی لکھی خاتون سے مشورہ کر کے اس کے لیے کچھ اور کتابیں خریدی تھیں۔ یہ کتابیں اسے پہلی کتابوں کی نسبت زیادہ پسند آئی تھیں۔ خواتین مصنفین کا لکھا ہوا پڑھنے میں زیادہ مزہ آتا تھا اور ایک بات جو اس نے ان کتابوں سے سیکھی وہ یہ تھی کہ برا وقت ایک دن اختتام کو ضرور پہنچتا ہے اور برائی ختم ہو کر رہتی ہے۔ اس نے سیکھا کہ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور ہوتی ہے۔ اور یہی خصوصیت اسے انعام دلوانے کا باعث بنتی ہے۔ اس کو اسی انعام کا انتظار تھا۔ اس کی امید جو ختم ہو گئی تھی ایک بار پھر سے بیدار ہونے لگی۔ اسے احساس ہوا کہ زمانے کے ساتھ چلنے کے لیے تعلیم کا ہونا کتنا ضروری ہے۔ پڑھائی چھوڑنے کے دو سال بعد اسے اچانک پھر سے پڑھائی میں دلچسپی پیدا ہونا شروع ہوئی تھی۔

اس نے تقریباً ہر ناول میں جو ایک مشترک بات دیکھی تھی وہ Poetic Justice تھی اس کی عمر خواب دیکھنے کی تھی اور خواب دیکھنے پر اس کے والدین پہرہ نہیں لگا سکتے تھے۔

اس Poetic Justice نے اس کے خوابوں کو نئی راہ دکھائی تھی۔ اسے اپنے خوابوں کی تعبیر اپنے ہاتھ میں دکھائی دینے لگی تھی۔

”جب سب کے ساتھ اچھا ہو سکتا ہے تو میرے ساتھ کیوں نہیں۔“
یہی سوچ کر اس نے پرائیویٹ ایف اے کرنے کا ارادہ کیا تھا تب اس سے دو سال چھوٹی غیر بھی اسکول سے پاس آؤٹ ہو چکی تھی۔ اس کے نہایت شاندار نمبروں کی بدولت اس کا ایڈمیشن کینڈیڈ کا لچ میں ہوا

تھا۔ وہ اپنی چھوٹی بہن جیسی قابل اور ذہین نہیں تھی مگر اتنی کند ذہن بھی نہیں تھی کہ ایف اے نہ کر پاتی۔ اس نے بھی نہایت ذوق و شوق سے گھر میں ہی پڑھائی کا دوبارہ آغاز کیا تھا۔ دادو جی کی دعائیں اور استانی جی کی رہنمائی قدم بہ قدم اس کے ساتھ تھی۔

سارا دن..... گھر کے کاموں کی مشقت کے بعد وہ جب کتابیں کھولتی تھی تو مشکل نصاب اسے الجھانے لگتا تھا مگر دل میں چھپی کوئی ایک آدھ نضحی کرن اسے ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتی اسے حوصلہ دیتی محسوس ہوتی۔ کتابوں اور داخلے کے لیے روپے اسے دادو جی نے دیے تھے۔ اس نے داخلہ بھجوانے کے بعد بہت یکسوئی سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ وہ راتیں اس کے لیے بہت تھکا دینے والی تھیں۔

اس نے وہ سب کیسے کیا تھا صرف وہی سمجھ سکتی تھی اور اس کے بعد وہ زلٹ آ جانے تک بہت خشوع و خضوع سے دعا مانگتی رہی تھی لیکن ہر بار کی طرح اس کی یہ دعائیں بھی قبول نہیں ہوئی تھیں وہ ٹل ہو گئی تھی اور غیر اس نے اس بار بھی بہت شاندار نمبر لیے تھے۔

خرم نے جب آ کر اسے اس کا زلٹ بتایا تو اسے لگا تھا جیسے وہ مر گئی ہے۔ امتحان میں ناکام ہو جانا اتنی بڑی بات نہیں ہوتی لیکن جس انسان کے لیے امتحان میں کامیاب ہو جانا ہی زندگی ہو اس کے لیے یہ ناکامی بہت بڑی بات تھی۔ وہ زار و قطار رونے لگی تھی۔ اس کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ روتے روتے وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔ پھر اس نے جھک کر نیچے ہتھی ہوئی جانے نماز بھیج کر دور پھینک دی۔ اس کی اہمیت و حیثیت کیا تھی شاید یہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ یہ رات بھی اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔

کچھ سال قبل ابو نے ایک غلط فہمی کی بنا پر تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ اس کی غلطی کی سزا دے رہے تھے۔ اس رات اس نے جتنی تکلیف محسوس کی تھی زلٹ والی رات بھی وہ بالکل ویسی ہی تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ وہ دروے گزر رہی تھی اور اس درد کا کوئی مداوا نہیں تھا۔ اس رات بھی اس نے دادو جی کی گود میں بلک بلک کر بہت شکوے کیے تھے اور اس رات بھی دادو جی اسے تسلی دینے میں ناکام رہی تھیں۔ امی اور غیر کے قہقہے ان کا خون جلا رہے تھے۔

”میں صابن کی نکیہ کی طرح ہوں..... مجھے کھل کھل کر ختم ہو جانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ جیسے صابن جسم کی غلاظت صاف کرتا ہے۔ میں اس گھر کی بد قسمتی صاف کر رہی ہوں۔ میری زندگی میں آنے والا ہر دکھ..... ان کی زندگی کے سکھ میں اضافہ کرتا جا رہا ہے۔“ وہ دادو جی کی گود میں سر دیے شکوہ کرتی رہی۔

☆ ☆ ☆

”تم ہمیشہ سے ایک خوش قسمت لڑکی رہی ہوں منال!“
”اچھا کیسے.....؟“ ماریہ کی بات پر منال مسکرا کر مصنوعی حقیر سے بولی۔ وہ دونوں کافی دیر سے سڑکوں پر آوارہ گردی کر رہی تھیں۔ ماریہ اپنی خالہ کے پاس پیرس رہ کر آئی تھی اور اب اس کے پاس منال کو سنانے کے لیے بہت دلچسپ قصے تھے مگر منال نے اس کی کہانیاں سن کر کوئی خاص رسپانس نہیں دیا تھا۔ اور اس کی سبکی اداس کی بچپن کی سہیلی کو چڑا رہی تھی۔ تب اس نے جل کر کہا۔

”کیونکہ..... میرے جیسی شاندار لڑکی تمہاری دوست ہے۔“

”میں تمہاری بات سے اس صورت انکار کرتی اگر ڈر کا بل مجھے پے کرنا ہوتا۔ اب چونکہ بل تم پے

کرنے والی ہو اس لیے مجھے تمہاری ہر بات سے اتفاق ہے۔“

”تم خاصی چالاک ہو۔“ ماریہ نے جل کر کہا۔ اور وہ دونوں ہی ہنس دی تھیں۔

”خوش قسمت ہو یا رات ہی تو صفوان جیسا شاندار شخص ملا ہے تمہیں۔“ ماریہ نے رشک سے کہا۔

”صفوان زیادہ خوش قسمت ہے“ منائل نے مسکرا کر کہا۔

”ٹھیک..... ٹھیک..... وہ سر ہلا کر بولی۔

”ویسے چالاک تو تمہاری ساس ہیں۔ میٹافون کر کے انوائٹ کرتا ہے اور وہ ایک منٹ میں سب دی

ایڈ کروتی ہیں۔“

ایک ہفتہ پرانی بات منائل نے ماریہ کو فون پر بتائی تھی۔

”وہ تو ایک پرابلم ہو گیا تھا اسی وجہ سے انہیں یہ سب کرنا پڑا ورنہ تم جانتی ہو وہ کتنی ناکس خاتون

ہیں۔“

ماریہ اس کی بات پر خاموش رہی۔ اس کو سبز شہلا قمر کچھ خاص بھاتی نہیں تھیں۔

”انہوں نے بعد میں مجھ سے ایکسیکو ز بھی کیا تھا اور وہ چاہ رہی تھیں کہ میں اور صفوان اگلے ہی دن

ان کی طرف سے ڈنر کریں مگر صفوان نیکسٹ ڈے OT میں مصروف تھا پھر اگلے دن وہ ڈھا کہ چلا گیا۔“

”ڈھا کہ..... خیریت؟“ ماریہ اس بارے میں لاعلم تھی۔

”WHO نے تیسری دنیا کے ممالک کے Cosmopolitan cities میں شوری کی آلودگی کے

باعث پیدا ہونے والی دماغی بیماریوں کی روک تھام کے لیے چند نئے تحقیقی مراکز قائم کیے ہیں۔ اس سلسلے میں

کوئی کانفرنس اور سیمینار وغیرہ تھا وہی ایڈیڈ کرنے گیا ہے۔“

”تم نے صفوان سے اپنے پولیس اسٹیشن والے ایڈونچر کا ذکر کیا؟“ ماریہ نے وڈ اسکرین سے نظریں

ہٹا کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اسے منائل کا یہ اقدام پسند نہیں آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب اس کے والدین

کو یہ بات پتا چلے گی تو انہیں اچھا نہیں لگے گا۔

”پاگل ہو گئی ہو۔ آئی نے خاص طور سے منع کیا تھا۔ کہ یہ بات کسی کو مت بتانا مناسب لگتا ہے۔

میں نے پچھو سے یہی کہا تھا کہ صفوان کے ساتھ جا رہی ہوں۔ اگر انہیں یہ بات پتا چل جاتی تو وہ مجھے اسی وقت

قتل کر دیتیں۔“ وہ بولی۔

”انہوں نے تمہارے ساتھ اس لڑکی کو دیکھ کر کچھ نہیں کہا..... کوئی سوال نہیں کیا؟“ ماریہ نے حیرت

سے پوچھا۔

”ان کی ملاقات اس سے اگلے دن صبح کے وقت ہوئی تھی مگر میں نے انہیں مطمئن کر دیا کہ وہ میری

ایک فرینڈ کی واقف کار ہے کچھ دن میرے پاس رہے گی پھر چلی جائے گی۔ ویسے بھی ان کے درمیان زیادہ

تفصیل سے گفتگو نہیں ہوتی۔ تطہیر زیادہ وقت اپنے کمرے میں رہتی ہے۔ پچھو سے اس کا سامنا کم ہی ہوتا ہے۔“

”تطہیر نام کتنا خوبصورت ہے..... خود کیسی ہے؟“ ماریہ کے انداز سے دلچسپی ہو رہی تھی۔

”ویسی ہی ہے جیسی عام لڑکیاں ہوتی ہیں..... عام سارنگ..... عام ساق..... عام ساحلیہ..... عام

سا انداز گفتگو..... عام سی سوچ..... عام سی ذہنی اپروچ۔“

وہ اپنے شوئزر بیگ سے چیونگم نکال کر رہ پر کھولتے ہوئے بولی۔

”لڑکی تو عام سی ہے مگر جو حرکت اس نے کی ہے وہ عام سی نہیں ہے۔“ ماریہ نے اپنی رائے کا اظہار

کیا۔

”سارا معاشرہ ہی اس قسم کے لوگوں سے بھرا ہے۔ فرسٹریشن اس قدر بڑھ چکا ہے۔ کہ لوگ توجہ

حاصل کرنے کے لیے ایسے اچھے بھٹکنڈے آزمانے لگے ہیں۔ ہر شخص لائم لائٹ میں آنا چاہتا ہے۔ اور اس

مقصد کے لیے وہ ہر حد پار کرنے کو تیار ہے۔“ چیونگم منہ میں ڈال کر وہ لاپرواہی سے بولی۔

”توجہ حاصل کرنے کے لیے تمہارے خیال میں یہ لڑکی توجہ حاصل کرنے کے لیے۔“ ماریہ نے مزید

تقریر میں مبتلا ہوتے ہوئے کہا۔

”میں کوئی حتمی رائے نہیں دے رہی صرف اپنا خیال ظاہر کر رہی ہوں۔“ منائل کو اس ساری بحث

سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔

”میرا خیال ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو تمہاری ساس نے بھی تو خدا ترسی کا عظیم مظاہرہ کیا ہے اس لڑکی کو

اتنا اسپیشل پروٹوکول دے کر اس کے بارے میں کیا کہتی ہو؟“ اس کی کوشش کامیاب رہی۔ منائل چڑھ گئی تھی۔

”وہ ایسی خدا ترسی کرتی رہتی ہیں..... ایسی ضرورت مند لڑکیاں روز ہی دیکھتی ہیں وہ..... ان کے

لیے یہ نئی بات نہیں ہے۔“

”تم نے اس لڑکی سے پوچھا کیوں کیا اس نے یہ سب۔“ ماریہ کو تطہیر میں زیادہ ہی دلچسپی محسوس ہو

رہی تھی۔

”پلیز ماریہ..... بند کرو یہ انٹرویو..... اتنے سوالات تو میرے کو لیگز بھی نہیں کرتے حالانکہ ہمار

واسطہ روزی ایسے لوگوں سے پڑتا ہے۔“

وہ ٹھیک ٹھاک زچ ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

”مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ وہ منائل کے سامنے بیٹھی کہہ رہی تھی اس تمام عرصہ میں شاید اس

سے اس طرح سے پہلی بار کوئی بات کی تھی۔

”موسٹ ویکم تطہیر!“ اس نے بے تکلفی پیدا کرنے کے لیے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ منائل کا

دوہیا محرومی خوبصورت کیونکس سے سجا ہوا اس کے سانو لے ہاتھ پہ دھرا اور بھی خوبصورت لگنے لگا۔ تطہیر نے

بہت آہستگی سے اپنا ہاتھ چادر میں چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ منابل نے اس کی اس حرکت کو محسوس بھی نہیں کیا تھا۔

”تین آپ سے یہ نہیں پوچھتی کہ آپ مجھے یہاں اپنے گھر میں کیوں لائی ہیں مگر..... میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں اس..... مہربانی کی مستحق نہیں ہوں۔ میں ان سب چیزوں کی حقدار نہیں ہوں جو آپ مجھے دے رہی ہیں۔“

وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی پھر سر جھکا کر بولی۔

”آپ کو اگر کچھ دن بعد..... اس ساری مہربانی کے لیے..... میرا مطلب ہے..... میں..... میرے پاس کچھ نہیں ہے..... میں آپ کو ان سب کے بدلے میں کچھ بھی نہیں دے سکتی۔ میں آج کل یا پرسوں یا پھر ایک سال بعد کبھی بھی اس قابل نہیں ہو سکوں گی کہ آپ کی اس مہربانی کے بدلے میں شکر کے علاوہ کچھ اور دے سکوں۔ آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ میں اس احسان کو یاد رکھنے کی کوشش کروں گی..... مگر..... میں ایک بے کار عورت ہوں۔“

اس کی آواز دھیمی اور سر جھکا ہوا تھا مگر آواز پر کوئی جذبہ غالب نہیں تھا۔

وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے کسی اور کے بارے میں بات کر رہی ہو۔ منابل کو اس قسم کے ڈیالاکز کچھ خاص بھاتے نہیں تھے۔ وہ تقدیر کی مہربانی سے مالا مال لڑکی تھی۔ وہ تطہیر رحمان کی پراہلہ کو صرف سن سکتی تھی۔ اس کا دل حساس تھا مگر اتنا نہیں کہ وہ تطہیر رحمان کی بات سن کر تڑپ اٹھتا۔ البتہ تطہیر سے ہمدردی ضرور محسوس ہوتی تھی۔

”کس قسم کی باتیں کر رہی ہو تطہیر! کیا کیا سوچتی رہتی ہو ایسا کچھ نہیں ہے۔ جیسا تم سوچ رہی ہو۔ مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے۔ میں یہ سب اس لیے کر رہی ہوں کیونکہ مجھے یہ سب کرنا اچھا لگتا ہے اور تم بے کار نہیں ہو تم اتنی ہی کارآمد ہو جتنی میں یا کوئی اور بھی لڑکی.....“

وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ وہ اس کی ہم عمر لڑکی تھی لیکن تطہیر رحمان عورت تھی اور منابل مرد لڑکی..... تقدیر کا ہیر پھیر تھا یا لفظوں کا کسے خبر۔

”میں خود چاہ رہی تھی کہ تم اس موضوع پر بات کر دو تمہیں اپنے بارے میں سوچنا چاہیے اور اگر تم کسی مقدمے وغیرہ سے ڈر رہی ہو تو اس ڈر کو دل سے نکال دو۔ تم سے یہاں اس گھر میں کوئی بھی کوئی سوال نہیں کرے گا۔ سب لوگوں کو میں مطمئن کر چکی ہوں۔“ منابل نے بات کرتے ہوئے اسے دیکھا پھر توقف سے بولی۔

”پریمی لکھی ہو؟“

”جی..... ایف اے کیا ہے۔“ تطہیر کے جواب پر منابل کو حیرت ہوئی۔

”آپ مجھے کوئی کام دلوا سکتی ہیں۔“ تطہیر نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

”ہاں کیوں نہیں میں تمہیں.....“

”آپ اجازت دیں تو میں آپ کے گھر کے کام کاج کر دیا کروں۔“

وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ منابل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ وہ مسز شہلا قمر سے بات کیے بغیر تطہیر کے بارے کی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔

مسز شہلا قمر کو ایک ضروری کام کے لیے امریکہ جانا تھا۔ وہ انہیں کے بارے میں وہاں سے آنے کے بعد کوئی فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ انہوں نے منابل سے درخواست کی تھی کہ وہ تطہیر کو مزید دس پندرہ دن کے لیے اپنے گھر میں ٹھہرا لے۔ منابل اپنے والدین کے واپس آ جانے تک بہت آرام سے اس کو اپنے گھر میں ٹھہرا سکتی تھی۔

”میں مسلمان ہوں..... بخدا میں مسلمان ہوں۔“

تطہیر نے اس کی ہچکچاہٹ کو کوئی اور معنی پہنا دیے۔ منابل سمجھ گئی تھی کہ وہ اپنی حرکت کی وجہ سے شرمندہ ہو کر اس طرح کہہ رہی ہے۔ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”میں جانتی ہوں تم مسلمان ہو اور تم اس گھر میں سب کام اطمینان سے کر سکتی ہو تم اپنی اس حرکت کے لیے شرمندہ ہو یہی کافی ہے..... غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔“ تطہیر نے جھکے سے سر اٹھایا تھا۔

”میں نے کوئی غلطی نہیں کی اور میں کسی چیز کے لیے شرمندہ بھی نہیں ہوں۔“ وہ تڑخ سے بولی تھی۔ منابل حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اتنی ہٹ دھرمی کی توقع نہیں تھی۔ تطہیر اس سے اجازت لینے آئی تھی۔ لے کر چلی گئی جبکہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کافی دیر تک اس صورت حال کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ مسز شہلا قمر جیسی خاتون تطہیر جس کو پچپانے میں غلطی کیسے کر سکتی ہیں۔ وہ اسے جتنی اہمیت دے رہی تھی وہ قطعاً اس کی مستحق نہیں تھی۔

اگلے چند روز میں اس نے تطہیر کو گھر کے کاموں میں دلچسپی لینے دیکھا۔ وہ حقیقتاً سکھڑ واقع ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ڈالٹھ تھا۔ پھوپھو کو اس کے ہاتھ کا پکا کھانا پسند آیا تھا۔ پروین کو ایک مددگار لگتی تھی اس لیے وہ بھی کافی خوش تھی۔ اسے صرف اس بات کا اعتراض تھا کہ تطہیر اس سے زیادہ بات چیت کیوں نہیں کرتی۔ اس سے اپنے دکھ سکھ کیوں نہیں کہتی جبکہ پھوپھو کو اس کی نینٹ نما چادر سے الجھن ہوتی تھی۔ وہ ہمہ وقت چادر لیے رکھتی تھی اور وہ ان سے بچنے اور احتراز برتنے کی کوشش بھی کرتی تھی۔ کبھی کبھی اس کا رویہ ایسا ہو جاتا جیسے وہ اس گھر میں رہنے والی اکیلی عورت ہے اور بہت سے مردوں کے بیچ میں پھنس گئی ہے۔ وہ کچھ زیادہ ہی احتیاط پسند تھی حالانکہ اس گھر میں ملازم مرد کوئی میں صرف دو تھے اور وہ بھی گھر میں اندر زیادہ نہیں آتے تھے اسی لیے تطہیر کی اس درجہ احتیاط عجیب لگتی تھی۔

منابل کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ بس مسز قمر کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہیں امریکہ گئے بہت دن ہو گئے تھے نہ جانے کیا وجہ تھی کہ ان کا قیام وہاں طویل ہو رہا تھا منابل کو ان سے تطہیر کے متعلق بہت سی باتیں معلوم کرنا تھیں کیونکہ وہ اپنے منہ سے ابھی بھی کچھ بتانے کو تیار نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ کہتا ہے یہ گھر اس کا ہے..... وہ اس گھر کا سربراہ ہے۔ وہ کہتا ہے وہ میرے ساتھ جس طرح کا

سلوک کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے اسے میری بے عزتی کا اتنا ہی حق ہے۔ جتنا ابو کو تھا۔۔۔۔۔ وہ کہتا ہے وہ۔۔۔۔۔ وہ میرا بھائی نہیں ہے۔۔۔۔۔ وہ کہتا ہے۔۔۔۔۔ میں اس کے لیے ہمیشہ سوتیلی ہی رہوں گی۔“

وہ یہ سب کہتے ہوئے رونے لگی تھی لیکن اس کے گرد ناپیدہ ان سب سے آنسوؤں کا ہالہ صاف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ آج بھی اس کو سننے کے لیے کمرے کی تنہائی کے علاوہ دادو جی موجود تھیں۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس کے سوالوں کے جواب نہیں دے پاتی تھیں۔ آج سے پہلے وہ اپنے امی ابو کی زیادتی کی وجہ سے روتی رہی تھی، مگر آج وہ اپنے سوتیلے بھائی کی زیادتی کی وجہ سے روتی تھی۔ ابو کے انتقال کو بمشکل چالیس دن گزرے تھے اور ان چالیس دنوں میں وہ چالیس ہزار مرتبہ خرم کے رویے پر حیران ہوئی تھی۔

ابو کے انتقال کے اتنے قلیل عرصہ بعد ہی خرم کو اپنی اس سوتیلی بہن کا وجود اس بری طرح کھٹکنے لگا تھا کہ وہ اسے جلد سے جلد اس گھر سے رخصت کر دینا چاہتا تھا اور اس نے اپنی سوتیلی بہن کے لیے اپنے اکتالیس سالہ ماموں کو پسند کیا تھا۔ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا۔ اس کے پانچ بچے بھی تھے اور اس کی بیوی ناگزیر وجوہات کی بنا پر اسے چھوڑ چلی گئی تھی۔

”آپنی! تم ان بچوں کے درد کو بھی سمجھ سکتی ہو انہیں ماں کی ضرورت ہے تم انہیں حقیقتاً ماں کا پیار دے سکتی ہو یہ بہت ثواب کا کام ہے آپنی! بن ماں کے بچے ہیں آپ کو بہت دعائیں دیں گے۔“

خرم نے بات کا آغاز یہی یہ کہہ کر کیا تھا۔ وہ اس کی شکل دیکھتی رہ گئی تھی اگر وہ جانتا تھا کہ بن ماں کے بچے پالنا ثواب کا کام ہے تو اس نے یہ بات آج تک اپنی ماں کو کیوں نہیں بتائی تھی۔ وہ یہ بات صرف اسے کیوں بتا رہا تھا۔

”آپنی! گھر کے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ ابو کے بعد میں اپنے آپ کو بہت سی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل نہیں سمجھتا۔ غیر کے متعلق تم جانتی ہو کہ وہ ابھی پڑھ رہی ہے اس کا ابھی شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے اور پھر اس کے لیے تو بہت سے پرپوزل ہیں۔“

وہ سچ مچ اسے حیران کر دینے کے موڈ میں تھا۔ وہ جانتی تھی ابو کے انتقال کے بعد ان کے آفس سے ایک خطیر رقم ملی ہے۔ انہوں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ کوئی پارٹ ٹائم بزنس بھی شروع کر رکھا تھا۔ وہ بھی کافی منافی بخش بزنس تھا۔ اس گھر میں بھی بیٹی کی حیثیت سے اس کا حصہ نکلتا تھا مگر پھر بھی اس کے لیے اب اس گھر میں سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے لیے ایک ایسے شخص کو جیون ساتھی کے طور پر منتخب کیا گیا تھا جو اس سے عمر میں دو گنا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اتنی رحمدل نہیں سمجھتی تھی کہ اپنی زندگی بن ماں کے بچوں کے لیے دان کر دے۔ زندگی میں اس کے لیے اگر کچھ اچھا تھا تو وہ اسے ملنا ہی چاہیے۔ یہی سوچ کر اس نے خرم کو انکار کر دیا تھا۔

”آپنی! اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہیں اس سے بہتر شخص مل سکتا ہے تو تم غلطی پر ہو۔ ماموں سے بہتر آدمی تمہیں کم از کم اس شکل کے ساتھ نہیں مل سکتا۔“ اس کی بات سن کر خرم نے نہایت خشک لہجے میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں کیا نہیں تھا۔ تضحیک تحقیر طنز نفرت اسے لگا وہ دیوار سے چپکلی ایک چھپکلی ہے اور اس کا بھائی اس پر تھوک دے گا جبکہ وہ کہہ رہا تھا۔

”اگر تم نے کبھی غور سے آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہو تو تم کبھی اس طرح انکار نہیں کرتیں۔ اس شخصیت کے ساتھ تم کس شہزادے سے شادی کر سکتی ہو۔ تمہارا رنگ و روپ شکل و صورت تمہاری تعلیم ہر چیز سے تم واقف ہو۔ آج سے دو سال بعد شاید تمہیں یہ سب بھی نہیں مل سکے گا۔ اس کے بعد تم کیا کرو گی۔ کہاں جاؤ گی تم؟ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں ساری زندگی تمہیں سنبھالوں گا اور کیا تم سمجھتی ہو کہ تم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مجھے تمہارے مرنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ تم غلطی پر ہو آئی! میں ایسا کچھ نہیں کروں گا۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ میں کچھ سننا بھی نہیں چاہتا۔ اپنے اچھے برے کی تم خود مددگار ہو تم اپنی مرضی سے فیصلہ کر سکتی ہو۔“

یہ سب کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ یہ سب کہتے ہوئے اس کی آواز میں ذرا جھجک نہیں تھی۔ وہ بہت اطمینان سے اس کے سامنے بیٹھ کر اس کی شخصیت کو چوٹی کی طرح پاؤں کے نیچے رکھ کر مسل گیا تھا اور وہ کچھ بھی کر نہیں پاتی تھی۔ وہ سانس لیے بغیر سنی رہی تھی۔ وہ اپنے بھائی کو فرشتہ کہا کرتی تھی اور اس کا بھائی حقیقتاً اس کے لیے فرشتہ ثابت ہوا تھا موت کا فرشتہ۔

☆ ☆ ☆

”لڑکیاں عام طور پر اتنی پکچھل نہیں ہوتیں جتنی کہ آپ ہیں۔“ وہ چادلوں کی ڈش میں سے چاول اپنی پلیٹ میں منتقل کرتے ہوئے مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ منال کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک ماہ بعد ہونے والی اس غیر متوقع ملاقات نے اس کے موڈ کو بہت خوشگوار کر دیا تھا۔ صفوان نے اسے آفس فون کر کے لُج کی آفر دی تھی اور بعد میں وہ خود لینے کے لیے کلینک سے اس کے آفس آ یا تھا لیکن اس کو آنے میں بیس منٹ کی تاخیر ہو گئی تھی اور اسی لیے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر وہ اس کی اس خوبی کو سراہ رہا تھا۔

”لڑکیاں عام طور سے اتنی ذہین بھی نہیں ہوتیں جتنی کہ میں ہوں۔“ اس نے بھی کھانے کا آغاز کرتے ہوئے مسکرا کر اعتماد سے کہا۔ وہ کھل کر ہنسا تھا۔

”اس خوش فہمی میں کس نے مبتلا کر دیا آپ کو؟“

اس کی مسکراتی آنکھیں منال کے موڈ کو خوشگوار کر گئی تھیں۔ براؤن شرٹ کی آستین چڑھائے بکھرے بالوں کے ساتھ اس لالہ بالی حلیے میں بھی وہ منال کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”اسی نے جس نے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیا کہ میں پکچھل ہوں۔“ وہ اسی کے انداز میں بولی تو وہ اپنا قبضہ ضبط نہ کر سکا۔ منال بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”Just kidding“ اس نے کہا۔ وہ نہ بھی کہتا تب بھی منال جانتی تھی کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔

”مام بھی آپ کی ذہانت کی تعریف کرتی ہیں۔“ مام کا حوالہ دے کر جیسے اس نے اسے بہلانا چاہا تھا۔ منال کا دل چاہ رہا تھا وہ اس کی ظاہری خصوصیات کی بھی تعریف کرے۔ وہ بتائے کہ وہ اچھی لگ رہی ہے مگر صفوان اس طرف آئی نہیں رہا تھا۔

”وہ صرف ذہانت کی تعریف نہیں کرتیں۔“ اس نے جتانے والے انداز میں کہا اور یہ حقیقت بھی تھی کہ مسز شہلا قمر اس کی خوبصورتی کو بہت سراہتی تھیں۔

”آپ کا کینس آف ہیومر بہت شاندار ہے منابل!“ منابل کا منہ حلق تک کڑوا ہوا۔ سارا زمانہ ہی اس کے انداز گفتگو کی ذہانت اس کی حاضر دماغی کی تعریف کرتا تھا مگر اسے صفوان کے منہ سے ایسی تعریف سننا اچھا نہیں لگتا تھا۔

”آئی کب واپس آئیں گی امریکہ سے؟“ اس نے خود ہی موضوع تبدیل کر دیا۔

”آج ہی ان سے فون پر بات ہوئی ہے۔ ابھی کچھ اور دن لگ جائیں گے۔ انہوں نے ہی مجھے تاکید کی کہ ان کی طرف سے آپ کو دلچسپی کے لیے لے جاؤں کیونکہ اس دن والا ڈراما بھی ہوئے۔ حالانکہ میں سوچ رہا تھا کہ اب کی بار آپ مجھے انوائس کریں گی مگر مام نے کہا کہ اس روز ان کی وجہ سے وہ ڈراما متوی ہوا تھا۔“ وہ ایک ماہ پرانی تفصیل اسے سنارہا تھا۔ منابل کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ یہ خیال ہی دل جلا رہا تھا کہ وہ صرف اپنی مام کے کہنے پر اسے دلچسپ کر رہا تھا۔

”دراصل.....“ اس نے بات کی ابتدا کی پھر گہری سانس بھر کر بولی۔

”کچھ ضروری کام آن پڑا تھا اس روز..... میں نے بعد میں فون کیا تھا ایکسکیوز کرنے کے لیے مگر آپ کا موبائل آف تھا۔“

”اٹس اوکے منابل! میں شکوہ تو نہیں کر رہا۔“ وہ بات اس سے کر رہا تھا مگر دھیان کھانے کی پالیٹ کی طرف تھا۔

”کاش تم نے کیا ہوتا۔“ وہ دل ہی دل میں خود سے مخاطب ہوئی تھی۔

”اسی طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں..... کیسا چل رہا ہے آپ کا سوشل ورک۔“ اس نے اس کی جاب کے متعلق پوچھا۔ نجائے کیوں منابل کو لگتا تھا کہ صفوان کو اس کی جاب کی نوعیت پسند نہیں ہے۔ اسے ہمدردی اور خدا ترسی جیسے لفظوں سے چڑھتی اور یہ بات وہ کم ہی کرتا تھا۔

”اوہ ہاں..... یاد آیا..... میں ڈھاکہ سے آپ کے لیے کچھ گفٹس لایا تھا۔ آپ کو دینا یا دینی نہیں رہا..... وہ ابھی تک میرے پاس پڑے ہیں۔ میں آپ کو ڈرائیور کے ہاتھ گھر بھجوا دوں گا۔“

وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا مگر منابل کو سخت توین کا احساس ہوا۔ وہ کہنے دن پہلے بنگلہ دیش سے واپس آیا تھا اور گفٹس دینے کا خیال اب آیا تھا اور وہ بھی ڈرائیور کے ذریعے..... اس کا موڈ مزید خراب ہو گیا تھا۔

محبت تو قعات کے پختے فرش پر رقص کرتی ہوئی جوان ہوتی ہے۔ اور اس سلسلے میں اسے بہت مرتبہ پھسلنا پڑتا ہے۔ وہ جتنی مرتبہ پھسلتی ہے اتنی ہی مرتبہ سنبھلتی ہے۔ لیکن اس پھسلنے اور سنبھلنے کے کھیل میں ایک جھین ایک تکلیف ہوتی ہے۔ محبت یہ ساری جھین اور تکلیف اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور پھر اسے اس شخص کو دان کر دیتی ہے۔ جسے عرف عام میں مریض محبت کہتے ہیں۔

اس کی خاموشی سے اتنا کر صفوان اس کا نفرنس کے متعلق بتانے لگا۔ جو وہ اسلام آباد میں اینڈز کر کے آیا تھا۔ اس نے وہاں کچھ منفرد نیورولکسز دیکھے تھے۔ وہ بہت دلچسپی سے دماغی بیماریوں کے متعلق بات کر رہا تھا۔

”کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔“ اس نیوروسرجن کو شاید یہی بیماری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ان دونوں کے درمیان ایک گہرا تعلق تھا کیونکہ یہ تعلق ان کے بڑوں نے اپنی رضامندی سے قائم کیا تھا، لیکن اس کے باوجود منابل کا کمزور محبت کا مارا دل انجانے خدشوں اور وسوسوں میں گھرا رہتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ صفوان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اگر ہے تو وہ اسے کبھی ظاہر نہیں کرتا تھا۔ اس کی اپنی ساس سے کافی بے تکلفی تھی۔ اور انہوں نے بطور خاص اسے بتایا تھا کہ صفوان نے زندگی میں کتابوں کے علاوہ کسی چیز سے عشق نہیں کیا اور وہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہے مگر منابل کو یقین تھا کہ جو شخص زندگی میں صرف کتابوں سے عشق کر رہا ہوتا ہے وہ زندگی میں پہلے کبھی انسانوں سے عشق میں ناکام ہو چکا ہوتا ہے۔

وہ اس کے سامنے بیٹھا بہت اطمینان سے وہ باتیں کر رہا تھا جس میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ خاموشی سے اس کی باتوں میں دلچسپی لینے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ اس کو صفوان کی باتیں سننا اچھا لگتا تھا۔

☆ ☆ ☆

”مجھے بھوک نہیں مجھے کھانا نہیں کھانا اور اگر اب مجھے کوئی تنگ کرے گا تو نتائج کا ذمہ دار ہوگا۔“ اس نے نیکی سے سر اٹھائے بغیر کہا۔ وہ جب سے واپس آئی تھی اسی طرح اپنے کمرے میں بند تھی۔ پھپھو آج صبح سے اپنے گھر گئی ہوئی تھیں اور گھر میں صرف ملازم تھے جو بی بی کی عادت سے بخوبی واقف تھے۔ پہلے پروین کی بڑی بیٹی کھانے کا پوچھنے آئی پھر چھوٹی بیٹی اور پھر پروین کچھ دیر پہلے ہی پوچھ گئی تھی۔ اس بار بھی اسے یہی مغالطہ ہوا کہ شاید ان لوگوں میں سے کوئی ہے مگر اب کی بار تطہیر تھی۔ وہ منابل کی ڈانٹ کی پروا کیے بغیر کمرے کے اندر چلی آئی۔ منابل اونڈھے منہ بستر پر لیٹی تھی۔

”میں آپ کو کھانے کے لیے بلائے نہیں آئی مگر میری ایک بات سن لیجئے۔“

”جی فرمائیے۔“ اس نے سر اٹھائے بغیر تطہیر کے انداز میں کہا۔ لہجہ انتہائی جلا ہوا تھا۔ جب اس کا موڈ آف ہوتا تھا تو وہ سب کے ساتھ اسی سلوک کا مظاہرہ کرتی تھی۔

”یہ لیجئے،“ تطہیر اسے کچھ دے رہی تھی۔ وہ اس کی ملازم نہیں تھی اسی لیے ڈانٹ کر اسے کمرے سے نکال نہیں سکتی تھی۔ طوعاً کرہاً اس نے نیکی سے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے لبالب بھرا گلاس تھا۔ منابل کی خفگی مزید بڑھ گئی۔

”مجھے پانی نہیں چاہیے تطہیر! اور اگر چاہیے ہوگا تو میں خود لے لوں گی۔“ وہ بہت مشکل سے ضبط کر کے بولی۔

”یہ عام پانی نہیں ہے..... دراصل.....“ وہ جھجک کر خاموش ہوئی پھر وہ دوبارہ سے بولی۔

”میں نے صبح کے وقت قرآن پاک کی تلاوت کر کے اس پر دم کیا ہے..... آپ کو بیاس نہیں ہے تب بھی تھوڑا سا پی لیجئے۔“

منابل نے اس کی بات سن کر ایک بار پھر سر نیکی پر گر لیا۔ تطہیر کی بات اسے نہایت عجیب لگی تھی۔ چند لمحوں خاموشی سے گزر گئے۔ تطہیر نے دوبارہ سے اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی مگر وہ اس کے بستر کے

قریب کھڑی رہی تھی۔ منابل نے گہری سانس بھر کر ایک بار پھر اسے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے خود بھی اس طرح غرے کرنا پسند نہیں تھا مگر صفوان کا لیا دیا انداز کبھی کبھی بہت چڑا کر دیتا تھا۔ تطہیر نے پانی کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر کڑک کڑا ہجاری پر وہ ڈرہ سانس رکھ دیا تھا۔ دھوپ کی ٹھنکی ہاری کر نہیں اپنا دم خم کھودنے کے بعد منابل کی طرح ابھی ابھی لگ رہی تھی۔ کمرے میں ذرا سی روشنی ہوئی تو ہر چیز پہلے کی نسبت کچھ واضح ہو گئی۔ تطہیر نے دوبارہ بیڈ کے قریب آ کر گلاس پکڑ لیا۔

”میں بیمار نہیں ہوں تطہیر! اس کے خیال میں بیمار لوگ ہی اس قسم کا پانی پیتے تھے۔ تطہیر خاموش رہی۔

”تھک گئی ہوں اس وجہ سے موڈ کچھ آف ہے۔“ وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی تطہیر اب بھی خاموش رہی۔ وہ منابل کو تک رہی۔ تاہم اس نے گلاس سے ایک گھونٹ لے لیا۔ وہی عام سا پانی تھا جو وہ روز پیتی تھی۔ اسے کم از کم اس پانی میں کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی مگر وہ خاموشی سے پانی پیتی رہی۔ تاوقتیکہ گلاس میں سے تین تہائی پانی اس کے اندر منتقل ہو گیا۔

”بیٹھ جاؤ تطہیر!“ اس نے مسکراتے ہوئے تطہیر سے کہا اور اس بار مسکرانے کے لیے اسے کوشش نہیں کرنی پڑی تھی۔ مسکراہٹ خود بخود اس کے لبوں سے پھسل کر اس کے چہرے کا حصہ بن گئی تھی۔ اسے مسکراتا دیکھ کر تطہیر بھی مسکرائی اور اس کے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

”یہ غصہ بھگانے کا سب سے کامیاب طریقہ ہے۔ دادو جی جب تک زندہ تھیں اسی طرح پانی پہ دم کر کے میرا غصہ اتارنے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔ میرا غصہ بھی فوراً ختم ہو جایا کرتا تھا۔“

”تمہیں غصہ آتا ہے..... تمہیں غصہ آ سکتا ہے۔ یقین نہیں آ رہا۔“ منابل مسکرا کر بولی۔ تطہیر خاموش رہی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے بولنا پسند کرتی تھی۔

منابل کو فانسو ہوا وہ پہلی مرتبہ اپنی زندگی کا کوئی رخ اس کے سامنے کھول رہی تھی۔ منابل نے باقی پانی ایک گھونٹ میں ختم کر دیا پھر گلاس سائیڈ پر رکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں غصے میں نہیں تھی۔“ پانی کا ایک گلاس کسی کے مزاج کو کس طرح نگلفہ کر سکتا ہے۔ یہ منابل کی سمجھ میں فی الحال نہیں آ سکتا تھا۔ مگر اس کے سر ہانے بیٹھی تطہیر اس کے چہرے سے پانی کے اس گلاس کا کرشمہ بخوبی دیکھ سکتی تھی۔

”میں بھی دادو جی سے اسی طرح کہا کرتی تھی۔“ تطہیر کی بات پر منابل ایک بار پھر مسکرا دی۔

”دراصل پانی کو کیمیائی زبان میں H_2O کہتے ہیں اور جب یہ H_2O آکسیجن یعنی ہوا یعنی O_2 سے ملتا ہے تو تعامل کے بعد جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ H_2O ہی ہوتا ہے۔ یعنی پانی ہی پیدا ہوتا ہے۔ اور پانی کی خصوصیات ہمیشہ ٹھنڈی ہوتی ہیں پھر جب ہوا دم کی ہوئی ہو تو ان ٹھنڈی خصوصیات میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ پانی غصے کی بجائی کو اپنے اندر حل کر لیتا ہے۔ اور اگر آپ یہ پانی پینے سے پہلے ”بسم اللہ“ پڑھ لیتیں تو پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی یہ کرشمہ ہو جاتا۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں وضاحت دے رہی تھی۔ منابل کچھ دیر تک بول نہ پائی۔

اس کے پاپا کیمسٹری کے پروفیسر تھے مگر اتنے عام سے فارمولے کی اتنی خاص وضاحت انہوں نے بھی کبھی نہیں دی تھی۔

”تمہیں کس طرح پتا چلا کہ میں نے ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ سے اجترائیں کی؟“ وہ ذرا کی ذرا شرمندگی سے بولی۔

”آپ کو مسکرانے کے لیے تین تہائی پانی پینا پڑا۔ اگر آپ نے اللہ کے مبارک نام سے ابتدا کی ہوتی ہے۔ پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی مسکراہٹ آپ کے چہرے پر آ جاتی۔“ وہ طنز نہیں کر رہی تھی۔ اس کا انداز ویسا ہی تھا۔ معصومانہ اپنے آپ سے بے نیاز۔ وہ وہی لڑکی تھی جسے منابل کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھی مگر وہ یکدم اہم ہو گئی تھی۔

”اب کھانا لگاؤں آپ کے لیے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں کھانا کھا چکی ہوں۔ صفوان کے ساتھ لُچ کیا تھا میں نے۔“ تطہیر کی منگنی کے بارے میں جانتی تھی۔

”اس کے باوجود آپ کا مزاج اتنا برہم دکھائی دے رہا ہے۔ حالانکہ آپ کو تو بہت خوش دکھائی دینا چاہیے۔“

وہ پہلی بار اس طرح چھیڑنے والے انداز میں بات کر رہی تھی۔

”تطہیر اتم نے کبھی محبت کی ہے؟“ صفوان کا ذکر آیا تو وہ اسے کریدتے ہوئے پوچھنے لگی۔ تطہیر کے چہرے پر ایسے تاثرات آ گئے جیسے منابل نے کوئی مذاق کیا ہو۔

”محبت کی جاتی ہے کیا؟“ اس نے الٹا سوال کیا۔

”اوکے..... فائن..... کیا تمہیں کبھی کسی سے محبت ہوئی؟“ اس نے سوال کی تصحیح کی۔

”نہیں۔“ تطہیر نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔

منابل نے صرف ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔ اسے اسی جواب کی توقع تھی۔ حیران وہ تب ہوتی جب تطہیر مثبت جواب دیتی۔ وہ جانتی تھی محبت کرنے کے لیے جو معیار اور شرائط ضروری ہوتی ہیں تطہیر ان سب میں صفر تھی۔ وہ بھول ہی گئی کہ محبت اور مذہب دو ایسی چیزیں ہیں جن کے لیے کسی معیار اور کسی شرط کی ضرورت نہیں ہوتی۔

”بہت اچھی بات ہے..... خوش قسمت ہو تم۔“

اس کی بات پر تطہیر کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی اور کا تب تقدیر کے چہرے پر بھی کہ بہر حال یہ ساری کارستانی اسی کی تھی۔ بد قسمت وہ نہیں ہوتا جس کی قسمت اچھی نہ ہو بلکہ بد قسمت وہ ہوتا ہے جو اپنی قسمت کو پہچان نہ پائے۔ نجانے ان دونوں میں سے بد قسمت کون تھا۔

”ہاں..... شاید۔“ تطہیر نے اس کی رائے سے اختلاف نہیں کیا تھا۔

منابل کو احساس ہوا کہ شاید اس نے زیادہ ہی تکلیف دہ بات کر دی ہے۔ وہ لڑکی جو اس قدر

مصائب میں تھی۔ وہ کس طرح خوش قسمت ہو سکتی ہے۔ محبت خوش قسمتی کو ناپنے کا مستند پتہ نہیں ہوتا۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ انسان جو کسی سے محبت نہ کرے وہ خوش قسمت ہو ازل سے دنیا جانتی ہے کہ چاہنے سے زیادہ چاہے جانا اہم ہوتا ہے۔

”آؤ چائے پیتے ہیں۔“ منائل نے بات پلٹ کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ وہ دونوں بچن کی طرف جاتے ہوئے بھی مسکرا رہی تھیں۔ نجائے کس چیز کا اثر تھا۔ پانی سورہ یاسین یا شاید کچھ اور.....؟

☆ ☆ ☆

”میں نماز نہیں پڑھوں گی.....“ وہ چلاتے ہوئے بولی تھی۔ اسے اس طرح بولنے چلانے اور شکوے کرنے کی عادت تھی وہ بچپن سے اس عادت میں مبتلا تھی۔ دادو جی کو لگتا تھا وہ شاید کچھ مختلف قسم کی مٹی سے بنائی گئی ہے ورنہ اسے آج سے دس پندرہ سال پہلے ہی مر جانا چاہیے تھا۔ انہوں نے اس لڑکی کی زندگی میں خوشیاں لانے کی ایک کوشش کی تھی انہوں نے اس کے ابو کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد اسے اس کی سگی ماں کے گھر بھجوا دیا۔ مگر وہ وہاں بھی رہ نہیں پائی تھی نجائے کی بات تھی۔ جو اس کا گزارا اس کی اپنی ماں کے گھرے میں بھی نہیں ہو سکا تھا۔ حالانکہ مالی حیثیت میں اس کی ماں اس کے ابو کے مقابلے میں بہت آگے تھیں۔ وہ صرف تین ماہ بعد ان کے گھر سے واپس آ گئی تھی۔

واپسی میں اس کے پاس کچھ نہیں تھا حتیٰ کہ وہ خود بھی اپنے آپ کے پاس نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے خوشی اور خوشی کے احساس تک کا گلا گھونٹ ڈالا تھا۔ وہ کچھ دیر قبل خرم کو اپنی منشا سے آگاہ کر آئی تھی۔ اس کا مثبت جواب سن کر خرم نے مسرت کا اظہار کیا تھا مگر ساتھ ہی اس نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ کہیں اب ماموں کا ارادہ بدل نہ گیا ہو۔ تین ماہ قبل وہ جس رشتے کے لیے بہت پر جوش تھا۔ اب تین ماہ بعد وہ عجب ملے جلے رد عمل کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ اس کا احسان مند ہونے کے بجائے اس پر احسان کرتا لگ رہا تھا۔ اس کی سوتیلی بہن اس کے علاوہ کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ اپنی ماں کے گھر سے واپس آ جانے کے بارے میں اس نے خود ماموں کو بتایا تھا کہ اس کی اپنی ماں بھی اسے بوجھ سمجھ کر واپس چھوڑ گئی ہے۔ وہ اپنے کانوں سے خرم کو یہ سب کہتے اور استہزاء ایسے انداز میں ہنستے دیکھ رہی تھی۔ واپس کمرے میں آ کر وہ بستر پر بیٹھ گئی تھی اس نے بازوؤں کو گھٹنوں کے گرد باندھ لیا تھا۔ اور سر کو تقریباً گھٹنوں میں دے لیا تھا۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی ماں کے گھر میں گزارے تین ماہ یاد آ گئے تھے۔

اسے ان کا وہ رویہ یاد آ گیا تھا جو وہ اپنے بیٹے اور اپنے دوسرے شوہر کے سامنے اس کے ساتھ روا رکھتی تھی۔

اسے وہ ناگواری یاد آئی جو اس کا حلیہ دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ناچنے لگتی تھی۔

اسے وہ جھنجھلاہٹ یاد آئی جو اپنے ملازموں کے سامنے اسے چلتا پھرتا دیکھ کر وہ محسوس کرتی تھیں۔

اسے وہ الجھن یاد آئی جو اس کی موجودگی میں انہیں ہونے لگتی تھی۔

اور اسے وہ گھڑی یاد آئی جب وہ اس کے سامنے اپنی مجبوریوں کو گوارا ہی تھیں۔ انہیں اس کے اپنے

گھر میں رہنے پر اعتراض نہیں تھا مگر ان کے شوہر اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنے سے قاصر تھیں۔ وہ اس کی ہر قسم کی مالی مدد کرنے کے لیے تیار تھیں۔ مالی مدد کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

انہوں نے اپنے منہ سے اسے دفعہ ہوجانے کے لیے نہیں کہا تھا مگر ان کا ایک ایک انداز اس سے یہی کہہ رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے ان کی بات سن لی تھی۔ اور اس نے ان کی بات مان بھی لی تھی۔ وہ بد قسمت اولاد تھی اس کا اپنے ماں باپ کی کسی چیز پر کوئی حق نہیں تھا۔ وہ حق جتنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی ماں سے زندگی میں پہلی بار ملی تھی اور پہلی بار میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ عورت سب کچھ ہو سکتی ہے مگر ماں نہیں.....

اسے بہت اچھی طرح سے پتا تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر میں کیوں نہیں رکھ سکتی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے سوتیلے باپ اور ان کے بیٹے کو اس سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ اس کی ماں تھیں جو اس کے یہاں رہنے کو مسئلہ سمجھتی تھیں۔ کیونکہ وہ ان کے معیار سے بہت نیچے تھی وہ کسی بھی طرح ان کی بیٹی نہیں لگتی تھی۔ وہ اسے اپنی بیٹی کہہ کر اپنے حلقہ احباب سے متعارف نہیں کروا سکتی تھی انہیں اس کو اپنے ساتھ رکھنے میں شرم آتی تھی۔ گزشتہ تین ماہ سے وہ اسے اپنے جیسا بنانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ بہت تھک ہار کر انہوں نے ایک خطیر رقم اس کے حوالے کر کے اسے صاف لفظوں میں وہاں سے جانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ اس گھر میں اور اس گھر میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ وہ جیسی وہاں تھی ویسی ہی یہاں تھی مگر پھر بھی وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی نہ جانے کیوں جاتے سے کوئی بندھن اسے وہاں رک جانے کے لیے مجبور کرتا رہا تھا مگر وہ ہر بندھن سے آزاد ہو کر واپس اپنے مرحوم باپ کے گھر چلی آئی تھی۔ اب اس کے دل میں کوئی خواہش نہیں تھی۔ خرم کی بات مان کر گویا اس نے اپنا آپ بھی قربان کر دیا تھا اور یہ سب کر دینے کے بعد جب وہ دادو جی کے سامنے بیٹھی تھی تو انہوں نے اسے نماز پڑھ کر اپنے لیے سکون کی دعا مانگنے کی تلقین کی تھی مگر وہ بھڑک اٹھی تھی۔

”نماز وہ پڑھے جس کی دعا قبول ہوتی ہو۔ میں کیوں نماز پڑھوں؟ کس لیے نماز پڑھوں؟ کس چیز کی دعا کروں؟ کس چیز کا شکر ادا کروں؟ اس شکل کا؟ اس ذہن کا؟ اس شخصیت کا؟ یا پھر اس حیثیت کا؟“

وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی نہ جانے کیوں ہر بار مشکل میں اللہ کو پکارنے پر بھی اس کی پکار رد کر دی جاتی تھی۔ وہ ناشکری کر رہی تھی اور علی الاطلاق کر رہی تھی۔ دادو جی آج بھی خاموش تھیں حالانکہ انہیں بولنا چاہیے تھا۔

☆ ☆ ☆

”خیریت ہے نا؟“ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے تھیر سے دروازے پہ کھڑی پروین کی طرف دیکھا رات کے اس پہر بیڈروم کے دروازے پر ہونے والی اس دستک نے کچھ دیر کو اس کے حواس معطل کر دیے تھے اس کی آنکھ اتنی جلدی کھلتی نہیں تھی یقیناً پروین نے اسے بیدار کرنے کے لیے بہت زور زور سے دروازہ بجایا تھا۔ اس کے استفسار پر سب سے پہلے پروین نے عادت کے مطابق لمبی سانس لی پھر حلق میں گلو گیر ترنم پیدا کر کے بولی۔

”اوہ بابی!..... بہت مصیبت ہو گئی ہے۔“

”کیا مطلب؟ کیا ہوا؟ پھپھو کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ وہ دل کی سریفہ نصیحتیں منابل کا پہلا دھیان انہی کی طرف کیا۔

”نہیں باجی.....! میرا مطلب ہاں باجی..... آپ پریشان مت ہوں۔“ وہ اصل بات بتانے کے بجائے اسے اطمینان دلانے لگی منابل کو ٹھیک ٹھاک غصہ آیا۔

”باجی.....! تطہیر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھپھو جی ان کے کمرے میں ہیں۔“

رات کے کھانے پر تو وہ اچھی بھلی تھی منابل اس کے کمرے کی طرف آگئی۔ پھپھو ایک کرسی پر بیٹھی تھیں ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے انہوں نے منابل کو دیکھ کر ایک سلگتی ہوئی نظر اس پر ڈالی۔ تطہیر بستر پر بیٹھی تھی اس کے بال کھلے ہوئے تھے جنہوں نے اس کے سارے چہرے کو چھپا کر رکھا تھا وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے پچھلے حصے کو دبائے میں مصروف تھی۔ منابل کو دیکھتے ہی اس نے سر پر کے مارے شروع کر دیے تھے پھر وہ بالوں کو نوچنے لگی اس کے منہ سے کراہنے کی آوازیں نکل رہی تھی۔ پروین نے دروازے میں ہی کھڑے رہنے میں عافیت جاتی وہ اس کے قریب بھی نہیں آئی تھی۔ بلکہ دور کھڑی منہ میں کچھ بڑھنے کے ساتھ کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھی بلاشبہ تطہیر سے خوف آ رہا تھا منابل کچھ جھجکتے ہوئے اس کے قریب چلی آئی۔

”تطہیر، تطہیر کیا ہوا ہے تمہیں۔“ وہ اس کے بستر پر بیٹھ کر بولی تطہیر نے سر نہیں اٹھایا وہ اپنے بالوں کو نوچنے میں مصروف تھی چند لمحوں بعد اس نے سر دونوں گھٹنوں میں دے لیا تھا وہ گھٹنوں کو بھیج کر سر کو دبائے کی کوشش کر رہی تھی۔

”پروین! بی بی آپریشن لے کر آؤ۔“ منابل نے تطہیر کے سر پر ہاتھ رکھا پروین دوڑ کر باہر نکل گئی تھی۔ منابل نے تطہیر کے جھکے سر کو اڑھایا پھر اس کے چہرے سے بال ہٹا کر اس کے رخسار چھپانے لگی۔ تطہیر نے اس کے ہاتھ کو ہٹانے یا جھٹکنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے تطہیر! کیا محسوس ہو رہا ہے۔“

وہ اس کے سر کو دبائے لگی تطہیر جس طرح سر کو دبائے میں مصروف تھی اس سے وہ یہی اندازہ لگا سکتی کہ شاید اس کے سر میں درد ہے۔ تطہیر نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر اس کی گود میں سر رکھ دیا۔ اس کا جسم گرم ہو رہا تھا۔ منابل نے حد درجہ گھبرا کر پھپھو کی جانب دیکھا وہ نہ جانے کیوں دور بیٹھی بس سر دنگا ہوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھیں حالانکہ وہ اپنے گھر کیلنوٹوں کے لیے خاندان بھر میں مشہور تھیں مگر انہوں نے آگے بڑھ کر تطہیر کی مدد کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پروین اس دوران آپریشن لے کر آگئی تھی اس نے بہت ڈرتے ہوئے بیڈ کے قریب آ کر وہ آپریشن منابل کو تھمایا۔

”پلیز اسے میرے اوپر سے تو اٹھاؤ۔“ وہ پروین اور پھپھو کے رویے سے جھلا کر بولی۔ پروین نے آنکھیں تقریباً بند کرتے ہوئے تطہیر کے کندھوں کو پشت سے تھامنا چاہا تطہیر نے ایک دم سر اٹھایا تھا۔ پروین چیخ مار کر ایک بار پھر دروازے کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

”باجی.....! ہٹ جائیں پیچھے ہٹ جائیں اس کو سایہ ہے آپ کو بھی ہو جائے گا باجی! وہ کپکپاتے

ہوئے کہہ رہی تھی۔

”چپ کرو۔“ پھپھو نے اپنی نشست سے اٹھ کر اسے ڈانتے ہوئے کہا وہ بہت الجھی ہوئی لگ رہی تھیں۔ انہوں نے تطہیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے منابل کی گود سے اٹھایا اور پھر ان دونوں نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ رات کے اس پہر وہ کسی ڈاکٹر کو بھی نہیں بلا سکتی تھی۔ پھپھو اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دھیرے دھیرے دوبار رہی تھیں۔

”اس کا بی بی چپ کرو۔“ انہوں نے منابل کی طرف دیکھ کر درشتی سے کہا وہ اس سے اس قدر خفا کیوں لگ رہی تھیں اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ حالانکہ کھانے کے وقت ان کا موز کافی خوشگوار تھا۔ وہ منابل کے جلدی گھر آ جانے کی روٹیں سے مطمئن تھی۔ مدینہ سے آنے والی اس کے پاپا کی کال میں بھی انہوں نے اس اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ منابل پریشان ہو کر بی بی چپ کرنے لگی۔ سردی کے باوجود اس کے جسم میں کوئی کپکپاہٹ نہیں تھی۔ منابل نے بی بی چپ کر کے آپریشن ایک طرف رکھ دیا۔ بی بی نائل نہیں تھا۔

”پروین فریج سے سیون اپ کی بوتل لے کر آؤ۔“

اس کی مٹی کو بی بی نائل کرنے کا یہ طریقہ ان کی کسی دوست نے بتایا تھا۔ پھپھو اس کے ہاتھ رگڑنے لگی تھیں۔ جبکہ پروین کو انہوں نے اس کے پاؤں کے تلوے رگڑنے پر لگا دیا۔ تطہیر کی آنکھیں ابھی بھی بند تھیں اور نقاب اس کے سارے وجود پر چھارہ تھی وہ اپنے ہاتھوں سے پھپھو کو روک جانے کا اشارہ کر رہی تھی۔

کافی دیر تک تیار داری کے بعد تطہیر کی حالت بہتر ہونے لگی تھی۔ اگلے پندرہ منٹوں میں وہ سوچنے لگی۔ پھپھو نے ان سب سے اٹھ جانے کے لیے کہا۔ وہ تینوں خاموشی سے باہر نکل آئیں۔ منابل کا خیال تھا پھپھو کمرے سے باہر آ کر اس سے تطہیر کی حالت کے بارے میں بات کریں گی مگر وہ پروین کا ہاتھ تھامے خاموشی سے بیڑھیاں اتر گئیں۔

☆ ☆ ☆

”باجی.....! پھپھو جی بلارہی ہیں۔“ پروین کی بیٹی آخر کار بلا دالے آئی ان کے کمرے تک آنے سے پہلے اس نے وہ تمام متوقع سوالات خود سے کر لیے تھے جو وہ اس سے تطہیر کے متعلق پوچھ سکتی تھیں۔ اس نے وہ خود ساختہ گھڑی ہوئی کہانی بھی ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کی جو اس نے تطہیر کے متعلق پھپھو کو سنا تھی۔

وہ ان کے کمرے میں آ کر خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ اس سے بہت خائف دکھائی دے رہی تھیں۔

”اس کا شوہر کہاں ہے۔؟“ انہوں نے منابل کے چہرے کو غصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے پہلا سوال میزائل کی طرح داغا۔

ایک لمحہ کو وہ سمجھ نہیں پائی کہ وہ کس کے شوہر کے متعلق دریافت کر رہی ہیں پھر اس کا ذہن پروین کی طرف گیا۔ اس نے بہت اطمینان سے انہیں بتا دیا کہ اس کا شوہر گیراج میں گاڑی دھو رہا ہے مگر ان کے چہرے پر غصے کے آثار دیکھ کر وہ سمجھ نہ سکی کہ وہ کس کے متعلق پوچھ رہی ہیں۔

”میں تطہیر کے شوہر کی بات کر رہی ہوں۔“ اس کی استفہامیہ نگاہوں سے چڑ کر وہ کرخنگی سے بولیں۔ منابل نے ان کی بات پر بہت مشکل سے خود کو حالت سکون میں رکھا اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ اس نے تطہیر کو کپڑوں کے سامنے شادی شدہ نظر کیا تھا یا غیر شادی شدہ۔

”پھپھو! اس کی شادی نہیں ہوئی ابھی تک۔“ اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا پھپھو کو اس کی بات سن کر جھٹکا لگا انہوں نے گھور کر اسے دیکھا پھر جوابات انہوں نے اسے بتائی وہ منابل کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچنے کو کافی تھی۔

”آپ..... آپ کا مطلب وہ پرنکینٹ ہے۔“ اس نے حلق میں کانٹے اگتے ہوئے محسوس کیے۔ پھپھو اسے گھورنے میں مصروف تھیں۔

”اور تم کہہ رہی ہوں اس کی شادی نہیں ہوئی..... اس بات کا مطلب؟“

انہوں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ منابل اندر ہی اندر شرمندہ ہو رہی تھی۔ اس کی می سانسے ہوتیں تو وہ انہیں نہایت تفصیل سے بتا سکتی تھی۔ لیکن پھپھو جس زمانے کی خاتون تھیں وہ انہیں کبھی بھی قائل نہیں کر سکتی تھی۔

”میرا مطلب تھا کہ..... دوسری شادی نہیں ہوئی..... میں سمجھی کہ آپ اس کی دوسری شادی کے متعلق پوچھ رہی ہیں دراصل تطہیر کا پہلا شوہر ایک حادثے میں وفات پا گیا تھا۔ اس بات کو دو تین ماہ ہی گزرے ہیں اسی لیے۔“

اس نے اعتماد کی نفا قائم کرنے کے لیے جھوٹ روانی سے بولا۔

”تین ماہ؟“

پھپھو نے آنکھیں سکیڑ کر پوچھا۔ ان کا دل ذرا سا پگھلا تو تھا وہ خود بیوہ تھیں اور انہیں زمانے میں سب سے بڑا دکھ بیوگی ہی لگتا تھا۔

”عدت پوری کرنے کا تو وقت ہی نہیں ملا..... ساس نے ظلم کرنے شروع کر دیے تھے۔ اسی لیے اپنے گھر سے لٹکانا پڑا۔“ وہ جان بوجھ کر ایسی باتیں کر رہی تھی کیونکہ پھپھو خود بھی اس قسم کے حالات سے گزر چکی تھیں اور وہ ایسی باتوں سے ہی پکھل سکتی تھیں۔

”یہ میری اچھی سہیلی کی دور پار کی رشتہ دار ہے دراصل وہ جانتی تھی کہ میرے گھر میں صرف پاپا ہی ہوتے ہیں اور وہ بھی آج کل یہاں نہیں ہوتے۔ اسی لیے میری سہیلی نے مجھے اس کو یہاں ٹھہرانے کے لیے کہا۔ آپ جانتی ہیں عدت میں اب وہ آدمیوں کا سامنا تو نہیں کر سکتی تھی۔“

پہلا جھوٹ بولنا مشکل لگا تھا مگر اب وہ بغیر دقت کے بات کر رہی تھی۔ پھپھو کے چہرے پر رنجہ دالم کے رنگ گہرے ہونے لگے۔

”مجھ سے..... بہتر کون جان سکتا ہے۔ بیٹا کہ بیوگی کا دکھ کیا ہوتا ہے؟ میں نے بھی بہت کٹھن حالات دیکھے ہیں۔“

وہ رقت آمیز لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ منابل نے دل ہی دل میں خود کو داد دی اور ساتھ ہی تطہیر کا گلا دبا دیے کو بھی جی چاہا وہ اس کے لیے ہر گزرتے دن کے ساتھ مشکلات پیدا کر رہی تھی۔

”آپ کو..... اس نے خود بتایا اس بارے میں۔“ اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

پھپھو کے سامنے لفظوں کا چناؤ بہت دیکھ بھال کے کرنا پڑتا تھا۔ وہ بن بیاہی بچیوں سے ہر بات ڈسکس کرنے کی قائل نہیں تھیں۔

”کس بارے میں؟“ وہ الجھ کر اس کا چہرہ دیکھنے لگیں کیونکہ وہ تو اسے اپنی ساس کے ظلم کی داستان سنانے لگی تھیں جبکہ وہ شاید سن ہی نہیں رہی تھی۔

”میرا مطلب..... پرنکینٹ..... کے بارے میں.....“ دل ہی دل میں تطہیر کو گالیاں دیتے ہوئے اس نے پوچھا۔ پھپھو کے چہرے پر پھر خنگی کے تاثرات آ گئے۔

”مجھے اس نے بتایا ہوتا تو میں تم سے پوچھتی۔“ وہ پھر سے اسے گھورنے لگی تھیں۔

”آپ کو کیسے پتا چلا پھر.....؟ اس نے ایک اور احقانہ سوال کیا۔ اب کی بار پھپھو کے چہرے پر ایسے رنگ آئے جیسے اسے چپت رسید کرنے والی ہوں۔

”اسحق.....“ اتنا ہی بولی تھیں اور منابل پھر بھی نہیں سمجھی۔

”میں بچی نہیں ہوں دودھ بپتی..... دنیا دیکھی ہے میں نے، مجھے پہلے اس بارے میں اس لیے پتا نہیں چل سکا کہ وہ اپنے آپ کو بہت چھپا کر رکھتی ہے۔ بیڈ شیٹ جتنی تو چادر اوڑھتی ہے وہ..... اسی لیے مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا۔“ وہ سانس لینے کو رکیں پھر بولیں۔

”بیوگی کا دکھ بہت برا ہوتا ہے بیٹی! عورت کو اندر ہی اندر ختم کر دیتا ہے ورنہ اس حالت میں تو بکری کا جسم بھی پھیل جاتا ہے۔“

اب منابل کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔ تطہیر سچ مچ اپنے سراپے سے حاملہ نہیں لگ رہی تھی۔ اتنے دن سے وہ ان کے گھر میں تھی مگر کسی کو پتا نہیں چل سکا تھا۔

”مجھے اس لڑکی سے ہمدردی ہے مگر کل کلاں کو کچھ مسئلہ ہو گیا تو میں تمہارے پاپا کو کیا جواب دوں گی میں جانتی ہوں تمہارے پاپا نے تمہیں بیٹوں کی طرح پالا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہر پرانے پھنڈے میں ٹانگ اڑا کر اپنے لیے مسائل کا انبار اکٹھا کرو اور پھر کل رات جو کچھ ہوا..... میں تو ہم پرست نہیں ہوں مگر..... جنات کا وجود تو بہر حال قرآن سے بھی ثابت ہے۔“

وہ تطہیر سے اس سے زیادہ ہمدردی نہیں کر سکتی تھیں منابل ان کی بات مکمل ہونے پر خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ پھپھو سے بحث کرنے یا ان کی بات سے انکار کرنے کا مطلب ان کی مزید خنگی مول لینا تھا جو وہ چاہتی نہیں تھی دیے بھی وہ اس سارے مسئلے سے اکتانے لگی تھی۔

تطہیر کے بارے میں ہر روز ایک نئی بات سامنے آرہی تھی ہر روز ایک نئے راز سے پردہ اٹھ رہا تھا۔ مگر شہلا قمر نے یہ بھاری ذمہ داری اس کے سر پر ڈال کر دو بارہ خبر نہیں لی تھی اور خود امریکہ جا بیٹھی تھیں وہ اسے

ہر دور و ز بعد فون کر کے صورت حال کے بارے میں پوچھتی ضرورت تھیں۔

انہوں نے اس سے خاص طور پر درخواست کی تھی کہ وہ فی الحال تطہیر رحمٰن کی موجودگی کو راز ہی رکھے حتیٰ کہ بہنوں نے صفحہ ان اور باقی کو لیکچر سے بھی یہ بات مخفی رکھنے کے لیے کہا تھا۔ ایک ماہ یہ تھی جس سے وہ یہ سب اطمینان سے کہہ سکتی تھی مگر اس جیسی الابالی لڑکی اس مسئلے کو سلجھای نہیں سکتی تھی۔

تطہیر کی شخصیت پیاز کی طرح پرت در پرت کھل رہی تھی مگر پھر بھی وہ ایک سربستہ راز کی مانند معلوم ہوتی تھی۔ منابل کو اس کی ہر لمحہ اوڑھی ہوئی چادر کا مقصد سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اس کا حجم اتنا پھیلا ہوا نہیں تھا کہ منابل جیسی لڑکی اس کی پریکٹس کے متعلق جان سکتی تھی مگر پھر بھی جہان دیدہ عورت سے اپنا آپ چھپانے کے لیے یہ سب ضروری تھا مگر وہ یہ سب باتیں چھپا کیوں رہی تھی چھپایا تو گناہ جاتا ہے تو کیا تطہیر رحمٰن گنہگار تھی۔ اس کے گناہوں کی لسٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ گناہ بھی عام گناہ نہیں کبیرہ گناہ۔ اس نے اپنے حسن سلوک سے جو ایک ایجنٹ بنایا تھا وہ پھر ٹوٹنے لگا تھا۔ اس کی شخصیت کا گراف پھر نیچے آ رہا تھا۔ اس کے بارے میں لاتعداد سوالات اٹھ رہے تھے۔ منابل مزید خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔

”تم کون ہو؟“ اس نے کمرے میں داخل ہو کر پہلا سوال یہ ہی کیا۔

☆ ☆ ☆

”میں کہاں جاؤں؟..... بولو میں کہاں جاؤں؟“

وہ اپنے شوہر کے گھر کی بلینز پر بیٹھی آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بار پھر اپنے مالک سے سوال کر رہی تھی اسے اسی طرح لاتعداد سوال کرنے کی عادت تھی لیکن اس بار وہ روئیں رہی تھی کیونکہ اس کے اندر رہنے والا آنسو دوؤں کا جھرنّا خشک ہو چکا تھا۔ اس کے جسم کے صحرا میں اندر باہر اب کہیں برسات نہیں ہوتی تھی۔ اس کے باپ اور بھائی کے بعد اس کی مرضی کے بغیر اس کی زندگی میں آنے والا تیسرا مرد اکبر علی تھا لیکن وہ ان دونوں سے قدرے مختلف تھا اگرچہ وہ زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا لیکن کچھ شکی اور توہم پرست بھی تھا مگر وہ اس کے ساتھ رہتے ہوئے مطمئن تھی۔ اس گھر میں آ جانے کے بعد اس کی دونوں سہیلیاں کیے بعد دیگرے وفات پا گئی تھیں ایک دادو جی اور دوسرے اس کی تنہائی۔ اس کے ابو کے گھر میں اب اس کا کچھ باقی نہیں بچا تھا اس نے اکبر علی کے گھر کو اپنا گھر سمجھنا شروع کر دیا۔

اکبر علی کے پاس کچھ نہیں تھا مگر دولت بہت تھی اور اس دولت کو خرچ کرنے کے معاملے میں وہ بہت شاہ خرچ واقع ہوا تھا۔ اکبر علی کا پیسہ خرچ کرتے ہوئے اسے کسی شرم یا تذلیل کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ خود ہی ہرمینے کی ابتدا میں اچھی خاصی رقم اس کے حوالے کر دیتا تھا۔ وہ اکثر اوقات اس کے لیے تعریفی الفاظ بھی استعمال کر دیتا تھا۔ شاید اپنی بیوی کی وفات کے بعد وہ اپنی تین جوان ہوتی ہوئی بیٹیوں کو لے کر کچھ زیادہ ہی حساس ہو گیا تھا اس لیے وہ اس کے ساتھ اپنا رویہ بہترین رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے بھی اپنی سویتلی ماں سے مطمئن تھے۔

شادی کے تقریباً آٹھ ماہ بعد اس کو وہ احساس ہوا جو ہر عورت کی تکمیل کہلاتا ہے۔ وہ زندگی تخلیق

کرنے جا رہی تھی وہ یقیناً اس قابل تھی کہ زندگی عدم سے وجود میں لے آئے۔ خوشی کیا ہوتی ہے اسے پتا چل گیا تھا خوشی کی حد کیا ہوتی ہے اسے یہ بھی پتا چل گیا تھا۔ ان دنوں اس کی اپنی زندگی اس کی کھلکھلاہٹیں سن کر حیران ہو جاتی تھی۔

ہماری خوشیوں کو ہماری اپنی ہی نظر لگ جاتا کرتی ہے۔ اس کی خوشی کو بھی شاید اس کی نظر لگ گئی تھی۔ پریکٹس کے پہلے ہی مہینے اس نے اپنے بچے کا نام سوچ لیا تھا۔ اس نے اپنی گری گری طبیعت کا ذکر اکبر علی سے بہت خوش ہو کر کیا۔ اکبر علی نے اسے کچھ الجھ کر دیکھا پھر اپنی جیب سے نوٹ نکال کر اس کے سامنے رکھے تھے۔ روپے خوش خریدنے کے لیے ہوتے ہیں لیکن وہ اسے یہ روپے اس کی زندگی کی اکلوتی خوشی کو ختم کرنے کے لیے دے رہا تھا۔ وہ اکبر علی کی بات کیسے مان سکتی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی گناہ نہیں کیا تھا اور پھر بھی اس نے گنہگاروں جیسی زندگی گزار رہی تھی اور اگر وہ یہ گناہ کر لیتی تو اس کی زندگی گنہگاروں سے بھی بدتر ہو سکتی تھی۔

اکبر علی اس سے اس کی زندگی کی یہ اکلوتی خوشی بھی چھین لینا چاہتا تھا۔ اس نے واضح لفظوں میں مزید اولاد کے لیے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا وہ اس عمر میں میٹرنی ہوم کے چکر لگا کر اپنا تماشا نہیں بنوانا چاہتا تھا۔ وہ اسے ایک استعمال چیز سمجھ کر گھر لایا تھا جسے اس کی اولاد بیک وقت واپس جڑاؤ بیلن اور چنے کی طرح استعمال کر سکتی تھی وہ اس استعمال کی چیز کے ہاتھوں خود استعمال نہیں ہوتا چاہتا تھا۔

اس نے اکبر علی کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ جواب میں اکبر علی نے بہت خاموشی سے طلاق کے کاغذات اس کے سامنے رکھ دیے۔ اسے کسی مولوی سے فتوے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اسے اپنے گھر سے نکلنے کا فیصلہ کر چکا تھا وہ اکبر علی کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی یہ بات اسے ہمیشہ حیران کرتی تھی کہ آخر اتنی مشکل سے بننے اور نبھانے والا یہ رشتہ اتنی آسانی سے کیسے ختم ہو جاتا ہے اور اب اپنے شوہر سے یہ کاغذات لیتے ہوئے سب سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر میں رکھنے کو تیار تھا مگر اپنی شرائط پر جو اسے منظور نہیں تھیں اکبر علی نے طلاق کی وجہ اس کی وہ بیماری ظاہر کی تھی جو بہت عجیب و غریب تھی اور وہ شادی سے پہلے اس کی اس بیماری کے متعلق نہیں جانتا تھا۔ وہ خود بھی اپنی اس بیماری کو جانتی تھی لیکن جو نام اسے اکبر علی نے دیا تھا وہ کچھ انوکھا تھا کم کم خود اس کے لیے۔

اسے جنات کا سایہ تھا۔ وہ جنات کے زیر اثر بہت نقصان دہ حرکتیں کرتی تھی۔ وہ اپنے شوہر اور اپنے بچوں کے لیے نقصان دہ تھی۔ ایسی عورت کو گھر میں کیسے رکھا جاسکتا تھا۔

لوگوں کی ہمدردیاں بٹورنے کے لیے اکبر علی کے پاس اس سے بہتر کوئی اور جواز ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک بار پھر کھلے آسمان کے نیچے آ گئی تھی۔ اس کے شوہر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر نکال دیا تھا۔ اس کی قسمت ہی یہی تھی شاید کہ ہر جگہ سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر نکال دیا جاتا۔

یہ ابو کے جوتے امی کے تھپڑ بہن بھائیوں کے طعنے نہیں تھے کہ وہ چلا چلا کر آسمان سر پہ اٹھا لیتی۔ ایک ایسی بات تھی جس کے لیے وہ کسی کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتی تھی۔ اور یہ ایک ایسی بات تھی جس کا سار کرڈٹ وہ خود لینا چاہتی تھی۔ اس کے لیے اپنے واسطے طلب کرنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا مگر وہ اپنے بچے کی کو

خواہش سے دستبردار نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بچا اپنا نجات دہندہ محسوس ہونے لگا تھا حالانکہ اس کے آنے تک اسے ٹھکانہ چاہیے تھا۔ وہ ایک بار پھر اللہ سے پوچھ رہی تھی۔ وہ ماں باپ بھائی شوہر کے گھر سے دھتکار دی گئی تھی۔ اسے گھر چاہیے تھا وہ اللہ سے ٹھکانا طلب کر رہی تھی۔

وہ کہتا ہے کہ وہ ہر پکار کا جواب دیتا ہے۔ اور اگر وہ ہر پکار کا جواب دیتا ہے تو وہ جواب سنائی کیوں نہیں دیتا یا پھر شاید اس کے جواب کو سن کر ان سنی کر دیا جاتا ہے اکثر اوقات اس کے جوابات کو ٹھیک طرح سے سمجھا ہی نہیں جاتا اور پھر شکوہ بھی اسی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا شاید ورنہ اللہ اپنے بندے سے اتنا لاپرواہ نہیں کہ اس کی پکار کا جواب نہ دے۔

☆ ☆ ☆

”میں کون ہوں؟ سوال یہ نہیں ہے۔ میں کیوں ہوں؟ سوال یہ ہے۔“

اس نے ہر حقیقت سے پردہ اٹھانے کے بعد کہا۔ نقاہت کے باعث اس کے چہرے پر زردی کے رنگ نمایاں تھے۔ رات کے وقت ہونے والے اس سردرد نے اسے بہت نڈھال کر دیا تھا وہ بہت بھڑبھڑا کر بات کر رہی تھی مگر اس نے منابل سے کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

منابل کے صرف ایک سوال پر وہ اس کے سامنے کھلتی چلی گئی تھی۔ والدین کی علیحدگی اس کی امی کے ظلم و ستم غیر کے طعنے خرم کی سنگدلی اس کی سگی ماں کی خود غرضی..... ایک ایک بات منابل کو بتا دی تھی اس نے، شاید وہ خود بھی اتنا غبار اٹھائے جانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اسے کسی سامع کی ضرورت تھی اور منابل ایک اچھی سامع ثابت ہوئی تھی۔

اس کی تعلیم زیادہ نہیں تھی مگر وہ کمال کا فلسفہ بولتی تھی کیونکہ فلاسفی بولنے کے لیے تعلیم سے زیادہ علم کی ضرورت ہوتی ہے اور علم تجربے سے بھی آ جاتا ہے۔ تطہیر کے پاس بہت تجربہ تھا۔ اس نے زندگی کی در ماندگی کو بہت ہمت سے سہا تھا۔

”مجھے اب کسی سے کچھ نہیں چاہیے میری ساری امیدوں کا مرکز میرا بچہ ہے۔ وہ جب اس دنیا میں آ جائے گا تو مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ میں اس کے سہارے زندگی کے تمام مصائب کو اپنی خوشی سہا لوں گی۔“ اس نے کہتے کہتے لمحہ بھر کا توقف کیا پھر بولی۔

”جب اکبر علی نے مجھے گھر سے نکالا تو میرے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں خرم کے پاس نہیں جاسکتی تھی۔ میں اپنی ماں کے گھر واپس نہیں جاسکتی تھی تب میں نے بہت دل سے اللہ کو پکارا تھا۔ مجھے رہنے کو ٹھکانہ مل گیا تھا۔ میں دارالپناہ میں آ گئی تھی۔ میں نے وہاں تین ماہ گزارے..... اور وہ تین ماہ میری تیس سالہ زندگی پر حاوی ہیں۔ میں نے ان دنوں زندگی کی جس تنگی کو محسوس کیا جن رنگوں کو دیکھا وہ اس قدر تکلیف دہ تھے کہ میں ابھی تک ان کو بھلا نہیں پاتی مگر میں انہیں یاد بھی نہیں کرنا چاہتی۔ گھر سے نکلی دارالامان پہنچی وہاں سے پولیس اسٹیشن اور پھر یہاں آپ کے پاس..... میں جانتی ہوں مجھے یہاں سے بھی جانا ہے میں آپ کو زیادہ دیر تک تنگ نہیں کروں گی..... بس دو تین ماہ صرف دو..... تین ماہ مجھے اپنے پاس رکھ لیں یقین کریں اس کے بعد میں آپ کو

کبھی شکل بھی نہیں دکھاؤں گی..... مگر براہ مہربانی۔“

اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ منابل سمجھ گئی تھی وہ ذلیوری تک اس کے گھر میں رہنا چاہتی تھی لیکن یہ منابل کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اپنے والدین سے پوچھنے بغیر اب کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ تطہیر کا دل بھی نہیں توڑ سکتی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر بات پلٹی۔

”اور وہ سب کچھ جو کل رات ہوا..... وہ کیا ہوا تھا۔ کیا جج جج تھیں.....“

یہ شاید پچھو کی بات کا اثر تھا کہ وہ بھی جنات کے وجود کے بارے میں پر یقین ہو چلی تھی اور پھر تطہیر کی طلاق کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی اسی لیے اس نے پوچھ لیا۔ تطہیر کے چہرے پر بہت مردہ سی مسکراہٹ نے جھلک دکھائی۔

”بچپن سے ہی ایسا ہے..... اچانک درد اٹھتا ہے۔ اور میں بے حال ہو جاتی ہوں حتیٰ کہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہتی..... دل چاہتا ہے سر کو اپنے ہاتھوں الگ کر دوں۔“

”تم نے کبھی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا؟..... کبھی چیک اپ بھی نہیں کروایا؟“ منابل نے پوچھا۔

”جب میں اپنی ماں کے گھر گئی تھی تب وہاں چیک اپ کروایا تھا۔ ڈاکٹر نے ٹیسٹ وغیرہ کیے تھے۔ وہ کہتا ہے میں پیدائشی ہائپر ٹینسو ہوں۔ اس نے اور بھی بہت سی باتیں بتائی تھیں دوائیں بھی دی تھیں۔ مگر۔“

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ منابل نے گہری سانس بھری..... اسے تطہیر سے ہمدردی ہوئی تھی اور اس جیسی لڑکی جو زندگی کے ہر میدان میں کامیابی کے نشے سے سرشار تھی وہ تطہیر کے لیے صرف ہمدردی ہی محسوس کر سکتی تھی۔

”تمہیں اپنی مایا گھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا..... بہر حال وہ تمہاری ماں ہیں وہ تمہیں بہتر طریقے سے سنبھال سکتی تھیں۔“ منابل نے رائے دی۔

”وہ بھی یہی کہتا تھا..... اس کا خیال تھا کہ بہت چھپتاؤں گی..... اور۔“ اس نے رک کر گہرا سانس لیا اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی منابل نے یہ مسکراہٹ پہلے کبھی اس چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

”اور اس کا خیال ٹھیک ثابت ہوا میں حقیقتاً چھپتاؤں بھی۔“ اس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے بات مکمل کی۔

”وہ؟ وہ کون؟“ منابل نے کھوجنے والے انداز میں پوچھا تطہیر کے چہرے پر جھنجھکی ہوئی مسکراہٹ میں اضافہ ہوا۔

”وہ..... وہ تھا..... وہ کہتا تھا اسے مجھ سے محبت ہے..... وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“

شرگیں مسکراہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ منابل کو خفیف سا جھٹکا لگا۔ بھلا تطہیر جیسی عام شکل والی لڑکی سے کون محبت کر سکتا تھا۔

”وہ میری ماں کے دوسرے شوہر کا بیٹا تھا ہر لحاظ سے مجھ سے مختلف ہر لحاظ سے مجھ سے بہتر.....“

وہ ایک بار پھر بات کرتے کرتے رکی۔ شرگیں مسکراہٹ استہزائیہ مسکراہٹ میں ڈھل گئی تھی۔

”اے میرے حالات سن کر ہمدردی کا بخار چڑھ گیا تھا وہ کہتا تھا اسے مجھ سے محبت ہوگئی ہے اور وہ میرے لیے ساری دنیا سے نکلے سکتا تھا۔“ وہ بتا رہی تھی جبکہ منابل کو حیرت ہو رہی تھی۔ تطہیر نے بتایا تھا وہ لڑکا اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ لڑکا اتنے بڑے بزنس مین کا بیٹا تھا یقیناً وہ بہت بائی فائی جو اس رکھتا تھا تو پھر اس نے بیوی کے لیے تطہیر کا انتخاب کیوں کیا؟ اس کے ذہن میں یہی سوال گردش کرنے لگے تھے۔

”بدھو ہوگا۔“ اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔

”تمہیں بھی اس سے محبت تھی؟“ منابل نے سرسری سے انداز میں سوال پوچھا۔

”ہاں نہیں میں نے کبھی سوچا نہیں..... مگر مجھے اس کی ہمدردی سے سخت نفرت تھی۔ میری ماں نے اس کی پرورش کی تھی وہ ان کا احسان اتارنے کے لیے مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا مجھے اس کے جھوٹ سے نفرت تھی وہ احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے مجھے استعمال کر رہا تھا اور وہ کہتا تھا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے محبت یہ تو نہیں ہوتی محبت اس طرح کی تو نہیں ہوتی۔“

وہ سر جھکائے کہہ رہی تھی۔ منابل سمجھ نہیں پائی کہ پھر وہ کس قسم کی محبت کی طلب گار تھی۔ وہ بات کرتے کرتے آنکھیں بند کر چکی تھی۔ اسے اس بات پر کافی حیرت ہو رہی تھی۔ کہ تطہیر سے کوئی لڑکا محبت کیسے کر سکتا ہے۔ یقیناً اس کی والدہ کا سوتیلا بیٹا نیکی کے موڈ میں تھا اور تطہیر نے اسے یہ نیکی کرنے نہیں دی تھی۔

☆ ☆ ☆

”آٹھ نمبر.....“ استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی نے نمبر پکار کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ منابل نے مسکراتے ہوئے اس خوب صورت سی رہنمائی کو دیکھا۔

”آپ آٹھ نمبر کے ساتھ ہیں؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”جی۔“ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر استقبالیہ پر آگئی۔

”میم! آپ اندر چلی جائیے۔“ وہ گانا کو لو جسٹ کے روم کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہی تھی۔ منابل خاموشی سے اندر چلی گئی۔ ویننگ روم میں بیٹھی خواتین نے حیرت سے اسے دیکھا تھا پھر ان میں سے دو ایک کھسر پھسر کر کے ہنسنے لگی تھیں اسی لیے وہاں سے اٹھتے ہوئے اس نے ذرا سکون کا سانس لیا تھا۔ ویسے بھی کسی بھی میٹرنی ہوم میں آنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ تطہیر پہلے سے گانا کو لو جسٹ کے روم میں تھی۔ اس کا چیک اپ ہو چکا تھا اور وہ اب کرسی پر خاموشی سے بیٹھی ہدایات سن رہی تھی۔

”آپ ہیں ان کے ساتھ؟“ بے حس سے چہرے والی اس گانا کو لو جسٹ نے پوچھا پھر اس کے اثبات پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”کیس بہت مشکل ہے۔ سیزیریئن کے بغیر تو ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم بے بی کو بچا سکیں۔ بہت کمزور ہیں یہ..... ہائیرٹیسو بھی ہیں..... بائی داوے آپ میری ہیں۔“

اس نے ایک دم سے سوال کیا۔

”نہیں!“ اسے اچانک ہی اپنے غیر شادی شدہ ہونے پر شرمندگی ہونے لگی۔ گانا کو لو جسٹ کے

چہرے کے تاثرات ہی ایسے تھے۔

”آپ کو کسی میریڈ خاتون کو اپنے ساتھ لانا چاہیے تھا۔ اب میں ان کو مزید تفصیلات سے کیا آگاہ کروں؟ آپ کا یہ پہلا بچہ ہے..... بہت احمقانہ کی ضرورت ہے..... کچھ کھلکا شہر ہو سکتی ہیں.....“

وہ ٹھہر ٹھہر کر ان دونوں کے چہرے اور اپنے سامنے پڑی تطہیر کی رپورٹس دیکھ کر کہہ رہی تھی۔ ایک دن پہلے اس نے اسی میٹرنی ہوم سے کچھ ٹیسٹ کروائے تھے۔

”Foetus کی مودنٹ بہت سلو ہے..... آپ اپنی خوراک کی طرف دھیان دیں..... ٹینشن..... اسٹریس..... ٹائٹ ایٹ آل۔“

اپنا چشمہ اتار کر اس نے میز پر رکھتے ہوئے کہا پھر منابل کے حلیے پر نظر ڈال کر بولی۔
”اوا نیکی یکشت کرنی ہوں گی..... آپ کا ڈنٹر پہ اپنا نام رجسٹر کروا کر نیکیٹ وزٹ کی ٹائمنگ طے کر لیجئے۔“

وہ اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولی۔ منابل کو اس نے بلایا ہی اس لیے تھا کہ تطہیر کو اپنے حلیے سے اس قابل نہیں لگ رہی تھی کہ اخراجات برداشت کر سکے جبکہ منابل کو دیکھ کر اسے اطمینان ہو گیا تھا۔
وہ دونوں شکر یہ ادا کر کے اٹھ گئی تھیں تطہیر کو گانا کو جسٹ کی باتوں نے پریشان کیا تھا یا نہیں اس کے چہرے سے پتا لگانا مشکل تھا یہاں آنے سے پہلے اس نے مسکراتے ہوئے منابل سے کہا تھا۔

”میں جانتی ہوں اس بار اللہ میرے ساتھ ہے وہ مجھ پر کرم ضرور کرے گا۔“

وہ مرکزی استقبالیہ پر آ کر ضروری معلومات فراہم کر کے تطہیر کا نام درج کروانے لگی تطہیر ایک طرف پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔

”ایلیکسیو زمی۔“ منابل نے مز کر دیکھے بغیر اس آواز کو پہچان لیا تھا اس آواز کو وہ ہزاروں کے مجمع میں بھی پہچان سکتی تھی وہ صفوان ہی کی آواز تھی۔ منابل کچھ جھنجکتے ہوئے مڑی۔ میٹرنی ہوم میں وہ کم از کم اس شخص کا سامنا نہیں کر سکتی تھی اسے یہ صورتحال ایک دم سے بہت عجیب لگی۔ صفوان کی آنکھوں میں تحیر تھا۔

”وہ..... میں اپنی ایک فرینڈ کے ساتھ آئی تھی۔“ اس کے استفسار پر وہ خجالت بھری مسکراہٹ سے بولی۔

”میرے ایک کولیگ کی وائف ہیں یہاں..... جڑواں بیٹے ہوئے ہیں ان کے گھر۔“ اسی کے انداز میں صفوان نے بھی وضاحت کی۔ اس کا اس جگہ پر ہونا اتنا بھی حیران کن نہیں تھا کیونکہ وہ خود ایک ڈاکٹر تھا مگر پھر بھی اس کی وضاحت منابل کو اچھی لگی۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے تطہیر کو اپنی سمت بلایا۔ صفوان نے بھی اس کی طرف دیکھا پھر وہ منابل کو دیکھنے لگا تھا۔

”یہ..... تطہیر.....“

”تطہیر رحمن۔“ صفوان نے اس کی بات اچک کر نام مکمل کیا تو منابل نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”یہ آپ کے ہاتھ میں نسخہ ہے تاور یہ رپورٹس۔“ فائل کی سمت اشارہ کیا جس پر تطہیر کا نام لکھا تھا اور

منائل کے ہاتھ سے فائل لے کر دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے مگر اس نے ان پر قابو پایا تھا۔ گاٹی کی رپورٹس کو مکمل طور پر سمجھنا اس کے لیے اتنا بھی آسان نہیں تھا۔ فائل اس نے چیک کرنے کے بعد واپس منائل کو تھما دی۔

”مبارک ہو آپ کو بہت۔“ اس نے تطہیر کی طرف دیکھتے ہوئے استہزائیہ انداز میں مبارک باد دی۔ وہ تطہیر کا مکمل جائزہ لے چکا تھا شاید اسے اس کے حلیے سے الجھن ہو رہی تھی کم از کم اس کے چہرے سے الجھن ہی ٹپک رہی تھی۔ سچی سنوری میک اپ سے آراستہ منائل کے مقابلے میں تطہیر کی سادگی اس کے روپ کو مزید گہوارہ بناتی تھی۔ تطہیر نے ایک نظر ہی صفوان کو دیکھا تھا اسے منائل کی قسمت پر رشک آیا تھا۔ صفوان کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

منائل نے صفوان کی آنکھوں میں تطہیر کے لیے الجھن دیکھی تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ جانتی تھی صفوان کو ہمدردی خدا ترسی سوشل ورک سب باتوں سے چڑ ہے۔ اس کے دل میں ایک انوکھا خیال آیا تھا۔

وہ اس لمحہ صفوان کو دکھا سکتی تھی کہ وہ کتنی ہمدرد اور حساس طبیعت رکھتی ہے اس کا دل لاچاروں کی تکلیف پر کتنا دکھ محسوس کرتا ہے اور وہ صفوان کی نظروں میں اپنا بلند کردار مزید بلند کرنے کے لیے تطہیر رحمن کو استعمال کر سکتی تھی۔ وہ اپنی ہمدرد طبیعت کا مظاہرہ کر کے اپنے نمبر بڑھا سکتی تھی۔ اپنی عظمت کو ثابت کرنے کا شاید ہی اس سے بہتر موقع کوئی اور ہوتا۔ اس کا دل مدرثر یا بننے کو چاہتا تھا۔

وہ صفوان کو اپنی اس مظلوم دوست کے عجیب و غریب سر درد کے متعلق بتانے لگی۔ وہ نیوروسرجن تھا۔ اور مسئلے کی اصل تہہ تک پہنچ سکتا تھا۔ لیکن وہ نہایت لائق تعلقی سے منائل کی بات سن رہا تھا اور وقتاً فوقتاً تطہیر کے سراپے پر نظر ڈال لیتا جو سر جھکائے اپنے جوتوں کو گھورنے میں مشغول تھی۔

☆ ☆ ☆

”جو انسان دارالامان جیسی جگہوں پر برائی ڈھونڈ سکتا ہے۔ جو وہاں کی مظلوم عورتوں کو فراڈ قرار دیتا ہے۔ اور جو ایسی جگہوں کو ختم کرنے کی بات کر سکتا ہے میں تو اسے مسلمان ہی نہیں مانتی۔“

سیریکانے میز کے گرد بیٹھے ساتوں افراد کے چہرے پر باری باری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”تمہارے زمانے سے میں کافر نہیں ہو جاؤں گا۔ الحمد للہ مسلمان ہی رہوں گا۔“

فیصل نے بہت اطمینان سے جواب دیا جبکہ سیریک کا خیال تھا وہ اس بات پر ضرورت پڑے گا اٹھے گا مگر وہ ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھا جنہیں غصہ ذرا کم ہی آتا تھا۔ سیریکانے جان بوجھ کر اس کی بات کا جواب نہیں دیا ورنہ ایک لمبی بحث چھڑ سکتی تھی جس سے وہ فی الحال احتراز برتنا چاہتی تھی۔

”یہ دارالامان جس طرح ضرورت مند عورتوں کو چھت آسرا اور پناہ فراہم کرتے ہیں وہ قابل تحسین ہے۔“

یہ کٹرا بھی فیصل نے ہی لگا یا تھا۔ وہ ایک کرائم رپورٹر تھا اس کے پاس اس طرح کی باتوں کے متعلق

ساری معلومات ہی نہایت اپ ٹو ڈیٹ ہوتی تھیں۔ لیکن سیریک کو اس کی کسی بات سے اتفاق نہیں ہوتا تھا۔ اس کے خیال میں فیصل کو انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے ہر اچھی چیز کو برا کہنے کا شوق تھا۔ ان کی این جی او کے سالانہ فنڈنگ سے حاصل ہونے والی رقم سے اس باریک دارالامان بنانے کا منصوبہ زیر غور تھا۔ سیریک کو بورڈ ممبرز کے ساتھ ساتھ جو سیریکسٹنر اسٹاف کی رائے بذریعہ دوئنگ لینے کے لیے کہا گیا تھا۔ وہ اسی سلسلے میں ان سب کو اس منصوبے کے فوائد اور دور رس اثرات سے آگاہ کر رہی تھی جب فیصل بھی وہاں چلا آیا اور آتے ہی اس نے اس منصوبے کے فوائد کو بگوس بگوس قرار دیا تھا سیریک دراصل اسی بات سے بھڑکی تھی۔ فیصل ان کا کوئی ایک نہیں تھا اس کا اس آفس سے صرف اتنا تعلق تھا کہ وہ ریمان قمر کا بھانجا تھا اور جب اپنے کام سے تھک جاتا تھا تو فریش ہونے کے لیے ان کے پاس آ کر بیٹھ جایا کرتا تھا کیونکہ وہ ایک فری لانس رپورٹر تھا اس لیے اپنی مرضی کا مالک تھا۔ وہ اس آفس میں ہونے والی ہر بحث میں کود پڑنے کا عادی تھا اور خاص طور سے سیریک جس بحث کو چھیڑتی اس میں ٹانگ اڑاتا تو اس کی عادت تھی۔ اب بھی یہی ہوا تھا اس نے سیریک کی بات سے اختلاف کر کے گویا اس کے غصے کو ہوا دی تھی۔

اس لمحہ اطمینان بھی قابلِ داد تھا۔ وہ سیریک کو چڑانے کے لیے جان بوجھ کر اس طرح سے بات کر رہا تھا۔ اس کی بار بار اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکی اسی لیے ترخ کر بولی۔

”تم تو مجھ سے بات ہی نہیں کرو فیصل۔۔۔۔۔ تم ایک مردہ دل کے مالک انسان ہو میرا دل چاہتا ہے کہ تمہاری پیشانی پہ یہ بڑا بڑا کر کے لکھوا دوں کہ یہ شخص پاگل ہے اس کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اسے کاٹنے کی عادت ہے۔“

وہ درپردہ اسے گالی دے رہی تھی۔ فیصل نے بہت جلی ہوئی مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

”ویل مس سیریک! آپ میرے بارے میں اور میری عادتوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی باخبر نہیں رہے لگیں۔ اور کس کس چیز کی عادت ہے مجھے یہ بھی بتا دیجئے۔“ منائل ’فہد ربیعہ‘ اظہر اور شعیب سب ہی ایک دم کچھ حناٹ ہوئے۔ فیصل کا یہ انداز ان کے لیے کچھ نیا تھا۔ سیریک کو بھی شاید اپنی غلطی کا احساس ہوا اسی لیے وہ بھی ذرا دیر کو خاموش ہو گئی فیصل اس کے اتارے چہرے کو دیکھ کر ایک دم سے ہنس دیا اور بات پلٹ کر بولا۔

”لیوٹ یار! یہ سب تو چلتا ہی رہتا ہے۔۔۔۔۔ کس بات کے لیے دوئنگ کر رہے تھے تم لوگ چلو پھر سے شروع کرتے ہیں۔“

اس کے ہلکے پھلکے انداز میں کہنے پر سب ہی کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”تم بھی تو اپنی رائے دو منائل!“ اسے خیالوں میں کھویا دیکھ کر اطہر نے متوجہ کیا۔ وہ اپنی دنیا میں کھوئی ان کی بات ہی نہیں سن پاتی تھی۔ سیریک اور فیصل کے درمیان تصفیہ ہو بھی چکا تھا یقیناً سیریک نے معذرت نہیں کی تھی لیکن فیصل کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ سب ٹھیک ہو چکا ہے۔ اسے کبھی کبھی اس شخص کی قوت برداشت پر رشک آتا تھا وہ کیسے ہر بات اتنے تحمل سے ہضم کر لیتا تھا۔

”میں ذاتی طور پر کسی ادارے یا تنظیم کے خلاف نہیں ہوں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ دارالپناہ جیسی

جگہیں نہیں ہونی چاہیں میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ مظلوم عورتوں کی بقا کو قائم رکھنے کے لیے کچھ نہ کیا جائے۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں سب سے بات کر رہا تھا لیکن وہ سنا تا صرف سید کا کوچا ہوتا تھا۔

”میرے کہنے کا صرف یہ مقصد تھا کہ تمہیں اور باقی سب لوگوں کو یہ بتا سکوں کہ جن جگہوں یا اداروں کے بارے میں ہم بہت حساس ہوتے ہیں اور ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہاں برائی یا برائی جیسی کوئی چیز ہو سکتی ہے دراصل وہاں سب سے زیادہ بدی اور برائی کے پائے جانے کا امکان ہوتا ہے کیونکہ وہاں کسی کی نظر نہیں پڑتی اور برائی بیکٹر یا کی طرح نمود پاتی چلی جاتی ہے۔“

وہ لمحہ بھر کو کرا پھر اس نے اپنی جیمہ کے پاس زمین پر پڑا بیگ اٹھا لیا۔ اس نے دو تین پرانے اخبار اس میں سے لے لیے اور سب کے سامنے میز پر پھیلا کر رکھ دیے۔

”یہ شہر کے چند بڑے دارالامان ہیں۔“ اس نے کاغذ کے اوپر لسٹ کی صورت میں لکھے ہوئے ناموں پر انگلی چلاتے ہوئے کہا پھر اس نے دوسرا کاغذ اوپر کیا۔

”اور یہ چند کم معروف دارالامان ہیں۔“ وہ دوسری لسٹ کے متعلق بولا پھر تیسرے کاغذ کی باری آئی۔

”اور یہ نہایت غیر معروف..... ان دارالامان کے ساتھ کسی بڑی، ان جی اوکسی ٹرسٹ یا کسی بڑے سیاستدان کا نام نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے تینوں کاغذ سمیٹ کر ایک طرف کر دیے۔

”برائی کا تناسب بھی اسی طرح ہے۔ سب سے زیادہ معروف دارالامان میں سب سے زیادہ..... کم معروف میں کم برائی کا تناسب اور پھر غیر معروف میں اس سے بھی کم۔“ وہ اسی طرح رک رک کر بات کرتا تھا۔

”سب سے زیادہ پکڑ میں کون سے دارالامان آتے ہیں؟“ وہ ان سب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ کر بولا۔

”وہ..... جہاں برائی سب سے کم ہوتی ہے مگر نظر سب سے زیادہ آتی ہے۔“ اس نے تیسری لسٹ ایک بار پھر سب کے سامنے رکھی اور اس لسٹ میں سے ایک پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”یہ..... ساندہ کے قریب واقع ایک بہت چھوٹا سا دارالامان ہے۔ یہاں کل عورتوں کی تعداد تین ہے اور یہ دارالامان ایک شخص نے اس لیے تعمیر کیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے رفاہ عامہ کا کوئی کام کرنا چاہتا تھا۔

اس کی بیٹی جل کر مر گئی تھی۔ وہ صدقہ جاریہ ٹائپ کوئی کام کرنا چاہتا تھا سو اس نے اور اس کی بیوی نے اس ایک چھوٹے سے ادارے کی داغ بیل ڈالی۔ شروع میں یہ ایک ہاسٹل کی طرح تھا آپ اب بھی اسے ایک ہاسٹل سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہاں پر رہنے والی تین تیس عورتیں اپنا پیٹ بھرنے کے لیے خود مختار کرتی ہیں۔ اس دنیا میں کوئی ایسا نہیں جسے یہ عورتیں اپنا کہہ سکیں وہ ایک دوسرے کو اپنا کہتی اور اپنا کہتی ہیں..... بلکہ سمجھتی تھیں..... کیونکہ

ایک ماہ قبل اس دارالامان کو بند کر دیا گیا۔“

وہ ایک بار پھر خاموش ہوا۔ سب ہی وجہ جاننے کے لیے بے تاب تھے۔

”یہاں پر رہنے والی ایک عورت نے شادی کر لی تھی۔ وہ کس سے کہتی کہ اسے شادی کرنی ہے؟“ اس کے بزرگ نہیں تھے وہ کسی کے حکم کی پابند نہیں تھی مگر پھر بھی اس دارالامان کو چلانے والے میرے معزز دوست کی مکمل مرضی اس شادی میں شامل تھی لیکن پھر بھی اس بات کو ایشو بنایا گیا کہ اس جگہ عورتیں بدکاری میں ملوث ہیں وہ اپنے گاہکوں کو گھیر کر اس جگہ پر لاتی ہیں..... اور شاید تم سب لوگوں کے لیے یہ بات دلچسپی کی حامل ہو کہ وہاں ایک عورت کے سوا سب کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان ہے۔ وہ لفافے بنا کر چھپ بنا کر کھجور کی ٹوکریاں بنا کر اور دوسری دستکاری وغیرہ کی مدد سے روزی کماتی تھیں۔ دارالامان بند کر دیا گیا اور ان عورتوں کو ایک معروف دارالامان میں شفٹ کر دیا گیا..... شاید اس الزام کو جی ثابت کرنے کے لیے۔“

”وہ خاموش ہو کر ایک اور لسٹ اوپر رکھ رہا تھا۔“

”یہ ایک معروف دارالامان ہے۔“ اس نے سب سے پہلی لسٹ میں سب کے آخر میں لکھے ہوئے نام پر انگلی رکھی۔

”اب ملاحظہ کیجئے یہاں کیا ہوتا ہے؟ زبردستی زنا، بیہودہ فلبوں کی ریہرسل اینڈ شوٹنگ..... کیا یہاں پر رہنے والی عورتیں یہ سب کام کرنے پر تیار ہو جاتی ہیں؟..... ویل..... اگر وہ تیار نہ ہوں تو دارالامان کی انتظامیہ کے پاس بہت سے حربے ہیں جن کی مدد سے وہ ان عورتوں کو یہ سب کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ عورتوں پر تشدد کیا جاتا ہے انہیں اتنی بری طرح مارا جاتا ہے کہ وہ یہ سب کام کرنے پر راضی ہو جاتی ہیں۔ واش رومز میں کمرے لگا دیے جاتے ہیں۔ بہت سی عورتوں کی مودی بنالی جاتی ہے اور پھر انہیں بلک میل کر کے اپنی مرضی و منشا کے تحت مجبور کر کے اپنا من پسند کام کر دیا جاتا ہے۔ یہاں سب خوب صورت عورتوں کو بڑے بڑے لوگوں کے گھر مہمان بنا کر بھیجا جاتا ہے واپسی میں ڈونیشن کے نام پر بڑی بڑی رقمیں لاتی ہیں اور پھر.....“

اس نے خاموش ہو کر ایک بار پھر سب کی شکل دیکھی اور سب سے زیادہ غور سے سید کا کوڈ دیکھا۔

”بہت خوبصورت عورتوں کو..... کچھ اور عورتیں بھی پسند کر لیتی ہیں اور اپنے گھر میں مہمان بنا کر رکھتی ہیں۔ ان کے درمیان غیر فطری تعلقات بھی ہوتے ہیں اور اس سے زیادہ الا بلا میں نہیں بتاؤں گا کیونکہ اگر اس سے زیادہ میں نے کچھ کہا تو لوگوں کو اعتراض ہو گا کہ میں عورتوں کو مردوں سے کمتر تصور کرتا ہوں اور فلیس دیکھ کر عورتوں نے اس قسم کی الزام تراشیاں کرتا ہوں۔“ وہ خاموش ہوا تو وہاں بیٹھی تینوں خواتین ایک لمحہ کو تو بالکل ہی ساکت رہ گئی تھیں ان میں سے کسی کو بھی امید نہیں تھی کہ بات کا رخ اس طرف نکل جائے گا۔

”یہاں پر رہنے والے لوگوں نے شہریوں نے بہت بار اس دارالامان میں ہونے والی سرگرمیوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے احتجاج کیا ہے۔ وہاں کے رہائشی چاہتے ہیں کہ اس دارالامان کو ختم کر دیا جائے کہ یہاں ضرورت مند عورتوں کو طوائف بن کر رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے مگر لوگوں کی بات پر کوئی نوٹس نہیں لیا گیا کیونکہ اس دارالامان کو چلانے والی خاتون ایک بہت معزز سیاستدان کی بھانجی ہیں بھانجی..... یہ مذاق بھی خوب ہے کہ ایسے لوگ جس عورت کو بیوی نہ بنا سکیں اسے بھانجی بنا لیتے ہیں۔ اس دارالامان کو ریکارڈ میں درجہ A میں رکھا گیا ہے۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا جبکہ باقی لوگ مسکرا بھی نہ سکے۔ ”یہ سب کسی ایک شہر میں نہیں

ہور ہا بلکہ سب شہروں علاقوں کی بات ہے۔ سیریکا جس دارالامان کے ساتھ مل کر کام کرنے کی بات کر رہی ہے اس کا بہت بڑا نام ہے مگر میں اخبار کا آدمی ہوں میں اندر کی بات جانتا ہوں اور اسی لیے میں اس پراجیکٹ کے خلاف ہوں میں صفیہ صفدر کے بیک گراؤنڈ سے بہت اچھی طرح واقف ہوں..... ابھی حال ہی میں ایک ماہ پہلے اس دارالامان میں جو کچھ ہوا کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔“

وہ رک کر ایک اخبار ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

”اسی کو دیکھ لو۔“ اس نے ایک دو کالمی خبر پرائنگ رکھی وہ سب باری باری اس خبر کو دیکھنے لگے۔

”اس گنگنا ر عورت کو صفیہ صفدر نے پکڑوایا پھر اس نے چھڑوایا..... کیسے؟ کیوں یقیناً رقم خرچ ہوئی ہے کسی طرح سے کس طرف سے کیوں؟ یہ میں نہیں جانتا مگر جلد ہی جان جاؤں گا۔“

وہ سیریکا کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا اس کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی اور اخبار اب منابل کے ہاتھ میں تھا۔ خبر میں ایک عورت کا ذکر تھا جو قرآن کی بے حرمتی کی مرتکب ہوئی تھی۔ منابل کا ذہن کہیں اور گم تھا اس نے بہت آرام سے پوری خبر پڑھی تھی اس کے ذہن میں بھول کر بھی کسی کا خیال نہیں آیا تھا۔ ایک نام جو اس کے ذہن میں مسلسل گردش کر رہا تھا وہ صفیہ صفدر کا تھا۔ اس نے یہ نام پہلے بھی سن رکھا تھا۔

اخبار دیکھنے کے بعد اس نے اپنے ساتھ بیٹھی ربیعہ کو دے دیا۔ وہ فیصل کی بات سے متفق تھی۔

”میں چاہتا ہوں برائی کا مکمل طور سے استحصال کیا جائے تاکہ اس کا مکمل طور سے خاتمہ کیا جاسکے اس شخص کی مدد کی جائے جو مدد کا مستحق ہے اس کے لیے ہمیں اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھنی ہوں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم برائی کو پھیلنے میں مدد دینے کے بجائے اس کا قلع قمع کرنے کی کوشش کریں۔ چور کو ختم کرنے سے پہلے چوری کو ختم کریں اور اس چیز کی ابتدا ہمیں گراس روٹ لیول سے کرنی ہوگی۔“

فیصل نے گہری سانس بھر کر کہا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ایک بہترین حل پیش کر دینے کے بعد اس کے پاس اب بولنے کے لیے کچھ باقی نہیں بچا۔

”یہ بات گراس روٹ لیول تک پہنچنے کی کیسے..... اور پہنچانے کا کون؟“

سیریکا نے ذرا کی ذرا شرمندگی سے فیصل سے ہی پوچھا..... وہ اس کی پوری بات سے متفق تھی فیصل مسکرا دیا پھر بولا۔

”ایسے ہی پہنچنے کی جیسے فیر اینڈ لولی پہنچی ہے اور پہنچائے گا یور برادرز۔“ وہ سب ہنس دیے تھے جبکہ سیریکا صرف مسکراتی تھی اس کی رنگت ذرا سناٹوئی تھی جسے نکھارنے کے لیے وہ بہت ٹوٹکے آزماتی تھی۔

”فیصل صاحب! آپ کو صفوان صاحب بلارہے ہیں۔ وہ مین سیکشن میں آئے بیٹھے ہیں۔“

منابل نے جھپٹکے سے سر اٹھا کر بیون کی طرف دیکھا۔ صفوان آفس آیا تھا اور اس طرف آ کر منابل سے ملنے کے بجائے مین سیکشن میں بیٹھا تھا۔ اس کے اندر تک آگ لگ گئی۔ فیصل اور وہ آفس میں کزن تھے وہ فوراً اٹھ کر چلا گیا مگر وہ وہیں بیٹھی رہی۔ ربیعہ سیریکا اسے چھڑنے والے انداز میں دیکھ رہی تھیں مگر وہ مسکرا بھی نہ سکی۔ اسے اس لمحہ بہت سکی کا احساس ہوا تھا۔ صفوان کم گو اور سرد مہر ہی سہی مگر اس کے کوئیکز کے سامنے تو وہ

انسانیت کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔ وہ اس خیال سے پیچھا چھڑائی نہیں پارہی تھی۔

☆ ☆ ☆

”آپ کو مجھ سے کبھی دلچسپی تھی ہی نہیں..... میں خود کو سمجھ نہیں پاتی کہ آپ نے مجھ سے رشتہ کیوں جوڑا..... جب آپ کو مجھ سے کوئی انٹرسٹ ہی نہیں تو آپ نے مجھے یہ انگٹھی کیوں پہنائی۔“

وہ چلا کر بولی۔ صفوان نے ریسپونڈ کو کان سے تھوڑا پرے کیا کیونکہ منابل کی آواز ہی اتنی اونچی تھی۔

اسے ایک دم سے اتنا غصہ کیوں آ گیا وہ حیران ہوتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اس نے فون کر کے اسے یاد دلایا تھا کہ اس کو اپنی فرینڈ کو میڈیکل چیک اپ کے لیے لانا تھا۔ یہ بات یاد دلا کر جب اس نے اس کا حال پوچھا تو وہ یکدم ہی غصے میں آ گئی تھی۔

”میں سمجھا نہیں منابل! آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“ وہ عجب شش و پنج میں گھر کر بولا۔

”یہی تو آپ کی پراہلم ہے صفوان! آپ کبھی مجھے سمجھ ہی نہیں پائے..... مجھے نہ میری فیملی کو اور..... نہ میری محبت کو..... میرا ہر جذبہ آپ کے لیے بیکار ہے۔ آپ مجھے اور میری محبت کو For granted لیتے ہیں۔“

”کیا؟..... کیا کیا؟“ For granted..... اس کی بات سن کر شکا لگا تھا جانے کس کی یاد دل کے کس کو نے سے نکل کر آہستگی سے سارے وجود میں سرایت کر گئی۔

”ہاں..... For granted مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آ سکا کہ آپ نے مجھے اپنی زندگی میں کیوں شامل کیا۔ جب آپ کو میری ضرورت نہیں تھی تو آپ نے مجھے اپنانے کا سوچا ہی کیوں..... آپ کی زندگی میں کہیں پر میں ہوں ہی نہیں اور پھر بھی..... پھر بھی آپ کے نام کی انگٹھی میری انگلی میں کیوں موجود ہے؟“

وہ شاید رو بھی رہی تھی۔ صفوان کے سارے وجود پر ایک بے چینی چھا گئی اس کے پاس الفاظ نہیں تھے وہ منابل کو کیسے سمجھا تا جبکہ منابل نے اس کی خاموشی کو کچھ اور سمجھا۔ اس نے صفوان کے احتراز برتنے کو اس کا لالعلقی سمجھا تھا۔ وہ بہت دن سے یہی سب محسوس کر رہی تھی مگر آج آفس میں جس طرح اس نے نظر انداز کیا تھا اس سے وہ بہت ہرٹ ہوئی تھی اور وہ مزید اپنے جذبات کو چھپا کر رکھنا نہیں چاہتی تھی جب اسے یہ پتا چلا تھا کہ تطہیر رحمان جیسی عام لڑکی بھی ان خوش قسمت لوگوں میں شامل ہے جنہیں جا بجا سکتا ہے تو صفوان کی سرد مہر سے زیادہ چھپے لگی تھی۔ اس جیسی خوب صورت لڑکی کا تو یہ حق تھا کہ اسے چاہا جاتا۔

”کبھی کبھی مجھے یہ لگتا ہے جیسے یہ تعلق آپ کے لیے مجبوری کے سوا کچھ نہیں۔ آپ اسے صرف نبھا رہے ہیں..... یہ تعلق آپ کے لیے گلے میں پڑے طوق کی مانند ہے جو آپ سے پہنا نہیں جا رہا اور اتارا بھی نہیں جا رہا آپ کو میری پروا ہے نہ میری ضرورت..... آپ صرف اپنے پیرنس کی وجہ سے ابھی تک اس رشتے کو قائم رکھتے ہوئے ہیں ورنہ آپ کو مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

وہ اس کی کم گوئی کو اس کی سرد مہر ہی سمجھ رہی تھی۔ اس نے اس لڑکی کے ساتھ مٹکی اپنی مکمل رضامندی کے ساتھ کی تھی وہ اسے For granted کیسے لے سکتا تھا۔

”آپ غلط سوچ رہی ہیں منابل..... ایسا کچھ نہیں ہے..... یہ سب غلط ہے۔ نجانے آپ نے اپنے ذہن میں کیسے کیسے مفروضے قائم کر لیے اور پھر انہیں ہی سو فیصد درست سمجھنا شروع کر دیا۔“ وہ بہت تھکے تھکے انداز میں بات کر رہا تھا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے آپ کی ضرورت نہ ہو یا مجھے آپ سے دلچسپی نہ ہو میں نے زندگی میں کبھی ایسا کام نہیں کیا جس میں میری سو فیصد مرضی شامل نہ ہو..... اور پھر یہ تو زندگی بھر کا فیصلہ ہے..... آپ غلط سوچ رہی ہیں منابل!“ وہ لہجہ بھر کر کا۔

”آئی ڈو کیئر فار یو..... رینلی آئی ڈو.....“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

”آپ جھوٹ بولتے ہیں..... آپ صرف میرا دل رکھ رہے ہیں اور.....“

”اوکے فائن..... میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ پھر؟“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ پہلے اس کی آواز میں لا چاری لگ رہی تھی مگر اب صرف غصہ غالب تھا۔ منابل نے تحیر سے ریسپور کی طرف دیکھا اس کو صفوان کے اس طرح بھڑک اٹھنے کی امید نہیں تھی۔ وہ اسے بہت ٹھنڈے مزاج کا آدمی سمجھتی تھی۔

”اور کچھ کہنا ہے آپ کو! کوئی اور الزام کوئی اور طعنہ.....“ وہ پہلے والے انداز میں کہہ رہا تھا منابل کچھ بول ہی نہ پائی۔

”اوکے دین..... اللہ حافظ۔“

اس کی خاموشی سے اسکا کر صفوان نے فون بند کر دیا۔ منابل کی آنکھ سے یکدم آنسوؤں کی لڑی موتیوں کی طرح گالوں پر پھیلی۔ وہ صفوان کے رویے پر افسردہ ہوئی تھی مگر رونا اسے پہلی مرتبہ بڑا تھا۔ وہ فون بند کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کے آنسوؤں سے اس کا تکیہ بھیننے لگا تھا چند لمحوں کی طرح رونے کے بعد اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں موجود وہ انگٹھی اتار کر زمین پر پھینک دی تھی۔ اسے صفوان سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ یہی سب سوچتے ہوئے وہ روتے روتے سو گئی تھی۔ زمین پر پڑی وہ انگٹھی رات بھر وہیں پڑی رہی مگر صبح ہوتے ہی منابل نے اسے اٹھا کر دوبارہ بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہن لیا تھا وہ اس انگٹھی سے دور رہی نہیں سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

”آئی ایم سوری..... مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھے۔“ وہ عداوت سے سر جھکائے کہہ رہی تھی۔ صفوان نے ایک نظر اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا پھر لا پرواہی سے بولا۔

”اٹس اوکے!“ منابل کا دل اس کے انداز پر کٹ کر رہ گیا۔ وہ اس کے بالکل سامنے بیٹھا تھا مگر بہت دور محسوس ہوا تھا۔ منابل نے صبح اٹھتے ہی فون کر کے معذرت کی تھی اور اس کو لچ کی آفر دی تھی۔ صفوان کا انداز بہت لیا دیا تھا۔ اس نے فون پر معذرت کا جواب اٹس اوکے کہہ کر دیا تھا۔ اور اب ریسٹورنٹ میں اس کے بالکل سامنے بیٹھ کر بھی وہ ایسے ہی کہہ رہا تھا۔ ریسٹورنٹ میں رش بالکل نہیں تھا ان کے علاوہ ایک اور لڑکا لڑکی تھے وہ بھی ان سے کافی دور بیٹھے تھے اسی لیے وہ آرام سے بات کر سکتی تھی۔

”میرا یہ مطلب.....“ وہ بات بھی مکمل نہیں کر پائی تھی کہ آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ صفوان نے ایک نظر اسے دیکھا پھر جھلا کر بولا۔

”پلیز منابل! مجھے اور پریشان مت کیجئے۔“ گویا وہ پہلے ہی بہت تھا۔

”آپ مجھ پر غصہ کر لیجئے مگر اس طرح..... لائق نہ برے میں آپ کی لائق برداشت نہیں کر سکتی۔“

وہ دھیمی آواز میں بولی آنسو بھی رواں دواں تھے۔ صفوان نے گہری سانس بھری۔

”کس کس کا غصہ کروں؟ آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے اس بات کا؟ یا آپ مجھے جھوٹا سمجھتی ہیں اس بات کا؟ میں آپ کی فیلنگز کو فار گر انڈ لیتا ہوں اس بات کا؟ آپ مجھے لیٹ ڈاؤن کرتی ہیں اس بات کا؟“

وہ بہت تحمل سے بات کر رہا تھا۔ منابل نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اس شخص کو کبھی لیٹ ڈاؤن کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

”دراصل..... بات یہ نہیں ہے صفوان! آپ مجھے نظر انداز کرتے ہیں۔“

وہ اپنی بات کی وضاحت کر نہیں پائی تھی۔ صفوان نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

”کب کیا میں نے ایسا؟..... کیا کبھی ایسا ہوا کہ میں نے جان بوجھ کر اس طرح کیا ہو؟“ وہ تیز لہجہ میں بولا۔

”آپ..... کل آفس آئے تھے اور..... آپ مجھ سے ملے بھی نہیں۔“ نجانے کیسے یہ بچکانہ شکوہ اس کے منہ سے پھلا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس طرح سے شکوہ کرے گی۔

”تو اتنی سی بات سے آپ نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ میں آپ سے محبت نہیں کرتا اور اتنی سی بات سے

آپ نے مجھے جھوٹا سمجھ لیا اتنی سی بات سے میں آپ کے لیے بے اعتبار ہو گیا..... ویری انٹر سٹنگ..... یعنی کہ

اگر ایک شخص کسی مجبوری کے تحت آپ سے کسی روز مل نہیں پائے گا تو آپ اسے جھوٹا سمجھ لیں گی۔ آپ جانتی

ہیں میں کل آپ کے آفس کیوں آیا تھا؟“ اس نے بات کرتے کرتے سوال کیا پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔

”میں آپ کے آفس کے اکاؤنٹ سیکشن میں آیا تھا۔ مام کو امریکہ میں کچھ رقم کی ضرورت تھی

انہوں نے فون کر کے میسج منگوائے تھے۔ کل میں غلط میں تھا آپ کے آفس سے مجھے بینک جانا تھا اور چار بجے

ایک ضروری آپریشن تھا۔ آپ سے ملنے کے لیے رک جاتا تو دیر ہو جاتی۔“

”آئی ایم سوری صفوان..... لیکن میرا یہ مطلب.....“ وہ وضاحت دے ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ اس قسم

کی بات بھی ہو سکتی ہے یہ اس کے ذہن میں ہی نہیں آیا تھا۔

”آپ کا جو بھی مطلب ہو منابل..... لیکن مجھے اس کا ایک ہی مطلب سمجھ میں آیا..... میری سمجھ

میں نہیں آتا کہ ایسی کیا بات ہے جو سارا زمانہ مجھے جھوٹا سمجھتا ہے کیا میرے چہرے پر کچھ ہے کہ میں جھوٹا ہوں

کیا کسی کی نظر میں میری اتنی بھی اہمیت نہیں کہ میرا اعتبار کر سکے..... میں اتنا برا ہوں کہ سارا جہان مجھے ناقابل اعتبار کہتا ہے۔“

”پلیز صفوان! میں نے آپ کو جھوٹا نہیں کہا“ وہ اس کے لہجے سے خائف ہو کر بولی۔

”کیا یہ لازم ہے کہ اندھے کو اس کے اندھے پن کا احساس اندھا کہہ کر دلا یا جائے کیا اور طریقے نہیں ہو سکتے اس کو اس کی کمزوری کا احساس دلانے کے..... اگر اس کی بیساکھی چھین لی جائے تو اسے پتا نہیں چل جائے گا کہ اسے معذور کہا جا رہا ہے۔ منابل آپ نے مجھ سے میرا مان چھین لیا۔ کیا میں اپنے ماتھے پہ لکھوا لوں کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں یا ہر بار سانس لینے سے پہلے اس بات کو دہراؤں کہ مجھے آپ سے محبت ہے۔“

وہ بہت سخت لہجے میں بات کر رہا تھا۔ منابل کو شرمندگی ہونے لگی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ سارا زمانہ اور سارا جہان کسے کہہ رہا ہے اور اس کے علاوہ اسے اور کون جھوٹا سمجھتا ہے مگر اس کی غلط فہمی دور ہونے لگی تھی کہ صفوان کو اس کی پروا نہیں ہے اگر اس کو پروا نہ ہوتی تو وہ غصہ کیوں کرتا..... غصہ صرف اپنوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اس کے اندر کسی قدر سکون اتر آیا تھا۔

”اگر آپ کے ہاتھ میں موجود گٹھنچی آپ کو میری محبت کا یقین دلانے میں ناکام ہو گئی ہے تو شاید کوئی چیز آپ کو میری محبت کا یقین نہ دلا سکے۔ میں شرمندہ ہوں منابل! کہ میں شاید کبھی بھی آپ کی توقع پر پورا نہ اتر سکوں کیونکہ میں بار بار تو یہ گردان نہیں کروں گا کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے تو اس اوکے.....“

”پلیز صفوان..... بس کریں پلیز۔“

وہ تڑپ کر اس کی بات کاٹ کر بولی نہ جانے وہ کیا کہنے والا تھا۔ اسے بھی اپنے لہجے کی سختی کا احساس ہوا۔ وہ دونوں ہی خاموش ہو گئے تھے چند لمحوں کی طرح گزر گئے۔ صفوان نے گلاس اپنے قریب کر کے اس میں پانی ڈال لیا وہ کچھ دیر پانی کے اس گلاس کو گھورتا رہا پھر اس نے گہری سانس بھر کر گلاس ہاتھ میں پکڑ لیا۔ منابل اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اس نے گلاس سے پانی کا ایک بڑا گھونٹ بھرا تھا۔ پانی کو اندر منتقل کر کے اس نے ایک بار پھر لمحوں کا توقف کیا اور منابل کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ چمکی تھی۔ پھر وہ مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے دھیرے دھیرے پانی پی پینے لگا۔ منابل کے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی اسے تطہیر حُسن اور اس کا غصہ بھگانے کا نوکھا طریقہ یاد آیا۔ اسی لمحے صفوان کو بھی کسی کی یاد آئی تھی۔ اس نے خالی گلاس ایک طرف رکھ دیا پھر منابل کو دیکھ کر بولا۔

”آئی ایم سوری..... میں کچھ زیادہ ہی تلخ ہو گیا تھا شاید۔“

وہ حقیقتاً شرمندہ لگ بھی رہا تھا اس سے پہلے کہ منابل کچھ بولتی اس نے پھر کہا۔

”مگر..... منابل..... ایک ریکوریسٹ ہے مجھے کبھی جھوٹا نہیں سمجھئے گا۔ کبھی بھی نہیں۔ مجھے حقیقتاً برا

لگتا ہے جب کوئی مجھ پر اعتبار نہیں کرتا۔“

اس کے لہجے میں عجیب سی بے چارگی تھی۔ منابل کو مزید شرمندگی نے آن گھیرا۔ اس نے میز پر

رکھے صفوان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”آئی ایم سوری اینڈ آئی پراس اب کبھی ایسا نہیں کہوں گی۔“ اس کے اس طرح سے کہنے پر صفوان

کے چہرے پر موجود مسکراہٹ میں اضافہ ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس سے اگلے ہی دن وہ تطہیر کو لے کر صفوان کے کلینک گئی تھی۔ اس کا مکمل میڈیکل چیک اپ ضروری تھا۔ منابل کی توقعات کے برعکس صفوان اس سوشل ورک میں اس کے ہم قدم تھا۔ اس نے اپنے ضروری آپائنٹمنٹس کینسل کر کے تطہیر حُسن کو ٹائم دیا تھا۔ منابل کو آفس جانا تھا اور وہ تطہیر کو اس کے کلینک میں ڈراپ کر کے خود آفس چلی گئی تھی حالانکہ تطہیر اس کے بغیر وہاں رکنا نہیں چاہتی تھی اس نے منت بھری درخواست کی تھی مگر وہ تسلی دے کر اسے صفوان کے پاس اس کے کلینک میں چھوڑ گئی تھی۔ کیونکہ صفوان نے کہا تھا کہ مکمل چیک اپ میں دیر ہو جائے گی اس لیے وہ بے فکر ہو کر اپنے کام کے لیے جاسکتی ہے چونکہ صفوان نے ایسا کہا تھا اس لیے منابل کے لیے یہ سب ماننا بہت ضروری تھا۔ وہ اسے یقین دلانا چاہتی تھی کہ وہ اس پہ اعتبار کرتی ہے۔

صفوان نے چیک اپ کے بعد کچھ ضروری ٹیسٹ کروانے کے لیے کہا۔ پھر اس نے خود ہی مختلف لیبارٹریز سے یہ ٹیسٹ کروائے تھے۔ تطہیر جس چیز کو صرف بلڈ پریشر کی زیادتی کی وجہ سے اٹھنے والا سر درد سمجھ رہی تھی وہ صرف بلڈ پریشر کی وجہ سے اٹھنے والا سر درد نہیں تھا۔ اس کے مکمل ٹیسٹ ہونے میں ایک ہفتہ لگ گیا تھا اور ایک ہفتہ بعد آنے والی ساری رپورٹس حیران کن تھیں صفوان کے علاوہ دینور و سرجن نے بھی اس سر درد کو برین ٹیومر کا نام دیا تھا۔ ایک ایسی بیماری جو اپنی آخری سٹیج پر تھی۔ صفوان نے یہ خبر منابل کو فون پر دی تھی اور اسے یہ خبر تطہیر کو سنائی ہی تھی۔ جو بے صبری سے اپنی رپورٹس کا انتظار کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

”آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ میرے پاس اتنا بھی وقت نہیں کہ میں اپنے بچے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔ اس کے آنے میں بہت تھوڑا سا وقت ہے اور اللہ نے مجھے اتنے وقت کی بھی مہلت نہیں دی تھی۔ اس نے مجھے زندگی میں ایک ہی خوشی دی تھی اور وہ مجھ سے یہ خوشی بھی چھین لیتا چاہتا ہے۔“

منابل کے منہ سے اپنی بیماری کا نام اور اس کی نوعیت جان کر اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے کہا۔ منابل نے اس سے پہلے بھی بہت بے یار و مددگار تکلیف میں مبتلا عورتیں دیکھی تھیں مگر اس کا دل کسی کی بھی تکلیف پر اتنا بے چین نہیں ہوا تھا جتنا اس لمحے تطہیر کی حالت زاد دیکھ کر ہوا تھا۔

وہ منابل کے منہ سے یہ سب سننے کے بعد یکدم رونے لگی تھی۔ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر وہ پہلی مرتبہ اس کے سامنے روئی تھی مگر چونکہ منابل اس کے ماضی کے متعلق سب جانتی تھی اس لیے وہ سمجھ سکتی تھی کہ یہ پہلا موقع نہیں جو وہ اسی طرح رو رہی ہے وہ اسی طرح روئی آئی تھی۔ اس کا پناہ دل بہت رنجیدہ ہو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تطہیر نے اپنے پاس پڑی سب چیزیں اٹھا کر زمین پر پھینک دی تھیں۔ منابل کے لیے اس کو نبھانا مشکل ہو رہا تھا۔

وہ مجھے دیکھتا ہی نہیں..... اتنے سال ہو گئے روتے ہوئے چلاتے ہوئے مگر وہ میری مدد کو تیار ہی

اس نے سرسری سی نظر اس پر ڈالی تھی۔

”یہ تطہیر ہیں..... شہلا کی بیٹی!“ صفوان کو اس کی طرف دیکھتا پا کر ڈیڈ نے تعارف کروایا۔ ابھی وہ اس سے ہیلو ہائے کرنے ہی والا تھا کہ مام بگلت میں بولیں۔

”تطہیر! ابھی بھوک نہیں ہے تو بعد میں کھالینا۔ نیند آرہی ہے تو اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔“

صفوان کو مام کے رویے پر حیرت ہوئی تھی اور اسے ان کی بیٹی پر بھی حیرت ہوئی تھی۔ وہ تو اس لڑکی کو ان کے سوشل ورک کی کوئی نئی مثال سمجھ رہا تھا مگر اس کا اندازہ غلط نکلا تھا وہ ان کی اپنی بیٹی تھی۔

اس نے مام کی نظر میں اپنی بیٹی کے لیے پیدا ہو جانے والی شرمندگی کو حیرت سے دیکھا۔ وہ ایک نامی گرامی سوشل ورکر تھیں جو ضرورت مندوں کی مدد کے لیے ہر دم تیار رہتی تھیں۔ اور اس لمحہ وہ اپنی ہی بیٹی سے عجیب سلوک کرتی نظر آرہی تھیں۔ صفوان نے سر جھٹک کر اپنا سارا دھیان کھانے کی طرف لگا دیا تھا۔ یہ ماما کا ذاتی معاملہ تھا اور وہ اتنا لائسنس نہیں تھا کہ ان کے ذاتی معاملے میں بے جا مداخلت کرتا مگر نجائے کیسے ان کا پرسنل میٹرو دیرے دیرے اس کے لیے بھی پرسنل ہونے لگا تھا۔ غیر ارادی طور پر وہ اس لڑکی کے ساتھ مام کے رویے کا جائزہ لینے لگا۔ ان کا رویہ اکثر بہت نامناسب اور اہانت آمیز ہوتا تھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ کیا سچ ہے وہ ان کی سگی بیٹی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ان کی سگی بیٹی لگتی نہیں تھی ان کی رنگت، نقوش اور سراپا ہر چیز اپنی بیٹی سے مختلف تھا حالانکہ صفوان نے تطہیر رضن کے انداز میں بہت تبدیلیاں محسوس کی تھیں۔

اس گھر میں آنے کے بعد اس کے ظاہری حلیے میں بہت سی تبدیلیاں آئی تھیں یقیناً مام اس کی ڈریسنگ وغیرہ کے معاملے میں بہت محتاط تھیں۔ انہوں نے اس کو اپنی طرح بنانے کی کوشش نہیں کی تھی مگر پہلے دن کے مقابلے میں وہ اب کچھ مختلف دکھائی دے رہی تھی۔ ایک چیز جو ابھی تک ویسی تھی وہ تھا اس کا سپاٹ چہرہ۔ صفوان کو لگتا تھا یہ لڑکی شاید ہی زندگی میں کبھی ہنسی ہوگی۔ وہ اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اور پہلے دن کے بعد اس نے ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی نہیں کھایا تھا اسی طرح اس کو ان کے ساتھ رہتے ہوئے ایک مہینہ بیت گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”بھوک لگی ہے؟“ اس نے دوستانہ مسکراہٹ چہرے پہ بجا کر پوچھا۔

وہ اس کی آواز سن کر کچھ محتاط ہو گئی تھی ورنہ اس سے پہلے وہ لان میں بنے سینٹ کے چبوترے پر دونوں ٹانگیں چڑھائے بیٹھی تھی۔ صفوان کے سوال پر اسے حیرت ہوئی۔ اسے کیسے پتا چلا تھا کہ اسے بھوک لگ رہی ہے دراصل جب وہ کچن میں کھڑی کھانے کو کچھ ڈھونڈ رہی تھی تو صفوان لاؤنج میں اپنا والٹ اٹھانے آیا تھا جو اس نے غلطی سے وہاں رکھ دیا تھا۔

تطہیر کچن میں کچھ کھانے کو ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر لان میں آ گئی تھی۔ پتا ہی نہیں چلا تھا کہ صفوان مسلسل اس کی حرکات کو نوٹس کر رہا ہے۔ مام اور ڈیڈ ایک پارٹی میں گئے تھے وہ خود اپنے فریڈز کے ساتھ ڈنر کر کے گھر آیا تھا۔ تطہیر کو شاید اس قابل سمجھا ہی نہیں گیا تھا کہ اس کے لیے پکا کر رکھا جاتا۔ وہ اس گھر کی مالکن کی بیٹی

وہ کہہ رہا تھا اور منابل جانتی تھی کہ وہ کتنی خوبصورت ہے اگر محبت کا عمل دخل نہ ہوتا تو صفوان کو وہ لڑکی کسی زاویے سے خوب صورت نہ دکھائی دیتی مگر محبت کے کھیل نرالے تھے۔ وہ منابل کے مقابلے میں اسے خوب صورت قرار دے رہا تھا۔

”محبت..... شکل سے کب ہوتی ہے؟ ہے نا منابل..... شکل سے محبت ہوا کرتی تو مجھے تم سے نہ ہو جاتی۔ پلیز منابل روٹھنا نہیں ورنہ میں کیا کروں گا وہ بھی تو مرنے والی ہے منابل وہ مر جائے گی۔ منابل بولو منابل میں کہاں جاؤں گا اس کے بغیر میں بھی مر جاؤں گا میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا منابل۔“

اس نے بہت زیادہ پی رکھی تھی۔ منابل خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل آئی۔ اس نے بہت بار چاہا تھا کہ وہ شخص اسے تم کہہ کر مخاطب کرتا اور جب آج وہ اسے تم کہہ کر مخاطب کر رہا تھا تو اسے برا لگتا تھا۔ وہ بہت آہستگی سے لاؤنج میں پھر پورچ تک آئی تھی۔ قسمت نے اس کے ساتھ عجیب کھیل کھیلا تھا۔ اور اس کھیل میں اسے شکست پھر اس انسان کے ہاتھوں ہوئی تھی جو کسی طور اس کا ہم پلہ نہیں تھا ایسی شکست زیادہ رلایا کرتی ہے شاید۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ بے آواز رو رہی تھی اور اس کے ذہن میں ایک فقرے کی تکرار تھی۔

”آئی دل کل یو تطہیر۔“

☆ ☆ ☆

”یہ کیوں ہیں؟“

تطہیر رضن کو پہلی مرتبہ اپنے گھر میں دیکھ کر جو بے ساختہ سوال اس کی منہ سے نکلا تھا وہ یہی تھا۔ اس نے اس لڑکی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اسی لیے وہ دل ہی دل میں کچھ حیران ہوا تھا۔ اس نے اپنی مام کو ہمیشہ ہائی صینٹری کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے دیکھا تھا وہ ہر چیز میں بہت اعلا معیار رکھتی تھی۔ ان کا حلقہ احباب بھی ان ہی جیسا ہائی فائی تھا ایسے میں پچھلے سے رنگوں میں ملبوس سادہ چہرے والی وہ لڑکی ان کے ساتھ نظر آنے کی وجہ سے صفوان کے لیے حیرانی کا باعث بن رہی تھی۔ اس کے استفسار پر ملازمہ نے کندھے اچکا کر لائسنس کا اظہار کیا تھا۔ وہ اپنی مالکن کی اس بدلی ہوئی روش پر صفوان سے زیادہ حیران دکھائی دے رہی تھی۔ صفوان کے اپنی دوسری ماں سے تعلقات بالکل نارمل تھے۔ وہ اچھے موڈ میں ہوتی تو کافی مہربان دکھائی دیتی تھیں اور برے موڈ میں وہ عام طور پر صفوان کا سامنا کرتی ہی نہیں تھیں۔

صفوان کے ڈیڈی سے شادی کے بعد انہوں نے کبھی بھی اپنی اولاد کے بارے میں نہیں سوچا تھا بلکہ دھڑلے سے کہتی تھیں کہ میرے لیے صفوان جیسا ایک ہی بیٹا کافی ہے۔ ان کے اچھے رویے کی وجہ سے ان کے حلقہ احباب میں تقریباً سب ہی لوگ اس بات سے بے خبر تھے کہ وہ اس کی سوتیلی ماں ہیں۔ اس لڑکی کے متعلق ملازمہ۔ استفسار کے بعد اس نے دوبارہ یہ سوال کیا تھا کیونکہ تجس اس کی عادت نہیں تھی اور اس کا دوبارہ اس لڑکی کے متعلق کچھ جاننے کا موڈ بھی نہیں تھا اگر اس کا سامنا اسی روز ڈائمنگ نیبل پر اس سے نہ ہوتا۔

وہ کلینک سے واپس آیا تو بھوک سے برا حال تھا۔ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے وہ ڈائمنگ ہال میں آ گیا۔ مام ڈیڈ کے ساتھ وہ لڑکی بھی موجود تھی۔ وہ خاموشی سے سب کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا۔

تھی مگر اس کی حیثیت ملازم سے بڑھ کر نہیں تھی اسے یقیناً بھوک لگ رہی تھی مگر وہ صفوان کے سامنے خاموش رہی۔

صفوان نے اپنے ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ باہر نکالا تھا۔ وہ اس چیز کو کچھ دیر ہاتھ میں پکڑ کر دیکھتا رہا پھر اس نے وہ چیز تطہیر کی طرف بڑھا دی۔ وہ چند لمحوں میں گھری اس کے ہاتھ کی طرف دیکھتی رہی۔ لان میں پھیلی بلب کی زرد روشنی میں وہ بمشکل اس چیز کو پہچان پائی تھی۔ وہ سارے دن کی بھوک مٹانے کے لیے اسے چاکلیٹ دے رہا تھا۔ اس نے کچھ جھپکتے ہوئے اس چاکلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن صفوان نے وہ چاکلیٹ اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے اس کے سامنے پھینک دی۔ تطہیر کو حد درجہ توجہ نہ تھی اس کا احساس ہوا۔ وہ شکوہ کرتی تھی اس طرح کا سلوک کیا گیا تھا۔ ہزاروں مرتبہ اس کو اسی طرح کھانے کے لیے دیا گیا تھا مگر اتنی بے قدری اسے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

”اٹھاؤ۔“ صفوان نے کہا۔

”مجھے نہیں چاہیے۔“ اس نے بہت دھیمی آواز میں جواب دیا۔ صفوان زور سے ہنسا تھا۔

”کیوں.....؟“ وہ ایک دم سے اس کے سامنے آکھڑا ہوا اور پوچھا۔ اس کے وجود سے تطہیر

کے پاس آنے والی زرد روشنی بالکل چھپ گئی تھی۔

”میری مرضی..... اور میں آپ کی غلام نہیں ہوں جو آپ اس طرح سے مجھے یہ چاکلیٹ دے رہے

ہیں۔ اٹھا لیجئے اسے۔“ مجھے نہیں چاہیے۔“ وہ تڑخ کو بولی صفوان ایک بار پھر ہنس دیا۔

”بہت خوب..... تو آپ کو بولنا آتا ہے.....؟ سن کر خوشی ہوئی۔ ساری دنیا سے اس طرح چیزیں

لینے والی تطہیر حزن مجھ سے اس طرح چاکلیٹ نہی لے سکتی۔“

اس کے ڈیڈ سے تطہیر کے متعلق یہ سب پتا چلا تھا۔

”ہاں میں اس طرح سے آپ سے یہ چاکلیٹ نہیں لے سکتی..... میں جانور نہیں ہوں کہ آپ یہ

سلوک کریں۔“

وہ کاٹ کھانے والے انداز میں بولی۔ صفوان اب کی بار ہنسا نہیں تھا مگر اس کے چہرے پر محظوظی

مسکراہٹ تھی۔ وہ تطہیر کے سرخ چہرے کی طرف بغور دیکھتا رہا پھر اس کے ساتھ بچہ بیٹھ گیا تھا۔

”یہ تو میں تمہیں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم جانور نہیں ہو اور جب تم جانور نہیں ہو تو لوگوں کو دنیا

کو اس بات کا موقع کیوں دیتی ہو کہ وہ تمہیں اس طرح ٹریٹ کریں جیسے تم کوئی جانور ہو۔“

وہ بہت اپناہیت سے ناصحانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ اب کی بار تطہیر خاموش رہی۔

”یہ سب جو تمہیں مل رہا ہے یہ بھیک نہیں ہے کہ تم اسے لیتے ہوئے شرمندہ ہو۔ یہ سب تمہارا حق

ہے۔ اسے حق کی طرح وصول کرو۔ یہ..... جہاں تم ابھی بیٹھی ہو۔ اس گھر کی قیمت لگ بھگ ایک کروڑ ہے اور یہ

گھر تمہاری مدد کا ہے۔ اور ان کے گھر کی واحد حقدار تم ہو۔ مام اگر اپنے سارے اثاثے ڈکلیئر کریں تو ان کی

مالیت ڈیڈ کی جائیداد سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ وہ ایک بزنس ٹائیکون ہیں۔ ان کے نام سے کتنے ٹرسٹ چل رہے ہیں۔ اور تم..... تطہیر حزن..... ان کی اکلوتی وارث ہو۔ اس کے باوجود یہاں ایسے رہتی ہو جیسے کوئی کسی غیر کے یہاں رہتا ہے۔ تم مام کی ہر جائز ناجائز بات استے آرام سے برداشت کر لیتی ہو۔ ان کا رویہ تمہارے ساتھ اہانت آمیز ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی تم سستی رہتی ہو۔ تم سب کیسے کر لیتی ہو۔ کم از کم میں تو ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھے کوئی جانور کی طرح ٹریٹ کر کے دیکھو تو میں اسے قتل کر دوں.....“ وہ خاموش ہو گیا تھا مگر اس کی بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے تطہیر کی آنکھ سے آنسو روم جھم کی طرح برستے دیکھا۔

”آپ یہ سب کر سکتے ہیں..... آپ یہ سب کر سکتے ہیں..... مگر میں یہ سب برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں کیونکہ اللہ نے مجھے بھی سب برداشت کرنے کے لیے مسنہ کے لیے پیدا کیا ہے۔ لوگ مجھے اسی لیے جانور طرح ٹریٹ کرتے ہیں کیونکہ انہیں اللہ نے یہ حق دیا ہے کہ وہ میرے ساتھ اس طرح کا سلوک کریں اللہ نے مجھے بنایا تو انسان ہے مگر میری قسمت.....“

”پلیز اب یہ مت کہنا کہ تمہاری قسمت کسی جانور کی قسمت کی طرح ہے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر

بولتا۔

”کوئی انسان اپنے منہ سے اپنی اس قدر تذلیل نہیں کر سکتا اور کوئی بھی انسان اس قدر تذلیل کے

قابل نہیں ہوتا کہ خود کو ایک جانور سے ملائے۔“

صفوان کی آواز کچھ اونچی ہو گئی تھی۔ مگر جب تطہیر بولی تو اس کی آواز اس سے بھی زیادہ اونچی تھی۔

”میں کر سکتی ہوں اپنے منہ سے اپنی تذلیل اور میں کسی جانور سے برابری بھی کر سکتی ہوں چھپکلی

سانپ اور ہر ایسے جانور سے جس سے کراہیت آتی ہے اور نفرت محسوس ہوتی ہے کیونکہ..... اللہ نے مجھے پیدا

ہی اس لیے کیا ہے کہ میری تذلیل کی جائے۔ جب اللہ ہی مجھے اس طرح ذلیل ہوتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے تو میں کس

طرح اس کی مرضی کے خلاف جا سکتی ہوں۔ میں سارے جہان سے لڑ سکتی ہوں مگر..... میں اللہ سے تو نہیں

لڑ سکتی۔“

وہ ہسٹریا کا شکار ہو رہی تھی۔ صفوان کو اس سب کی امید نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا وہ اس کے سامنے

اپنی ماں کے لیے نفرت کا اظہار کرے گی اپنے باپ کے خلاف بولے گی وہ دنیا کی زیادتی کی بات کرے گی۔ مگر

ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

”اللہ کے بارے میں ایسے بات مت کرو۔“

صفوان کو سال میں دو مرتبہ ہی مذہب سے دلچسپی پیدا ہوتی تھی جب اسے عیدین کی نماز پڑھنے مسجد

جانا ہوتا تھا مگر اس سے اس لڑکی کے منہ سے ایسی باتیں سن کر وہ اسے ٹوکے بنانہ رہ سکا جب کہ وہ مزید بھڑک

واضحی۔

”پیدا ہونے سے لے کر اب تک اس نے مجھے ہر چیز کے لیے ترسایا ہے۔ ہر چیز کے لیے مجھے ستر

ستر بار اس کو پکارنا پڑا ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ میری طلب کی ہوئی کوئی چیز مجھے نہیں ملی۔ میری ہر خواہش

آزمائش بن گئی میری ہر چاہ آہ بن کر پلٹ آئی۔ والدین..... ذہانت..... شخصیت، نعمت، ہر چیز میں مجھے بد قسمت رکھا۔ ہر چیز میں۔ اتنی نفرت تو کوئی بھی کسی سے نہیں کرتا۔“

وہ بچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ اور اسی لیے ایک ایک کر بول رہی تھی۔ صفوان کو احساس ہوا کہ یہ موضوع چھیڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اسے کیا پڑی تھی کہ کسی غیر لڑکی کے آنسو پونچھ کر اس کی تکلیف کم کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر نجانے کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک دفعہ اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ اس کے دل سے ساری غلط فہمی دور کر ڈالے مگر وہ اتنی غلامی نہیں بول سکتا تھا۔ وہ لفظوں کے معاملے میں تھوڑا کجسوس اور تھوڑا ناٹائی تھا۔ اس نے کبھی اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسے نہیں سوچا تھا۔ کیونکہ اسے کبھی ایسے سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس نے دنیا کی ہر نعمت کو پیدا ہونے کے ساتھ ہی اپنے قریب پایا تھا۔ اس کی ماں بھی اس کے بچپن میں انتقال کر گئی تھی مگر اسے سوتیلی ماں جیسی کسی چیز سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ریمان قمر نے جب شہلا رحمن سے شادی کی تو وہ جھ برس کا تھا۔ اس نے بچپن کا ایک عرصہ دادا دادی کے ساتھ انگلینڈ میں گزارا تھا جب واپس آیا تو اس کی اسکولنگ ختم ہو چکی تھی وہ دینے والی عمر میں تھا نہ سز شہلا قمر دبانے والی پوزیشن میں، اسی لیے ان کے تعلقات ہمیشہ آپس میں خوشگوار رہے تھے۔ اس کے علاوہ وجاہت، ذہانت، دولت میں وہ آؤٹ اسٹینڈنگ تھا۔ قسمت کا بہرہ بھیر کیا ہے وہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور حقیقت تو یہ ہے اس نے کبھی سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ کیونکہ ایسا کرنے کی اسے کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

اس نے بچکیاں بھرتی تطہیر کی طرف دیکھا وہ کیا تھی وہ کیوں تھی؟ وہ زندگی تھی۔ وہ سب کچھ وہ جو اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتی تھی رات کے پہر اس لمحہ وہ کسی کے لیے اس کا سب کچھ ہو گئی تھی۔ جو قدرت کو مہربان ہوتے دیر نہ لگتی ہے۔

وہ اس لڑکی کو خاموش کروانے لگا جسے یہ نہیں پتا تھا کہ اللہ کی مہربانی ہوتی کیا ہے۔ وہ اس کی مہربانی کو سمجھنے کے بجائے اس کی نامہربانی کا شکوہ کر رہی تھی۔ اس رات صفوان بہت مشکل سے اسے پرسکون کر پایا تھا۔ مگر ان دونوں کی دوستی میں اس رات نے بہت کردار ادا کیا۔ غیر محسوس طریقے سے صفوان اس کا خیال رکھنے لگا تھا۔

”تم پاگل ہو گئی ہو؟“ اس نے چڑ کر کہا مگر تطہیر پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی طرح سر جھکائے ہوئے اپنے ناخنوں کو نکتے میں مشغول تھی۔ صفوان کو اس کے رویے نے سخت بد مزہ کیا تھا اور پچھلے ایک ماہ میں ان کے درمیان اتنی بے تکلفی ضرور پیدا ہو چکی تھی کہ وہ اسے ٹوک کر اس کے غلط رویے اور فیصلے پر تنقید کر سکتا تھا۔

”تمہیں واپس جا کر کرنا ملے گا؟ کیا وہ گھر اس گھر سے زیادہ بہتر ہے یا اس گھر کے لوگ تمہیں اس گھر کے لوگوں سے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔“

وہ بالکل اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی کبھی نہیں آیا تھا کہ وہ واپس اپنے ابو کے گھر کیوں جا رہی ہے حالانکہ اپنے گھر کے متعلق ساری باتیں بتاتے ہوئے اس نے ایک بار کہا تھا کہ وہ زندگی میں کبھی بھی دوبارہ اس گھر میں ان سوتیلے رشتوں کے سچ نہیں جانا چاہتی۔ اسے اس گھر میں رہتے ہوئے دو ماہ ہو چکے

تھے۔ اور ماں سے اس کے تعلقات کی نوعیت ویسی ہی تھی جیسی پہلے دن تھی۔ مگر صفوان کے ساتھ وہ بہت کھل مل گئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے متعلق تقریباً بہت ساری باتیں اسے بتائی تھیں۔ اسے اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے ایک مہربان دوست کی ضرورت تھی۔ اور صفوان میں اسے وہ مہربان دوست مل گیا تھا۔

اس کی خاموشی اسے تاؤ دلاؤ رہی تھی۔ جب کہ وہ اپنا فیصلہ سنا دینے کے بعد اب گونگے کا گڑ کھائے بیٹھی تھی۔

”کیا میں یہ سمجھوں کہ تم مجھے وجہ بتانا نہیں چاہتیں؟“ وہ ایک دم سے اس کے سامنے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ تطہیر کے وجود میں خفیف سی لرزش ہوئی تو تھی۔

”اوکے فائن..... میں چلتا ہوں اب کبھی کچھ نہیں پوچھوں گا۔“

وہ اٹھ کر باہر کی سمت چل دیا تھا۔ اس کو مکمل یقین تھا کہ وہ آواز دے کر روک لے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا وہ لاؤنچ سے باہر لان میں آ گیا تھا اور کتنی دیر تک لان سے پورچ، کار پورچ سے لان میں چکر لگاتے ہوئے تطہیر کی بے حس کے متعلق سوچ کر سلکتا رہا تھا۔ اس نے اس لڑکی کے لیے کیا کیا نہیں کیا تھا۔ اپنا قیمتی وقت اس پر ضائع کر کے اس میں جینے کی لگن پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اس کو اپنی شخصیت کا اتنا زعم تھا کہ وہ کبھی کسی لڑکی کو کلفت بھی نہیں دیتا مگر اس تطہیر رحمن کو لے کر وہ گھنٹوں باہر گھومتا تھا۔ اس نے ابھی حال ہی میں اپنا کلینک شروع کیا تھا وہ کلینک سے تھکا ہارا گھر واپس آتا تھا۔ مگر اس کو دیکھ کر نجانے کیوں کچھ دیر کو تھکن کو بھول سا جاتا وہ منہ لٹاکے پریشان حال اداس بیٹھی ہوتی اور ایسے میں صفوان کا دل چاہتا اس لڑکی سے اس کی ساری اداسی ساری پریشانی لے کر اس کے چہرے پر ایک ازلی مسکراہٹ بجا دے۔

وہ اس کے اس گھر میں آنے سے پہلے اکثر ڈنر باہر سے کر کے آتا تھا مگر اس کے آنے کے بعد وہ خاص طور سے جلدی گھر آ جاتا تھا کہ ڈنر اس کے ساتھ کر سکے۔ دوپہر کو لچ کے وقت وہ اسے فون کر کے کھانے کے متعلق استفسار کرتا حالانکہ اس کے ہاسٹل کے کونکیز اس بات پر اس کا مذاق اڑانے لگے تھے کہ شاید وہ ہر روز اپنی کسی گرل فرینڈ کو فون کرتا ہے۔ مگر اسے پروا نہیں تھی اور یہ لا پرواہی لڑکی کتنے آرام سے اسے بتا رہی تھی کہ وہ واپس اپنے ابو کے گھر جا رہی ہے اور اسے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ اس کا دوست اس سے ناراض ہے بہت دیر تک اس کے رویے پر کڑھتا رہنے کے بعد وہ گاڑی لے کر باہر نکل گیا..... جان بوجھ کر ڈنر بھی باہر کر کے جب وہ گیارہ بجے کے قریب گھر واپس آیا تو تطہیر لان میں بیٹھی تھی۔

وہ اسے بیکر نظر انداز کر کے اندر کی سمت بڑھ گیا۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کھڑکی سے لان میں دیکھا تو وہ وہیں بیٹھی نظر آئی۔ دونوں گھنٹوں میں سردیے اپنے آپ سے بے نیاز صفوان کندھے اچکا کر اپنے بستر پر بیٹھ کر کچھ مریضوں کی کیس ہسٹری دیکھنے لگا تھا مگر زیادہ دیر تک وہ اپنے آپ کو اس کام میں مصروف نہیں رکھ پایا۔ اس کا دل اس لڑکی کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

دل کو کوستے ہوئے وہ سلپر پہن کر خود بھی لان میں آ گیا۔ بہت خاموشی سے وہ اس کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ ہوا میں بہت ہلکی سی خشکی تھی۔ جو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ تطہیر نے سر اٹھا کر اسے نہیں دیکھا تھا مگر وہ

ہچکیاں لینے لگی تھی۔ صفوان کے دل کو جیسے کسی نے مسل ڈالا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ یہ وہ بھی اس کی وجہ سے روئے گی۔

”تظہیر پلینز..... اوکے بابا..... سوری..... میری غلطی ہے۔“

اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بھی اس سے بات نہیں کرے گا مگر اس کے آنسو دیکھ کر وہ اپنے آپ سے کیے گئے سارے وعدے بھول گیا..... وہ مسلسل ہچکیاں لے کر رونے میں مشغول تھی۔

”پلینز یار.....! کیوں شرمندہ کرتی ہو؟ اب بس بھی کرو۔“ وہ عجیب بے بسی سے بولا تھا۔

”پلینز مجھ سے کبھی ناراض مت ہونا۔ کبھی بھی نہیں۔“ اس نے ایک دم سے سر اٹھا کر کہا..... اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے اور اس کی غم آنکھوں میں التجا ہی التجا تھی۔ صفوان بہت دیر تک اس کے چہرے سے نظر ہٹا نہیں پایا تھا۔

”میں تم سے ناراض ہو ہی نہیں سکتا..... کبھی بھی نہیں..... تم میری بہترین دوست ہو۔“

آخری بات شاید اس نے اپنے آپ سے کہی تھا۔ وہ ایک عام سی لڑکی کے لیے اپنے آپ کو اتنا بے بس کیوں محسوس کر رہا تھا۔ وہ خود سمجھ نہیں پایا۔

”میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی تھی یہاں سے جانا ہے۔ یہ میرا گھر نہیں ہے۔ یہ تو میری ماں کا گھر ہے اور میری ماں کو مجھ سے محبت نہیں ہے بلکہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہیں..... نہیں، میرے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے حتیٰ کہ میرے کھانا کھانے کے طریقہ پر بھی اعتراض ہے۔ وہ اس بات پر غصہ کرتی ہیں کہ میں پھری کانٹے سے نہیں کھا سکتی..... انہیں یہ بات بھی بری لگتی ہے۔ کہ میں ان کے ملازموں کے سامنے انہیں مخاطب کیوں کرتی ہوں اور میرے بولنے کا طریقہ ایسا ہے جیسے پچاس ساٹھ سال کی کوئی عورت بات کر رہی ہو۔“

اس بار صفوان کے پوچھے بنائی وہ سب کچھ بتانے لگی تھی صفوان کو اندازہ تھا کہ مام کا رویہ ہی اس کے لیے جھک کا باعث ہے اور اسی لیے وہ یہاں سے جانا چاہتی ہے۔

”دراصل..... انہیں میرے سانس لینے پر اعتراض ہے انہیں اس بات پر اعتراض ہے کہ میں کیوں ہوں؟ میں زندہ کس لیے ہوں میں اب تک مر کیوں نہیں گئی میں ان کے لیے وہاں جان ہوں۔“ وہ اس سے سوال کر رہا تھا پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔

”تم پاگل ہو ظہیر! بالکل پاگل ہو..... یہ تمہاری ماں ہیں اگر کچھ کہہ بھی دیتی ہیں تو تم برداشت کرو تمہیں برداشت کرنا چاہیے..... مگر وہ لوگ تو سب تمہارے لیے سوتیلے ہیں..... تمہارے اپنے نہیں ہیں وہ بھی تو تمہارے ساتھ اسی طرح کا رویہ روارہیں گے پھر.....؟ پھر کیسے برداشت کرو گی کہاں جاؤ گی؟ ماں کے گھر سے نکلو گی تو واپس باپ کے گھر..... اور جب دوبارہ وہاں سے نکالا گیا تب..... بولو کہاں ٹھکانا ڈھونڈو گی۔“

تظہیر نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔ اور اپنے گالوں کو ہاتھ سے صاف کرنے کی کوشش کی۔

”بتاؤ نا.....؟ کیا کرو گی؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”آپ یہ سب اتنے آرام سے اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ کو زندگی میں کبھی بھی اپنوں کی نفرت کا

دیکھنا نہیں ہوتا پڑا۔ آپ نے کبھی اپنوں کی آنکھوں میں اپنے آپ کے لیے جھنجھلاہٹ یا الجھن نہیں دیکھی۔ آپ نے کبھی اپنوں کی آنکھوں میں تنہیک کی جھلک محسوس نہیں کی۔ میں نے کی ہے۔ اپنے باپ کی آنکھوں میں جھنجھلاہٹ الجھن اپنی ماں کی آنکھوں میں اہانت اور حقارت.....“ وہ لمحہ بھر کور کی پھر سلسلہ کلام وہیں سے جوڑ کر بولی۔

”انسان ساری دنیا کی نفرت برداشت کر سکتا ہے مگر اپنوں کی نہیں..... میں بھی انسان ہوں مجھ سے بھی اپنی ماں کی آنکھوں میں نفرت نہیں دیکھی جاتی..... میں نہیں برداشت کر سکتی..... وہ مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہیں کہ اس گھر میں میرا وجود بھی برداشت نہیں کر سکتیں..... میں اپنے سوتیلے رشتوں کے ساتھ رہ لوں گی۔ کیونکہ ان کی زیادتیوں پر میں ان سے لڑ سکتی ہوں۔ چیخ چلا سکتی ہوں مگر اپنوں سے نہیں لڑ سکتی میں اپنی ماں سے نہیں لڑ سکتی اور آپ نے پوچھا ہے کہ میں اپنے مرحوم باپ کے گھر سے ایک بار پھر دھکاری دی گئی تو کہاں جاؤں گی؟ میں وہاں جاؤں گی، جہاں سب جاتے ہیں۔ قبرستان..... میں مر جاؤں گی۔“ وہ بے رحمی سے بولی۔ تو صفوان اس کی آخری بات پر تڑپ اٹھا تھا۔

”مر جاؤ گی؟ اور میں.....؟ میرے بارے میں سوچا ہے کہ میرا کیا ہوگا؟“

الفاظ اس کے منہ سے خود بخود پھسلے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ جذبہ کون سا ہے۔ مگر وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ یہ لڑکی اس کے لیے اہم ہے اتنی ہی اہم جتنا کہ وہ خود تھا اپنے آپ کے لیے۔

”میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا ظہیر! میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا وہ بھی صرف اتنی سی بات کے لیے کہ مام تمہیں ناپسند کرتی ہیں۔“ وہ ایک نئے عزم سے بولا تھا۔

”کیوں ناپسند کرتی ہیں وہ تمہیں؟ تم ان کے اسٹینڈرڈ پر پورا نہیں اترتیں میں تمہیں ان کے معیار کا بناؤں گا..... میں تمہیں تبدیل کر دوں گا..... اتنا تبدیل کہ تم بھی خود کو پہچان نہیں پاؤ گی۔ کیا سیکھنا ہے تمہیں؟ چھری کانٹے سے کھانا کھانا سوسائٹی میں مو کرنا..... انگلش بولنا میں سب سکھا دوں گا ظہیر! لیکن.....“

وہ جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ کر بولا۔

”تم اپنے آپ کو اندر سے تبدیل کرو..... تبدیلی کی ضرورت تمہارے اندر ہے سب سے پہلے تم خود اپنے آپ کو اہمیت دینا شروع کرو تا کہ باقی لوگ تمہیں اہمیت دیں۔ تم اتنی گلی گزری نہیں ہو کہ جس کا دل چاہے تمہیں لیٹ ڈاؤن کرے۔ جس کا دل چاہے تمہیں فور گر ایڈ لے۔ لیکن یہ ساری باتیں سب سے پہلے اپنے آپ کو سمجھاؤ.....“

”میں کیسے تبدیل ہو سکتی ہوں..... طریقہ بدل سکتی ہوں انداز نہیں۔ عقل بدل سکتی ہوں شکل نہیں۔ یہ چہرہ تو یہی رہے گا نا..... بد صورت کراہیت آمیز.....“

”فارگا ڈسک! ظہیر! اس طرح سوچنا چھوڑ دو۔“ وہ اس کی بات سے زچ ہو کر بولا۔ سجانے کیوں اُس لڑکی کو ہمہ وقت اپنی تحقیر کا شوق تھا۔

”کسی بات پر تو خدا کا شکر کرنا سیکھو..... کبھی تو تمہارے منہ سے کلمہ شکر سنوں میں..... اتنا مکمل بنایا

ہے اللہ نے تمہیں کس چیز کی کمی ہے؟ آنکھیں نہیں ہیں کیا؟ ٹانگیں نہیں ہیں؟ ہاتھ تو لٹے ہوئے ہیں۔؟“
وہ اس کی طرف دیکھ کر سختی سے بول رہا تھا۔

”یاد رکھو تظہیر! شکر اور شرک کے درمیان ذرا سا فرق ہوتا ہے۔ شکر ادا نہ ہو تو شرک بن جاتا ہے اور اللہ کو شرک پسند نہیں۔ شرک کرنا چھوڑ دو اور شکر کرنا سیکھو پھر دیکھو اللہ کیسے مہربان ہوتا ہے۔ اس کی نعمت کو پہچاننا سیکھو۔ کسی معاملے میں اگر اس نے کوئی کمی رکھی ہے تو کہیں نہ کہیں اس کی مہربانی کی زیادتی بھی ہوگی۔ شکوے کرنا چھوڑ دو اور اللہ کے کرم کو پہچاننے کی کوشش کرو۔ وہ تمہیں مایوس نہیں کرے گا۔ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اس کا کرم کب کیسے کس پر اور کس طرح ہو جائے۔ اس سے اس کا کرم طلب کرو وہ یقیناً مہربان ہوگا۔“
وہ اتنا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ اس کو اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے فلسفہ شکر کس طرح تظہیر کو سمجھایا۔ وہ خوش تھا کہ اس نے کچھ اچھی باتیں تظہیر کو سمجھانے کی کوشش کی۔

☆ ☆ ☆

”میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔“ اس نے قطعی لہجے میں بغیر مجاباش رکھے انکار کر دیا۔ اس کو مذاق کرنے کی عادت نہیں تھی کہ صفوان اتنے دوٹوک انکار کو اس کا مذاق سمجھتا۔ اسے تو پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کب وہ اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ وہ تو اسے مام کی پسند کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش میں وہ اس کی اپنی پسند میں ڈھلتی چلی گئی۔
”زندگی میں چھری کانٹے سے کھانا ضروری نہیں ہوتا۔ کھانا ضروری ہوتا ہے اور کھایا ہاتھوں سے بھی جاسکتا ہے۔“

اتنی پریکٹس کے بعد بھی چھری کانٹے سے الجھتا دیکھ کر اس نے سمجھایا تھا۔ اس دن کے بعد وہ ہاتھ سے اطمینان سے کھانا کھانے لگی تھی۔ شاید کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس کی یہ حرکت صفوان کو کبھی بھی پسند نہ آتی۔ مگر تظہیر حُسن کے لیے اس کا دل ہر رعایت برتنے کو تیار تھا اور تظہیر حُسن اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”اس شادی کی بنیاد کیا ہوگی..... ہمدردی..... خدا ترسی..... رحمدلی..... اور یہ شادی کتنا عرصہ چلے گی؟ دو ماہ چھ ماہ ایک سال۔“

صفوان نے انکار کی وجہ دریافت نہیں کی تھی مگر وہ خود ہی کہنے لگی۔

”اور اس ہمدردی خدا ترسی اور رحمدلی کے صلہ میں جو اولاد پیدا ہوگی وہ اگلے پچیس سالوں تک دنیا کی ٹھوکروں کی زد پران ہی تنہا چیزوں کی حقدار ہوگی۔“ وہ بہت سنگدل سے کہہ رہی تھی۔ صفوان زچ سا ہو گیا۔ اس لڑکی کا واحد مسئلہ خود ترسی تھا اور وہ پچھلے تین ماہ سے اسی خود ترسی والی عادت سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم اس پاگل پن سے کب باہر آؤ گی تظہیر؟“ وہ بے بسی سے کہتے ہوئے اس کے سامنے پڑے کاؤچ پر بیٹھ گیا۔

”یہی تو میں آپ سے کہنا چاہ رہی تھی کہ آپ اس پاگل پن کا شکار کیوں ہو رہے ہیں؟ جب میری

ماں کو مجھ پر کبھی ترس نہیں آیا تو آپ کیوں مجھ پر ترس کھارہے ہیں۔؟“

”واٹ ریش تظہیر! چپ کرو۔۔۔۔۔۔ گزشتہ تین ماہ سے یہی سب سن رہا ہوں۔ کیوں ہر وقت خود کو ڈی گریڈ کرتی رہتی ہو..... مت کیا کرو ایسے بہت اہم ہوتے میرے لئے۔“

”امپورٹنٹ اور میں..... ہا.....“ وہ استہزاء سے انداز میں ہنسی تھی۔ ”میں کسی کے لیے اہم کیسے ہو سکتی ہوں؟ میرے پاس ایسا ہے ہی کیا کہ جو مجھے دوسروں کے لیے اہم کر دے۔ آپ نے کبھی مجھے غور سے دیکھا ہے میرے چہرے سے کراہیت آتی ہے میری ماں کو۔ میرا باپ مجھے کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ غیر نے ہمیشہ میرے رنگ اور نقوش کا مذاق اڑایا۔ ماں نے کبھی اس قابل نہیں سمجھا کہ مجھ سے دو گھڑی بات کر لے۔ کیونکہ میں ایسی باتیں نہیں کر سکتی۔ جیسی میری ماں کو پسند ہیں۔ میری ماں ایسٹریڈیم اور برٹنکھم کے شاپنگ مالز کی باتیں کرتی ہیں اور میں لاہور کے کسی شاپنگ مال کے بارے میں نہیں جانتی۔“

وہ ہمیشہ اپنے بارے میں ایسے ہی بات کرتی تھی مگر آج صفوان کو اس کی باتوں میں ایک نیا پن محسوس ہو رہا تھا کیونکہ آج اس نے اسے بھی سب کے ساتھ ایک قطار میں کھڑا کر دیا تھا۔

”میرا وجود اتنا بے کار اتنا بے وقعت ہے کہ میرے قریب سے گزرنے والا کوئی انسان رک کر میری طرف نظر ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا آپ کے گھر کی ملازمہ بھی مجھ سے زیادہ بہتر ہے اور..... آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ میرا مزید تماشا بن سکے۔ جب میں آپ کے ساتھ چلوں تو لوگ میرا مذاق اڑائیں اور آپ کی عظمت کی داد دیں کہ آپ نے خدا ترسی کا عظیم مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے سے کمتر لڑکی سے شادی کی۔ میں نے بہت سے لوگوں کی ہمدردیاں سنی ہیں مگر آپ جیسا ہمدرد کبھی نہیں ملا۔ وہ لڑکی جس کے ساتھ اس کے اپنے چند منٹ نہیں گزار سکتے وہاں ایک غیر اس کے ساتھ ساری زندگی گزارنے کی بات کر رہا ہے۔“

وہ خشک لہجے میں بات کر رہی تھی اور پہلی بار ایسی باتیں کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی کا نشان تک نہیں تھا۔ اس کی باتوں سے صفوان کو بہت دکھ ہوا تھا اور آخری بات پر تو جیسے جھٹکا لگا تھا۔

”غیر.....؟ غیر کون.....؟ تم مجھے غیر کہہ رہی ہو۔ تظہیر.....؟ یہ سب تمہارے اپنے ہیں اور..... میں..... میں غیر ہو گیا.....“

وہ اپنے سینے پر انگلی رکھ کر پوچھ رہا تھا۔ تظہیر خاموش رہی تھی۔

”کیا تمہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ غیر تم سے محبت کرتا ہے اور تمہارے ساتھ ساری زندگی ہنسی خوشی گزارنے کو تیار ہے۔“

”بہت دیا لو بہت فیاض ہیں آپ..... ہمدردی کو محبت کہتے ہیں ہمدردی کو محبت سمجھتے ہیں۔“

وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ صفوان کو بھی غصہ آیا تھا۔

”شٹ اپ..... شٹ اپ تظہیر!“ تظہیر نے اتنے غصے میں اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”تم میری انسلٹ کر رہی ہو اور میری محبت کی بھی۔“ وہ اپنے آپ پر قابو پا کر بول رہا تھا۔ تظہیر نے استہزاء سے ساتھ لگا لیا۔

”آپ مجھے پہنچتے ہیں یا بے وقوف..... کیا میں اس قابل ہوں کہ مجھ سے محبت کی جائے..... اور اگر ایسی بات ہوتی تو میرا خالق مجھ سے اس قدر نفرت نہ کر رہا ہوتا۔“

”دراصل..... تمہیں خود اپنے آپ سے نفرت ہے اور اسی نفرت کی وجہ سے تم خود اپنے بارے میں کچھ بھی اچھا سوچنے کے قابل نہیں ہو۔ تم نے زندگی کے ہر میدان میں ناکامی کا منہ دیکھا تو اس کا سبب تم خود ہو..... کبھی اچھا سوچا ہے تم نے۔ کبھی کوئی مثبت بات آئی ہے تمہارے ذہن میں۔ ہر وقت اپنے آپ میں کیڑے ڈھونڈتی رہتی ہو۔ غلطیاں نکالتی رہتی ہو..... تمہارے چہرے پہ یہ جو بارہ بجے رہتے ہیں نایہ اسی قنوطیت کا نتیجہ ہے۔ سوچ تازہ ہو تو چہرے پہ تازگی نظر آئے۔“

یہ تو ہوگی تمہاری ظاہری شخصیت کی بات اور یہ جو تم ہر وقت ذہانت کی کمی کا رونا روتی رہتی ہو نا تو یہ بھی تمہاری اپنی غلطی ہے جب تم اور باتیں اتنی ذہانت والی کر سکتی ہو تو پڑھائی میں یہ ذہانت کیسے نہ کام آتی مگر تم نے خود ہی یہ سوچ لیا کہ ہر کام بس ایک بار کیا جائے گا اور اس کام میں ناکام ہونے کی صورت میں دوبارہ کبھی اسے کرنے کی کوشش ہی نہیں کر دو گی۔ بہت بڑے بڑے کامیاب لوگ بھی دوسری کوشش پہ یقین رکھتے ہیں مگر تمہاری ڈکشنری میں شاید یہ لفظ ہی نہیں ہے۔ تم نے ایف اے میں ناکام ہونے کے بعد دوبارہ پڑھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ حالانکہ تم نے خود مجھے بتایا تھا کہ تمہاری دادوجی نے تمہاری بہت منت کی تھی کہ تم دوبارہ سے پیپرز دے لو مگر تم نے ان کی بات بھی نہیں مانی۔

میں جانتا ہوں زندگی نے تمہارے ساتھ بہت بار زیادتی کی ہے۔ تمہاری توقعات ہرٹ ہوئی ہیں مگر یقیناً کہیں تو زندگی مہربان ہوگی۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم نے زیادتی کو تو یاد رکھا مگر مہربانی کو بھول گئیں۔ بہت سے لوگوں کے پاس ماں اور باپ دونوں نہیں ہوتے مگر تمہارے پاس باپ کا سایہ تو تھا..... باپ کی محبت میں کمی تھی مگر دادوجی کی محبت تھی اور پھر تمہیں..... چھت کا آسرا تو تمہارے پاس ہمیشہ رہا ہے۔ اپنی ماں کے گھر میں ہوا باپ کے گھر میں..... عزت تو تمہاری ہر جگہ محفوظ رہی ہے۔ کبھی کسی کی میلی نظر کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا تمہیں لیکن تم شاید اس چیز کو اللہ کی نعمت ہی نہیں سمجھتی۔ تمہارے نزدیک یہ مہربانی ہی نہیں ہے سرے سے۔

اس کے علاوہ کوئی ایسی رات جب تمہیں بھوکے سونا پڑا ہو تمہیں فاقہ سہنا پڑا ہو۔ کیا تم نے اس بات کو اللہ کی نعمت سمجھا نہیں نا۔ تم اتنی قنوطیت پسند ہو کہ رحمت کو زحمت سمجھتی رہیں۔ تمہارے پاس وہ نظر ہی نہیں جو تمہیں رحمت اور زحمت میں فرق دکھائے اور نہ تمہیں میری محبت ہی سمجھ آ جاتی.....“

وہ بولتے بولتے تھک گیا تھا مگر بات ابھی بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا تمہیں کو وہ بات کبھی نہیں سمجھا سکے گا جس بات کو اسے وہ گزشتہ تین ماہ سے مسلسل مختلف طریقوں سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا وہ تین گھنٹوں میں اسے کیسے سمجھ آ سکتی تھی۔

”تم اللہ کا شکر ادا کر سکتی تھیں کہ ایک شخص تمہاری محبت میں پائے ہوا جا رہا ہے۔ تم صبح کہتی ہو تو وہ اس پر بھی تیار ہو جاتا ہے اور تم..... تمہیں اتم یہ کہتی ہو کہ میں تم سے ہمدردی کر رہا ہوں ترس کھا رہا ہوں تم پر۔ کیا تم نے اس سے پہلے کوئی ایسا ہمدرد شخص دیکھا ہے جو خود کو بھول کر کسی دوسرے کو اپنا بنانے کی کوشش کر رہا ہو۔ تم میری

محبت کو رحم دلی کہتی ہو۔“ وہ نہایت بے چارگی سے کہہ رہا تھا۔ تمہیں کا جھکا سر دیکھ کر اسے اور غصہ آیا تھا۔

”آپ بھی تو اپنی رحم دلی کو محبت کہہ رہے ہیں اور اس جھوٹی محبت کا پرچار کر رہے ہیں۔“ وہ دھیمی آواز میں بولی تھی مگر اس کی آواز کے دھیمے پن نے بھی صفوان کے اندر تک آگ لگا دی۔ اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

”جھوٹی محبت؟“ اس نے تحیر سے اس کے الفاظوں کو دہرایا۔

”اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ تمہیں! میں نے ہمیشہ تمہاری اور تمہارے احساسات کی عزت کی ہے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی مرضی اور اپنے ہر فیصلے میں آزاد ہو۔ اب میں تمہاری راہ میں نہیں آؤں گا لیکن میں تمہاری پکار کا انتظار ضرور کروں گا کیونکہ.....“

وہ کچھ لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ محبت کے اظہار کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ وہ لڑکی اس کے ہر جذبے کو اپنی مرضی کے معنی پہنائی چلی جا رہی تھی۔

صفوان نے کچھ دیر اسے دیکھا پھر باہر نکل گیا۔ اس سے اگلی صبح وہ اس سے بات کیے بغیر کلینک چلا گیا تھا اور جب شام ڈھلے وہ واپس آیا تو اسے لگا یہ شام اب کبھی صبح میں تبدیل نہیں ہوگی۔ اس شام کا اثر زندگی پر مستقل ہو چکا تھا وہ واپس جا چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

”تمہیں رحمان! تم ہو کون چیز کیا ہو؟“

وہ اس کے تقریباً سر پر کھڑی سوال کر رہی تھی۔ تمہیں کی آنکھیں ابھی بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ شاید وہ اس کی غیر موجودگی میں بھی روتی رہی تھی۔ منابل کو اب کی بار اس پر ترس نہیں آیا..... رقیب مر بھی جائے تب بھی رقیب ہوتا ہے۔

”تمہاری اوقات کیا ہے! یہ جو کپڑے تم نے پہن رکھے ہیں نایہ میری اترن ہیں۔ میری وجہ سے آج تم یہاں حالت سکون میں بیٹھی ہو ورنہ شاید وہیں تمہارے میں مر گئی ہوتیں اور تم..... تم صفوان سے محبت کرتی ہو شکل دیکھی ہے اپنی۔“

وہ بہت غصے میں تھی۔ تمہیں کو اس کے غیض پر حیرت نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ منابل اسی طرح کرے گی اسی لیے وہ صفوان کے کلینک جانے اور جتنی کہ اس کا سامنا کرنے سے بھی ڈرتی تھی۔

”میں محبت نہیں کرتی۔ وہ کہتا تھا کہ وہ محبت کرتا ہے..... وہ.....“

”تم اپنی بکواس بند کرو اگر تم نے کبھی خود کو غور سے دیکھا ہوتا تو تم یہ بات بھی نہیں کہتیں تم یہ بات اپنے ذہن میں بھی نہ لاتیں مگر تم اس سے محبت کرتی تھیں اسی لیے تم نے ابتدا میں ہی اپنی سگی مٹی کے بارے میں مجھ سے چھپایا۔ میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کیا تمہیں! اور تم نے..... تم نے میرے ساتھ ایسا کیا کیوں کیا۔ میں نے تمہارا کتنا خیال رکھا اپنے گھر میں تمہیں جگہ دی اور تم.....“

وہ یکدم ہی رونے لگی تھی۔ تمہیں کی آنکھ میں آنسو نہیں تھے مگر وہی ایک منابل کی شکل دیکھ رہی

تھی۔ اسے اس طرح کے رد عمل کی توقع نہیں تھی۔ اس نے پہلی بار جب منابل کے منہ سے صفوان کا ذکر سنا تو وہ کچھ چونکی تھی مگر پھر بھی اس نے یہ سوچ کر اس بات کو ذہن سے نکال دیا کہ ایک جیسے ناموں والے بہت سے لوگ ہو سکتے ہیں مگر پھر ایک روز پروین نے بہت فخر سے منابل کی ہونے والی ساس کا ذکر کرتے ہوئے اسے ان کی اخبار میں چھپی تصویر دکھائی تھی۔ اور تب اسے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ کھیل کھیل گیا ہے۔

منابل اس کی ماں کے کہنے پر اسے اپنے گھر لائی تھی اور اسی لیے غیر ہوتے ہوئے بھی وہ اس کے ساتھ اتنی مہربانی سے پیش آتی تھی اور اس کی ماں اپنی سماجی ساکھ قائم رکھنے کے لیے اسے اپنی بیٹی نہیں مان سکتی تھی۔ ورنہ وہ انکیشن میں اپنے دوڑ گنوا دیتی اسی لیے راتوں رات اسے تھانے سے گھر منتقل کر دیا گیا تھا۔ یہی سب سوچتے ہوئے اس نے منابل کا گھر چھوڑ دینے کا ارادہ کیا تھا مگر اسی رات اس کو وہی سرد ہوا جو اکثر ہوتا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر منابل سے اپنی شناخت نہیں چھپائی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اس مہربان لڑکی کو کس طرح بتائے کہ اس کی شادی جس لڑکے سے ہونے جا رہی ہے وہ اس سے بھی زیادہ مہربان ہے۔ وہ تو اسے اپنے گھر لائی تھی جبکہ وہ لڑکا اسے اپنی زندگی میں لانا چاہتا تھا مگر وہ اسے کچھ بتائیں پائی تھی۔

وہ صفوان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر اب یہ قسمت کی خرابی تھی کہ وہ میٹرنٹی ہوم میں مل گیا۔ منابل کو اپنی ہی ذہن میں سمجھ میں نہ آ سکا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر کس بری طرح سے چونک گئے ہیں۔ صفوان نے اسے طنز یہ انداز میں مبارک باد دی تھی مگر جب منابل اس کو کلینک میں ڈراپ کر گئی تھی تو صفوان نے اس سے بہت باتیں کی تھیں۔ وہ اس سے اس کے متعلق اگھوانے کی کوشش کرتا رہا تھا اور اس کے شوہر کے متعلق پوچھتا رہا تھا مگر تلخیر اپنے متعلق کوئی بھی بات بتانے کے بجائے اسے منابل کے بارے میں بتاتی رہی تھی اور اب منابل کہہ رہی تھی کہ اس نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔

”تم میرے گھر سے چلی جاؤ..... ابھی اسی وقت..... چاہے وہیں واپس دارل امان چلی جاؤ..... جہاں سے تم گناہ کر کے تھانے پہنچی تھیں..... یا اپنی مدر کے پاس چلی جاؤ..... مگر میری زندگی سے نکل جاؤ..... میرا صفوان مجھے واپس کر دو۔“

وہ بہت بے رحمی سے کہہ رہی تھی۔ تلخیر کو شاید اسی کی توقع تھی۔ اس نے جبکہ چھوڑ دی تھی۔ اس کا گھر یہ بھی نہیں تھا اس کی منزل کہیں اور تھی اسے یہ جبکہ چھوڑنی ہی تھی۔ اس نے ایک بار منابل کو دیکھا وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ جو وہ سوچ رہی ہے وہ غلط ہے مگر وہ جانتی تھی منابل اس کی بات کا یقین نہیں کرے گی۔

اس نے جوتے پہننے شروع کیے تھے۔ پہلا جوتا پہن کر اس نے اس کے تسمے بند کیے تھے اور جب وہ دوسرا جوتا پہننے لگی تھی تب اچانک ہی اس کے پیٹ میں ہلکا سا درد اٹھا۔ ایسی درد کی لہر جس پچھلے کئی دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی۔

جوتے پہن کر اس نے چادر درست کی..... وہ خالی ہاتھ آئی تھی خالی ہاتھ جا رہی تھی۔ دروازے پر پہنچ کر درد کی شدت میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ اس نے منابل کی طرف دیکھا اس کا دل چاہا ایک رات کے لیے یہاں رک جائے۔ وہ منابل سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ صبح چلی جائے گی مگر منابل سے کچھ کہنے کی ہمت اس کے

پاس نہیں تھی۔ وہ اس کی محسنہ تھی اور وہ اسے مزید تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔

اپنی تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

درد برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا مگر وہ چلتی رہی تھی اس سے چلا نہیں جا رہا تھا مگر وہ چل رہی تھی پھر ایک مقام پر تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ کون سی جگہ ہے مگر وہ ٹھہر گئی۔ اس نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگالی۔ بے حال کرتے ہوئے درد نے ہر طرف سے آنکھیں بند کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں ہر چیز چھپ گئی تھی۔ زندگی موت سے پہلے والی موت کا نام ہے۔

میں وہ اقلیم کہ محروم چلی آتی تھی

سالہا دشت نور دوں سے، جہاں سے گردوں سے

اپنا ہی عکس روا تھی گویا

ایک محرومی دیرینہ سے شاداب تھے

آلام کے شجار وہاں

برگ و باران کی وہ پامال امیدیں جن سے

پری افشاں کی طرح خواہشیں آویزاں تھیں

نہمی ارمانوں کے آوارہ سرا سیمہ طور

کسی نادیہ شکاری کی صدا سے ڈر کر

ان کی شاخوں میں اماں پاتے تھے سستاتے تھے

اور کبھی شوق کے دیرانوں کو اڑ جاتے تھے

شوق بے آب و گیاہ

دلوں سے جس میں بگولوں کی طرح ہانپتے تھے

اوجھتے ذروں کے تپتے ہوئے لب چومتے تھے

”ہم“ کہ اب ”میں“ سے بہت دور نکل آئے ہیں

دور اس وادی سے جو کہ اک منزل بے نام بھی تھی

کروٹیں لیتے ہیں جس منزل میں

عشق گم گشتہ کے افسانوں کے خواب

دولوں کے وہ ہیو لے جہاں

جن کی حسرت میں تھے نقاش طول

جن میں افکار کے کہاروں کی روئیں سرور بستہ ہیں

اولین نقش ہیں ارمانوں کے آوارہ پرندوں کے جہاں

خوابوں اور امیدوں کے چین

اپنی ہی ذات کے ہمسائے ہیں

آج ہم خود سے بہت دور نکل آئے ہیں

وہ بچ بچ بہت دور نکل گئی تھی۔ ڈھلتی شام نے اس کے مرنے کی خبر قبرستان میں بہت زور و شور سے

سنائی تھی۔ ایک اور انسان خود سے بہت دور ہو کر خالق کے بہت قریب ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”منابل پلیز اب بس بھی کرو۔۔۔۔۔ بھول جاؤ تطہیر رحمان کو۔“

ماریہ نے بے بسی سے تقریباً گھو گھیر لہجے میں کہا۔ اس سے منابل کی حالت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ بلاشبہ اسے بھی تطہیر رحمان کی موت کا دکھ تھا مگر اتنا دکھ جتنا کسی بھی غیر انسان کی موت کا ہو سکتا ہے۔ وہ ایک بار تطہیر رحمان سے ملی تھی اور اسے اس لڑکی میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی تھی جسے اس کی خصوصیت یا خوبی قرار دیا جاتا۔ وہ حقیقتاً عام لڑکی تھی اور ماریہ کے ذاتی خیال میں منابل اس عام لڑکی کے لیے اتنے دن سے سوگ منا کر اسے بہت خاص بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسے مسز شہلا قمر یہ بھی غصہ آ رہا تھا کیونکہ اس کو اس الجھن میں پھنسانے والی بھی وہی تھیں۔ وہ خود امریکہ سے واپس ہی نہیں آ رہی تھیں جبکہ منابل کے والدین اگلے ہفتے واپس آ رہے تھے۔ پچھو خود منابل کے لیے پریشان تھیں۔ انہوں نے فون کر کے ماریہ کو بلایا تھا تا کہ وہ منابل کو سمجھا سکے۔ وہ خود اسے سمجھا سکتا تھا چکی تھیں۔ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ ایسی اموات تو معاشرے میں روز ہوتی تھی وہاں ایسی اموات بہت عام تھیں۔ گویا کسی کی موت کا دکھ منانے کے لیے اس کا خاص ہونا ضروری ہے۔ منابل کسی کو نہیں سمجھا سکتی تھی کہ آرگنائزیشن میں کسی کا آنا اور بات ہے اور زندگی میں آنا بالکل ایک اور بات ہے۔ اس کی تطہیر رحمان سے کیا رشتہ داری تھی۔ ان کے بچ کتنا گہرا تعلق تھا وہ کسی کو نہیں بتا سکتی تھی۔

اس کے مرنے کے بعد گویا وہ صفوان کی زندگی سے بھی نکل گئی تھی۔ اس نے اس کا صفوان اسے واپس کر دیا تھا مگر پھر بھی وہ خوش نہیں تھی۔ تطہیر کا دو ماہ کا ساتھ اسے دو سو سال کے برابر لگ رہا تھا۔ وہ آئی بھی اور چلی بھی گئی تھی مگر وہ تھی اور اسے سدا دہیں رہنا تھا۔

”ہم کسی کو گھر سے تو نکال سکتے ہیں مگر دل سے نہیں۔“ یہ بات منابل کی سمجھ میں تھی۔ جب تطہیر نے وجود سے عدم کی راہ پر سفر شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کے گھر سے نکل کر کہاں گئی کسی کو نہیں پتا تھا مگر دو دن بعد ایک گناہ فون کے ذریعے اسے بتایا گیا تھا کہ یہ عورت دو دن پہلے مر گئی تھی۔ اسے لاوارث سمجھ کر دفن دیا گیا تھا اور فون کرنے والا انسان کون تھا؟

”سیف اللہ خان وہی پولیس انسپکٹر جس نے تطہیر رحمان کو منابل مرتضیٰ کے حوالے کیا تھا۔ وہ اس لڑکی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا مگر وہ منابل کو بہت اچھی طرح سے جان گیا تھا کیونکہ وہ ایک بڑی عورت کی ہونے والی بھوتھی اسی لیے اس نے فون کر کے تطہیر کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا تھا۔

لاوارث تدفین اتنی بھی آسان نہیں ہوتی مگر اس عورت تطہیر رحمان کی حالت اتنی بری تھی کہ اسے جلت میں دفن کرنا پڑا تھا۔ وہ زندہ بھی معاشرے کے لیے تب بھی ناقابل برداشت تھی اور مرنے کے بعد اسے برداشت کرنا مشکل ترین ہو گیا تھا۔

”ہم انسان پر رحم نہیں کریں گے تو ہم پر رحم کیسے ہوگا۔“

سیف اللہ خان نے منابل سے ملنے کے بعد کہا تھا۔ وہ اس کی خدا ترسی کو سراہ رہا تھا۔ منابل کے بچے آنسو اس کے درجے کو مزید بلند کر رہے تھے۔

اس انسپکٹر نے ایک لاوارث عورت کے لیے ایک مشہور عورت کو اتنا بے تحاشا روتے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اسے تطہیر رحمان کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ ہر وہ بات جو منابل سے مخفی تھی مگر سیف اللہ کو دوران تفتیش پتا چلی تھی اور اس ساری تفصیل نے منابل کے احساس جرم کو بہت بڑھا دیا تھا۔

”منابل! اب ختم کرو یہ رونا دھونا تم کب تک اس طرح روتی رہو گی۔“

ماریہ نے اس کے بستر پر بیٹھ کر اس کے ٹھنڈے رخ ہاتھ تھام لیے تھے۔ ”ماریہ! میں اس کا خیال رکھتی تو وہ کبھی نہ مرتی۔ وہ میری وجہ سے مر گئی۔“

اس نے ماریہ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر کہا تھا۔ یہی وہ بات تھی جو پچھو کو بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی اور یہی وہ بات تھی جو منابل کی زبان پر ہمہ وقت رہنے لگی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ ناکام رہی تھی تو اور خیال رکھنا کسے کہتے ہیں۔

”وہ تمہاری وجہ سے نہیں مری ہر شخص اپنی مدت پوری ہونے پر مر جاتا ہے اسے بھی مرنا تھا کیونکہ اس کی مدت پوری ہو چکی تھی۔“

وہ زچ ہو کر بولی۔

”میں چاہتی تو اس کی مدت کبھی نہ پوری ہوتی میں چاہتی تو وہ کبھی نہ مرتی۔“ اس نے ایک اور بے تکی بات کہی۔ ماریہ کو اس بار شدید غصہ آیا۔

”کیوں تم کون ہو؟ اور بھلا انسانی جان انسان کے ہاتھ میں کب سے ہونے لگی۔ تمہارے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے اور کیا ہو سکتا تھا تمہارے چاہنے سے۔“

وہ سخت لہجے میں بولی تھی منابل سے جھکراٹھا یا نہیں جا رہا تھا۔ وہ اسے کچھ بتا سکتی تھی۔ وہ اس کی بچپن کی سبلی تھی مگر پھر بھی اسی نے تطہیر کے ساتھ جو کیا تھا اور تطہیر نے اس کے ساتھ جو کیا تھا وہ اسے نہیں بتا سکتی تھی۔ وہ اسے اپنے گھر میں لائی تھی اور پھر ای نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ اگر وہ یہ بات ماریہ کو بتا دیتی تو پھر سوال جو ماریہ کے ذہن میں آتا وہ ”کیوں؟“ ہوتا اور وہ ماریہ کے کسی ”کیوں“ کا جواب نہیں دے سکتی تھی۔ اس صورت میں ہر راز سے پردہ اٹھ جاتا اور یہی وہ نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس شخص کی سائنڈ چوائس تھی جسے اس نے اپنی زندگی میں ہمیشہ پہلا درجہ دیا تھا۔ یہ بات سب جانتے تھے کہ ماریہ اس کے ماں باپ اس کے سب دوست اور حتیٰ کہ صفوان بھی۔

اس نے سیف اللہ کا فنون آنے کے بعد صفوان کو فنون کر دیا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ قبرستان گئے تھے۔ شہر سے قدرے دور واقع اس قبرستان میں تطہیر کو جگہ صرف اس وجہ سے مل سکی کہ اس کی تدفین میں حصہ لینے والوں میں ایک انیسٹر موجود تھا وگرنہ شاید اسے اس قبرستان میں جگہ بھی نہ مل پاتی۔

”میں نے اسے سمجھایا تھا کہ یہ تمہارا آخری ٹھکانہ ہے۔ یہاں سے کہیں اور مت جانا۔ اس گھر کو اتنی آسانی سے مت چھوڑنا۔“

قبرستان کی طرف ڈرائیو کرتے ہوئے صفوان کی زبان پہ ایک یہی فقرہ تھا۔ اس نے منابل کو کوئی وضاحت دینے کی کوشش نہیں کی تھی اور اس چیز نے اسے اندر سے مزید توڑ ڈالا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے صفوان قبر کو تطہیر رحمان کی کچی قبر پر زار و قطار روتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ شاید اس موت پہ اتنا سوگ نہ مناتی اگر وہ اس شخص کو اس طرح روتے نہ دیکھتی۔ اس کے اندر احساس جرم بڑھنے لگا تھا۔ اگر وہ تطہیر کو اپنے گھر سے نکل جانے کے لیے نہ کہتی تو شاید حالات آج مختلف ہوتے۔ وہ اس لیے تکلیف میں تھی کیونکہ صفوان تکلیف میں تھا اور وہ ماریہ کو نہیں بتا سکتی تھی کہ صفوان تکلیف میں کیوں ہے۔ اسے لگنے لگا تھا وہ شاید سراسر اٹھا کر اب بھی دنیا کا سامنا نہیں کر پائے گی۔

سومنا کے مندر پہ کئی حملے ہوئے تھے۔ مگر جان لیوا حملہ آخری ہی تھا۔ بالکل اسی طرح تطہیر کے ساتھ زیادتی کرنے والے لوگ بہت زیادہ تھے مگر آخری زیادتی منابل مرتضیٰ نے کی تھی۔ اسے تطہیر کو اپنے گھر سے رات کے اس پہر نہیں نکالنا چاہیے تھا۔ اس نے اپنے قریب بیٹھی ماریہ کو دیکھا۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”ماریہ! میں نے تطہیر کو مار ڈالا۔ میں اسے یہاں سے چلے جانے کے لیے نہ کہتی تو وہ کبھی نہ مرنے۔“ وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ ماریہ کو اس کی بات پر خاص حیرانی نہیں ہوئی تھی۔

”تم نے اسے یہاں سے جانے کے لیے کہہ دیا تھا؟“ وہ استفسار کر رہی تھی۔ منابل اس بات کا جواب کیا دیتی۔

”کیوں؟“ توقع کے عین مطابق ماریہ نے دوسرا سوال یہی کیا تھا اور اس سوال کا جواب منابل مکرر بھی نہیں دے سکتی تھی۔ وہ کسی کو کیسے بتا دیتی کہ وہ ”ان چائی“ ہے۔

”ویل..... اگر ایسی کوئی بات ہے بھی تو تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم نے اس کے لیے کیا نہیں کیا وہ ایک گنہگار عورت تھی اور تم نے اس کی کتنی مدد کی۔ تم نے اسے اپنے گھر میں پناہ دی۔ وہ حرکت جو اس نے کی تھی اس کی سزا موت سے کم تو نہیں ہوگی اور پھر بھی تم اس عورت کے لیے اتنا زیادہ رورہی ہو۔“ وہ نامحاند انداز میں کہہ رہی تھی۔ منابل کی آنکھ سے آنسو ٹپکے۔

”کوئی ہی غلام حرکت؟“ اس نے ایک بار پھر سر جھکاتے ہوئے پوچھا۔

”ارے..... اتنی جلدی بھولنے والی بات تو نہیں۔ قرآن پاک شہید کر ڈالا تھا اس نے۔“ وہ تھیرے بولی۔

”Blasphemy (اللہ کی بے ادبی کتنا بڑا گناہ ہے۔“ وہ منابل کے چہرے پر چھائی زردخاں کو

گھورتے ہوئے بولی۔

”Blasphemy of life (زندگی کی بے ادبی) بھی بہت بڑا گناہ ہے۔ اور.....“ اس نے خلا میں ایک ناپیدہ نقطے کو گھورتے ہوئے کہا۔ ماریہ کو لگا جیسے وہ اپنے حواس کھو چکی ہے۔ اور بے تکی باتیں کرنے میں مصروف ہے۔

”ماریہ! اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ بہت اچھی مسلمان تھی۔ وہ شراب پی کر قرآن پاک کی بے حرمتی کیسے کر سکتی تھی۔ اسے اللہ تعالیٰ سے بہت سے شکوے تھے۔ ایسے شکوے جیسے ہم سب کرتے رہتے ہیں۔ اپنائیت بھرے محبت بھرے۔ اس کا تو اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں تھا اسی لیے وہ اللہ سے شکوے ضرور کرتی تھی مگر وہ مشرک نہیں تھی وہ گنہگار نہیں تھی۔“

اس نے سچ اگلا تھا اور یہ سچ اسے سیف اللہ نے بتایا تھا۔ ”وہاں دارالامان میں عورتوں سے ایسے کام کروائے جاتے ہیں جو انسانیت کے خلاف ہوتے ہیں۔ تطہیر نے یہ سب کرنے سے انکار کر دیا تھا اسی لیے وہاں کے حکام اسے مار چر کرتے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ یہ ساری باتیں اور ثبوت پولیس کو فراہم کر دے گی اسی لیے..... اسی لیے ماریہ! صفیہ صفدر نے اسے آفس بلا کر ہر اسام کیا تھا کیونکہ دارالامان میں ایک فنکشن ہونے والا تھا جس میں کچھ بڑے سیاستدان اور محترم حضرات آنے والے تھے۔ وہ ڈومینشن کے لیے اس فنکشن کو خراب نہیں کرنا چاہتی تھی مگر تطہیر نے سب گڑ بڑ کر دی۔“

منابل سانس لینے کو رکھ کر بولی۔

”اس فنکشن والے روز سب کے سچ کھڑے ہو کر سب باتیں کہہ ڈالیں۔ اسے خاموش کر دیا گیا تھا مگر بعد میں صفیہ صفدر نے بدلہ لینے کے لیے جان بوجھ کر صحیفہ کی بے ادبی کروائی۔ اس کو بے ہوشی کی دوا ملا کر کھانا کھلایا۔ عورتوں کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ زمین پر پڑی ہے اور اس کے گرد مقدس کتاب کے صفحات زمین پر پڑے ہیں۔ سب ہی عورتیں جانتی تھیں کہ اسے اللہ میاں سے چیخ چیخ کر شکوے کرنے کی عادت ہے اور بہت سی عورتیں اس کی حرکت سے عاجز تھیں۔ انہوں نے اسے مشرک قرار دیا تھا اور وہاں سے وہ حوالات آگئی تھی۔“ وہ خاموش ہو گئی اور ماریہ تو جیسے شاکہ تھی۔ جب سیف اللہ نے یہ ساری باتیں منابل کو بتائی تھیں تب منابل کی بھی یہی حالت تھی کہ تطہیر رحمان بری تھی اور اس نے اگر اس کے ساتھ برا کیا تھا تو وہ اسی مستحق تھی۔

”پولیس اسٹیشن سے تم اسے اپنے گھر لے آئی تھیں مسز شہلا کے کہنے پر ان کو اس سے کیا غرض تھی؟“ ماریہ کے سوال شروع ہو چکے تھے اور ان ہی سوالات کے جواب منابل اسے نہیں دے سکتی تھی۔ وہ اس سے زیادہ کچھ بتا بھی نہیں سکتی تھی۔ ماریہ نے بھی یوں ہی سوال کیا تھا اسے شاید جواب چاہیے بھی نہیں تھا۔

”سب کچھ کن کر عجیب سا لگتا ہے جیسے ایک کہانی سن رہے ہوں۔“ ماریہ نے رائے دی۔ منابل نے گہری سانس بھری..... پھر وہ بولی۔

”کہانی بننے سے کہانی سننا بہتر ہے۔“

ماریہ نے سراسر اٹھا کر اسے دیکھا اس کی آنکھوں میں پھر سوال تھا مگر منابل کے پاس جواب دینے کے

لیے الفاظ نہیں تھے۔ وہ اسے نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ کس طرح ظہیر رحمان کی کہانی کا حصہ بن گئی تھی۔

”دعا کرو ماریہ! میرے لیے دعا کرو مجھے سکون مل جائے۔“

اس نے گھٹنوں پہ سر رکھتے ہوئے التجائیہ انداز میں کہا تھا۔ ماریہ دعا کے علاوہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

”تمہیں..... سب پتا چل گیا تھا نا؟“

وہ سر جھکائے پوچھ رہا تھا۔ منابل کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے شرمندہ تھے اور وہ دونوں اس سے بھی شرمندہ تھے جس کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے آئے تھے۔ منابل کو امید نہیں تھی کہ صفوان یہ ذکر اس طرح سے چھیڑ دے گا۔ وہ خاموش ہی رہی۔ وہ جانتا تھا کہ نشے کی حالت میں وہ بہت کچھ منابل کو بتا چکا ہے۔

”میں نے کبھی کچھ چھپانا نہیں چاہا منابل! کبھی بھی نہیں۔ میں آپ کو سب بتانا چاہتا تھا..... مگر.....“

مجھے..... یقین کریں منابل! سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں یہ بات کس طرح کروں۔“

وہ ”تم“ سے ایک بار پھر ”آپ“ پر آ گیا تھا۔ یہ اس کی ذہنی حالت کے انتشار کو ظاہر کر رہا تھا۔

”آپ کو مجھ سے آل ریڈی کچھ شکایتیں تھیں۔“

مجھے احساس تھا کہ میں بھی کبھی..... آپ کو..... میرا مطلب..... آپ اکثر خود کو نظر انداز کیا جاتا محسوس کرتی تھیں۔“ وہ پھر پھر کربات کر رہا تھا۔

”آپ کو ظہیر سے محبت تھی؟“ کچھ سوالات کے جوابات ہمیں پتا ہوتے ہیں مگر پھر بھی ہم کلاس روم میں انہیں بار بار پوچھتے ہیں۔ منابل نے ایک ایسا سوال ہی کیا تھا۔ صفوان کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے دھیرے سے اقرار کیا۔

”ہاں..... بہت..... میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا اور اب بولنے کو رہ گیا تھا۔

”میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے اسے پروپوز کیا تھا مگر..... اس لڑکی کو میرا یقین نہیں تھا۔ وہ سمجھتی تھی میں اس سے ہمدردی کے لیے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اسے لگتا تھا میں اس کی ماں کے احسانات کا بدلہ چکانا چاہتا ہوں۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ مجھے کسی نے مجبور نہیں کیا تھا۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ مام کارویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا، حالانکہ وہ ان کی سگی بیٹی تھی مگر انہیں اس کے وجود سے شرم آتی تھی۔ وہ اپنے حلقہ احباب میں اسے متعارف کروانے سے شرماتی تھیں، اور یہ بات ظہیر کو بہت اچھی طرح سے پتا تھی۔ وہ اس خیال سے پیچھا چھڑا ہی نہیں پالی تھی۔“

منابل خاموشی سے سب سن رہی تھی۔ اسے دھیرے دھیرے اپنی بد قسمتی کا یقین آتا جا رہا تھا۔ حالانکہ وہ لڑکی جو زندگی بھر اپنی قسمت کو روتی رہی تھی اس کے سامنے قبر میں ابدی نیند ہو رہی تھی۔

”اس کی ایک بڑی عادت تھی ناشکری کی عادت۔ اسے کسی چیز کے لیے شکر ادا ہی نہیں کرنا آتا تھا۔“

میں اسے بہت سمجھایا کرتا تھا مگر وہ شاید سمجھنے کی حد سے آگے نکل چکی تھی۔ وہ اپنی ہر کی کو اپنے سر پر سوار کر کے اسے اپنے اوپر حاوی کر لیتی تھی۔ یوں تو منابل! جو انسان شکر نہ کر سکے پھر وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ ظہیر کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اسے لگتا تھا وہ بہت بد قسمت ہے۔ حالانکہ وہ خوش قسمت تھی۔ وہ چلی گئی ہے مگر اپنے پیچھے کتنے بہت سے لوگوں کو روتا چھوڑ گئی ہے۔ ایسے لوگوں کو جن سے اس کا کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔“

وہ گہری سانس بھر کر بولا..... اس کا اشارہ منابل کی طرف تھا۔

”مام کو ڈاکٹر نے بریسٹ کینسر بتایا ہے۔“ اس نے ایک اور اطلاع دی۔ منابل شاکد رہ گئی۔

”وہ اسی لیے امریکہ گئی تھیں۔ یہ بات مجھے خود کچھ دن پہلے پتا چلی ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ

اپنے چیک اپ کے لیے امریکہ جا رہی ہیں۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ وہ لڑکی جو ان کی سگی بیٹی تھی، وہ مر چکی ہے۔ مام رورہی تھیں۔ میں جانتا ہوں وہ اپنے لیے رورہی تھیں۔ انسان خود مرنے والا ہو تو اسے مرے ہوؤں پر رونا آ ہی جاتا ہے۔“

وہ بہت لائق ہو کر بات کر رہا تھا۔ شاید اس کی سوتیلی ماں کا یہی حق تھا۔

”میں نے انہیں آپ کے بارے میں بتا دیا تھا، وہ آپ سے شرمندہ ہیں منابل! اور میں بھی۔“

اس کی بات پر منابل نے جھٹکے سے سرائی کر اسے دیکھا۔

”میں صرف آپ ہی سے شرمندہ ہوں کیونکہ میں نے صرف آپ کے ساتھ زیادتی کی، ظہیر کے ساتھ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ وہ کہتی تھی کہ اللہ اس کی مدد نہیں کرتا۔ آپ بتاؤ منابل! اور مدد کیسی ہوتی ہے۔ کیا اللہ خود زمین پر آتا ہے مدد کے لیے؟ وہ انسانوں کو وسیلہ بناتا ہے۔ میں نے ظہیر سے کہا تھا کہ میں اس کے لیے وسیلہ بنوں گا۔ میں اس کی زندگی سے ہر خارجہ کر اسے گلاب بنانے کو تیار تھا۔ اگر وہ مجھ پر یقین کرتی..... مگر.....“

اس نے پھر پھر کر گہری سانس بھری۔

”اس نے اپنی سگی ماں کی زیادتی کی سزا ان کے سوتیلے بیٹے کو دی۔ اگر وہ مجھ پر اعتبار کرتی تو شاید

آج حالات مختلف ہوتے۔ وہ جب ہمارے گھر پہنچی تھی تب اتنی بیمار نہیں تھی۔ میں نے خود اس کے ٹیسٹ کروائے تھے۔ وہ نامکمل ٹیسٹ کروا پائی تھی مگر تب ڈاکٹر نے اس کی بیماری کی کچھ اڑ۔ وجہ بتائی تھی۔ وہ میرے پاس رکتی تو اس کا علاج ہو سکتا تھا مگر.....“

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ اس کی زندگی میں بہت سے اگر مگر آچکے تھے۔ منابل کیا کہتی؟ وہ خاموش ہی

رہی۔

”میں یہ نہیں کہتا کہ میں اسے جلد بھول جاؤں گا مگر میں کوشش ضرور کروں گا۔ آپ اپنی مرضی سے

جو فیصلہ کریں گی، میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ اگر آپ خود یہ انگلی نہیں اتار سکتیں اور آپ کو کچھ اندیشے ہیں تو

آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ میں خود انکار کر دیتا ہوں۔“

مناہل کا دل کٹ کر رہ گیا..... وہ ایک کوکھو چکا تھا اور دوسری کوکھو نے کی تیاری کر رہا تھا۔ کتنے بہت سے لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ مناہل نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا..... اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ قسمت کس طرح ہم سب کو اپنے چکر میں جھولا جھلانے کی کوشش کرتی ہے۔ غلطی کی سزا غلط کو دی جاتی ہے، مجبور کو نہیں اور وہ صفوان کو مجبور سمجھتی تھی، غلط نہیں۔ جو ہو چکا تھا وہ بھلانا آسان تھا مگر کوشش کر کے اسے آسان بنایا جاسکتا تھا۔ اس نے صفوان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”میں اس رنگ کو اپنی انگلی سے کبھی نہیں اتاروں گی۔“

اس سے زیادہ واضح اقرار وہ نہیں کر سکتی تھی۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا..... مگر وہ مسکرائے نہیں تھے، لیکن شاید قبر میں لیٹی تطہیر ضرور مسکرائی تھی۔ صفوان اور مناہل نے اس کی قبر کے ساتھ بنی اینٹوں کی ٹوٹی روش پر قدم رکھ کر باہر کی سمت چلنا شروع کر دیا۔ نماز عصر کا وقت ہو چلا تھا۔ اور قبرستان میں سنانے کا راج دھیرے دھیرے قائم ہونے لگا تھا۔ سنانا جو ہر جگہ خاموش ہوتا ہے مگر قبرستان میں جو ہمہ وقت بولتا ہے وہ سنانا ہی ہے۔ شام کے سائے منڈلائے تھے اور سنانے کو بولنے کے لیے ایک ساتھی مل گیا تھا۔ آج قبرستان میں ایک ہی موضوع کی بازگشت تھی۔

”تطہیر رحمان کیا تھی خوش قسمت یا بد قسمت؟“

سنانا اور شام بھی اسی کی باتیں کر رہے تھے اور صفوان اور مناہل بھی۔ اول الذکر قبرستان سے باہر جا چکے تھے۔ یہ آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے لیکن تطہیر رحمان کو اب کہیں نہیں جانا تھا۔ اسے طویل عرصے کے لیے مستقل ٹھکانہ مل چکا تھا۔ تطہیر رحمان جس نے ہمیشہ خود کو ایک Pipsqueak (بے قدر) سمجھا تھا۔ حالانکہ دنیا میں اللہ کی بنائی کوئی چیز Pipsqueak نہیں ہو سکتی۔ سنانا بھی یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا اور شام بھی۔ انہوں نے تطہیر کی قبر کی طرف دیکھتے ہوئے تاسف سے سر ہلایا تھا۔ وہیں کہیں خزاں زدہ درخت کے زرد پتے نے یہ بات سنی۔ اس نے گرتے ہوئے ان دونوں کی گفتگو میں مداخلت کی تھی۔

”جبر کو صبر سے برداشت کرنے والوں کے لیے صرف قبر ہی رہ جاتی ہے۔“



یہی میرا حوالہ ہے

”برصغیر کی تقسیم ہی غلط تھی۔“

قانتا راج نے اپنے چہرے پر بکھرے بھورے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر کلپ میں جکڑتے ہوئے بہت نزاکت سے کہا۔ آمنہ کے چہرے پر ناگواری اور پیشانی پر شکنوں کا اضافہ ہوا۔ رگوں میں بہتے خون کی روانی میں تیزی آئی اور کنپٹیوں پہ ہلکا ہلکا دباؤ محسوس ہونے لگا۔ قانتا راج پال جو سیلو لیس شرٹ اور ٹائٹ جینز میں لمبوس تھی، نے اپنے دو دھیا برہنہ بازو سامنے میز پر پھیلانے اور پھر اپنی دھن میں مگن بولی۔

”ہمارے بزرگ اس بات کی مخالفت کرتے رہے۔ ہماری تاریخ کی کتابوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے اور ہم سب بھی اس کا ذکر کرتے ہیں اور ہم سب بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ برصغیر کی تقسیم فقط جغرافیائی تقسیم نہیں تھی بلکہ اس تقسیم نے دلوں کو تقسیم کر ڈالا۔“

”واٹ ڈائیل! شی از ٹانگ اب اوٹ.....“

(یہ کیا بکواس کر رہی ہے)

آمنہ کی جذباتی اور حساس طبیعت اس سے زیادہ نہیں سن سکتی تھی۔ وہ نہایت ناگواری سے بول اٹھی جبکہ اس کی بات ابھی ادھوری تھی کہ ”شش..... شش.....“ کی آوازیں اور شور نے اسے خاموش ہو جانے پر مجبور کیا۔

”شش..... وہ ہمارے مہمان ہیں..... کول ڈاؤن اینڈ کپوز یور سیلف۔“ (خود پر قابو رکھو) اس کے بالکل ساتھ بیٹھی مدیحہ افتداری نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی میں اسے سمجھایا تھا۔

”ڈی جی صاحب نے خصوصاً تاکید کی تھی کہ بحث طلب معاملات کو ڈسکس نہیں کرنا۔“

اس کے بائیں جانب بیٹھے مصطفیٰ کمال تارڑ نے بھی مدیحہ کے سے انداز میں اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے یاد دلانے کی کوشش کی، جبکہ مصطفیٰ کے ساتھ بیٹھی سمیرہ سہگل ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ آمنہ نے حیرت سے اپنے ہم وطنوں، ہم عمروں اور ہم جماعتوں کی جانب دیکھا۔ اس نے بحث طلب معاملات شروع نہیں کئے تھے۔ یہ اس کے سامنے بیٹھی معزز مہمان کی کارستانی تھی۔ قانتا راج پال اگر اس طرح کی بات نہ کرتی تو وہ کبھی اس طرح غصے میں نہ آتی مگر اس کی رو میں بیٹھے اس کے ہم وطن اس بات کی مخالفت کر رہے اور چاہ رہے تھے کہ وہ خاموش رہے۔

آمنہ خاموش ہو گئی تھی مگر اس کے جذبات میں ایک اٹھل پھٹل شروع ہو چکی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک عمر رسیدہ ٹھہری ٹھہری مدرسی آواز گونجی تھی۔ اسے یاد آنے لگا تھا کہ اس کی ایک ”بے ضرر“ سی بات پر کسی کو کتنا غصہ آ گیا تھا۔

”جب کوئی یہ کہے کہ آپ کو پیدا نہیں ہونا چاہیے تھا اور آپ کا وجود ایک غلطی ہے تو کیا آپ کو غصہ نہیں آئے گا۔ مجھے بھی غصہ آتا ہے، جب کوئی پاکستان کے قیام کو غلطی قرار دیتا ہے کیونکہ میرا وجود اور میری نسل کی بقا پاکستان کے وجود سے قائم ہے۔“

اسے یاد آیا تھا کہ ایک بار کچھ ”معصوم“ سی باتیں کرنے پر کسی کی خفگی بھری آواز میں یہ سب سننا پڑا تھا۔ وہ جب سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے خاموش ہوئی تھی مگر آج وہ سر جھٹک سکی تھی نہ مسکرا سکی تھی۔ آج اسے مجبوراً خاموش ہونا پڑ رہا تھا۔ قانتا راج پال اپنی لمبی گردن کو رعونت سے ادھر ادھر گھماتے ہوئے مسلسل بول رہی تھی۔

”مجھے یہ بتائیے کہ اس تقسیم کا اس دراڑ کا فائدہ کیا ہوا۔ دو بھائی آپس میں دشمن ہو گئے، دلوں کا بڑا ہوا۔ آپ ہمارے لیے، ہم آپ کے لیے اجنبی بن گئے۔ دو بھائیوں کی لڑائی میں چھوٹے بھائی کا نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ آپ لوگ جانتے ہی ہیں کہ آپ کا زیادہ نقصان ہوا۔

تجارتی راستے بند ہو گئے، معاشی ترقی میں رکاوٹ آ گئی، نہایت سستی اشیاء نہایت مہنگے داموں ملنے لگیں۔“

وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش ہوئی پھر اپنی دائیں اور بائیں جانب پڑے پانی کے گلاس کو بائیں ہاتھ سے پکڑ کر پانی کا گھونٹ بھر کر بولی۔

”ان باتوں کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ آج ہمیں اس صدی میں ان لڑائی جھگڑوں کو ختم کر کے آگے بڑھنا ہوگا تاکہ آئندہ نسلیں محبت کی چھاؤں میں پروان چڑھیں۔“

آمنہ نے ایک بار پھر اپنے دائیں بائیں جانب بیٹھے لوگوں کو دیکھا۔ پاکستان بھر سے یہ پچاس ذہین ترین اسٹوڈنٹس اکٹھے ہوئے تھے مگر کیا کسی میں اتنی جرات کلام بھی نہیں تھی کہ کوئی قانتا راج پال کی بات کا جواب دے دیتا۔ وہ سب لوگ قانتا راج پال کی اس بات پر میز کی سطح پر ہاتھ مار مار کر

اسے داد دینے لگے۔

”کاش یہ ہاتھ قانتا راج پال کے سر پر پڑ رہے ہوتے۔“ آمنہ نے دل ہی دل میں سوچا۔
”دماغ کے فیصلے دل کی مشاورت سے طے ہونے چاہئیں۔ جو قومیں دماغ و دل کی اس باہمی مشاورت کو ترک کر دیتی ہیں، وہ کمزور ہو جاتی ہیں، ان کے دماغ کام کرنا بند کر دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر قتل لگ جاتے ہیں۔ انہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ ہاتھ کا استعمال کس جگہ کرنا ہے اور زبان کا کس جگہ۔“

اس کے ذہن میں ایک بار پھر کچھ الفاظ گونجنے لگے۔ اس نے ایک بار پھر گہری سانس بھری تھی۔ وہ بولنا چاہتی تھی، وہ قانتا راج پال کو کھری کھری سنا چاہتی تھی مگر اس کے کندھے پر ابھی بھی مدیحہ اقتدار کا ہاتھ تھا۔ اسے مصطفیٰ کمال تارڑ کی آنکھوں میں ابھی بھی تنبیہ نظر آرہی تھی اور سمیرہ سہگل کے ہونٹوں پر رکھی انگلی اسے ابھی بھی ”شٹ اپ“ کہتی محسوس ہو رہی تھی۔

”ہمارے ساتھ دشمنی رکھنے کا فائدہ کیا ہے۔ ہمیں دوست بنا کر آپ ہمیشہ کے لیے جنگ کے خطرات سے آزاد کیوں نہیں ہو جاتے۔ اس جی جی، بی جی سے چھٹکارا ملے گا تو ساری قوم پر سکون ہو جائے گی۔ وہ رقم جو آپ کی حکومت دفاع پر خرچ کرتی ہے، وہ آپ کی بھلائی پر خرچ ہونے لگے گا۔ آپ کی انوکھی تیزی سے ترقی کرنے لگے گی۔ آپ پانچ کے بجائے پچیس روپے کی بچت کرنے لگیں گے۔ آپ کو آلو بیس نہیں، دو روپے کلو ملے گا۔ آپ ادویات پر ایک ہزار کے بجائے پانچ سو روپے خرچ کرنے لگیں گے۔ آپ پچاس ہزار میں برائڈ نیوکیپیوٹریس خریدیں گے کیونکہ وہ آپ کو پچیس ہزار میں ملنے لگے گا۔ آپ کو ایک لاکھ کی سوزوکی ستر ہزار میں ملے گی۔“

راہیکا ٹیل نے نہایت اعتماد سے وہ تفصیلات بیان کیں جو وہ گھر سے چلتے وقت رٹ کر آئی تھی۔ ہال میں ایک بار پھر میز کی سطح پر رکھے ہاتھ تھرکنے لگے۔ قانتا راج پال، راہیکا ٹیل، سونی سوریش، آئندہ اگر وال، ساحر کار اور ان کے بقیہ پتالیس، ہم وطنوں، ہم جماعتوں، ہم عمروں کے چہروں پر ایک ایسی مسکراہٹ بھری تھی جس نے آمنہ کا دل جلا کر رکھ دیا تھا مگر اس کے ساتھی تالیاں پیٹ رہے تھے۔ وہ سب کے سب اپنی اپنی فیلڈ کے ماہر تھے۔ انہیں ملک بھر کی یونیورسٹیز، کالجز اور دوسرے اداروں سے یہاں جمع کیا گیا تھا تاکہ وہ ہمسایہ ملک سے آئے ہوئے اپنی ہی طرح کے ان پچاس اسٹوڈنٹس کے ساتھ ”گپ شپ“ لگا کر خیر سگالی جذبات اور امن و محبت کی فضا کو مزید سازگار کرنے میں مدد دے سکیں جو ان کی طرح اپنی اپنی فیلڈ میں ایک الگ مقام رکھتے تھے۔

آمنہ کو قائد اعظم یونیورسٹی آئی آر ڈی پارٹمنٹ سے بلوایا گیا تھا۔ وہ تھرو آؤٹ پوزیشن ہونڈر اور ایک بہترین مقرر تھی۔ اس نے سارک ممالک کی طرف سے آرگنائز کیے گئے سادھ ایشیا کونز مقابلوں میں اپنی ٹیم کو گولڈ میڈل دلوانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس نے آئی آر میں پہلے دو سمسٹر

میں ٹاپ کر کے ایک پرانا ریکارڈ برابر کیا تھا۔ اسے گفتگو میں کمال حاصل تھا۔ وہ جب اپنے مخصوص انداز میں بولتی تھی تو ایک زمانہ سننے کے لیے تیار ہو جاتا تھا مگر آج یہاں اس کانفرنس روم میں وہ خاموش بیٹھی تھی۔ اسے بولنا چاہیے تھا مگر وہ نہیں بول رہی تھی اور اسی پر کیا موقوف، وہاں بیٹھے سب لوگ اس کی طرح نہایت شاندار اکیڈمک ریکارڈ رکھتے تھے۔ وہ سب آمنہ کی طرح گھنٹوں بلا ٹکان بول سکتے تھے مگر وہ سب بھی خاموش تھے۔

آمنہ کے برعکس وہ مسرور دکھائی دے رہے تھے، ان کے چہروں پر سکون و اطمینان تھا۔ وہ اپنے سامنے بیٹھے پچاس لوگوں سے انتہائی مرعوب دکھائی دے رہے تھے۔ آمنہ کو ایک عجیب سی بے چینی نے گھیر لیا۔ اس کے دل و دماغ پر کچھ یادیں دستک دینے لگی تھیں۔

”ہر قوم کی نئی جوان نسل اس قوم کا غرور ہوا کرتی ہے۔ کیا تم اس قوم کا غرور ہو؟“

☆ ☆ ☆

”ہر قوم کی نئی جوان نسل اس قوم کا غرور ہوا کرتی ہے۔ کیا تم اس قوم کا غرور ہو؟“

دادو کی گرجدار آواز نے اسے اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑے ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ریموٹ اس کے ہاتھ سے پھسل کر زمین پر گر پڑا۔ دادو کمرے کے عین وسط میں کھڑے انتہائی غصیل و غضب کے عالم میں اسے گھور رہے تھے۔ آمنہ نے اپنی تیرہ سالہ زندگی میں پہلے کبھی انہیں اتنے غصے کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ اس نے جھپکتے ہوئے زمین پر گرا ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی بند کر دیا۔ اسے ان کی آمد کا بالکل بھی پتا نہیں چلا تھا۔ وہ دس پندرہ منٹ قبل اپنے کسی دوست سے ملاقات کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ وہ جب کسی دوست سے ملے جاتے تھے تو پھر دو ڈھائی گھنٹے بعد ہی واپسی ہوتی تھی۔ ان کی غیر موجودگی کا یقین کرتے ہوئے ہی آمنہ نے ٹی وی پر ہندی قومی چینل دور درشن ٹیون کیا تھا۔ کسی فلم کے گیت دکھائے جا رہے تھے۔ اس نے اپنی ایک فرینڈ کے گھر بھی پہلے کبھی یہ گیت اسٹیریو پر سن رکھے تھے، وہ ٹی وی کا وائیوم فل کر کے اطمینان سے کاؤچ پر ٹپک گئی۔

جب کوئی بات بگڑ جائے، جب کوئی مشکل پڑ جائے

تم دینا ساتھ میرا او ہمو

یہ گانا اسے بہت پسند آیا تھا۔ وہ جیسی آواز میں ساتھ ساتھ گنگنا نے لگی تھی اور یہی براہوت تھا جب دادو نے چھاپہ مار کر اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا تھا۔“ انہوں نے آمنہ کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتے ہوئے استفہار کیا۔

”دادو اور اصل یہ بہت اچھا گانا ہے۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میں بس..... وہ.....“

آمنہ منمناتے ہوئے بولی تھی۔

”یہ بہت اچھا گانا، جو تمہیں کہا تھا کہ تم انڈین فلمیں دیکھو گی نہ انڈین فلموں کے گانے

سنو گی مگر تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آتی۔ تمہاری نظر میں میری کوئی عزت نہیں ہے۔ تم سمجھتی ہو یہ بڑھا آدمی پاگل ہے جو بلا وجہ بکنا رہتا ہے۔ تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے آمنہ!“

وہ غضب ناک لہجے میں بولے۔ ان کا چہرہ لال بھسوکا ہو رہا تھا۔ تیرہ سالہ آمنہ کے لیے ان کا یہ روپ بہت حیران کن تھا۔ اس قدر مشفق اور اس قدر مہربان ہستی کا اتنے جلال میں آ جانا اور وہ بھی صرف اتنی سی بات پر۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی، اسے کبھی کسی نے اس طرح نہیں ڈانٹا تھا۔ اس کے ابو کے انتقال کے بعد تو وہ دادو کی بھی بہت چچی ہو گئی تھی۔ اس کی بہتر تعلیم و تربیت کے لیے ہی وہ جہانیاں جیسا چھوٹا سا شہر چھوڑ کر مستقل لاہور آ گئے تھے۔ انہیں اپنی اس اکلوتی پوتی سے بہت محبت تھی، وہ اس کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کر سکتے تھے مگر اس لمحہ نجانے انہیں اتنا برا کیوں لگا تھا کہ وہ اپنے رویے کی تلافی کرنے اور اسے منانے کے بجائے جھکے ہوئے کندھوں کے ساتھ خاموشی سے اپنی خوابگاہ کی سمت چل دیے۔ آمنہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

”میں دادو سے کبھی بات نہیں کروں گی۔“

اس نے روتے روتے کئی مرتبہ یہ عزم دل میں دہرایا تھا۔ اسے بھی دادو سے بہت محبت تھی وہ اپنی امی سے زیادہ ان سے بے تکلف تھی۔ ان کی وجہ سے اسے ابو کے بعد بھی ابو کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ جب جہانیاں سے چند ماہ قبل لاہور شفٹ ہوئے تھے تو دادو نے اسے بہت سی نصیحتیں کی تھیں۔ انہیں اس بات کی بہت فکر رہتی تھی کہ آمنہ کی تربیت بہت اچھی ہونی چاہیے۔ وہ اسے پوری قوم کے لیے قابل فخر بنانا چاہتے تھے، اسی لیے بہت چھوٹی عمر سے انہوں نے اس کے دل میں ملک و قوم کی محبت پروان چڑھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے اصول اسے ازبڑ کروانے شروع کر دیے تھے۔ وہ اسے قیام پاکستان اور ہجرت کے وقت کے ظلم و بربریت سے بھرے واقعات سنا کر اس کے دل میں اپنے وطن کی محبت و افادیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کیا کرتے جو ان کے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئے تھے مگر آمنہ کے لیے یہ سب پرانے دور کی کہانیاں تھیں۔

”تم کیا جانو، زمین کے اس خطے کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں کیا کیا کھونا پڑا تھا۔“

دادو اکثر اوقات کوئی پرانا قصہ سنانے کے لیے اپنی اس نئے زمانے کی پوتی کے سامنے یہی فقرہ دہراتے تھے۔ آمنہ ان کی بات اس وقت تو دھیان سے سنتی مگر چند دن بعد بھول جاتی۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ قیام پاکستان کے لیے کتنی مشکلات اٹھانی پڑی تھیں۔

اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ قیام پاکستان کے وقت فوجی ساز و سامان کی تقسیم میں کیا دھاندلی ہوئی؟

مسلمان فوجیوں کو کس طرح برصغیر کے دور دراز علاقوں میں غیر ضروری مشن پر بھیج دیا گیا؟
مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر کے لیے انگریزوں سے کیا ساز باز کی؟
کس مسلمان اکثریت والی ریاست کو کس طرح ہندوستان سے ملحق کر دیا گیا؟
مسلمان مہاجرین کی منتقلی کے لیے ناکارہ پروزوں والی ٹرینیں کیوں فراہم کی گئیں؟ بنالہ میں
کیا ہوا؟ امرتسر میں راستے ہلاک کیوں کر دیے گئے؟

سکھوں کی کرپا میں سرعام برہنہ کیوں ہونے لگیں؟

مسلمان لڑکیاں اور عورتیں اپنے باپ بھائیوں اور شوہروں کے ہاتھوں کیوں ذبح کر دی
گئیں؟

تالیوں اور گٹروں میں گندے پانی کے بجائے لاشیں کس طرح پہنے لگیں؟ مسلمان بوزھوں کو
گلیوں میں پڑے نقص میں زندہ کیوں دفن کیا جانے لگا؟ مسلمان بچے ایک دوسرے کی غلاظت کھانے
پر کیوں مجبور ہوئے؟

وہ بچپن سے لے کر لڑکپن تک اس قسم کے واقعات سنا کرتی تھی۔ اسے دادو کی باتوں سے
الجھن نہیں ہوتی تھی کیونکہ اسے انہیں سننا اچھا لگتا تھا مگر کبھی کبھی اکتاہٹ ہونے لگتی۔ وہ کب تک یہی
فرسودہ کہانیاں سن سکتی تھی۔ وہ لڑکپن سے نکل کر جوانی کی سرحد تک پہنچ رہی تھی۔ اسے بھی ان ہی
چیزوں سے دلچسپی تھی جو اس کی عمر کی باقی لڑکیوں کی پسندیدہ تھیں۔

وہ ٹی وی پر آنے والے نت نئے پروگرام دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ ڈش کلچر سے مستفید ہونا
چاہتی تھی اور دادو کو یہ باتیں پسند نہیں تھیں جبکہ آمنہ کو جہانیاں چھوڑ کر لاہور آنے میں صرف اس لیے
کشش محسوس ہوتی تھی کہ وہاں پر ٹی وی کے نئے نئے پروگرام انجوائے کرنے کا موقع ملتا جبکہ جہانیاں
میں تو وہ قومی چینل ہی دیکھ پاتی تھی۔ اس کے پاس اسٹیریو تھا مگر اسے کیسٹس دادو ہی لا کر دیتے تھے جو
اسے پسند تو آتی تھیں مگر وہ اپنی فرینڈز کے گھر پر سنے گئے گانوں کو بھی سننا چاہتی تھی جو اس کے کلیکشن
میں نہیں ہوتے تھے جبکہ دادو کو یہ بات سخت ناپسند تھی۔

دادو نے سختی سے کہا تھا کہ اگر ڈش انٹینا لینے کی ضد کرے گی تو دادو اسے لاہور سے دوبارہ
جہانیاں لے جائیں گے اور یہی بات تھی جو آمنہ کو کسی بھی قسم کی ضد کرنے سے باز رکھتی تھی۔ وہ کسی
صورت جہانیاں واپس نہیں جانا چاہتی تھی اس لیے وہ دادو کی غیر موجودگی میں دور درشن دیکھ کر دل بہلا
لیتی جو لوکل ٹی وی پر بغیر ڈش انٹینا کے دیکھا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی فرینڈز بھی تھیں جن کے
گھروں میں یہ سب ”سہولیات“ تھیں۔

وہ ان کے گھر جا کر اس قسم کی سہولیات سے مستفید ہو سکتی تھی اور وہ ہوتی بھی تھی جبکہ دادو کو
کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی۔ آج جب دادو نے اسے ایک بے ضرر سا گانا سنتے دیکھ لیا تھا تو وہ اس

بڑی طرح ناراض ہو گئے تھے۔ آمنہ بھی ان سے ناراض تھی مگر وہ ان سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتی
تھی اسے انہیں منانے کا کڑا آتا تھا۔ چائے کی ایک پیالی اور شرمندہ سی مسکراہٹ ان کی خفگی دور کر سکتی
تھی۔

☆ ☆ ☆

”پاکستان کے وسائل بھارت کی نسبت بے حد محدود ہیں ان وسائل کے ساتھ ترقی کی
منازل طے کرنا بہت مشکل ہے جبکہ آپ کو قومی خزانے کا بڑا حصہ جنگی آلات اور اس قسم کے دوسرے
سامان کی درآمد پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس قسم کی صورتحال میں ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑا ہونا
کس طرح ممکن ہوگا؟“

ریتورما کے شیریں لہجے میں کہے گئے تلخ الفاظ اسے ماضی سے حال میں تھکٹ لائے۔
دادو کی خواہگاہ سے اس کا نفرنس روم تک پہنچنے میں اسے آٹھ سال لگے تھے جبکہ دیوار پر لگے سنہرے وال
کھاک نے صرف پندرہ منٹ گزرنے کی نشاندہی کی تھی۔ وہ ریتورما کے الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھ نہیں پاتی
تھی اس لیے اس نے مدیحہ کی جانب دیکھا۔

ریتورما کا فکر بہت زبردست ہے۔ یہ ایک پرفیکٹ ماڈل ہے۔ یقیناً یوگا کرتی ہوگی، میں
اس سے یوگا کے کچھ ٹپس ضرور لوں گی۔“

آمنہ کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کر وہ سرگوشی میں بولی تھی۔ مدیحہ اقتدار خود بھی کچھ عرصہ قبل
بہت سے مشہور میگزینز کے لیے ماڈلنگ کر چکی تھی اور کیٹ واک میں اسے خاص مہارت حاصل تھی۔

اس نے گہری سانس بھر کر سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔ کسی سے کچھ دریافت کرنے کا فائدہ
ہی نہیں تھا۔ اس کے ارد گرد مدیحہ اقتدار جیسے ”لبرل“ اور ”براڈ اسٹنڈ“ لوگ بیٹھے تھے۔ وہ لوگ جو
ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر پاکستانی معیشت کی زبوں حالی کا رونا روتے تھے۔ وہ لوگ جو پیسے کا خالی
ٹن ہوا میں اچھال کر فلسطین پر اسرائیل کے مظالم کا ذکر کرنا پسند کرتے تھے اور وہ لوگ جو اپنی اپنی
مرسڈیز اور لینڈ کروزر زمیں سڑکوں پر سنگل توڑ کر گزرتے تھے اور پھر منہ بھر بھر کر ٹریفک سسٹم کو گالیاں
دیتے تھے۔

وہ لوگ پاکستان کی چودہ کروڑ آبادی کا وہ ایک کزور واں حصہ تھے جو دنیا بھر میں پاکستان
کی نمائندگی ضرور کرتے تھے مگر جو خود ”پاکستانی“ نہیں تھے۔ وہ آمنہ کے لیے اور آمنہ ان کے قطعاً
اجنبی تھے۔

”ہم لوگ اکٹھے رہنا چاہتے ہیں۔ میں نے یہاں بہت سے بچوں سے ملاقات کی ہے جو
ہمارے فلمی ہیروز کے دیوانے ہیں۔ ہم میں انہیں اپنا آپ نظر آتا ہے وہ ہمارے ساتھ رہنا چاہتے
ہیں۔ ہمارا میڈیا آپ کی رگوں میں اتر آیا ہے۔ بچہ بچہ ”جے ہند“ کا مطلب جانتا ہے اور یقیناً کچھ

یہ سب دیکھ کر دل بہت خوش ہوتا ہے۔ احساس ہوتا ہے کہ ہم سب ایک ہیں۔ ہمیں جغرافیائی حدود رالگ نہیں رکھ سکتیں۔

ریتورما اپنی سریلی آواز میں کہہ رہی تھی اور آمنہ کا دل چاہ رہا تھا اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دے۔ اسے دادو کے الفاظ یاد آئے۔

”ہم سب ایک نہیں ہیں۔ اس ملک کی اساس دو قومی نظریہ ہے اور یہ نظریہ واضح طور سے کہتا کہ ہم دو ہیں۔“

اس کا دل چاہا ریتورما اور اس کے ساتھیوں سمیت اپنے ساتھیوں کو بھی اس نظریے کی یاد دلائے مگر اس کی آواز نقارخانے میں طوطی کے جیسی تھی اس کا دل چاہا وہ یہاں سے چلی جائے۔ مگر وہ پھر بھی نجانے کس طاقت کے زیر اثر وہاں ہی بیٹھی تھی۔

”چند روز قبل ہمارے ایک اخبار نے پاکستانی ٹین ایجرز سے ایک سروے کیا جس میں یہ سوال کیا گیا کہ وہ بھارت سے دوستی کے خواہاں ہیں تو سب کا جواب تھا کہ وہ لوگ ٹرم ریلیشن شپ چاہتے ہیں۔ سروے کا ایک سوال تھا کہ برصغیر کی تقسیم کو کتنے لوگ جیسی فائی کرتے ہیں آپ کو جان کر خوشی ہوگی کہ پچھتر فیصد لوگوں نے کہا کہ وہ اس تقسیم کو قطعاً جیسی فائی نہیں کرتے اور اگر انہیں موقع دیا جاتا تو وہ اکٹھے رہنا پسند کرتے۔“

ریتورما کے ساتھ بیٹھی اس کی بہن تارا درما نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”الگ رہنے میں نقصان بھی تو بہت ہے اور تکلیف بھی۔ آپ لوگوں کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ کے یہاں جمہوریت کا جو حال ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ آپ لوگوں کو اقتدار ہینڈل کرنا نہیں آیا۔ آپ کی حکومت قرض کے بوجھ تلے دبی ہے اور ان قرضوں کی ادائیگی کئی سالوں تک ممکن نہیں۔ آپ کو مہاجرین کی آباد کاری میں جو مشکلات پیش آئیں اس کی وجہ سے آپ ابھی تک سنبھل نہیں پائے۔ آپ بھارت سے الگ ہوئے تو پھر کتنے حصوں میں بٹ گئے۔ اب آپ لوگ صرف پاکستانی نہیں ہیں۔ آپ سندھی، پنجابی، بلوچی، پنجتون ہیں جبکہ ہمارے یہاں ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہم سب کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، بدھ سب ایک ساتھ رہتے ہیں اور بہت محبت سے رہتے ہیں۔“

سگیتا مہتانے ناک چڑھا کر کہا۔ وہ اس وفد کی سب سے مغرور لڑکی کے روپ میں سامنے آئی تھی۔

”کوئی تو ہو جو ان کو چپ کر دے۔ کوئی تو سچا پاکستانی ہو جو بولے۔“ آمنہ نے بے چارگی سے سوچا۔ مدیحہ کا ہاتھ ابھی بھی اس کے کندھے پر تھا۔ اس نے دل ہی دل میں خود پر سو بار لعنت بھیجی۔ وہ بہترین مقررہ تھی اور گفتگو کے سب اصول اسے ازبر تھے اور وہ چاہتی تھی کہ اس کے

بجائے کوئی اور آئے اور سامنے بیٹھے لوگوں کا منہ بند کروادے۔ وہ شاید کسی محمد بن قاسم کے انتظار میں تھی حالانکہ ضرورت محمد بن قاسم کی نہیں محمد بن قاسم جیسے حوصلے کی ہوتی ہے جو کوئی انسان بھی اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے اور وہاں کوئی محمد بن قاسم جیسے حوصلے والا نہ تھا۔

”مشرقی پاکستان کے سانحے نے آپ کو یہ سبق ضرور سکھایا ہوگا کہ الگ رہنے میں بہت نقصان ہے، تب آپ بھی اسی تکلیف سے گزرے ہوں گے جس سے 47ء میں ہم گزرے تھے۔ اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے مگر جب یہ باتیں یاد آتی ہیں تو بے حد تکلیف ہوتی ہے ہم اس تکلیف سے بچنا چاہتے ہیں اس لیے ہم آپ کی طرف بار بار دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں کیونکہ ہم چاہتے ہیں دونوں ممالک کے روابط بے حد شاندار خطوط پر استوار ہوں۔ ہماری آئندہ آنے والی نسلوں کو اپنی تاریخ کی کتابوں میں یہ سب باتیں پڑھتے ہوئے کسی پچھتاوے اور دکھ کا احساس نہ ہو کیونکہ تاریخ بدل جائے گی۔ ہم دوستی کا یہ پیغام لے کر آئے ہیں ہم آپ کو بدلنے آئے ہیں۔“

راج شرودھیا کرنے نے تلے انداز میں کہا۔

”آپ تاریخ بدلنے نہیں آئے آپ ہمیں بدلنے آئے ہیں اور کیل کانٹوں سے لیس ہو کر آئے ہیں۔ اس بار آپ کے ہتھیار ماضی کے ہتھیار سے مختلف ہیں۔ اس بار آپ ہمیں بغیر جنگ کے فتح کرنا چاہتے ہیں۔“

آمنہ نے جل کر سوچا۔ اسے پھر سے دادو کی یاد آئی۔

”میکالے کہتا ہے کہ اگر تم کسی قوم کو جنگ کے بغیر فتح کرنا چاہتے ہو تو اسے احساس کمتری کا شکار بنادو، وہ تمہاری ہمیشہ غلام رہے گی۔“

دادو نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے تھکی تھکی سی آواز میں کہا۔ آمنہ جو کمپیوٹر اسکرین میں پوری طرح منہمک تھی ان کی آواز پر چونکی۔ اس کے کانوں میں مائیکروفون لگا تھا جس کی وجہ سے وہ دادو کی بات مکمل طور پر سمجھ نہیں پاتی تھی۔ اس نے مائیکروفون اتار کر مسکراتے ہوئے ان کی جانب دیکھا پھر بولی۔

”دادو! میں پانچ منٹ میں فارغ ہو جاؤں گی۔“

وہ اپنی کسی انڈین نیٹ فرینڈ سے گپیں..... کر رہی تھی۔ اس نے انٹرمیڈیٹ پارٹ ٹو کے پیپر زدے رکھے تھے اور آج کل کھٹک ڈانس کی کلاسز لے رہی تھی۔ جب دادو کمرے میں آئے تب وہ اپنی انڈین فرینڈ سے اس کے متعلق بات کر رہی تھی اور انڈین کھٹک ڈانسز کو سراہ رہی تھی۔

”تم لوگ ہر فیلڈ میں شاندار ہو یا رہا! ہم تو بس ایویں ہیں۔“

اس نے اپنی فرینڈ سے کہا تھا تب ہی دادو کمرے میں داخل ہوئے تھے اور انہوں نے آمنہ کا بھی فقرہ سن کر اسے میکالے کا مشہور زمانہ قول سنایا تھا۔ انہیں اس قسم کے اقوال ہمیشہ ازبر رہتے تھے

وہ ان کے ساتھ اس بات پر بحث کرتی تھی کہ پاکستانی رہنماؤں کے مغربی طرز زندگی پر بحث کیوں نہیں ہو سکتی جبکہ بھارت میں تو نہرو کی رومانوی زندگی پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تک لکھا جا چکا ہے۔ وہ یہودیوں کو ماڈرن سائنسزم میں بے پناہ ترقی کے باعث انسانیت کا محسن کہتی تھی۔ دادو جب کبھی جھنجھلا کر اسے نصیحت کرنے کی کوشش کرتے تو وہ جواب دیتی۔

”ہمیں اس ”کنویں کے مینڈک“ والی روش کو ختم کرنا ہوگا۔ ہمیں اسلام کے بجائے انسانیت کے خلاف جنگ لڑنی چاہیے۔ ہمیں باطنی وسعت اور قلبی کشادگی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔“

اس کی ان ہی باتوں کی وجہ سے دادو اب اسے ٹوکنے سے گریز کرتے تھے۔ اب وہ چھوٹی سی آمنہ نہیں تھی جو پاکستانی پرچم زمین پر گرا دینے کے باعث ان کا تھپڑ آرام سے کھا لیتی اب وہ اٹھارہ سالہ آمنہ تھی جو خود کو انٹرنیٹ اتج کی لڑکی مانتی تھی اور حب الوطنی جس کے نزدیک خود کو محدود کر لینے والی بات تھی۔

”زمین کا ایک ٹکڑا آپ کا آئی ڈی کارڈ نہیں ہونا چاہیے دادو! ساری دنیا ہماری ہے بحیثیت انسان ہم ساری دنیا کی نمائندگی کرتے ہیں۔“

وہ دھڑلے سے کہتی تھی اور دادو اس کی ذہنی حالت میں سدھار کے لیے دعا کرتے اس کے پاس سے اٹھ جاتے۔ اب بھی اسے انٹرنیٹ کی دنیا میں گمن دیکھ کر وہ اس کے پاس سے اٹھنے لگے تھے کہ اس نے پتلی نگاہوں سے ان کی جانب دیکھ کر مزید پانچ منٹ مانگے۔ دادو خاموشی سے دوبارہ کاؤچ پر بیٹھ گئے تھے۔ آمنہ کے کمپیوٹر پہ مادھوری ڈکٹ کی تصویر والا ڈسک ٹاپ تھا۔ دادو نہیں جانتے تھے وہ خاتون کون ہیں مگر اس کے ایک طرف لگا تین رنگوں والے ترنگے کا بیج وہ بخوبی پہچانتے تھے۔ آمنہ نے کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کیا اور پھر ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”آئی ایم سوری دادو! دراصل تسنیم کی بات لمبی ہوتی جا رہی تھی۔“

”میرے بچے، یہ تم کن چکروں میں پڑی رہتی ہو اس کا کیا فائدہ ہے؟ میرے پاس بہت اچھی کتابیں آئی ہیں..... مرزا صاحب نے بھجوائی ہیں تم وہ کتابیں پڑھو تمہارے ناچ میں اضافہ ہوگا۔“ وہ بہت محبت سے بولے۔ آمنہ کی اس آزادانہ روش کے باوجود انہیں اپنی پوتی سے بہت محبت تھی۔

”دادو! آپ کے پاس ساری کتابیں نہایت بورنگ ہوتی ہیں۔ میں بالکل انجوائے نہیں کرتی۔ برصغیر کی تقسیم، دو قومی نظریہ، علیحدہ تشخص، مجھے یہ سب ہضم نہیں ہوتا دادو!“

اس نے گویا صاف انکار کر دیا۔ دادو کا دل چاہا وہ اسے بتائیں کہ یہ سب جاسے ”بورنگ“ لگتا ہے وہ اس کی سانسوں کا ضامن ہے۔ وہ جسے صرف زمین کا ٹکڑا سمجھتی ہے۔ وہ ٹکڑا اس کے اعتبار سے کھڑا ہونے کے لیے کس قدر ضروری ہے اور زمین کے اس ٹکڑے کو حاصل کرنے کے لیے انہیں کما

اور وہ اکثر و بیشتر آمنہ کو یہ اقوال سنا کر شرمندہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے حالانکہ وہ جانتے تھے آمنہ اب سمجھنے والے مراحل سے بہت آگے نکل چکی تھی۔

وہ کلینر ڈکالچ کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اور پڑھائی میں بہت اچھی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں وہ بہت شاندار ریکارڈ رکھتی تھی۔ وہ یقیناً ہر میدان میں آؤٹ اسٹینڈنگ تھی یہی وجہ تھی کہ اس کے فرینڈز میں بیوروکریٹس، آرمی افسران اور بزنس مین کے بچے شامل تھے جبکہ خود اس کا تعلق ایک عام سے گھرانے سے تھا۔

جہانیاں سے لاہور آنے کے بعد دادو نے ساری جمع پونجی سے شہر کے اچھے کاروباری علاقے میں دکانیں خرید لی تھیں جو کرائے پر چڑھادی گئی تھیں۔ ہر ماہ ایک معقول رقم کرایہ کی مد میں موصول ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی امی ایک انگلش میڈیم میں جونیئر ونگ میں اردو کی ٹیچر تھیں اور شام کو وہ گھر میں کوئنگ اسکول چلا رہی تھیں۔

آمنہ کو کبھی روپے کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی پھر اس کا حلقہ احباب بھی بہت ہائی فائی ٹم کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ گزشتہ پانچ سالوں میں اس کے نظریات میں بے حد پختگی آئی تھی۔ اس نے انٹر میں میوزک اور سوشل ورک پڑھا تھا اور اس کی دلچسپیاں ان دو فیلڈز میں بھی تھیں۔ وہ کالج کی ڈرامیٹک سوسائٹی کی ممبر تھی۔ اس کے علاوہ بیڈنٹن میں بہت سے انعامات جیت چکی تھی غرضیکہ وہ ایک ہرفن مولا ٹائپ لڑکی تھی اور وہ اپنی خوبیوں سے آگاہ بھی تھی۔ زندگی میں ہر مقام پر ملنے والی بے پناہ ستائش نے اسے کسی قدر مغرور بنا دیا تھا اور وہ زیادہ تر معاملات کو اپنی مرضی سے حل کرنا چاہتی تھی۔

دادو جانتے تھے کہ ان کی پوتی آج کی لڑکی ہے جس کے اپنے نظریات ہیں۔ وہ اس کی اس روش سے اکثر الجھن میں ضرور مبتلا ہو جاتے تھے۔ وہ کہیں سے بھی نور الحسن کی پوتی نہیں لگتی تھی۔ وہ آدمی امریکن برٹش آدمی انڈین اور آدمی پاکستانی مسلمان لڑکی تھی وہ انہیں نوٹیلیجک اور بنیاد پرست ہونے کا طعنہ دیتی تھی۔ وہ ان سے بحث کرتی تھی کہ انہیں ماضی سے باہر آنا پڑے گا تاکہ وہ زمانے کے ساتھ چل سکیں اسی وجہ سے ان کا خوب جھگڑا ہوتا تھا اور دادو ہمیشہ ہار جاتے تھے۔ وہ عجیب عجیب سے دلائل دیتی تھی۔

”دادو! ہم ہمسایہ ملک سے ہر لحاظ سے پیچھے ہیں۔ وہ کامیاب لوگ ہیں دادو! ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہمارے یہاں تو چھوٹے چھوٹے ایٹوز پر ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ معیشت، تعلیم، سیاست، ہر چیز..... ہم تو وہیں کھڑے ہیں جہاں 47ء میں کھڑے تھے جبکہ وہ لوگ کہاں سے کہاں نکل گئے۔“

وہ اکثر کہتی تھی اور دادو حیرت سے اس کی شکل دیکھتے رہ جاتے وہ ان کے بیٹے ابوبکر کی بیٹی کہیں سے بھی نہیں لگتی تھی جو کشمیر کے جہاد میں شہید ہوا تھا۔

کیا نہیں دیکھنا پڑا تھا۔

وہ ضلع گورداسپور کے چھوٹے سے قصبے بٹالہ کے رہنے والے تھے۔ امرتسر سے کچھ فاصلے پر واقع یہ ضلع انڈین حدود میں شامل کر دیا گیا تھا۔ تیس ستمبر 1947ء کو ہونے والے بلوایوں کے حملے میں اس کی آنکھوں کے سامنے ان کے ماں باپ کو ذبح کیا گیا تھا۔ وہ کس طرح بلوایوں کے حملے سے بچ کر امرتسر اور پھر لاہور پہنچے یہ ان کا دل ہی جانتا تھا۔ بارہ سال کی عمر میں انہوں نے بہتر سالہ زندگی کے مظالم دیکھ لیے تھے۔ اپنے چھوٹے بھائی کو وہ اپنی قمیض کے نیچے پیٹ پر باندھ کر لائے تھے۔ ان کا دو سالہ بھائی جب بھوک سے بلکتا تو وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتے کہ کہیں سکھ جتوں کو یہ آواز نہ پہنچ جائے۔ وہ کس طرح پاکستان پہنچے، یہ وہ کبھی بھلا نہیں کر سکتے تھے۔ راستے میں انہوں نے ظلم کو کس طرح ظالم کے ہاتھوں بے بس پایا یہ کوئی ان سے پوچھتا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ظلم خود ظالم سے شرمندہ ہے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے وہ رنگ ابھی بھی گہرے تھے اور ان کی پوتی کہتی تھی انہیں یہ سب بھول کر ہمسایہ ممالک سے محبت بڑھانے کے متعلق سوچنا چاہیے وہ آمنہ کو کیسے سمجھاتے کہ ان کا عمر رسیدہ دل یہ سب بھول نہیں سکتا وہ بھول جاتے اگر ان کی زندگی میں اس حوالے سے کوئی روشن دن آیا ہوتا۔

ان کا بھائی نور الحسنین، جس کی پرورش انہوں نے اولاد کی طرح کی تھی وہ 1970ء میں مشرقی پاکستان میں مکتی بانی کے ہاتھوں شہید ہوا تھا۔ اس کے وہ خطوط اب بھی ان کی الماری میں پڑے تھے جو اس نے مشرقی پاکستان سے لکھے تھے۔ وہ ایک اخباری رپورٹر تھا اس نے مکتی بانی کی بربریت کے جو مناظر دیکھے تھے انہیں کاغذ پر منتقل کر کے انہیں بھجوا دیا تھا۔ اس کی ہینڈ رائٹنگ میں وہ خطوط آج بھی ان کے پاس محفوظ تھے۔

وہ کیسے ان بوسیدہ خطوط سے ٹپکتے آنسوؤں اور خون کی بوندوں کو فراموش کر دیتے۔ وہ ان کا المیہ تھا اور ایسے اتنے آرام سے کب فراموش کیے جاتے ہیں۔ بھائی کے بعد ان کا بیٹا کشمیر میں شہید ہوا تھا اور انہیں اس کی شہادت پر فخر تھا مگر آج اپنے بیٹے کی بیٹی کو دیکھ کر انہیں احساس ہوتا کہ یہ فخر کہیں نہ کہیں تفکر میں ڈھل چکا تھا۔ ان کی ذہن و فطین پوتی آزادی اور آزادی کی اہمیت جیسی کسی چیز کو مانتی ہی نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

”ہم ہمیشہ سے آپ کے خیر خواہ رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم نے اب تک آپ کی طرف سے ہونے والی ماضی کی ہر کوتاہی کو معاف کر دیا ہے۔ تاہم اعلاطرنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ کی غلطیوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے آپ کے پاس آئے ہیں اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ جو بابا ہمیں کیا دیتے ہیں۔“

”آند اگر وال نے اپنی بیڑل گرے آنکھوں کو گھماتے ہوئے کہا۔ اس کی بات پر ایک بار

پھر کانفرنس روم تالیوں کی آواز سے گونجنے لگا۔ یہی تالیاں تھیں جو آمنہ کو ماضی سے حال میں کھینچ لاتی تھیں۔ اس نے ایک بار بھی میز نہیں بجائی تھی۔

اس کا دایاں ہاتھ اس کے بائیں ہاتھ پر سختی سے دھرا تھا اسے محسوس ہو رہا تھا کہ شاید کئی صدیوں سے وہ یونہی ہاتھ پر دھرے فارغ بیٹھی لائینی اور بے معرف سوچوں سے الجھ رہی تھی۔

”ہم بہت پر امید ہیں کہ اب کی بار یہ لڑائی جھگڑے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے ہم نے یہاں بہت سے لوگوں سے ملاقات کی ہے۔ ان کو دیکھ کر قطعاً یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ ہم سے مختلف ہیں۔ ہماری آئیڈیولوجی، ہمارا کلچر، ہمارے رہن سہن کا طریقہ ایک ہی ہے جب ہم ایک ہیں تو پھر محض ان جغرافیائی خطوط کی بنا پر اس قدر تعصب کیوں ہے؟“

رادھیکا پنیل نے تئیر میں گھر کر استفسار کیا تھا۔

”مجھے تو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ انہی بنیادوں پر آپ کے آباؤ اجداد نے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا تھا۔ میرے ذہن میں اکثر یہ سوال آتا تھا کہ اگر وہ سب اس بات سے واقف ہوتے کہ پچاس ساٹھ سال بعد دونوں ممالک کے رہنے والوں کے نظریات پھر سے مماثلت اختیار کر جائیں گے تو کیا وہ پھر بھی ایک الگ وطن کا مطالبہ کرتے؟“

ساحر کمار نے کہا تھا۔ آمنہ کو محسوس ہوا جیسے سوال اسی سے پوچھا گیا ہے۔ وہ بول سکتی تھی مگر اصولی طور پر ابھی اس کے بولنے کی باری نہیں آئی تھی۔

”آپ لوگوں کے یہاں جو لباس پہنا جاتا ہے کم و بیش ہمارے یہاں بھی وہی لباس زیب تن کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کا قومی لباس ساڑھی ہے اور وہ آپ کے یہاں کی خواتین بہت کثرت سے استعمال کرتی ہیں۔ میں نے بہت سی خواتین سے پوچھا کہ وہ ساڑھی اتنے شوق سے کیوں پہنتی ہیں تو انہوں نے کہا کہ اس لباس کو پہننا انہیں اچھا لگتا ہے اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔“

آند اگر وال نے دوبارہ سے بولنا شروع کیا تھا۔ وہ فیشن ڈیزائننگ میں انڈین اسکول آف آرٹس سے اپنی ڈگری مکمل کر رہا تھا۔ یہ بات بہت دلچسپی کی حامل تھی کہ انڈیا سے جو وفد آیا تھا اس میں زیادہ تر فیشن ڈیزائنرز، ماڈلز، تھیٹر آرٹسٹس، سنگرز، وغیرہ شامل تھے۔ ان کی گفتگو کا مرکز بھی گھوم پھر کر انہی دو چار چیزوں پر آ جاتا تھا۔

”آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے یہاں کا ڈرامہ آپ کے یہاں کس قدر پسند کیا جاتا ہے۔ لوگ ان کے انتظار میں اپنے ضروری آپائنٹمنٹس کینسل کر دیتے ہیں۔ ان ڈراموں کے کردار آپس کی گفتگو میں بار بار زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ ڈراموں کے کرداروں کی طرح کے لباس سنوائے جاتے ہیں۔ آپ کے یہاں ہونے والی شادیوں میں ہمارے یہاں کا میوزک بجایا جاتا ہے۔ آپ کسی بچے سے پوچھ کر دیکھیں کہ اس کا فیورٹ ہیرو کون ہے وہ لمحہ بھر کی ہچکچاہٹ کے بغیر شاہ رخ خان کا نام

لے گا۔ یہ ان کے دلوں میں موجود ہماری محبت کا نتیجہ ہے کہ وہ ہمارے یہاں کے ایک فلمی ایکٹر کو اپنا ہیرو مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ حالیہ کرکٹ میچز میں آپ نے دیکھا کہ دونوں ٹیموں کے درمیان ہار جیت کے جذبے سے زیادہ ملنساری اور محبت کا جذبہ نظر آیا۔ آپ نے ہماری کرکٹ ٹیم کو جو عزت دی جو پروٹوکول دیا ہم مدتوں اسے یاد رکھیں گے۔“

راہیہ کا پٹیل نے کہا۔ اس کی بات پر آمنہ کی سائیڈ پر بیٹھے کتنے لوگوں کے چہرے اتر سے گئے۔ حالیہ کرکٹ میچز میں جو کچھ ہوا اس نے بہت سے لوگوں کو حیران بھی کیا تھا اور ان کے دل بھی دکھائے تھے مگر جو منظر عام پر آیا تھا وہ بہت شرمناک تھا۔ آمنہ کی نظر میں وہ سب تصویریں گھوم گئیں جو اس نے اخباروں اور مختلف میگزینز میں دیکھی تھیں۔ پاکستانیوں کے پریشان حال چہرے، شکست پر آنسو بہتی آنکھیں، اور فوج کی دعا کرتے لب کسی اخبار یا میگزین میں نہیں تھے مگر جینز اور ہاف شرٹس میں لمبوس لڑکیاں جو انڈین کرکٹرز کے ساتھ تصویریں بنوانے کے لیے بے تاب تھیں ہر میگزین کی زینت بنی تھیں۔ اسے پھر سے دادو کی بات یاد آئی۔

”ہمارا ایک فیصد انتہائی امیر طبقہ باقی نانوائے فیصد غریب طبقے کی خالص اور پاکیزہ سوچ کو منظر عام پر آنے دے تو کسی کو پتا چلے کہ پاکستانی کس قسم کے لوگ ہیں۔“

وہ اکثر آمنہ کی آزادانہ سوچ پر کڑھ کر کہا کرتے تھے اور آمنہ ہمیشہ ان کی بات کو اہمیت دیے بغیر اپنے آپ میں گمن رہتی تھی۔ اسے اپنے ماضی پر انتہا کا افسوس ہوا۔ اس نے بھی کبھی اس انتہائی ماڈرن اور انتہائی لبرل سوچ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے راہیہ کا پٹیل نے اپنے سامنے بیٹھے پچاس لوگوں میں سے صرف اسے ہی طعنہ دیا ہے۔ اس کا انداز بے حد جتانے والا تھا بلکہ اسی پر کیا موقوف ہمسایہ ملک سے آئے ہوئے اس وفد کا ہر رکن نہایت رعب سے بات کر رہا تھا جبکہ ان لوگوں کو خصوصاً تاکید کی گئی تھی کہ رویے میں دوستانہ پن اور عاجزی کا مظاہرہ کرنا ہے۔

”میں یہاں لاہور میں شاپنگ کے لیے بھی گئی۔ بہت سے شاپنگ مالز پر جانے کا اتفاق ہوا۔ شاپ کپیرز کو جب پتا چلا کہ میں انڈیا سے آئی ہوں تو انہوں نے مجھے ہر چیز میں بہت ڈسکاؤنٹ دیا بلکہ کچھ لوگوں نے تو مجھے گفٹس بھی دیئے مجھے ان کے اس جذبے نے بہت متاثر کیا۔ میرا دل نہایت خوش ہوا یہ سب دیکھ کر اور یہ احساس بھی ہوا کہ برف پگھلنا شروع ہو چکی ہے ظاہر ہے جب جذبات میں اس قدر گرمجوش ہوگی تو سرد مہری کی یہ برف پگھل کر رہے گی۔“

قاتنا راج پال نے مقامی دکانداروں کے حسن سلوک کو سراہا تھا مگر پھر بھی اس کے انداز میں ستائش کی جگہ طنز ہی نظر آیا۔ ان سب کے منہ میں سیاسی زبان تھی اور وہ جذبہ خبر سگالی کی بات کر رہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ خارجہ پالیسی کے تحت نہیں آئے بلکہ وہ محبت

کے پیامبر بن کر آئے ہیں۔ ان کی یہ محبت بھری خارجہ پالیسی آمنہ کے ذہن میں سوئی بن کر چھ رہی تھی۔ اسے افسوس سا ہوا کہ وہ اسلام آباد سے صرف اس وفد کی خاطر لاہور آئی تھی مگر یہاں اسے سب کچھ ویسا ہی محسوس ہوا تھا جیسا دادو نے اسے بتایا تھا۔

وہ اپنی سفاک خواہشات کو نرم لباس پہنا کر ان کے سامنے پیش کر رہے تھے ان میں سے کسی نے ایک بار بھی نہیں کہا تھا کہ وہ ”کشمیر ایٹو“ کا منصفانہ حل چاہتے ہیں جبکہ وہ بار بار یہ مطالعہ کر رہے تھے کہ سرحد پار دراندازی کو ختم کیا جائے۔ ان کے نزدیک ہر چیز دورنی اور دہرے معیار کی حامل تھی۔ آمنہ کو یک دم اس سارے ماحول سے بے پناہ اکتاہٹ محسوس ہونے لگی۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

کانفرنس روم میں اب کولڈ ڈرئکس تقسیم ہونے لگی تھیں۔ وہ اپنا پرس اٹھا کر ہال سے باہر نکل آئی۔ دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے مڑ کر اپنے انچاس ساتھیوں کو دیکھا تھا اور پھر دل ہی دل میں انہیں مخاطب کر کے وہی بات کہی تھی جو دادو نے اسے کبھی بہت رنج سے کہی تھی۔

”جنہیں تم دوست کہتے ہوتا وہ تمہارے دوست نہیں ہیں انہوں نے ہمیشہ ہمیں دکھ دیے ہیں اور دکھ بھی عام دکھ نہیں بلکہ ذات کے دکھ اور ذات کے دکھ ساری حیات پر بھاری ہوتے ہیں۔“

☆ ☆ ☆

”جنہیں تم دوست کہتے ہوتا وہ تمہارے دوست نہیں ہیں انہوں نے ہمیشہ ہمیں دکھ دیے ہیں اور دکھ بھی عام دکھ نہیں بلکہ ذات کے دکھ اور ذات کے دکھ ساری حیات پر بھاری ہوتے ہیں۔“

دادو نے انتہائی رنج بھرے لہجے میں کہا تھا مگر آمنہ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ فیصلہ کر چکی تھی اور اس نے اپنے فیصلہ سے انہیں آگاہ کر دیا تھا۔

”میں قاسم خان سے ہی شادی کروں گی۔“

اس نے قطعیت سے کہا تھا۔ اس کی امی اس کے ساتھ تھیں مگر دادو کسی صورت نہیں مان رہے تھے۔ انہیں قاسم خان پسند تھا۔ انہیں اس کی فیملی پر بھی اعتراض نہیں تھا مگر انہیں اس جگہ پر اعتراض تھا جہاں وہ رہتا تھا۔ وہ انڈیا کے شہر احمد آباد کا رہنے والا تھا۔ دادو، آمنہ کی شادی اتنی دور نہیں کرنا چاہتے تھے اور پھر انڈیا تو وہ اسے کبھی بھی نہ بیاتے مگر آمنہ پہلی ملاقات میں ہی قاسم خان کو اوکے کر چکی تھی۔ قاسم خان ملازمت کی غرض سے ٹیکساس میں مقیم تھا مگر اس کی فیملی احمد آباد میں ہی رہتی تھی وہ دادو کے چچا زاد بھائی کا نواسہ تھا جو قیام پاکستان کے وقت انڈیا میں ہی رہ گئے تھے۔ کئی سالوں بعد جب دونوں ممالک کے روابط میں ذرا نرمی آئی ہوئی تھی تو وہ سمجھوتہ ایکسپریس سے دادو سے ملنے اور پاکستان کے نادرین ایریاز کے سیر کی غرض سے آئے تھے۔

قاسم خان کمپیوٹر سافٹ ویئر میں ایک ایکسپٹ انجینئر کے طور پر جانا جاتا تھا۔ قاسم خان

سمیت جب اس کے نو افراد پر مشتمل گھر والے پاکستان کی سرزمین پر اترے تو آمنہ ان کا استقبال کرنے والوں میں سب سے آگے تھی۔ ان دنوں وہ گریجویشن کر چکی تھی اور یونیورسٹی میں تھی۔ اس نے انڈیا سے آئے اپنے خاص الخاص مہمانوں کو لاہور کے علاوہ ناردرن ایریاز بھی گھمایا تھا اور یہیں کہیں کیو پڈ کے تیرنے اسے گھاگل کر دیا۔ ایسا ہی کچھ وار قاسم خان پر بھی ہوا۔ اس نے واپس جانے سے ایک دن قبل اپنا پرپوزل دادو کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ انہوں نے اسے مناسب الفاظ میں انکار کر دیا تھا۔

”میں عرصے پہلے اس زمین کو چھوڑ کر یہاں آ بسا تھا اب میں دوبارہ ایسا کوئی تعلق نہیں جوڑنا چاہتا جس کی بنا پر مجھے بار بار وہاں جانا پڑے۔“

انہوں نے بہت عاجزی سے اپنے چچا زاد بھائی طاہر نقوی کو کہا تھا جو قاسم خان کے نانا تھے۔ طاہر نقوی اس آئیڈیولوجی پر یقین نہیں کرتے تھے مگر انہوں نے دادو کو منانے کی کوشش نہیں کی مگر آمنہ رات کو ان کی خواہگاہ میں آئی تھی اور اس نے انہیں اپنی مرضی سے آگاہ کیا تھا۔

”فارگا ڈیک دادو! آپ کب ان برسوں پرانی یادوں سے چھٹکارا حاصل کریں گے۔ وہ ہمارے دشمن ہیں۔ وہ ہمارے دوست نہیں ہو سکتے۔ کیوں دادو! جب ہماری نیت میں فتنہ نہیں تو وہ ہمیں دھوکہ کیوں دیں گے؟ میں ایسی باتوں پر یقین نہیں کرتی۔ مجھے احمد آباد میں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں وہ بھی ایسا ہی ایک شہر ہوگا جیسا یہ لاہور، کراچی، فیصل آباد، گوجرانوالہ، پشاور وغیرہ ہے۔ وہاں پر بھی ایسے ہی لوگ ہوں گے جیسے یہاں ہیں۔ وہ اسی طرح کھاتے ہو گے اسی طرح پیتے ہو گے جیسے ہم کھاتے پیتے ہیں۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا رسم و رواج، رہن سہن، ہم سب ایک ہی تو ہیں دادو! پھر ہم الگ رہیں یا ایک ساتھ کیا فرق پڑتا ہے۔ اب زمانہ تبدیل ہو چکا ہے۔ اب دونوں طرف پہلے جیسی صورتحال نہیں رہی اب حالات بہت مختلف ہیں۔ میں وہاں بہت خوش رہوں گی۔“ اس نے ضدی لہجے میں کہا اور وہ اپنی ذہن و فطین مقررہ پوتی کے منہ سے یہ سب باتیں سن کر وہ جیسے ہکا بکا رہ گئے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ پانی سر سے اتنا اونچا ہو چکا ہے۔ انہوں نے اسے سمجھانا چاہا۔

”تم وہاں خوش نہیں رہ سکتیں میری بچی۔ وہاں سب کچھ بہت مختلف ہوگا۔ وہاں تم ادھار کی زندگی جیوگی۔ وہاں تمہیں سب کچھ ”حق کے طور پر نہیں بلکہ ”بھیک“ کے طور پر ملے گا۔ تمہاری بھاتا تمہارا نام و نشان اس سرزمین سے ہے۔“

”دادو! پلیز“ آپ مجبور نہیں کر سکتے میں فیصلہ کر چکی ہوں اور آپ جانتے ہیں میں بہت ضدی ہوں اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ان صدیوں پرانی فلاسفی پر یقین نہیں رکھتی۔ زمین کے ایک ٹکڑے کی اہمیت نہیں ہے۔ انسان کی اہمیت ہے اور میں قاسم کے ساتھ کہیں بھی رہ لوں گی۔ میں قاسم خان سے ہی شادی کروں گی۔“

اس نے اتنا کہنے کے بعد ان کی جانب دیکھے بغیر کمرے سے باہر قدم بڑھا دیئے۔ وہ جانتی تھی دادو مان جائیں گے اور وہ مان بھی گئے تھے۔ پہلی بار انہیں احساس ہوا تھا کہ انہوں نے اپنی لاڈلی پوتی کی تربیت میں کوتاہی کی تھی۔ قاسم خان نیکلاس رہتا تھا اس کا ارادہ مستقل وہیں رہائش پذیر ہونے کا تھا کم و بیش اس کے باقی اہل خانہ بھی یہی چاہتے تھے اس طرح پاکستان چھوڑنے سے قبل قاسم اور آمنہ کی نسبت طے کر لی گئی تھی۔ آمنہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ عام حالات میں وہ انڈیا یا پاکستان میں کسی جگہ رہنے کو ترجیح نہ دیتی مگر قاسم خان نے اسے انڈیا میں رہنے کے لیے قائل کر لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا شادی کے بعد آمنہ کچھ عرصہ احمد آباد میں رہے پھر وہ اسے اپنے ساتھ نیکلاس لے جاتا۔ شادی دو سال بعد ہونا طے پائی تھی۔ قاسم واپس نیکلاس چلا گیا جبکہ آمنہ نے پی جی ڈی کمپیوٹر سائنسز میں ایڈمیشن لے لیا کیونکہ منگنی کے معاملات میں الجھ کر اس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن کی ڈیٹ گزاری تھی۔ اس کی وہی دلچسپیاں تھیں وہی شوق تھے مگر اب اس کی زندگی کا محور قاسم خان ہو گیا تھا۔ وہ روز نیٹ پر ایک دوسرے سے بات کرتے، ہفتہ میں دوبارہ اسے فون بھی کر لیتا اور ہر ماہ بعد اسے خلوص و محبت سے سجا ایک کارڈ اور گفٹ بھی موصول ہو جاتا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کی محبت گہری ہوتی چلی گئی اس طرح ایک سال پلک جھپکتے گزر گیا۔

”میں ایک ماہ کی چھٹیوں کے لیے واپس احمد آباد جا رہا ہوں۔ میں پلان کر رہا تھا کہ نکاح کی تقریب پہلے کر لیتے ہیں ورنہ پھر بعد میں پیپرز وغیرہ بنوانے میں مسئلہ ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ شادی کے بعد میں نیکلاس میں اکیلا رہوں اور تم وہاں احمد آباد میں میرے لیے اداس گانے گاتی رہو۔“ قاسم نے نیکلاس سے اسے فون پر کہا تھا۔

”تم کسی خوش فہمی میں مبتلا مت ہو قاسم! میں تمہارے لیے کبھی اڈاس گانے نہیں گاؤں گی بلکہ مجھے امید ہے کہ میں وہاں احمد آباد میں تمہاری امی کے ساتھ بہت اچھا وقت گزاروں گی۔ تم میری فکر مت کرو میں دادو کی طرح اس قسم کے دوسوں کا شکار نہیں ہوتی۔“

اس نے جواباً قاسم کو تسلی دی تھی۔ قاسم، احمد آباد چلا گیا تھا اور ان کے نکاح کی تیاریاں دونوں طرف شروع ہو چکی تھیں۔ آمنہ نے ساری شاپنگ اپنی مرضی سے کی تھی۔ نکاح کی تقریب کے لیے اس نے مدد اسی ساڑھی کا انتخاب کیا تھا کیونکہ قاسم نے اس سے کہا تھا کہ اس کی سرودہ شخصیت پر ساڑھی ہی سوٹ کرے گی۔ جب ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ کارڈز بھی بٹ چکے تھے حتیٰ کہ بیوٹیشن اور فونو گرافر سے اپائنٹمنٹس بھی لے لی گئی تھیں کہ قاسم کی طرف سے نکاح کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دیا گیا کیونکہ احمد آباد، گجرات اور بھارت کے کچھ دوسرے علاقوں میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ دنیا کی ایک بڑی سیکولر ریاست میں وہاں کی اکثریتی آبادی نے اقلیتی آبادی کو چن چن کر مارنا شروع کر دیا۔ وہی مظالم جو آمنہ دادو کی زبانی سنا کرتی تھی۔ 47ء کے وہی قصے جنہیں آمنہ فرسودہ پرانی

کہانیاں کہا کرتی تھی یکدم ری پلے کی صورت دوبارہ سے چلنے لگے۔ اخبارات میں لوگوں کی ڈری ڈری صورتیں، اپنے پیاروں کے مرنے پر رنج و الم کی تصویر بنے لوگ اور پھر موت کے ظالم شکنجے سے بھاگتے پھرتے، بچتے بچاتے لوگ ہر روز ایسی ہی تصاویر اخبارات کی زینت بنی ہوتیں۔ بی بی سی اور سی این این پر جو خوفناک رپورٹس پیش کی جاتیں وہ آمنہ کو ہلا کر رکھ دیتیں۔

”یہ سب دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔“ وہ ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھ کر عجیب سے لہجے میں دادو سے کہتی جو دائیں ہاتھ میں کپڑی تیج کے دانے گراتے جاتے اور مسلم امہ کی بھلائی، بہتری و حفاظت کی دعا کئے جاتے۔ آمنہ فون کی جانب دیکھتی رہتی، انٹرنیٹ کینکٹ کر کے قاسم کے آن لائن ہونے کا انتظار کرتی رہتی مگر وہ فون کرتا نہ نیٹ پر آتا نکاح کی طے شدہ تاریخ گزر جانے کے پانچ دن بعد قاسم نے ای۔ میل کی تھی۔

”آمنہ! دعا کرو حالات بہتر ہو جائیں ایسا لگتا ہے جیسے ہم جہنم میں رہ رہے ہیں۔“ وہ ہمارے خون کے پیا سے ہو گئے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے ہم گوشت کے لوتھڑے ہیں اور وہ کتے جو ہمیں بھنبھنڈو..... کر کھانا جانا چاہتے ہیں۔ یہاں سچ خون کا، ہولی کھلی جارہی ہے آمنہ!“

آمنہ اس کی میل چیک کرتے ہوئے تڑپ تڑپ کر رو دی۔ وہ دن میں کئی بار اس میل کو دیکھتی اور آنسو اس کی آنکھوں میں نہانے کہاں سے اتر آتے۔ اسے زندگی میں پہلی بار احساس ہوا تھا کہ دادو کی الماری میں موجود کچھ بوسیدہ خطوط، کچھ خون آلودہ کپڑے گندھے بالوں کی ایک کٹی ہوئی چٹیا، جس کے بارے میں دادو کا کہنا تھا کہ وہ ان کی ماں کی تھی، ان کی آنکھوں میں یہ سب چیزیں دیکھتے ہوئے آنسو کہاں سے آ جاتے تھے۔ وہ جو انہیں اس نوسلطیہ سے نکلنے کے لیے کہا کرتی تھی خود ایک عجیب سے نوسلطیہ کا شکار ہونے لگی۔ ان ہی دنوں قاسم کی ایک ای۔ میل آئی۔ اس کے خالہ زاد بھائی کو سر بازار چر پھاڑ ڈالا گیا تھا۔

”آمنہ! انہوں نے اس کا قیمہ کر دیا تھا۔ اس کی انگلیاں کاٹ کر اس کے کان میں گھسا دیں۔ اس کے دانت اس کے ناک میں گاڑے ہوئے تھے۔ اس کی ٹانگیں توڑ کر انہوں نے نکلے نکلے کر ڈالی تھیں۔ وہ کم و بیش سب مسلمانوں کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم گائے کو سجدہ کریں تو وہ ہمیں بخشے کو تیار ہیں۔ ہمارے لیے دعا کرو آمنہ!“

اس کی میل ایسی ہی باتوں سے بھری ہوئی تھی۔ آمنہ نے اسے لکھا تھا کہ۔

”تم ٹیکساس واپس چلے جاؤ اور اپنے اہل خانہ سے کہو یہاں پاکستان آ جائیں۔ یہاں سب نہیں قتل کر لیں گے۔ وہ جگہ چھوڑ دو قاسم! وہ تمہارے رہنے کے قابل نہیں ہے۔“

دادو اس کی حالت دیکھ رہے تھے اور دعا کر رہے تھیں اخبارات میں چھپنے والی تصاویر اور خبریں انہوں نے بھی پڑھی تھیں۔

وہ قاسم کے فون کا انتظار کرتے رہتے کیونکہ اس نے منع کیا تھا کہ آپ خود فون نہ کریں ورنہ کال ٹریس ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ اس دن اچانک اس کا فون آ گیا۔ وہ بمبئی سے فون کر رہا تھا اسے کرائم برانچ والوں نے طلب کیا تھا۔

”دادو! وہ سمجھتے ہیں کہ میں پاکستانی جاسوس ہوں کیونکہ انہیں میرے پاکستانی تعلقات کے متعلق سب علم ہے۔ وہ جانتے ہیں میری جس لڑکی سے شادی ہونے والی ہے وہ پاکستانی لڑکی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں، میرا باپ، میرا دادا، سب شریف آدمی ہیں۔ ہم ہمیشہ اس دھرتی کے ساتھ وفادار رہے ہیں مگر وہ ہمیں مسلمان ہونے کی سزا دے رہے ہیں دادو!“

قاسم نے تقریباً روتے ہوئے انہیں فون پر بتایا تھا۔ اس کے بعد قاسم کا کوئی فون نہیں آیا بلکہ اس کے نانو (جو آمنہ کے دادو کے چچا زاد بھائی تھے) کا فون آیا۔

”قاسم کو انویسٹی گیشن سیل نے اذیتیں دے دے کر مار دیا ہے نور الحسن! مجھے آج سمجھ میں آیا کہ جب تم دو قومی نظریے کی اساس پر ہندوستان چھوڑ کر گئے تھے تو تم نے بہت اچھا کیا تھا اور میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی اور اس غلطی کا خمیازہ میری نسل کو بھگتنا پڑا۔ کاش میں تب ہی تمہاری بات مان لیتا۔“

وہ روتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ قاسم کی المناک موت نے آمنہ کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسے دہشت گرد اور پاکستانی جاسوس کہہ کر قتل کیا گیا تھا۔ اس کے قتل کے بعد ہندو بلوائیوں نے جن جن کر اس کے اہل خانہ کو بھی قتل کر دیا تھا۔

آمنہ ان دونوں اتارو چکی تھی کہ مزید رونے کا حوصلہ ہی نہیں رہا تھا۔ انقلاب اس لیے برپا ہوتے ہیں تاکہ تبدیلیاں لائی جاسکیں۔ قاسم کی موت کے انقلاب نے آمنہ کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا تھا اسے لگا وہ آمنہ ابو بکر نہیں رہی بلکہ نور الحسن بن ہو گئی ہے۔

”جب اذیت خود آپ کی شاہ رگ پر کھڑی ہو کر آپ کو اذیت دینے پر آتی ہے تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ آنکھ سے خون اور زخم سے آنسو بہنے لگے تو کیا ہوتا ہے۔“

اس کی ان باتوں پر سب پہلے حیران ہوئے اور پھر انجان ہوتے چلے گئے۔ وہ فرینڈز جو ہمیشہ اس کا دم بھرتے نظر ہوتے تھے اس سے دور ہوتے چلے گئے کیونکہ اب وہ ان کے معیار کی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے دادو کی طرح کی پرانے دور کی کہانیاں سناتی تھی جسے پائیز و فکشنز سے الرجی ہونے لگی تھی۔

اب وہ کھینک اور یوگا میں دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ ہر دو دن احمد مارکٹ میں کسی نئی اینڈین مودی کی DVD دستیاب ہوتی تھی مگر وہ ان کی طرف تھوکنہ بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ وہی آمنہ ابو بکر جو انڈین موزی اور ڈراما کو حقیقت کی سب سے بڑی تصاویر مانا کرتی تھی یکدم ہی ان سب چیزوں سے

بیزار ہو گئی۔ اس کے کتابوں کے شوکیس میں کتابیں اس کی وارڈ روپ میں ڈریسر اس کے کیبکس میں وڈیو، آڈیو کیسٹس اور اس کے درازوں میں سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز بدل گئی تھیں۔ وہ جو اس قسم کی سوچوں کو ”تنگ نظری“ کہا کرتی تھی وہ جو کلچر کو ”یونیورسل“ کہا کرتی تھی وہ لڑکی کسی اور روپ میں ڈھل گئی بھی۔ ایک قاسم خان کے مرنے سے کیا سب کچھ ختم ہو گیا تھا؟

”دنیا میں لاکھوں انسان مر جاتے ہیں مگر ایک ایسا انسان بھی ہوتا ہے جو آپ کے لیے سب سے اہم ہوتا ہے جب وہ شخص مر جاتا ہے تو پھر آپ بھی مر جاتے ہیں۔“

اس نے اپنی ایک فرینڈ سے کہا تھا جو اس کی اس تبدیلی پر حیران تھی اسے خود بخود ان تمام کتابوں سے دلچسپی ہو گئی جنہیں پڑھنے کے لیے دادو اسے ہر قسم کا لالچ دیتے رہے تھے مگر وہ ان کی طرف دیکھتی بھی نہ تھی اور اب وہ ان ہی کتابوں میں دلچسپی لیتی تھی۔ حقائق پرت در پرت اس کے سامنے آ رہے تھے۔ وہ جان گئی تھی کہ جس باتوں کو ہم صرف کتابی باتیں کہہ کر انور کر دیتے ہیں وہ صرف کتابی باتیں نہیں ہوتیں ان کے پیچھے ہزار ہا داستانیں کارفرما ہوتی ہیں۔

اس نے ایک دن خود سے یہ اعتراف کر لیا تھا اور پھر اسے احساس ہوا تھا کہ دادو کن دکھوں پہ پریشان رہتے تھے۔ وہ کون سی باتیں ہیں جو انہیں بار بار 47 سے پہلے کے قصوں میں الجھائے رکھتی ہیں۔ اس کی رائٹنگ ٹیبل کے درازوں میں قاسم کے خطوط، اس کے لٹفٹس کے ساتھ اخبارات کی وہ کٹنگ بھی رہنے لگیں جو ہندو مظالم کی داستانیں چیخ چیخ کر سناتے تھے۔ اس کی اور دادو کی الماری اب ایک سی لگتی تھی۔

آپ رات کو جھوٹ کے نرم پالنے میں سو جائیں اور جب صبح انہیں تو حقیقت کا گرم فرش آپ کی پشت جلا رہا ہو تو پھر آپ خود بخود آنکھوں، کانوں اور اپنے ذہن کا استعمال شروع کر دیتے ہیں پھر آپ کو کسی مبلغ کسی ناصح کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ آپ خود مبلغ اور ناصح بن جاتے ہیں، آمنہ بھی ایک ایسی ہی شخصیت میں ڈھل چکی تھی۔ اس نے دادو کے کہنے پر قائد اعظم یونیورسٹی میں آئی آر میں ایڈمیشن لے لیا جہاں وہ ہاسٹل میں رہتی تھی۔ وہ باقی لڑکیوں کو ان ہی دلچسپیوں میں مگن دیکھتی تھی جو پہلے کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھیں اور پھر ان کی زندگی میں کسی انقلاب کے آئے بغیر ان کے بدل جانے کی دعا کیا کرتی۔

وہ کیسے اس کو وفد کے اراکین کی باتیں خاموشی سے سن لیتی جو صرف جھوٹ پر مبنی تھیں اسی لیے وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔

اس کی ذات کے دکھ اس کی ساری حیات پر بھاری ہو چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

”تم واپس جا رہی ہو؟“ کارڈور سے گزرتے ہوئے اس نے کسی کی آواز سنی۔ وہ عمر ایزد

تھا۔ وہ بھی اس کے پچاس ساتھیوں میں سے ایک تھا۔ عمر ایزد کے بارے میں اس کی رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ وہ اسے ہمیشہ سے مغرور لگا تھا۔ دونوں کی پہلی ملاقات سارک ممالک کی طرف سے منعقد کی گئی تھی کہ کانفرنس میں ہوئی تھی۔ وہ آمنہ کے ساتھ اس ٹیم میں شامل تھا جس نے کونز پروگرام میں گولڈ میڈل جیتا تھا۔ وہ اس ٹیم کا سب سے سینئر طالب علم تھا۔ وہ ان سب کا جلیٹ کے بیچ میں واحد یونیورسٹی اسٹوڈنٹ تھا اس لیے اس کا غرہ ان سب سے زیادہ تھا۔ آمنہ کی اور اس کی ملاقات ہمیشہ باخوش گوار انداز میں ہوئی تھی۔ اب بھی واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے آمنہ اس کا سامنا بالکل نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”ہاں میں واپس جا رہی ہوں۔“ وہ چلتے ہوئے بولی عمر ایزد اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ”کیوں؟ انڈین بیویز کی باتیں تمہیں دلچسپ نہیں لگ رہیں؟“ اس نے ایک اور سوال کیا۔ آمنہ نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

”کہاں ہوتی ہو آج کل؟ کیا کر رہی ہو؟“ اپنی عادت کے برعکس وہ مسلسل سوال کر رہا تھا۔ ”انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹرز کر رہی ہوں قائد اعظم یونیورسٹی سے اور تم؟“ آمنہ نے اکتا کر پوچھا تھا۔

”ویل..... میں بھی ماسٹرز ہی کر رہا ہوں کشمیریات میں۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔ آمنہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ جب پہلی بار اس سے ملا تھا تب وہ شاید ہسٹری میں ماسٹرز کر رہا تھا۔

”اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو؟ کیا میں شکل سے اسٹوڈنٹ نہیں لگتا؟ دراصل اس کا کریڈٹ ہماری پنجاب یونیورسٹی کو جاتا ہے۔ یونیورسٹی نے جو ایونگ پروگرام شروع کیے ہیں، اس کی بدولت آپ خود کو ہمیشہ اسٹوڈنٹ کہلا سکتے ہیں کیونکہ ایونگ پروگرامز میں داخلے کے لیے عمر کی کوئی حد نہیں رکھی گئی۔“

وہ اس کی حیرت دور کرتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں کا ریڈور سے نکل کر اپنے اپنے بیجز باہر کھڑے گاؤڑ کو دکھا رہے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ مین گیٹ کی جانب بڑھ گئے۔

”تم پہلے سے بہت بدل گئی ہو۔“ اس نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ آمنہ اب بھی خاموش رہی۔

”تم نے اب بھی اخبار پڑھنا شروع کیا یا نہیں؟ کیا ابھی تک اپنے دادو سے رٹنی رٹائی باتیں سن کر تقریریں کرتی رہتی ہو۔“ اس نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا۔ وہ پہلے بھی آمنہ کو تنگ کرنے کے لیے کہتا تھا کہ وہ نالائق لڑکی ہے جو اپنے دادو سے تقریر لکھواتی ہے۔

”اگر اب تم نے اخبار پڑھنا شروع کر دیا ہے تو یقیناً میرا نام تمہاری نظر سے گزرتا ہوگا۔“

میرے کالمز تو تم پڑھتی ہی ہوگی؟“

وہ پرزعم انداز سے کہہ رہا تھا۔ آمنہ نے ذرا کی ذرا اس کی جانب دیکھا۔

”میں عمراکبر کے نام سے کالم لکھتا ہوں۔“ ایک اور اطلاع دی گئی۔ آمنہ نے اس کے کچھ کالمز پڑھ رکھے تھے۔

”تمہیں میرے کالمز پسند تو آئے ہوں گے۔ اب تم تعریف کرو گی، مجھے سرا ہوگی پھر مجھ سے پوچھو گی کہ میں اتنا اچھا کیسے لکھ لیتا ہوں۔“ وہ اتراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”نہیں“ میں ایسا کچھ نہیں کہوں گی اور ایسا کوئی احقانہ سوال بھی نہیں پوچھوں گی کیونکہ میں تمہارے کالمز نہیں پڑھتی۔ میں نے تمہارا ایک آدھ کالم پڑھا تھا اور وہ مجھے بالکل پسند نہیں آیا تھا۔“ آمنہ نے صاف گوئی کی حد کر دی۔

”مانڈ مت کرنا مگر یہ حقیقت ہے کہ تم بہت بکواس لکھتے ہو۔“ اس کے چہرے پر کھسیانی سی مسکراہٹ آگئی جسے اس نے فوراً چھپالیا پھر ڈھٹائی سے بولا۔

”تم جیسے لوگ جو خود طریقے سے کچھ لکھ بھی نہیں پاتے، وہ اسی طرح دوسروں کے لکھے ہوئے پر تنقید کرتے ہیں۔“

”میں تنقید نہیں کر رہی، صرف حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ مثلاً وہ کالم جو تم نے پچھلے سال ”پندرہ اگست“ کے ٹائٹل سے لکھا تھا، وہ نہایت بکواس تھا۔“

آمنہ نے اسی کے انداز میں کہا۔ اسے وہ کالم بہت اچھی طرح سے یاد تھا کیونکہ اس نے اور دادو نے اس کالم پر کافی دل کھول کر تبصرہ کیا تھا۔

”اب مجھے نہیں یاد تم کس کالم کی بات کر رہی ہو، میں تو ہر ہفتے تین کالم لکھتا ہوں۔ بائی دادے تمہیں اتنا پرانا کالم کیسے یاد آیا؟“ وہ حیرت سے بولا۔ آمنہ کے چہرے پر استہزائی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تم نے اس کالم میں اس بات پر زور دیا تھا کہ دراصل پاکستان 14 نہیں 15 اگست کو آزاد ہوا تھا اور پاکستان کا یوم آزادی 15 اگست کو منایا جانا چاہیے۔“

آمنہ نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

”ہاں تو اس میں ”بکواس“ کیا ہے۔ یہ تو سراسر حقیقت پر مبنی بات ہے۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کیونکہ میرے پاس بہت سے ہسٹری کے پروفیسرز کے انٹرویو ہیں جو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ داراصل پاکستان چودہ اگست کو نہیں بلکہ.....

”ایک منٹ۔“ آمنہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

”مجھے تمہاری باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں کسی پروفیسر کی بات نہیں مانتی۔ میں

صرف یہ جانتی ہوں کہ پاکستان اسی تاریخ کو وجود میں آیا جس تاریخ کا ذکر کرتے ہی اس سرزمین کے بوڑھوں، بچوں اور جوانوں کے دل دلوے اور جوش سے گنگناٹے لگتے ہیں۔ تم ان کے دلوں میں جھانک کر دیکھو۔ وہ پندرہ نہیں، چودہ اگست کو جشن آزادی پاکستان منایا کرتے ہیں۔ تاریخ اہم نہیں ہوتی، دن اہم ہوتے ہیں عمرا!“

وہ رسائیت سے بات کر رہی تھی۔ حالانکہ اس دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ عمرایز دے کوئی بحث کرے۔

”واؤ..... یہ تم ہی ہونا آمنہ ابو بکر! یہ معجزہ کیسے ہو گیا۔ اب تم ایسی باتیں کیا کرتی ہو۔ میں نے تمہارے بارے میں سنا تھا کہ تم بہت بدل گئی ہو مگر مجھے یقین نہیں آیا تھا..... بھئی..... یہ کیا پلٹ کیسے؟“

وہ مصنوعی انداز میں تحیر کا اظہار کرتا آمنہ کو سخت برا لگ رہا تھا۔ آمنہ اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے آگے بڑھ کر مین گیٹ کے گارڈز کو شناختی بیج دکھنے لگی۔ اس کے بعد وسیع کار پارکنگ ایریا تھا جسے کراس کر کے آمنہ کو اپنی گاڑی تک پہنچنا تھا۔ عمرا بھی بھی اسی کے ساتھ چل رہا تھا۔

”اچھا مت بتاؤ، بس ایک آخری بات پوچھ لوں۔ اگر تم اجازت دو۔“ وہ ڈھیٹ بنا کہہ رہا تھا۔ اس کے انداز و اطوار آمنہ کو کسی قدر حیران کر رہے تھے۔

”تمہارا منگیتر کیسا ہے؟ وہی ٹیکساس کا شہزادہ..... جس کا حوالہ تم بار بار اپنی گفتگو میں دیا کرتی تھیں۔ وہ جو شاید انڈیا میں رہتا تھا اور اب جب یہ کانفرنس روم میں تمہارے سرسالی آئے بیٹھے ہیں تو تم منہ موڑ کر جا رہی ہو۔“

وہ کھلنڈرے پن سے بولا تھا۔ آمنہ نے گہری سانس بھری پھر جان چھڑانے کے لیے جلدی سے بولی۔

”وہ مرچکا ہے۔“ اس کے انداز میں اس قدر سکون تھا کہ عمرایز دے گھور کر اس کی طرف دیکھا کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہی مگر اس کے چہرے پر سنجیدگی ہی سنجیدگی تھی۔

”اوہ..... اس کا مطلب ویسکی خالی ہے۔“ وہ یکدم ہی سابقہ انداز میں بولنے لگا۔ آمنہ نے اب کی بار اسے گھور کر دیکھا مگر منہ سے کچھ کہنے کے بجائے وہ آگے کی طرف بڑھ گئی۔ عمرایز دے کا یہ روپ اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

”اچھا یار!“ آئی ایم سوری، ختم کرو اب۔ یہ بتاؤ، اس کانفرنس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، اچھی بات ہے نا۔ یہ برسوں کی جی برف ضرور پگھلنی چاہیے۔“ آمنہ کے انداز نے اسے شاید ذرا سا خائف کیا تھا۔

”سوال یہ نہیں ہے کہ برف پگھلنی چاہیے۔ سوال کہ ہے کہ کیا یہ پگھل سکتی ہے؟“ اس نے گہری سانس بھر کر کہا۔ عرایزہ کو اس جواب کی توقع نہیں تھی۔

”اور کم آن آمنہ! ایسی باتیں مت کرو جیسے میانوالی یا چیچہ وطنی کے کسی گاؤں کے چوپال میں بیٹھے اسی اسی سال کے بوڑھے کرتے ہیں۔ بی پرکینیکل یار! اس اے نیڈ آف آور۔“ (عملی بنو، یہ وقت کی ضرورت ہے۔)

وہ چڑھ کر بولا۔ آمنہ نے گہری سانس بھری، وہ اس کے سامنے جذباتی نہیں ہونا چاہتی تھی۔
”وہ دوستی کا پیغام لے کر آئے ہیں، ہمیں کم از کم اس پیغام کو سمجھنا چاہیے۔“
وہ اسی زبان میں بات کر رہا تھا جس میں کانفرنس روم میں بیٹھے ہوئے آمنہ کے باقی ساتھی متفق تھے۔

”یار!“ مجھے ایک بات بتاؤ، تمہیں کون بیسٹ ڈیپٹر کہتا ہے جبکہ تمہیں تو بولنا نہیں آتا۔“ وہ اس کی خاموشی سے اکتا کر بولا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، مجھے بولنا نہیں آتا۔“ اس نے سرد آہ بھرنے سے انداز میں کہا تھا۔ اس کے لہجے میں عجیب سی یاسیت اتر آئی۔

وہ اسلام آباد سے لاہور آئی تو دادو اسے دیکھ کر بے پناہ خوش ہوئے۔ جب انہیں کانفرنس کے متعلق پتا چلا تو وہ بہت پر جوش ہو گئے تھے۔ انہوں نے کئی ایک نکات پر آمنہ سے بحث کی تھی تاکہ وہ کانفرنس میں ان ہی خطوط پر بات کر سکے۔ انہیں پتا ہوتا کہ آمنہ اس طرح گلگ ہو کر سب سن کر آجائے گی تو شاید وہ اس پر بہت ناراض ہوتے۔

”فرض کر لیتے ہیں کہ تمہیں بولنا نہیں آتا اور چند لمحے کے لیے یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ مجھے سننا نہیں آتا۔ ہم دونوں گونگے بہرے ہیں۔ اب ہم دل ہی دل میں فرض کرتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے اشاروں کی زبان میں باتیں کر رہے ہیں اور پھر.....“

”شٹ اپ پلیز مسٹر عرایزہ!“ وہ اس کی بک بک سے تنگ آ کر بولی۔ اس کا دل پہلے ہی بوجھل ہو رہا تھا اور عمر کی بے معنی گفتگو اسے زچ کرنے کو کافی تھی۔

”میں شٹ اپ ہو جاتا ہوں مگر تم مجھے یہ بتادو کہ اس کانفرنس روم میں جو بھی باتیں ہو رہی ہیں، تم ان سے اتفاق کرتی ہو یا نہیں؟“ وہ بے شرمی اور ڈھٹائی کی انتہا کرتے ہوئے بولا۔

”میں ان سے بالکل اتفاق نہیں کرتی کیونکہ وہ سب بکواس ہے، جھوٹ ہیں۔ وہ جس دوستی کا پرچار کر رہے ہیں، وہ دوستی نہیں ہے۔ وہ ہماری آستینوں کے سانپ ہیں۔ وہ کبھی ہمیں ڈینگ مارنے سے باز نہیں آئیں گے۔“

آمنہ قدرے اونچی آواز میں بولی تھی۔ عمر نے ارد گرد دیکھا، وہاں ان کے علاوہ کوئی نہیں

تھا۔ سوائے گاڑیوں کی لمبی قطاروں کے جبکہ بائیں جانب جنگلا نما گیٹ تھا جس پر لگی روشنیاں ان دونوں کے چہرے کا احاطہ کر رہی تھیں۔

”ایسا لازمی نہیں ہے۔ اگر تم دماغ سے سوچو تو تمہیں احساس ہوگا کہ.....“
آمنہ نے یکدم عمر کی بات کاٹی۔

”دماغ کے فیصلے دل کی مشاورت سے طے ہونے چاہئیں جو تو میں دل و دماغ کی اس مشاورت کو ترک کر دیتی ہیں، اور ان کے دلوں پر قفل لگ جاتے ہیں۔ انہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ ہاتھ کا استعمال کس جگہ کرنا ہے اور زبان کا کس جگہ۔“

وہ چلا کر بولی تھی۔ اس کے منہ میں 1965ء سے کچھ عرصہ پہلے پیدا ہونے والے کسی شخص کی زبان تھی۔

”مجھے یہ بات میرے دادو نے تب کہی تھی جب میں فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی۔ انہیں میرے کتھک ڈانس کی کلاسز لینے پر اعتراض تھا۔ انہیں میرے انڈین گانے سننے پر اعتراض تھا اور مجھے ان کی باتیں سن کر لگتا تھا جیسے وہ پاگل ہیں، سٹھیا گئے ہیں۔ جیسے ان کے دل میں صرف نفرت ہی نفرت ہے مجھے ان کی باتیں سن سن کر الجھن ہوتی تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے احساس ہوتا گیا کہ پاگل وہ نہیں تھے، پاگل میں تھی جو ان کی باتوں کو سمجھ نہیں پاتی تھی۔“ اس نے لمحہ بھر رک کر سانس لیا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بھیکنے لگے تھے۔

”میرے دادو کے بڑے بھائی نے 1940ء میں ہندو مسلم فسادات میں اپنی جان گنوائی تھی پھر پاکستان بن گیا۔ میرے دادو نے ہجرت کے وقت اپنے ماں باپ کو اپنی آنکھوں سے دشت و بربریت کا نشانہ بننے دیکھا تھا۔ وہ جس بھائی کو اپنے ساتھ بچا کر لانے میں کامیاب ہوئے تھے، بعد میں وہی بھائی مشرقی پاکستان میں بمبئی ہاتھی کے ہاتھوں شہید ہوا تھا۔ میرے ابو کشمیر میں شہید ہوئے تھے۔ میں نے قاسم کو احمد آباد میں کھویا تھا۔“

وہ ایک بار پھر خاموش ہوئی اب کی بار آنسو اس کی آنکھوں سے اتر کر گالوں پہ پھسلنے لگے۔
”یہ باتیں تمہارے لیے اہم نہیں ہیں کیونکہ ایسی بہت سی باتیں تم بہت سے بوڑھوں کے منہ سے سن چکے ہو گے۔ اسی سال کا کوئی بوڑھا، ستر سال کی کوئی بوڑھی تمہیں ایسے کئی واقعات سناسکتی ہے۔ ان میں کوئی نیا پن نہیں ہے مگر کوئی ہم لوگوں سے پوچھے جن کے دل، دل نہیں رہے، کھر ٹھڑوں سے بھرے زخم بن چکے ہیں۔ ایسے حالات میں کوئی اٹھ کر جب ان آستینوں کے سانپوں سے دوستی کی باتیں کرتا ہے تو ہمارے یہ دل زار زار روتے ہیں“

اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ عمر کو ایسے حالات کی امید نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر اسی طرح روتی رہی پھر اپنے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

جیسے بھینس کے آگے مین بجانا۔ وہ خاموشی سے اپنی گاڑی کی جانب بڑھنے لگی۔ عمر ایزد نے ایسے پشت سے آواز دی تھی۔

”اے مس آمنہ ابوبکر!..... ذرا رکنا تو۔“

آمنہ کے قدم خود بخود رک گئے۔ وہ چند قدم بھر کر اس کے قریب آ گیا۔

”مجھے اس بات پر ہمیشہ حیرت ہوتی ہے کہ مسلمان ہو کر ہم لوگ اکیلے ہونے سے کیوں ڈرتے ہیں۔ حالانکہ ”ہم“ جانتے ہیں کہ ہم کبھی اکیلے نہیں ہوتے۔ تم بھی ایک عام سی مسلمان نکلیں آمنہ ابوبکر! تم نے بھی عام مسلمان کی طرح ”اکائی کی طاقت“ پر بھروسہ نہیں کیا نا۔ ”اکائی کی طاقت“ تو کائنات کی مالک ہے۔ خیر یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ یہ لو! اپنی آنکھیں صاف کرلو۔“

اس نے اپنی جینز کی ہپ پاکنٹ سے سفید رنگ کا ایک رومال نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ آمنہ کے ہاتھ میکا کی انداز میں رومال کی جانب بڑھے۔ عمر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اکائی کی طاقت“ وہ اپر سکرانی کرتی ہے۔ تم آزما کر تو دیکھو۔“

اس نے آسمان کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ آمنہ نے حیرت سے اس ”ولی“ کی جانب دیکھا۔ وہ واپس کانفرنس روم کی جانب چل دیا تھا۔ آمنہ وہیں کھڑی رہی۔ چند قدم چلنے کے بعد عمر نے دوبارہ سے آمنہ کی جانب مڑ کر دیکھا۔

”سنو..... کانفرنس روم میں واپس آنے سے پہلے چہرہ مت دھونا، آنسوؤں سے بھری تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت لگتی ہیں۔ قانتا راج پال کی ساری خوبصورتی تمہاری ان دو آنکھوں کے آگے بے بس دکھائی دینے لگے گی۔“

آمنہ پہلی بار اس کے فلتی انداز پر مسکرائی۔ وہ کانفرنس روم کی جانب بڑھتے ہوئے دوبارہ سے بہت بڑے جوش ہو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

کسی نے سچ کہا ہے یہ
محبت اور کہانی میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا
مگر میری محبت تو
کہانی ہی کہانی میں
کوئی راجہ نہ رانی ہے
نہ شہزادہ نہ شہزادی
محبت کی کہانی تو
مسافت ہی مسافت ہے

”تم یہ باتیں 1965ء میں شہید ہونے والے کسی فوجی کے سگوواران سے کر کے دیکھو۔ تم یہ مشورے 1971ء میں مکتی بانی کے ہاتھوں ذلت ناک موت پانے والے لوگوں کے سگوواران سے مانگو اور تم یہ باتیں کارگل میں شہید ہونے والے فوجیوں کے گھر والوں سے پوچھو یا پھر وہ لوگ جو سیاحین میں شہید ہوئے، اس کے علاوہ وہ لوگ جو ہر سال سرحد پر کراس فائرنگ میں شہید ہو جاتے ہیں۔ کبھی ان کے گھر والوں سے یہ باتیں کر کے دیکھو، تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا کہ میں اس ”دوستی“ کے بارے میں کیا سوچتی ہوں۔“

اس نے رک کر عمر کی جانب دیکھا جو لافلتی کے انداز میں چیونگ چہا رہا تھا۔

”میں یہ نہیں کہتی کہ مذاکرات نہیں ہونے چاہئیں یا دوستی کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں مگر جوہ لوگ دوست بن کر آئے ہیں، انہیں دوستوں کی طرح ہی ٹریٹ کرو۔ انہیں فرشتہ سمجھ کر کندھوں پر مت بٹھاؤ، اس ”نام نہاد دوستی“ میں چھپے اصلی راز کی تہہ تک پہنچنا ضروری ہے جو ہم میں سے کوئی بھی نہیں کر رہا بلکہ ہم خوشی سے پاگل ہو رہے ہیں۔ وہ صرف ہاتھ ملاتے ہیں اور ہم بغل گیر ہونے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ ان الٹوز پر بات نہیں کرتے جو ہمارے فائدے کے ہیں مگر جو بات ان کو فائدہ دے رہی ہے، وہ بار بار گھما پھرا کر اسی ایٹو کو ڈسکس کرنے لگتے ہیں۔“

اس نے توقف کر کے سانس لیا اور عمر شاید اسی موقع کے انتظار میں تھا۔ وہ تالیاں بجانے لگا۔

”یار! تم جھوٹ بول رہی تھیں کہ تم بولنا نہیں جانتیں۔ تم تو بہت اچھا بولتی ہو۔ لوگ اگر تمہیں بیسٹ ڈیٹر کہتے ہیں تو یقیناً ٹھیک کہتے ہیں۔“

اس کے چہرے اور آنکھوں میں عجیب سی شرارتی مسکراہٹ تھی۔

”مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ تم کانفرنس روم میں خاموش کیوں بیٹھی رہیں۔ کسی بات پر تو اختلاف کرتیں نا تاکہ ہمیں بھی احساس ہوتا کہ ہم میں بھی ایک ”زندہ“ انسان موجود ہے۔“

عمر کا لہجہ پہلی بار سنجیدہ ہوا تھا۔

”میں کیا بولتی عمر ایزد! میں اکیلی ہوں۔ وہاں میرا ساتھ دینے کو ایک بھی شخص موجود نہیں۔ میرے انچاس کے انچاس ساتھی میرا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھے میں اکیلی کیا بولتی۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”لو جی..... تم اس لیے خاموش تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ تم شریعتی قانتا راج پال کی انگریزی سے خائف ہو۔ باپ رے، وہ بہت روانی سے انگریزی بولتی ہے۔“

عمر ایزد کے چہرے سے سنجیدگی بالکل غائب ہو چکی تھی۔ آمنہ نے تاسف سے اس کی جانب دیکھا۔ اے لگا وہ صحیح باتیں ایک غلط شخص کے سامنے کر بیٹھی تھی۔ عمر ایزد سے یہ باتیں کرنا ایسے ہی تھا

محبت کی مسافت اور

ضرورت کی مسافت میں

مسافر واپسی کے سارے امکاں پاس رکھتا ہے

محبت کی مسافت میں

مسافر کے پلٹنے کا کوئی رستہ نہیں ہوتا

وہ ساری کشتیاں اپنی

جلا دیتے ہیں ساحل پر

کہ تا اُمید ہونے پر

پلٹنا بھی اگر چاہیں

تو واپس جا نہیں پائیں

وہیں غرقاب ہو جائیں

”برصغیر کی تقسیم ہی غلط تھی۔“

کانفرنس روم میں گونجنے والی یہ آواز آمنہ ابوبکر کی تھی۔ اسے بہت دیر خاموش رہنے کے بعد بولنے کا موقع ملا تھا اور وہ اس موقع کا پورا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

”اکائی کی طاقت دنیا پر حکمرانی کرتی ہے، تم آزما کر تو دیکھو۔“

عمر ایزد کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور اس کی آنکھیں آمنہ کو ”کیری آن“ کا سٹنل دینے لگی تھیں۔ اس نے بھی قاتنا راج پال کی طرح بالوں میں ہاتھ چلایا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

”برصغیر کی تقسیم ہی غلط تھی کیونکہ تقسیم کرنا تو ایک چیز کو دو برابر حصوں میں بانٹنا ہوتا ہے جبکہ برصغیر کی تقسیم تو ہم سب کے سامنے ہے۔ اس تقسیم میں برابری کے کسی اصول کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا تھا، اس لیے اصولاً یہ تقسیم غلط ہے۔“

وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور پھر سامنے دیکھا۔ اسے سامنے والی رو میں بیٹھے لوگوں کے چہرے پر تجسس نظر آیا۔ وہ سننا چاہتے تھے کہ آمنہ مزید کیا کہتی ہے۔

”یہ تقسیم درست ہو سکتی تھی، اگر کانگریس حقیقتاً بڑے بھائی کا فرض ادا کرتے ہوئے پاکستان کے حصول کو ہندوستان کے ساتھ ملحق کرنے کی سازش نہ کرتی مگر خیر اب تو جو ہوتا تھا، ہو چکا۔ ان پرانی باتوں کو یاد رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اب فائدہ کس بات میں ہے۔ میں آپ لوگوں کی بات سے اتفاق کرتی ہوں کہ برصغیر کی تقسیم سے ہمارا زیادہ نقصان ہوا کیونکہ نقصان ہمیشہ اس کا زیادہ ہوتا ہے جس کے ساتھ دھاندلی اور بے ایمانی ہوتی ہے۔“

اس نے پھر توقف کیا۔ سامنے کی رو میں بیٹھے لوگوں کا پہلو بدلنا اس سے مخفی نہیں رہا تھا جبکہ

اس کے پیچھے بیٹھی مدیحہ اقتدار کا ہاتھ اس کے کندھے پر آٹکا تھا۔ اس نے بہت نرمی سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔ سمیرہ سہگل کے ہونٹوں پر رکھی انگلی کو نظر انداز کیا اور مصطفیٰ کمال تارڑ کی آنکھوں میں چھپی سرزنش کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے عمر کی جانب دیکھا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں ”v“ کا نشان بنا رہی تھیں۔

عمر ایزد کے بائیں جانب بلال اطہر بیٹھا تھا جس کے چہرے پر بے پناہ دلچسپی تھی۔ ایمان گل بھی پر تجسس نظروں سے آمنہ کی جانب دیکھ رہی تھی۔ آمنہ نے اپنے اندر توانائی کی ایک سرورگن لہر اترتی محسوس کی۔ وہ اکیلی کب تھی، اس کے ساتھ اس کے اپنے تھے جو اسے حوصلہ دے رہے تھے۔

”آپ لوگ حقیقتاً ایک عالی ظرف قوم ہیں جو ہمسایہ ممالک کو ساتھ لے کر آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتی ہے اور کبھی کبھی آپ اتنا آگے بڑھ جاتے ہیں کہ آپ کی خود سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ واپس کیسے جائیں گے چونکہ کشمیر کی بات کرنا فی الحال آپ کو پسند نہیں، اس لیے پہلے ہم بنگلہ دیش کی بات کریں گے۔ آپ نے پاکستان کے وجود کو کبھی تسلیم نہیں کیا اور اس تقسیم کو ہمیشہ غلط قرار دیا مگر جب بنگلہ دیش قائم ہوا تو آپ نے نہ صرف اس تقسیم کو جائز قرار دیا بلکہ آپ بنگلہ دیش کے وجود کو تسلیم کرنے والے چند پہلے ممالک میں سے ایک تھے۔“

میں یہ نہیں کہہ رہی کہ یہ دوغلا پن ہے، یہ تو آپ کی خارجہ پالیسی ہے۔ اب آپ کی خارجہ پالیسی دوغلی ہے یا نہیں، یہ تو آپ کو ہی پتا ہوگا۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ بہت عالی ظرف لوگ ہیں۔

آپ نے کتنی بھنی بنا کر ہمسایہ ملک کا کتنا ساتھ دیا۔ آپ کے اس ساتھ دینے سے ہمارے یہاں کتنے باپوں نے اپنی جوان اولادوں کو دفنایا۔ آپ کو اس امر سے کوئی دلچسپی نہیں اور آپ کو دلچسپی ہونی بھی نہیں چاہیے کیونکہ کچھ معاملات میں ”چشم پوشی“ ہی بہتر رویہ ہوتی ہے۔

آپ سب لوگ بھارت سے آئے ہیں بھارت، پاکستان کے لیے بڑے بھائی کا درجہ رکھتا ہے اور بڑے بھائی اکثر معاملات میں اس طرح کی ”چشم پوشی“ کر ہی جاتے ہیں مگر ہم لوگ چشم پوش ہیں نہ ہی اعلا ظرف۔ ہم لوگ آپ لوگوں جیسا رویہ اپنا ہی نہیں سکتے، اس لیے بنگلہ دیش کے قیام کے وقت ہم نے اپنے زخموں کو خود ہی سہلا لیا تھا اور ان پر خود ہی مرہم لگا کر مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش کے روپ میں تسلیم کر لیا تھا۔ ہم اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہوئے مگر آپ کی طرح وسعت نظری کا ثبوت نہ دے پائے۔ ہم نے بنگلہ دیش کے اندرونی معاملات میں دوبارہ دخل دینے کی کوشش نہیں کی۔“

اس نے رک کر سانس لیا تو بہت سے لوگوں نے بھی گہری سانسیں لیئیں۔

”مس آمنہ.....! یو آر کوائٹ روئنگ اینڈ کین.....“

(مس آمنہ! آپ بالکل غلط کہہ رہی ہیں۔ میں.....) سورج گپتا نے لمحہ بھر کی خاموشی سے

فائدہ اٹھانا چاہا مگر سیرہ سہگل نے اس کی بات کاٹ دی۔

”ہم نے بھی آپ کی ساری باتیں خاموشی سے سنی تھیں مسٹر سورج گپتا۔ اب آپ کی باری ہے۔“

آمنہ نے خفیف سے خیر میں گھر کر سیرہ سہگل کی جانب دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر رکھی انگلی غائب ہو چکی تھی۔

”سیرہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ رابعہ اشفاق بولی جو سیرہ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی تھی، آمنہ کھل کر مسکرائی۔

”اکائی کی طاقت دنیا پر حکمرانی کرتی ہے۔ تم آزما کر دیکھو“

آمنہ کی سماعتوں میں سرگوشی ہوئی اور اس کے چہرے کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

”میں آمنہ سے اتفاق کرتا ہوں۔ آپ لوگ سچ مچ بہت اچھے چشم پوش ہیں، آپ لوگ ہمارے خیر خواہ ہیں مگر جن معاملات میں کبھی ہمیں آپ کی ضرورت پڑی، آپ نے چشم پوشی کا رویہ اختیار کیا۔“

عثمان علی نے کرسی کی بیک سے کمر نکاتے ہوئے بہت بیٹھے لہجے میں کہا۔ وہ سب اسی لہجے میں بات کر رہے تھے۔ سب کی یہی کوشش تھی کہ لہجہ بھی تلخ نہ ہو اور دل کی بھڑاس بھی نکل جائے۔

”تم غلط کہہ رہے ہو عثمان!“ عمر ایز نے حاضرین کی جانب دیکھ کر گفتگو کا آغاز کیا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ان لوگوں نے اکثر معاملات میں ہماری مدد بھی کی ہے۔ ایٹمی دھماکے اس کی روشن مثال ہیں۔ یہ لوگ دھماکے کرنے میں پہلے نہ کرتے تو ہماری کیا مجال تھی کہ ہم اپنی ایٹمی ٹیکنالوجی دنیا کے سامنے لاتے، اس لیے اس کامیابی کا کریڈٹ انہیں ملنا چاہیے۔

”ہماری کامیابی کا کریڈٹ آپ لوگوں کو جاتا ہے اور آپ کی کامیابی کا کریڈٹ ہمیں ملنا چاہیے۔ آپ کی اتنی طاقتور معشیت کا تھوڑا سا بوجھ تو ہمارے نازک کندھوں پر بھی ہے۔ آپ اپنی طاقتور معشیت کو مزید طاقتور بنانے کے لیے دوڑ دوڑ کر اس طرف آتے ہیں مگر آپ جب بھی آتے ہیں، صرف معیشت کی بات کیوں کرتے ہیں۔ آپ اپنی رنگین ثقافت کو ہی میٹنگ ایجنڈا کیوں بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ صرف اپنے فنکاروں، گلوکاروں اور کھلاڑیوں کو ہی یہاں بھیجنے میں دلچسپی کیوں لیتے ہیں، جبکہ ہمارے یہاں سے صنعتکار، کمپیوٹر انجینئرز، ڈاکٹرز، اکائمسٹ اور انویسٹرز ہی کو اپنے یہاں بلوانے پر کیوں اصرار کرتے ہیں۔ آپ حقیقتاً ہماری اکانومی کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں تو پھر اپنے یہاں سے بھی لوگوں کو یہاں کیوں نہیں بھیجتے۔“

عثمان علی اکناکس کا اسٹوڈنٹ تھا، اس کی دلچسپی اس موضوع میں تھی۔

”ہمیں اگر آپ کی معیشت کے استحکام میں دلچسپی نہ ہوتی تو ہم اپنی اٹھارہ ہزار کی موٹر بائیک آپ کو پندرہ ہزار میں بیچنے پر کیوں تیار ہوتے؟ ہمیں اگر آپ کی پروا نہ ہوتی تو ہم آپ کے بچوں کی اپنے ہاسٹلو میں مفت سرجری کیوں کرتے؟ ہم آپ کے لوکل فنکاروں اور گلوکاروں کو اپنے انٹرنیشنل لیول کے چینلوں پر کوریج کیوں دیتے؟“

قائما راج پال نے پیشانی پر آئی نمی کو غیر محسوس طریقے سے صاف کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔

”یہ تو ایک عام فہم سی بات ہے۔ بھلا آپ.....“ آمنہ نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ عثمان نے پھر اس کی بات کاٹی۔

”آمنہ! پہلے مجھے ایک بات کلئیر کرنے دو، میں آپ کی توجہ ایک اہم ایٹھ کی طرف دلانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ آپ اپنی اٹھارہ ہزار کی بائیک ہمیں پندرہ ہزار میں بیچ کر بھی نقصان میں نہیں رہیں گے، کیونکہ پاکستانی پندرہ ہزار روپے تقریباً انڈین اٹھارہ انیس ہزار روپے کے لگ بھگ ہی بن جاتے ہیں۔ کرنسی ریٹ سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ قطعاً گھائٹے کا سودا نہیں ہے۔“

عثمان اپنی عینک کو ناک پہ جماتے ہوئے سابقہ انداز میں بولا۔

”جہاں تک اپنے ہاسٹلو میں بچوں کے مفت علاج کی بات ہے تو وہ دوسرے لوگوں کے لیے صرف ایک پبلیٹی پروگرام تھا تاکہ وہ اپنے بیمار بچوں کو آپ کے کارڈیک سرجری کے وارڈز میں علاج کی غرض سے لائیکیں کیونکہ دل کے امراض کا بہترین علاج آپ کے یہاں ہوتا ہے مگر ہمارے یہاں بھی کینسر کا بہترین علاج ہوتا ہے مگر آپ اپنے مریضوں کو پاکستان کی سر زمین پر علاج کی غرض سے بھیجنا بھی پسند نہیں کرتے بلکہ امریکہ اور یورپ، اسرائیل اور روس بھجوانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے اور ہم سے آپ یہ توقع کرتے ہیں کہ ہم مہنگی مہنگی میڈیکل ٹرینمنٹس کے لیے اپنے مریضوں کو انڈیا بھجواتے رہیں۔ آپ یہ لاجب بھی پیش کرتے ہیں کہ جب ہمسایہ ملک میں بہترین سہولیات میسر ہیں تو پھر امریکہ یا یورپ جاکر خوار ہونے کا فائدہ۔ آپ کو نہیں لگتا کہ کسی بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی کے ساتھ ایسی دورخی پالیسی نہیں اپنانی چاہیے۔

آمنہ کی ہر دلیل اس کے ساتھیوں کو دل ہی دل میں واہ واہ کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ان کے سامنے والی والی رو میں بیٹھے لوگ بھی خود کو بے بس محسوس کر رہے تھے۔

اب کی بار وہ بولنا چاہتے تھے مگر چونکہ ان کی بات خاموشی سے سنی گئی تھی، اس لیے وہ مجبور تھے کہ سب باتیں خاموشی سے سنیں۔

”آپ ہمارے فنکاروں اور گلوکاروں کو کوریج دے رہے ہیں تو یہ بھی پی آر بڑھانے کا

ایک طریقہ ہے۔ آپ چیلٹی کے لیے یہ سب کر رہے ہیں۔ یہ بھی آپ کی میڈیا وار کا ایک حصہ ہے۔ آپ ہمارے لوکل فنکاروں کو اتنا بڑھا چڑھا کر اسے لیے پیش کر رہے ہیں تاکہ دنیا بھر کو بتائیں کہ آپ بہت عظیم لوگ ہیں اور آپ دوسرے ممالک سے دوستی کرنے کے خواہاں ہیں۔ آپ کو ہم سے غرض نہیں مگر آپ یورپی اور امریکی اقوام کے منہ سے ”واہ واہ“ ضرور سننا چاہتے ہیں۔“ آمنہ کہنے لگی۔

”آپ لوگوں نے خارجہ پالیسی پر بحث شروع کر دی ہے۔“ ریتو ورنے ماحول کی تنقید کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ہمارا قصور نہیں ہے کہ ہماری گفتگو میں بار بار خارجہ پالیسی کا ذکر آ جاتا ہے۔ یہ ہمارے تعلقات کی ڈیمائڈ ہے۔ ہم خارجہ پالیسی کی وجہ سے ہی آج اس طرح ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہیں۔ تو ہماری گفتگو میں بار بار اس خارجہ پالیسی کا ذکر آئے گا۔“

بلال اطہر گویا تڑپ کر بولا۔ اس نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

”آئی ایم سوری۔ آپ کو شاید برا لگا مگر ہمارا یہ.....“ قانتا راج پال نے معذرت کی جبکہ آمنہ نے اس کی بات کاٹی۔

”میں آپ کی بات کاٹنے کے لیے معذرت خواہ ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمیں یہ سب برا نہیں لگتا مگر آپ جس انداز سے یہ سب باتیں جتانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ ہمیں اچھی نہیں لگتی۔ آپ نے ابھی میڈیا کا حوالہ دیا اور یہ کہا کہ میڈیا ناکارہ ہو چکا ہے اور آپ کا میڈیا ہماری رگوں میں اترا ہوا ہے۔ آپ نے کلچر کا حوالہ دیا اور کہا۔ انڈین کلچر اب انڈیا سے زیادہ پاکستان میں نظر آتا ہے۔ آپ کی ان دونوں باتوں سے میں مکمل طور پر اتفاق نہیں کرتی مگر پھر بھی ایک بات تسلیم کرتی ہوں کہ ان دونوں باتوں میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔ آپ کا میڈیا حدود قیود سے آزاد جس قسم کی سوسائٹی کو پیش کرتا ہے، وہ پاکستانی ہی نہیں، انڈین قوم کو بھی گھیر رہی ہے۔ برائی میں لذت ہے اور مدہوشی میں سکون۔ آپ کا ہر چیلنل یہی سب دکھا رہا ہے اور لوگ یہی سب دیکھ رہے ہیں۔ آپ جن چیلنلز کو گھریلو چیلنل کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ وہاں ایسا گھریلو ماحول دکھایا جاتا ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ شاید وہ جنت میں آ گیا ہے۔ بڑے بڑے گھر، زرق برق کپڑوں میں ملبوس انسان۔ آپ ایسا ماحول پیش کرتے ہیں کہ انسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ دنیا میں غریبی نام کی کوئی چیز نہیں، کسی ملازم نما انسان کو بھی مسئلہ درپیش ہوگا تو وہ سیکڑوں، ہزاروں کا نہیں بلکہ لاکھوں کا ہوگا۔ انسان فیئیلیٹی میں رہنا پسند کرتا ہے اور آپ اسے فیئیلیٹی فراہم کر رہے ہیں۔ اور یہ قوم کے لیے تباہ کن ہے۔

مجھے آپ لوگوں کے ایک مشہور چیلنل پر کچھ پروگرامز دیکھنے کا اتفاق ہوا اور ان پروگرامز کو دیکھ کر کہیں سے یہ محسوس نہیں ہوا کہ انڈیا آبادی کے لحاظ سے بڑا ملک ہے اور یہاں کے لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ غریبی اور بھوک ہے۔ مگر ان پروگرام کو دیکھ کر تو یہ احساس ہوتا ہے جیسے ”نا جائز اولاد“

ہندوستانی قوم کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔“

اس کی بات پر کئی چروں پر دھیمی مسکراہٹ آئی تھی۔

”یہ بات تو خیر برسہیل تذکرہ آگئی۔ میں آمنہ کی بات کو آگے بڑھانا چاہتا تھا کہ آپ دھیرے دھیرے اپنی ہی نہیں، ہماری قوم کو بھی ٹرینکولائزڈ کا عادی بنا رہے ہیں۔ ٹائن لیون والے واقعہ کے بعد کسی ”امریکن اسکالر“ نے کہا تھا کہ وہ لوگ جو دوسروں کو سلا پوائزن دے کر تباہ کر رہے ہیں، ان کا انجام بدترین ہوگا۔ ان کا اشارہ افغانستان کی جانب تھا، جہاں پوسٹ کی کاشت ہوتی ہے اور اس کے علاوہ وہ دہشت گردی کی بھی بات کر رہے تھے۔ اب ان امریکن اسکالر کی بات ذہن میں آتی ہے تو ساتھ ہی آپ کی اس میڈیا وار کا خیال آ جاتا ہے۔“

عثمان نے عجیب سی بات کی تھی مگر ساحرکار تڑپ اٹھا اور تڑپنے والی بات بھی تھی۔ یہ تو ڈائریکٹ ان کے میڈیا کو بدنام کرنے والی بات تھی۔ ”آپ لوگ ہمارے میڈیا پر اس طرح تنقید نہیں کر سکتے کیونکہ آپ خود جانتے ہیں پورے پاکستان میں ہمارے ہٹ فنکار آپ کے قومی چیمپل پر بھی اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آپ کی ساری قوم ہمارے فلمی ہیروز کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔“

”آپ کی بات اپنی جگہ درست ہے مگر ہم بھی کیا کریں۔ جب آپ اپنے چیمپلز پر دوسروں سے داد سمیٹنے کے لیے ہمارے فنکاروں کو دکھائیں گے تو ہمیں بھی مجبوراً آپ کے فنکاروں کو اپنے ٹی وی چیمپلز پر پیش کرنا پڑے گا اور پھر جہاں تک فلمی ہیروز کو دیکھ کر خوش ہونے کی بات ہے تو ہم لوگ کارٹونز دیکھ کر بھی بہت خوش ہوتے ہیں۔“

ساحرکار کے خاموش ہونے پر عمر ایزد بولا تھا۔ ماحول میں تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

”سن 80ء میں ہمارا میڈیا بھی پاور فل تھا۔ ہمارا میوزک، ہمارے ٹی وی ڈرامے آپ لوگوں کے یہاں نہایت ذوق و شوق سے دیکھے جاتے تھے مگر ہم کتنا ریٹائمنڈ کلچر پیش کرتے تھے کہ ہمارے بہت سے مشہور پروگرامز اپنے چیمپلز پر آپ بغیر اجازت آج کل بھی پیش کرتے رہتے ہیں مگر ہم لوگوں نے کبھی آپ پر نہیں جتایا۔ آپ نے کہا کہ ہمارے یہاں بہت سی خواتین آپ کے یہاں کی خواتین سے متاثر ہو کر ساڑھی باندھتی ہیں اور ہم آپ کے کلچر کی نقل کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں ممالک کے کلچر میں تو فرق ہے مگر دونوں کلچرز پر ایک دوسرے کی چھاپ لگی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم آپ کے کلچر کی نقل کرتے ہیں، اس طرح تو آپ لوگوں کے یہاں بھی شلوار قمیض شوق سے پہنا جاتا ہے۔ آپ کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کی چیئر پرسن کی بیٹی اکثر اوقات شلوار قمیض میں ملبوس نظر آتی ہیں تو کیا ہم کہہ دیں کہ ہمارا کلچر آپ کے ایوان تک پہنچ چکا ہے۔“

آمنہ کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ ایک کے بعد ایک دلیل دینے لگی۔

”ہمیں آپ لوگوں کی ایسی باتوں سے یہ الجھن ہوتی ہے۔ ہم جب بھی آپ کی طرف

دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں تو آپ عجیب و غریب اختلافات کا ذکر شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کشمیر کی بات شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ آپ کو سمجھنا چاہیے کہ جب مشرقی پاکستان آپ کا حصہ ہو کر آپ کے ساتھ نہیں رہ پایا تو کشمیر آپ کے ساتھ کیسے رہ سکے گا۔“

تارا اور ماجو رتو درما کی بہن تھی، نہایت تلخی سے بولی۔ اس کے ساتھیوں کے چہروں پر سکون اتر آیا۔ تارا درما کے اس ”چو کے“ پر اس کے ساتھی داد دیے والی نظروں سے اس ایک جانب دیکھنے لگے۔

”آپ اس بات کی فکر مت کیجئے۔ جب کشمیر ہمارا ہوگا تو یہ ہمارا بھی اندرونی معاملہ ہوگا۔ ویسے بھی کشمیر ہماری شہ رگ ہے تو شہ رگ کو دل کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔“

مدیحہ افتدار نے جذباتی انداز میں کہا مگر عمر ایزد نے اسے خاموش کر دیا پھر گہری سانس بھر کر بولا۔

”آپ اس بات کی حقیقتاً فکر مت کیجئے۔ یہ فکر کشمیریوں کو کرنے دیجئے۔ انہیں استصواب رائے کا حق دیجئے، وہ خود ہی فیصلہ کر لیں گے اور یہ ہم برسوں سے کہتے آ رہے ہیں کہ کشمیری بھائیوں کو ان کی مرضی سے فیصلہ کرنے دیجئے۔“

”میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اگر آپ کشمیر میں مکتی بانی کی سوتیلی بہن انڈین آرمی کی ناجائز سرگرمیوں کو روک دیں تو کشمیریوں اور کشمیر کے مسائل حل ہو جائیں گے، انشاء اللہ۔“

تسکین ظفر نے بھی اپنی پہلی انٹری دی جبکہ ان کی طرف سے قاننا بولنا شروع ہوئی۔

”ہم دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں ہمیشہ پہل کرتے ہیں مگر آپ ہمارا ہاتھ جھٹک کر اس طرح کی بات کیوں شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کا واحد مسئلہ کشمیر ہی تو نہیں ہے۔ آپ مسائل کے انبار تلے دبے ہیں مگر آپ کو احساس ہی نہیں ہے۔ آپ اپنی معیشت کو مستحکم کرنے کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔ آپ عام لوگوں کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے جو امن و آشتی اور محبت سے رہنا چاہتے ہیں۔ آپ اپنی فلم انڈسٹری کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے جو زیوں حالی کا شکار ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ آپ نے ہمیشہ ہمارے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹکا ہے۔“

”تاریخ کے اوراق اس بات کی بھی گواہی دیں گے کہ ہم نے بہت بار آپ کو آزمانے کے بعد یہ پالیسی اپنائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے جب بھی آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا، آپ نے اسے قبول نہیں کیا بلکہ آپ نے ہماری دوستی کی کسی بھی آفر کو اہمیت نہیں دی، اس کے برعکس آپ نے جب ہاتھ بڑھایا، ہم نے نہ صرف اپنا ہاتھ آگے کیا بلکہ پورے خلوص سے اس دوستی کو مضبوط کرنا چاہا مگر آپ نے کیا کیا..... آپ نے ہمارا ہاتھ نہیں جھٹکا مگر اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا اور ہمارا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا، اسی لیے اب ہم محتاط ہو گئے ہیں۔ ہمیں ڈر لگتا ہے کہ ہم اس ”لٹکنے والے مشغلے سے بچک آچکے ہیں اور پھر آپ کی ترجیحات بھی ہمیشہ الارم بجاتی رہتی ہے۔ آپ ہماری معیشت پر اتنا زور

دیتے ہیں کہ ہمیں محتاط ہونا پڑتا ہے۔ آپ یہاں اس غرض سے آئے ہیں کہ اپنے اپنے بزنس کو بڑھا سکیں، اسی لیے آپ نے بہت غور و فکر خوض کے بعد ان چیزوں کا انتخاب کیا ہے جو حقیقتاً صرف آپ کو فائدہ دیں گی۔ یہ تو نرا گھٹائے کا سودا ہے، اسی لیے ہم بار بار آپ کی ترجیحات سے ہٹ کر اپنی ترجیحات کی بات کرتے ہیں۔“

آمنہ نے طویل مکالمے کے بعد سانس لیا۔ اس کے ساتھی اس کے لیے میز بجا کر داد دے رہے تھے۔ اسے اب کوئی گٹھن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بلال نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اب وہ بولنا چاہتا تھا۔

”ساری دنیا جانتی ہے کہ آپ کا فوکس آف انٹرسٹ صرف ”پاکستانی منڈی اور کاروبار کے مواقع“ ہے۔ کیا یہ بڑے بھائیوں والا رویہ ہے؟ کیا بڑے بھائی اس طرح سے چھوٹے بھائیوں کو استحصال کیا کرتے ہیں؟ آپ ہماری معیشت کو کمزور کرنا چاہتے ہیں کیونکہ آپ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ کسی ملک کو کمزور کرنا ہو تو پہلا حملہ اس کی معیشت پر کرنا چاہیے۔“

بلال اطہر کی بات پر ایک بار پھر تالیاں بج اٹھیں مگر یہ تالیاں صرف اس کے ساتھی بجا رہے تھے۔ ہمسایہ ملک سے آیا ہوا پچاس اسٹوڈنٹس کا وہ دستہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ کچ کی تلخی نے ان کے حلق کو کزوا کر دیا تھا۔

”ہم جانتے ہیں یہ پچاس برس کی شکایتیں ہیں جو اتنی آسانی سے دور نہیں ہوں گی۔ ہمیں اعتماد کی فضا قائم کرنی پڑے گی۔ ایک دوسرے کا ساتھ دینا ہوگا۔ اس بار ہم یہاں آئے ہیں، اگلی بار آپ آئیے گا۔ یہ آنا جانا ہوتا رہے گا تو سب شکایتیں دور ہوتی رہیں گی۔“

قاننا راج پال نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس ساری بحث سے کافی اکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کی تھکی تھکی سی بات پر بہت پر جوش تالیاں بجی تھیں۔

”ہم بھی آپ کے ساتھ خواہ مخواہ کی دشمنی کو طول نہیں دینا چاہتے۔ ہم بھی اچھے ہمسایوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں۔ ہم بھی آپ سے دوستی کے خواہاں ہیں مگر یہ دوستی صرف آپ کی ترجیحات کی بنیاد پر نہیں ہو سکتی، ہماری ترجیحات ہمارے لیے مقدم ہیں۔“

آمنہ نے کہا اور اس بار دونوں طرف سے اسے داد دی گئی تھی۔ حالانکہ تقریباً سب لوگ جانتے تھے کہ یہ اتنی جلدی ممکن نہیں ہے۔

”ہندوستان اور پاکستان کا تعلق اس دھاگے کی مانند ہے جو ٹوٹ جائے تو اسے گرہ لگا کر جوڑ لیا جاتا ہے مگر اس گرہ کی جھین اور تلخی ساری زندگی نہیں جاتی۔“

آمنہ کو داد کوئی گئی، بات ایک دفعہ پھر یاد آئی۔ اسے ان کی بات سے اتفاق تھا۔

دور ریفریٹمنٹ کے لیے مہمانوں کو بلوایا جانے لگا۔ سب لوگ دھیرے دھیرے اپنی جگہ سے اٹھ کر ہال کی جانب جانے لگے۔

بہت طاقتور ہے اور طاقت ہمیشہ فتح حاصل کرتی ہے۔“

”ارے چھوڑو یار! میں اکائی کی طاقت کے علاوہ کسی طاقت پر یقین نہیں رکھتا۔“ ان کے میڈیا کے غبارے سے تو تب ہی ہوا نکل گئی تھی جب بی جے پی کو ایکشن میں شکست ہوئی۔ حالانکہ میڈیا نے سارا زور ایک ”جناب واجپائی“ کو جتوانے کے لیے لگایا ہوا تھا۔“

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا پھر آمنہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

”اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں۔“ اس کا اندازہ کچھ مختلط تھا۔ آمنہ نے مسکرا کر اسے گویا اجازت دی تھی۔

”تم ایسی نہیں تھیں بلکہ بہت مختلف تھیں۔ تم نے بتایا کہ تمہارا منگیتھر مرچکا ہے۔ مجھے ایمان نے ابھی بتایا کہ وہ احمد آباد میں رہتا تھا اور کسی کیس میں بے ایمانی سے پھنسا لیا گیا تھا اور پھر وہیں جیل میں یا پھر شاید حراست میں اسے قتل کر دیا گیا۔“

وہ مختلط سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ آمنہ کو اس کا سوال سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ نجانے کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ اس ایک حادثے نے تمہیں یکسر تبدیل کر ڈالا۔ یعنی اگر یہ حادثہ نہ ہوتا تو تم ویسی ہی آمنہ ابکھر رہتیں جو مجھے پہلی بار سری لنکا میں ملی تھی اور جو نظریہ وطنیت کو ڈھکوسلہ اور فرسودہ کہانی کہتی تھی۔“

وہ بہت صاف گوئی سے کہہ رہا تھا۔ آمنہ نے گہری سانس بھری۔ وہ صحیح تو کہہ رہا تھا۔ ”ہاں“ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں نے قاسم کو کھونے کے بعد حقیقت کو سمجھا تھا، ورنہ اس سے پہلے تو مجھے ایسی باتوں کا احساس ہی نہیں تھا۔“ اس نے بہت آرام سے اعتراف کر لیا۔ عمر نے گہری سانس بھری۔

”اب ساری قوم تو اپنا اپنا ”قاسم“ نہیں گنوا سکتی تا کہ تم جیسی بن جائے اور تم جیسی سوچ اپنالے۔“

اس نے تلخی سے کہا جبکہ آمنہ کو اس کے منہ سے یہ سن کر حیرت کا جھٹکا لگا۔ ”نہیں عمر! تم ایسے مت کہو۔ یہاں لاکھوں کروڑوں افراد ایسے ہیں جنہوں نے 1947ء میں اپنے اپنے قاسم گنوادے تھے اور تب سے لے کر اب تک وہ صراط مستقیم پر چل رہے ہیں۔ تم یہ مت کہو کیونکہ یہاں صرف آمنہ ابکھر جیسی لڑکیاں نہیں ہیں جو غلطی کر کے سدھر جاتی ہیں۔ یہاں اس قوم میں بہت اچھی اچھی لڑکیاں بھی ہیں جو غلطیاں کیے بغیر بھی سیدھی راہ پر چل رہی ہیں۔ تم اس ملک کے خواص پر مت جاؤ، یہاں کے عوام کو دیکھو جو بے حد محبت وطن ہیں۔ یہ جو ہم جیسے لوگ ہیں نا جو سطح پر نظر آتے ہیں جو ہر جگہ چھائے ہوئے نظر آتے ہیں، یہ دراصل ”کنزود“ اور ”ہکے“ لوگ ہیں جو سچ آج پر اپنی کمزوری کے باعث تیرتے رہتے ہیں اور دنیا کی نظر میں آ جاتے ہیں جبکہ یہاں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اپنی اپنی اپروچ میں بہت بھاری ہیں، بہت ٹھوس ہیں اسی لیے وہ گہرائی میں رہتے

”ویل ڈن آمنہ ابکھر!“ تسکین ظفر نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔ ”شاباش آمنہ!“ اعجاز علی نے بھی داد دی جو اس ساری گفتگو میں خاموش تماشائی کی حیثیت سے موجود تھا۔

”کمال کر دیا تم نے آمنہ!“ طیب خان نے کہا۔

”ایکسیلنٹ..... ویری گنڈ..... شاباش..... زبردست..... خوش کر دیا آمنہ!“

ایک کے بعد ایک ساتھی اسے داد دیتے ہوئے گزر رہا تھا مگر عمر ایزد نے اتنا کہنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ حالانکہ آمنہ اس کا شکریہ ادا چاہتی تھی۔

چائے پیتے ہوئے آمنہ نے اسے قاتنا راج پال کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف دیکھا۔ اسے ہنسی آگئی۔ عمر ایزد حقیقتاً ایک عجیب لڑکا تھا۔ وہ چائے پیتے ہوئے مسلسل مسکراتی رہی۔

☆ ☆ ☆

"Bravo man, your are too good".

(شاباش یار! تم کمال ہو۔)

وہ اس کے سامنے کھڑا مسکراتی نظروں سے اسے داد دے رہا تھا۔ سب لوگ کانفرنس روم سے نکل کر اپنی اپنی گاڑیوں کی سمت بڑھ رہے تھے۔ وہ بھی اپنی گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول رہی تھی۔ جب عمر ایزد نے اسے مبارک باد دی۔

”تھینک یو..... تھینک یو سوچ..... تم نے ٹھیک کہا تھا۔“ اکائی کی طاقت“ ساری دنیا پر حکمرانی کرتی ہے۔“

وہ درپردہ اسے اس بات کا کریڈٹ دے رہی تھی کہ اس کی وجہ سے وہ بولنے کے قابل ہوئی۔

"Pleasure is all yours mam".

وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔ آمنہ اس کے انداز پر مسکرائی۔

”مجھے تمہارے دلائل نے حقیقتاً بہت متاثر کیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں پہلے سے جانتا تھا۔ کہ جب تم بولو گی تو سب دل لگا کر تمہیں سننے پر مجبور ہو جائیں گے اور تمہارا ساتھ بھی دیں گے۔“ وہ ایک بار پھر سنجیدہ ہوا۔

”ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔ مجھے احساس ہوا میں غلط تھی۔ وہاں تو سب اپنے بیٹھے تھے اور میں نواہ نواہ نہیں اٹھ رہی تھی۔“

آمنہ نے فوراً اعتراف کیا پھر اس کی جانب دیکھ کر بولی۔

”جب ”انہوں“ نے میڈیا کی تکرار کی تو میں کچھ مختلط ہو گئی تھی۔ کیونکہ ان کا میڈیا حقیقتاً

جلا ڈالی تھیں میں نے بھی

وہیں سب کشتیاں اپنی

جہاں پہلا پڑاؤ تھا

شکستہ جسم تھا میرا

میرے سینے میں گھاؤ تھا

بھڑکتا اک الاؤ تھا

کسی کی چاہ میں سب کچھ لٹا کر

آ گیا تھا میں

کہاں پر آ گیا تھا میں؟

جہاں پہچان کا اپنی

حوالہ ہی نہ ملتا تھا

حوادث کے تھپڑوں سے

سنجیلا ہی نہ ملتا تھا

شب تیرہ سے نکلا تھا

اجالوں کی تمنا میں

مگر مجھ کو کسی جانب

اجالا ہی نہ ملتا تھا

مگر ہمت نہیں ہاری

مگر ہمت نہیں ہاری

یہاں تک آ گیا ہوں میں

جہاں ہر سو اجالا ہے

میری پہچان ہے اپنی وطن میرا حوالہ ہے

مجھے اس نے سنجیلا ہے اسے میں نے سنجیلا ہے

یہی میرا حوالہ ہے

یہی تیرا حوالہ ہے

☆ ☆ ☆

”جب یہ ملک بنا تو ہمارے پاس کچھ نہ تھا۔ ہم خالی دامن اور دریدہ آنچل لے کر یہاں آئے تھے۔ ہمارے اثاثے، ہماری املاک، ہمارا قیمتی ساز و سامان سب وہاں رہ گیا تھا۔ ہم میں سے

ہیں۔ وہ کمزور لوگوں کی طرح سطح آب پر نہیں کرتے۔ تم یقین مانو عمر! اس ملک کی جڑیں گہری ہیں، بہت گہری۔“

وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ عمر کے چہرے سے سنجیدگی پھر غائب ہو گئی۔ اس شخص کا عجیب مسئلہ تھا۔ وہ تب سنجیدہ ہونا پسند کرتا تھا جب سب لوگ غیر سنجیدہ ہوتے تھے اور تب غیر سنجیدہ ہو جاتا جب سب لوگ سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر بیٹھے ہوتے تھے۔ اب بھی آمنہ کی انتہائی سنجیدہ بات سن کر وہ مسکرا دیا۔

”مجھے تمہاری بات پر یقین تو نہیں ہے مگر پھر بھی مان لیتا ہوں۔“ وہ پھر سے شرارتی انداز میں بولا۔

”نہیں عمر! میری بات کا یقین کرو بلکہ میں ثابت کر سکتی ہوں۔ مرید کے میں میرے دادو نے غریب بچوں کے لیے ایک اسکول بنا رکھا ہے۔ یہ ایک طرح کی آرگنائزیشن ہے جو غریب بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے مختلف پروگرامز کا انعقاد کرتی رہتی ہے۔ کل شام کو وہاں ایک ورائٹی پروگرام ہے، جہاں بچوں کے بنائے گئے ہینڈ میڈ کارڈز، مختلف سجاوٹ کی چیزیں، ان کی ڈرائنگز اینڈ پینٹنگز اور کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ ہوں گی۔ تم وہاں آنا اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا کہ وہ بچے اس وطن کے معمار لگتے ہیں یا نہیں۔ تمہیں خود ان کی آنکھوں میں وہ جذبہ نظر آئے گا جو اس ایک فیصلہ کن کلاس میں نظر نہیں آتا۔ پھر تمہیں میری بات کا یقین آ جائے گا۔“ وہ اسے مدعو کرتے ہوئے کہہ رہی تھی جبکہ اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے پھر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”نارے بابا..... میں اپنی شام تمہارے اس ورائٹی پروگرام کے نام کر کے اپنا نقصان نہیں کر سکتا۔ مجھے کل شام شرمیلی قاتناراج پال نے انوائٹ کر رکھا ہے، پرسوں ان لوگوں کو واپس چلے جانا ہے اور وہ کل کی شام میرے ساتھ گزارنا چاہتی ہیں اور تم چاہتی ہو کہ میں اتنا رنگین پروگرام ڈراپ کر کے تمہارے اس بورنگ ورائٹی پروگرام میں آؤں۔ مجھے معاف رکھو مس آمنہ ابوبکر! میں چلتا ہوں۔“ وہ اس کی بات سننے بغیر آگے بڑھ گیا۔ آمنہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”تم حقیقتاً ایک معمرہ ہو عمر! زو!“

وہ عقب سے جھنجھلا کر بولی تھی۔ عمر نے اس کی بات سن کر مڑ کر اسے دیکھا پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا تھا گویا اس کو میبلنٹ پر شکر یہ ادا کر رہا ہو۔ آمنہ مسکراتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کے پاس آج کی رات دادو سے شیر کرنے کے لیے بہت سی باتیں جمع ہو گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

محبت کی کہانی میں مسافت کی بشارت تھی

مسافت طے ہوئی تو پھر

بہت سے لوگوں نے خود اپنے ہاتھوں اپنی بہنوں بیٹیوں کو ذبح کر ڈالا تھا تاکہ انہیں سکھ جھٹوں اور ہندو بلوایوں سے بچاسکیں۔ بہت سے ماں باپ نے اپنے جوان بیٹے کھوئے، بہت سے جوان بیٹیوں نے اپنے بوڑھے ماں باپ گنوائے مگر ان سب کے باوجود یہاں اس سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد ہم بہت خوش تھے۔ ہمیں لگتا تھا ہم نے زمین پر جنت جیسی کوئی چیز پالی ہے۔“

وہ ستر بہتر سال کا بارش آدمی جس کی سفید داڑھی اس کے گہرے تجربے و مطالعے کو ظاہر کرتی تھی، اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس کے ارد گرد دائرہ بنا کر بیٹھے بچوں کے چہرے پر انتہا کا تجسس تھا۔ موسم میں جس نہیں تھا مگر گرمی کے اثرات کے باعث تقریباً سب ہی کے چہرے پر پسینے کی ہلکی نمی تھی مگر ان بچوں میں سے کوئی بھی اکتایا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔ اس بارش شخص نے سفید رنگ کا باریک ململ کا کرتا شلوار پہن رکھا تھا۔ سر پر سفید ٹوپی تھی اور بائیں طرف ایک عصا رکھی تھی۔ اس پورے گراؤنڈ میں اتنی عمر کا کوئی دوسرا آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ یقیناً آمنہ ایوبکر کے دادو، نور الحسن تھے۔ عمر ایزد آگے بڑھ کر انہیں سلام کرنا چاہتا تھا مگر بچوں کے چہرے پر تجسس دیکھ کر وہ ایک سمت میں کھڑا ہو گیا۔ تاکہ دادو اپنی بات مکمل کر لیں۔

”اس زمانے میں کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اسے بمبئی، چندی گڑھ، دہلی یا کلکتہ جیسے شہروں میں رہنا ہے بلکہ سب لوگ اپنی اپنی پریشانیوں کو چھوڑ کر پاکستان چلے آئے۔ میں خود اپنے والدین کو گنوائے کے بعد اپنے منے سے بھائی کو اپنے کرتے میں چھپا کر لایا تھا اور بہت سے لوگوں کو اپنے ننھے منے بھائیوں کو کرتوں میں چھپانے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ ہم جب یہاں لاہور پہنچے تو والٹن کی قریب مہاجریمپ لگا تھا۔ میں نے سب سے پہلے والٹن کی زمین کا بوسہ لیا تھا۔

میرے دل سے ماں باپ کو کھونے کا ملال بھی نکل گیا تھا کیونکہ پاکستان پہنچ جانے کا خیال ہی اس قدر پر کیف تھا کہ کوئی دکھ دل میں جگہ بنا ہی نہیں پاتا تھا۔ ہم سب جانتے تھے کہ زندگیوں میں امتحانوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے مگر ہم سب پر جوش اور پر امید تھے۔ ہم سب میں ایک لگن تھی اور محنت کا جذبہ بھی۔“

انہوں نے کہتے کہتے رک کر سانس لیا پھر تپائی پر پڑا ایلمینیم کا گلاس اٹھا کر پانی کا ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا اور پھر سے بولنے لگے۔

”میرے بچوں! تم کو یقین نہیں آئے گا کہ جب پاکستان بنا تو یہاں تھوڑی سی ٹوٹی پھوٹی سڑکیں تھیں۔ ہمارے پاس ہاسپتال نہیں ہوتے تھے اور جو ہاسپتال تھے، وہاں بہت کم مریضوں کی گنجائش ہوا کرتی تھی۔ سڑکیں کم تھیں، اس لیے ٹرانسپورٹ سسٹم بھی بہت ناقص تھا اور گاڑیوں کی تعداد تو بہت ہی کم تھی۔ یہاں کی قابل کاشت زمین بھی خیر لگتی تھی۔ میں لاہور (والٹن) سے جہانیاں چلا گیا۔ وہاں میں محنت مزدوری کرتا تھا۔ بہت کم پیسے ملتے تھے، مگر ان کم پیسوں میں بھی اتنی برکت ہوتی تھی کہ میں

تینوں نام نہ صرف خود پیٹ بھر کر کھاتا تھا بلکہ اپنے بھائی کو بھی کھلاتا تھا۔ آزادی کے پالنے کا احساس ہی اس قدر مضبوط تھا کہ غربت یا پسماندگی کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ میں نے بہت محنت کی اور اس محنت کا صلہ بھی ملا۔ میں نے محنت مزدوری کرتے کرتے اتنا کمایا کہ اپنا کاروبار شروع کر سکوں۔ ایک پرچون کی دکان سے ابتدا کی پھر دھیرے دھیرے اسے ایک بڑے سے اسٹور میں تبدیل کر لیا۔ اس کے بعد زندگی میں کچھ ایسے حادثات آئے کہ جہانیاں سے لاہور شفٹ ہونا پڑا مگر یقین کرو میرے بچو! میں کبھی مایوس نہیں ہوا۔ ہمیشہ پر امید رہا کیونکہ مجھے خدا پر یقین تھا۔ مجھے زندگی میں جو کچھ ملا تھا، اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے اس دھرتی کی بدولت ملا تھا۔“

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔

”میں تب بھی مایوس نہیں ہوتا تھا اور میں اب بھی مایوس نہیں ہوں۔ جس طرح سے میں نے ترقی کی اور ایک پرچون کی دکان سے ایک بڑے اسٹور کا مالک بن بیٹھا، اسی طرح اس ملک نے بھی بہت ترقی کی۔ پہلے کی نسبت اب ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اب ہمارے ملک میں سڑکوں کی لمبائی تیس لاکھ نوے ہزار کلومیٹر ہو چکی ہے۔ گاڑیوں کی تعداد پچاس لاکھ اکٹھ ہزار ہو چکی تھی۔ فون لائنز چالیس لاکھ کی حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس ملک میں اکیس ہزار سنٹالیں میگاواٹ بجلی پیدا ہوتی ہے اور اس کی برآمدات میں ہزار ملین ڈالر ہو چکی ہیں۔“

وہ بات کرتے کرتے تھوڑا کر کے پھر پرسوج انداز میں بولے۔

”میرے بچو! ہمیں اس صورت حال پر خوش ہونا چاہیے مگر ہم مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا یہ مسلمان قوم کے لیے باعث شرمندگی نہیں کہ جب کچھ نہیں تھا تو سب بہت پر امید اور پر جوش تھے مگر اب جب بہت کچھ ہے تو ہم اس صورت حال پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی بجائے منہ لٹکا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم سب اپنے وطن کو برا بھلا کہتے ہیں اور ہم میں سے بہت سے لوگ اس وطن کو چھوڑ کر کہیں اور جا کر بسنا چاہتے ہیں۔ میرے بچو! مجھے بتاؤ کہ کیا یہ مایوسی اچھی بات ہے، کیا ہمیں پہلے کی طرح پر امید نہیں رہنا چاہیے؟“ وہ بچوں سے سوال کر رہے تھے اور عمر ایزد نے دیکھا کہ تقریباً سب بچے زور زور سے گردن ہلا رہے تھے۔ ان کی گردنیں اثبات میں ہل رہی تھیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ انہیں پر امید رہنا چاہیے۔ یہی عوامل اقوام کی ترقی میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

”میرے بچو! تبدیلی کی ضرورت زمین میں نہیں، ہم انسانوں میں ہے، ہم پاکستانیوں میں ہے۔ ہم میں یہ جو مایوسی آتی جا رہی ہے نایہ بہت گندی چیز ہے۔ ہمیں خود کو اس مایوسی سے بچانا ہوگا اور ہم بچیں گے، انشاء اللہ۔“ انہوں نے نہایت پر اعتماد لہجے میں کہا تھا اور ان کی آواز میں آواز ملانے کے لیے سب بچوں نے ”انشاء اللہ“ کہا تھا۔ عمر ایزد کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

باطل سے ڈلنے والے اے آچھان نہیں ہم

چھو بال لے چکا ہے تو امتحان ہمارا

ایک بچے نے اپنی توتلی آواز میں معصوم انداز سے یہ شعر پڑھا تھا۔ عمر ایزد نے اب کی بار ایک قہقہہ لگا دیا تھا۔ دادو کی نظر اس قہقہے کی آواز پر عمر ایزد کی جانب اٹھ گئی۔
”السلام و علیکم۔ مجھے آمنہ نے یہاں بلوایا تھا۔ میرا نام عمر ہے۔“ وہ ان کی استفہامیہ نگاہ کے جواب میں بولا پھر قریب آ کر ان سے ہاتھ ملا کر دوسرے ہاتھ میں پکڑے پھول اور کیک ان کی جانب بڑھا دیے۔

”ارے..... تم آمنہ کے دوست ہو..... آمنہ بچے! ادھر آؤ..... یہ عمر بیٹا آیا ہے۔“

انہوں نے اپنی نشست سے اٹھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور پھر آمنہ کو پکارا۔ عمر کو شرمندگی محسوس ہوئی اور دادو کے انداز پر دل ہی دل میں اس نے خود کو ڈانٹا بھی مگر دادو نے محسوس بھی نہ کیا تھا۔ آمنہ نجانے کس کونے سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی۔ پنک کمر کے سادہ سے لباس میں وہ بالکل چھوٹی سی بچی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے دوپٹہ ایک کندھے سے گزار کر کمر پر باندھ رکھا تھا۔ اس گھریلو سے طبع میں وہ کوئی اور ہی آمنہ ابوبکر لگ رہی تھی۔

”تم یہاں..... مجھے یقین نہیں آ رہا..... اچھا اس طرف آ جاؤ۔“

وہ اس کے ہاتھ سے پھول اور کیک لے کر بچوں کو تھماتے ہوئے بولی۔ عمر اس کے ساتھ دوسری سمت میں آ گیا۔ جہاں کچھ ننھی مٹی پچیاں سفید رنگ کے پھولے پھولے فرائیڈ پینے ہاتھوں میں ستارے والی ٹہنیاں تھامے پریوں کے گیٹ اپ میں کسی ٹیلو کی ریہرسل کر رہی تھیں۔ عمر نے حیرت سے اس وسیع و عریض گراؤنڈ کو دیکھا۔

ایک طرف اسٹالز بھی لگے تھے۔ بچے اپنی اپنی پینٹنگز بھی سجائے بیٹھے تھے کچھ اور چیزیں بھی نظر آ رہی تھیں۔

”تمہیں ایڈریس کس طرح ملا؟ کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟ اپنی گاڑی پر آئے ہو گے؟ وہ

میرے دادا تھے۔“

اس نے خود ہی سوالات کرتے ہوئے دادو کا تعارف کر دیا۔ اس کے انداز میں غلبت دیکھ کر عمر جھجلا گیا۔ وہ اتنی دور سے آیا تھا اور مس آمنہ اس کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے بچوں میں مگن تھیں۔
”یار! میں اتنی دور سے آیا ہوں، کم از کم میرا شکریہ ہی ادا کر دو۔“ وہ اسے گھورتے ہوئے بولا تو آمنہ مسکرا دی۔

”تم اتنی دور سے آئے ہو مگر میں تمہارا شکریہ ادا نہیں کر دوں گی البتہ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تم یور نہیں ہو گے اور جب تم یہاں سے واپس جاؤ گے تو تم میرا شکریہ ادا کرو گے۔“

وہ آمنہ کی بات پر مسکرانے کی بجائے خاموشی سے ان بچیوں کو دیکھنے لگا جو گول دائرے میں

گھوم رہی تھیں۔ ان ہی کے قریب ایک نو عمر لڑکی کھڑی تھی جو کسی نظم کو ترنم سے پڑھنے میں مصروف تھی۔ میری پہچان ہے اپنی وطن میرا حوالہ ہے۔

مجھے اس نے سنبھالا ہے اسے میں نے سنبھالا ہے

وطن میرا حوالہ ہے

وطن میرا حوالہ ہے

اس لڑکی کے بائیں جانب زمین پر چند بچے بیٹھے تھے جو ساتھ ساتھ تالیاں بجا رہے تھے اور ٹیلو کی ریہرسل کرتی بچیوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔

”بھئی بیٹا! آپ بازو کو ٹھیک سے نہیں گھما رہیں۔ یوں اوپر سے دائرہ بنا کر نیچے لاؤ۔“

آمنہ نے ایک بچی کو ٹوک کر صحیح کی۔

عمر اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ بچی کو ہدایات دے کر فارغ ہوئی تو اس کی طرف دیکھ کر ایک بار پھر مسکرا دی۔

”یہ آئٹم چودہ اگست کو پیش کرنے کے لیے خاص طور پر تیار کیا گیا ہے۔ یہ سب تیاری ان بچوں نے کی ہے۔ بچے بہت پر جوش ہیں۔“

وہ بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”یار آمنہ! میں تو ابھی سے بور ہو گیا ہوں۔ وہاں اچھی بھلی قانتا راج پال کے ساتھ ایک ٹھیک ٹھاک شام گزر سکتی تھی مگر میں یہاں آ گیا اور تم نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ راستے میں مشکل تو نہیں ہوئی اور یہ کہ ایڈریس کیسے ڈھونڈا اور وہاں میری گاڑی.....

”اف! میں عجیب آدمی ہوں، بھول ہی گیا۔ میرا بھائی بھی ساتھ ہے، باہر گاڑی میں بیٹھا ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں دیکھ کر آتا ہوں ہم صحیح جگہ پہنچے ہیں یا نہیں۔ وہ بے چارہ گاڑی میں بیٹھا سوکھ رہا ہے۔“

وہ غلبت بھرے انداز میں بولا۔ آمنہ ایک بار پھر مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی عمر ایزد خود بھی اس جذبے کے تحت یہاں کھنچا چلا آیا ہے جس جذبے کے تحت وہ اور دادو گزشتہ سالوں سے آرہے تھے۔ و یقیناً ان بچوں کی آنکھوں میں دھیرے دھیرے جلتی امید کی مشعلوں کو مزید ایندھن فراہم کرنے آیا تھا اور آمنہ کے سامنے خواہ مخواہ ایکٹنگ کر رہا تھا۔

”تمہارا چھوٹا بھائی نہیں ہے۔ اس کو بھی ساتھ لے آتے۔“ آمنہ نے متبسم لہجے میں کہا اور عمر انہیں اچکا کر اس کی جانب دیکھا۔

”ظفر کر رہی ہو“

”ارے نہیں بھئی، میں بھی بالکل سنجیدہ ہوں۔ ہمیں بہت سے بڑے بھائیوں کی، چھوٹے

بھائیوں کی، بہنوں کی، بایوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں بہت سے ہاتھوں کی ضرورت ہے، ہمیں بہت سے معماروں کی ضرورت ہے جو تعمیر وطن میں حصہ لے سکیں۔“

آمنہ نے بے حد جذب کے عالم میں کہا تھا۔

”اچھا..... ایسی بات ہے تو میں اگلی بار تمہارے اس سکول میں آتے ہوئے اپنی امی، خالہ، چاچی، ثانی، اپنے ابو، بڑے بھائی، چاچو، اپنی ہونے والی بیوی، اپنی سالیوں کو، سالیوں کے سرال والوں کو، اپنے گھر میں کام کرنے والے ملازم کو، اس کی بیوی کو، اس کی بیوی کے بھائی کو اور.....“

عمر یکدم خاموش ہوا کیونکہ آمنہ نے بے تحاشا ہنسنا شروع کر دیا تھا۔ عمر کے چہرے پر مسکراہٹ کھڑ گئی۔

”ٹیپو..... ٹیپو..... یہاں آؤ۔“ اس نے ہنستے ہوئے دور کھڑے ایک پندرہ سال کے لڑکے کو آواز دی۔

”یہ عمر بھائی ہیں۔ انہیں ذرا کہنی دو۔“ اس نے اس بچے کو عمر کے ساتھ لگایا اور ساتھ ہی مزید ہدایات دیں۔

”ان کے بھائی بھی ہیں ساتھ، باہر گاڑی میں بیٹھے ہوں گے، انہیں بھی لے آؤ اور سنو، میرے خرچ پر انہیں کوئلہ ڈرنگ بھی پلوا دیتا۔“

عمر چوں چرا کیے بغیر اس لڑکے کے ساتھ عقبی حصے کی طرف آ گیا۔ وہ حصہ سامنے والے حصے کی نسبت زیادہ اچھی طرح سے سجایا گیا تھا۔ بہت سے بچے اور بچیاں ادھر ادھر گھومتے نظر رہے تھے۔ مختلف اسٹالسجے ہوئے تھے جن میں مختلف چیزیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ ٹیپو تھوڑی دیر میں اس کے بھائی کو لے کر بھی آ گیا۔ عمر اپنے ساتھ عمیر کو خاص طور پر لایا تھا تاکہ اٹھارہ سالہ عمیر اپنے ملک کے مستقبل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ عمیر تھوڑی سی دیر بعد اپنی عمر کے چند ایک دوست ڈھونڈنے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا جو ان ہی کی طرح اس چیریٹی شو میں مدعو تھے۔ عمر نے ایک چھوٹی سی ڈائری نکال کر اس بہت سی باتیں نوٹ کی تھیں۔ اور عمیر نے اپنے ڈیجیٹل کیمرے سے بہت سی تصویریں بنائی تھیں۔

عمر اپنا اگلا آرٹیکل اسی پر امید مستقبل کی جھلکاتی روشنی میں لکھنا چاہتا تھا جبکہ عمیر کو فوٹو گرافی کا شوق تھا۔ اس نے خاص طور سے جشن آزادی کے موضوع پر ہونے والے فوٹو گرافی کے مقابلے کے لیے تصویریں اتاری تھیں۔ ان دونوں کو بلاشبہ بہت مزہ آرہا تھا۔ عمر جانتا تھا کہ وہ اس شام کو بہت انجوائے کرے گا، اسی لیے وہ ساری مصروفیات پس پشت ڈال کر یہاں آیا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے مٹی کے چھوٹے چھوٹے برتنوں سے سجے ایک اسٹال پر کھڑے ہو کر ایک چھوٹے سے دیے کو ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

”یہ چراغ ہے۔ میں نے خود بنایا ہے۔“ وہ بچہ خوش ہو کر بتانے لگا۔ اس دیے پہ بیرونی سطح

پر سبز اور سفید رنگ سے پینٹ کیا گیا تھا۔ وہ دیا بہت خوبصورت نہیں تھا مگر اس بچے کے چہرے پر جو خوشی اور فخر تھا، وہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔

”مجھے کتنے میں دو گئے؟“ عمر نے اس دیے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس بچے کے اسٹال پر اتنی عمر کا شاید پہلا گاہک تھا، اسی لیے وہ کچھ جھینپ سا گیا۔

”پچاس روپے تو بہت زیادہ ہیں یار!“ انچاس لے لو۔“

عمر نے شرارتی انداز میں سودا بازی شروع کی۔ بچے نے سعادت مندی سے گردن ہلائی تو عمر کو ہنسی آ گئی۔ اس نے اپنا والٹ نکال کر پچاس روپے اس کی پھیلی پر رکھ کر وہ دیا اٹھایا۔

”میں ان پیسوں کا نیا جھنڈا خریدوں گا۔ اس بار میں اپنے گھر کی چھت پر نیا جھنڈا لگاؤں گا۔“ اس بچے کے چہرے پر یہ سب کہتے ہوئے ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ عمر اسے دیکھتا رہ گیا۔

”تم نے اس قوم کی اصل اسپرٹ دیکھنی ہو تو اس بچے کی آنکھ میں دیکھنا جو جھنڈیوں کی دکان پر اپنے بابا کی قمیض کھینچ کھینچ کر جھنڈیاں خریدنے کی ضد کرتا ہے یا پھر وہ بچہ جو اپنے گھر پر سب سے اونچا جھنڈا لگانے کے لیے محلے والوں سے ہانس مانگتا پھرتا ہے یا پھر وہ بوڑھا جو پاکستان کے ساتھ لا الہ الا اللہ کی تسبیح کرتے نہیں تھکتا۔ تم دیکھنا عمر! پھر تمہیں احساس ہوگا کہ وہ سب لوگ بکواس کرتے ہیں جو اس قوم کے مستقبل سے ناامید ہو کر الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں۔“

آمنہ نے اسے یہاں انوائٹ کرتے ہوئے کہا تھا اور وہ اس بات پر بہت دل سے مسکرایا تھا مگر اس نے آمنہ کی سامنے صرف ناک چڑھانے پر اکتفا کیا تھا۔ وہ ننھے سے دیے کو ہاتھ میں لے کر دوبارہ سے آمنہ کی طرف آ گیا جو ابھی تک ان بچیوں کو ریمپرل کروانے میں مصروف تھی۔

”تمہارے لیے“ اس نے وہ دیا آمنہ کی جانب بڑھایا۔ آمنہ نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر وہ دیا تمام لیا۔

”تھینک یو آمنہ!“ اس نے آمنہ کے قریب ہو کر کہا تھا کیونکہ اب کی بار ٹیبلو والی بچیاں زمین پر بیٹھے بچے سب مل جل کر اونچی آواز میں گنگنا رہے تھے۔

”میری بچیاں ہے اپنی، وطن میرا حوالہ ہے“

مجھے اس نے سنبھالا ہے، اسے میں نے سنبھالا ہے وطن میرا حوالہ ہے

وطن تیرا حوالہ ہے“

آمنہ نے مسکرا کر عمر کی جانب دیکھا، وہ بھی مسکرا دیا تھا۔ اس وسیع و عریض گراؤنڈ میں موجود سب لوگوں کی آنکھوں میں امید خود بھی ایک عزم سے مسکرا دی تھی۔